جلد دوم

بے خبر! تُو جوہرِ آئینۂ ایّام ہے
تُو زمانے میں خُدا کا آخری پیغام ہے

آئینۂ ایّام

حالاتِ حاضرہ کا عکس ایک صاحبِ نظر کے زاویہ سے



پروفیسر مُفتی مُنیبُ الرحمٰن

بے خبر! تُو جوہرِ آئینہ ایّام ہے
تُو زمانے میں خُدا کا آخری پیغام ہے

حالاتِ حاضرہ کا عکس ایک صاحبِ نظر کے زاویہ سے

آئینہ ایّام

2

پروفیسر مُفتی مُنیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور کراچی پاکستان

نام کتاب	آئینۂ ایام (۲)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
کمپوزنگ	مولانا عبدالمجید چانڈیو، مولانا یاسر رحمان
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	بار اول 2016ء
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	KM17

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411 فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

ziaulquranpublications@gmail.com

Website:- www.ziaulquran.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ مُدّعا

الحمدللہ علیٰ احسانہٖ روزنامہ دنیا میں ''زاویۂ نظر'' کے عنوان سے شائع ہونے والے میرے کالموں کا دوسرا مجموعہ پیشِ خدمت ہے۔ اس میں ستمبر 2014ء سے لے کر ستمبر 2015ء تک کے کالم شامل ہیں۔ قارئینِ کرام نے پہلے مجموعے کی پذیرائی فرمائی، اسی سبب دوسرا مجموعہ جلد طبع کرانے کا حوصلہ ہوا۔ ان شاء اللہ العزیز تیسرا مجموعہ بھی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

یہ کالم عارضی نوعیت کے نہیں کہ کچھ عرصے کے بعد یہ قاری کو فرسودہ Out Dated معلوم ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو یہ ہمیشہ قارئینِ کرام کو تازہ محسوس ہوں گے اور ان میں وہ اپنے عہد کا لمس محسوس کریں گے۔ کیونکہ ہمارے حالات اور مزاج میں کسی مثبت تغیُّر اور صورتِ حال کی بہتری کے امکانات کم ہی نظر آتے ہیں، صرف حکمران بدلتے ہیں طرزِ حکومت تقریباً ایک سا رہتا ہے، یعنی چہرے بدلتے ہیں نظام نہیں بدلتا۔ اس لیے یہ ہمیشہ کلامِ امروز Talk of the day ہی محسوس ہوں گے اور قاری جتنی بار بھی پڑھے گا، طبیعت اکتائے گی نہیں۔ ان کالموں کی حتمی تصحیح (Final Touching) اور ای میل کے ذریعے ترسیل میں میرے معاون مفتی عبدالرزاق نقشبندی کا بھی حصہ شامل ہے، اس کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں۔

قارئین سے گزارش ہے کہ اپنے تاثرات سے ضرور آگاہ فرمائیں۔ یہ کالم دراصل ہمارے نظام اور سماج کا آئینہ اور عکس ہیں۔

مفتی منیب الرحمٰن

فہرس

ستمبر2014ء

سات طبقات

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سات اشخاص ایسے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ اُس دن اپنی خصوصی سایۂ عاطفت میں رکھے گا، جس دن اس کے سایۂ رحمت کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ (۱) عادل حکمران، (۲) وہ نوجوان جس نے عنفوانِ شباب میں اپنی زندگی اللہ کی عبادت میں گزاری، (۳) وہ شخص جس کا دل (ہمیشہ) مسجد میں لگا رہے، (۴) ایسے دو اشخاص جو محض اللہ (کی رضا) کے لیے آپس میں محبت کریں، ان کے باہم تعلق قائم کرنے اور توڑنے کا سبب صرف رضائے الٰہی ہو، (۵) ایسا شخص جسے کسی منصب (Status) اور جمال والی عورت نے دعوتِ (گناہ) دی ہو، تو وہ کہے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں (اور اس کے قدم گناہ کی طرف بڑھنے سے رک جائیں)، (٦) ایسا شخص جو اس قدر رازداری سے صدقہ کرے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو پتا نہ ہو کہ اس کے دائیں ہاتھ نے (اللہ کی راہ میں) کیا خرچ کیا، (۷) اور ایسا شخص جس نے خلوت میں اللہ کو یاد کیا ہو اور (خوفِ الٰہی سے بے اختیار) اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ہوں''۔ (بخاری:660)

اس حدیث میں ایسے سات انسانی طبقات (Categories) کو بیان کیا گیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کو اَز حد محبوب ہیں اور جنہیں وہ حشر کے دن اپنی رحمت کے سائبان میں خصوصی پناہ عطا فرمائے گا، جس دن اس کے سایۂ رحمت کے سوا کسی کے لیے کوئی جائے امان نہیں ہوگی۔ ان میں سے سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''امامِ عادل'' کا ذکر

فرمایا، کیونکہ عدل ہی کے ذریعے لوگوں کو حقوق ملتے ہیں، ظالموں سے امان ملتی ہے اور اللہ کی زمین امن وآشتی اور عافیت کا گہوارہ بنتی ہے، ورنہ فساد اور انتشار دلوں کے چین اور ذہنوں کے سکون کو غارت کر دیتا ہے۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''عادل حکمران کا ایک دن (جس میں وہ مظلوموں کو انصاف فراہم کرے) ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے اور اللہ کی زمین پر قائم کی جانے والی ایک حد، جس میں اس کے حق کی پوری رعایت کی گئی ہو، چالیس سال کی بارش سے زیادہ زمین کو (شر سے) پاک کر دیتی ہے''۔ (نصب الرّایۃ، جلد:4، ص:67)

اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت کا فائدہ اجر کی صورت میں عبادت گزار کو ملتا ہے، مگر عدل کے سبب مظلوم انسانوں کو حقوق ملتے ہیں، ظلم سے نجات ملتی ہے اور ان کے لیے اللہ کی زمین راحت کدہ بن جاتی ہے۔

اللہ کے محبوب بندوں کا دوسرا طبقہ وہ جوان ہیں، جنہوں نے آغازِ شباب ہی سے اپنی زندگی اپنے رب کی عبادت میں گزاری ہو۔ عالمِ شباب میں جب انسان کی تمام قوتیں اپنے عروج پر ہوتی ہیں اور شیطانی ترغیبات چاروں جانب سے اسے اپنی طرف مائل کر رہی ہوتی ہیں۔ ظاہری اسباب کے باوجود وہ اپنے نفس اور نفس کی باطل خواہشات پر قابو پا کر اپنے آپ کو اللہ کی رضا کے تابع کر دے، ایسے نوجوان اللہ کو بہت محبوب ہیں اور یہ دین کا اثاثہ اور ملّت کا سرمایہ ہوتے ہیں۔

انسان کبھی بھی اپنے آپ کو دنیوی حاجات اور ضروریات سے لاتعلق نہیں رکھ سکتا، لیکن اسلام چاہتا ہے کہ دنیا کی محبت اس پر اس قدر غالب نہ ہو جائے کہ اسے یادِ خدا سے غافل کر دے۔ اس لیے وہ بشری تقاضوں کے مطابق دنیاوی کام کاج بھی کرتا ہے، لیکن اس کا دل مسجد میں لگا رہتا ہے، یعنی اللہ کی عبادت کا شوق اس پر غالب رہتا ہے۔ ہم ایک ایسے دور میں ہیں کہ ہمارے تعلقات کا مدار ترغیب وترہیب پر ہے، یعنی یا تو طمع و لالچ کے سبب کسی سے جڑے رہتے ہیں یا اس کے ضرر اور شر سے بچنے کے لیے تعلق قائم کرتے

ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مومن کا دوسرے مومن سے تعلق صرف اللہ کی رضا کے لیے ہونا چاہیے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا:

''اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں، جو نہ نبی ہیں نہ شہید، قیامت کے دن اللہ سے ان کا قرب دیکھ کر انبیا علیہم السلام اور شہدائے کرام ان کی تحسین کریں گے، صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! یہ کون لوگ ہیں؟ (یعنی ان کی صفات کیا ہیں)، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ ہیں جو کسی رشتے داری اور لالچ کے بغیر صرف میری رضا کے لیے لوگوں سے محبت کرتے ہیں، ان کے چہرے نورانی ہوں گے اور جب (قیامت کے دن) لوگ خوف زدہ ہوں گے، انہیں کوئی خوف نہیں ہوگا''۔ (سنن ابوداؤد:3528)

اس حدیثِ پاک میں نفلی صدقات کو چھپا کر دینے کی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے، کیونکہ اس میں ریا اور نام ونمود کا شائبہ نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور اگر تم صدقات علانیہ طور پر دو، تو یہ درست بات ہے اور اگر تم ان کو پوشیدہ رکھ کر فقرا کو دو، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے''۔ (البقرہ:271)

یعنی کسی دینی حکمت کے تحت صدقات علانیہ طور پر دیے جاسکتے ہیں، مثلاً دوسروں کو ترغیب اور جوش دلانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے، لیکن زیادہ افضل چھپا کر دینا ہے تاکہ ریاکاری کا ادنیٰ سے ادنیٰ احتمال بھی نہ رہے، کیونکہ ریاکاری سے اعمالِ خیر کا اجر باطل ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا رشاد ہے:

''اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور اذیت پہنچا کر اس شخص کی طرح ضائع نہ کرو، جو اپنا مال ریاکاری کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا، بس اس کی مثال اُس چکنے پتھر کی طرح ہے، جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کی بارش ہوئی، جس نے اس پتھر کو بالکل صاف کردیا''۔ (البقرہ:264)

اور پھر اگلی آیت میں فرمایا:

''اور جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دلوں کو مضبوط رکھنے کے لیے خرچ

کرتے ہیں، ان کی مثال اونچی زمین پر ایک باغ کی طرح ہے، جس پر زوردار بارش ہو تو وہ اپنا پھل دُگنا لائے اور اگر اس پر زوردار بارش نہ ہو تو اسے شبنم ہی کافی ہے''۔

(البقرہ:265)

اس حدیث میں یہ بھی بتایا کہ انسان کے ضمیر میں خوفِ خدا ہی ایسا جوہر ہے جو اسے شہوت رانی اور نفس پرستی سے روکتا ہے اور اس کے ایمان وعمل کی حفاظت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور رہا وہ جو (قیامت کے دن) اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر (جواب دہی کے تصور سے) ڈرا اور نفسِ امارہ کو اس کی خواہش سے روکا، پس بے شک جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے''۔(النازعات:41-40)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کے تصور سے ڈرا، اس کے لیے دو جنتیں ہیں''۔(الرحمٰن:46)

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:''بے شک جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں، انہیں اگر شیطان کی طرف سے کوئی خیال چھو بھی جاتا ہے، تو وہ خبردار ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں''۔(الاعراف:201)

یعنی وہ غفلت سے نکل آتے ہیں اور گناہ میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔اسی طرح اس حدیثِ پاک میں مومن کے دل پر اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور جلالت کے طاری ہونے اور اس کے نتیجے میں آنکھوں سے آنسو جاری ہونے کی کیفیت کا بیان ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور جب وہ رسول کی طرف نازل کیے ہوئے کلام کو سنتے ہیں، تو آپ دیکھتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، کیونکہ انہوں نے حق کو پہچان لیا ہے''۔

(المائدہ:83)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''جو شخص اللہ کے خوف سے رویا، وہ دوزخ میں داخل

نہیں ہوگا، حتیٰ کہ دودھ تھن میں لوٹ جائے اور اللہ کی راہ میں پڑنے والا غبار اور دوزخ کا دھواں جمع نہیں ہوگا"۔ (ترمذی:1633)

یعنی جس طرح تھن سے دودھ نکلنے کے بعد واپس تھن میں نہیں جا سکتا، اسی طرح جس دل میں خشیتِ الٰہی ہو اسے اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ سے محفوظ رکھے گا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دو قسم کی آنکھوں کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی:
(۱) وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئی ہو، (۲) اور وہ آنکھ جس نے اللہ کے دین کی حفاظت کے لیے اسلامی ریاست کی سرحد پر رات گزاری ہو"۔ (سنن ترمذی:1639)

مگر یہ اس رونے کی فضیلت ہے، جو خلوت میں ہو اور اللہ تعالیٰ کی ہیبت وجلالت اور اس کی بارگاہ میں جواب دہی کے تصور سے گریہ طاری ہو، کیونکہ اس میں ریاکاری کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ یہ اس گریہ وزاری کی فضیلت نہیں ہے، جس کے اشتہار دیے جاتے ہیں کہ رقت آمیز دعا کی جائے گی، اشتہاری رقّت اداکاری اور ریاکاری کا ہی مظہر ہوتے ہیں۔ جب کہ خلوت (تنہائی) کے آنسو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قابلِ قدر ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا ہے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

4 ستمبر 2014ء

پاکستانی پارلیمنٹ کا تاریخی کارنامہ

آج کل پاکستانی پارلیمنٹ ہر جانب سے ہدفِ طعن و تشنیع اور نشانۂ ملامت ہے اور یہ کافی حد تک بجا ہے، سو پارلیمنٹ کے ارکان کو کسی اور پر غصے اتارنے کی بجائے اپنے اندر اپنی ناکامیوں کے اسباب کو تلاش کرنا چاہیے۔ شیطان کے مریدین اور متبعین جب قیامت کے دن شیطان کو ملامت کریں گے کہ اس نے ہمیں گمراہ کیا اور اس خطرناک انجام سے دوچار کیا، تو قرآن مجید کے الفاظ میں شیطان کا جواب یہ ہوگا:

''اور جب فیصلہ ہو چکے گا تو شیطان کہے گا: اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، وہ برحق تھا اور میں نے جو وعدہ کیا تھا، اس کی میں نے خلاف ورزی کی، (مگر یہ بھی تو سوچو!) میرا تم پر کوئی غلبہ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں گناہ کی دعوت دی اور تم نے میری دعوت قبول کر لی، سو تم مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ کو (ہی) ملامت کرو، (اب اس مقام پر) نہ میں تمہاری فریادرسی کر پاؤں گا اور نہ ہی تم میری''۔ (ابراہیم:22)

تاہم ایک ادارے کی حیثیت سے ہماری اس پارلیمنٹ کے چند کارنامے قابلِ افتخار ضرور ہیں۔ اِن میں سے ایک قیامِ پاکستان کے 26 سال گزرنے اور آدھا پاکستان گنوانے کے بعد 1973ء کا متفقہ آئین ہے، جو پاکستانی قوم کا اجتماعی عمرانی معاہدہ (Social Contract) اور دستوری میثاق ہے، جس نے آج تک پاکستان کو مختلف اَدوار کے اہلِ اقتدار کی بے تدبیریوں اور ناکامیوں کے باوجود جوڑے رکھا ہے اور دعا ہے کہ یہ وحدت تا قیامِ قیامت قائم رہے۔

ہماری نظر میں پاکستانی پارلیمنٹ کا دوسرا اہم کارنامہ دستور کی متفقہ ساتویں ترمیم ہے، جس کے نتیجے میں ریاستی سطح پر انکارِ ختم نبوت کو کفر وارتداد قرار دیا گیا اور برصغیر پاک وہند کے جھوٹے مدعیِ نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی یا مجدّد یا مسلم ماننے والوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا گیا۔ عہدِ رسالت مآب ﷺ کے بعد خلافتِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے دوران اس امت میں جو پہلا فتنہ برپا ہوا، وہ فتنۂ انکارِ ختمِ نبوت تھا اور اس وقت بھی ریاست نے اِجماع اور مکمل اتفاقِ رائے کے ساتھ اسے ارتداد قرار دیا اور اس کی مکمل سرکوبی کی۔

اسلام میں امام الانبیاء والرسل سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ آپ کو خَاتِمُ النَّبِیّٖن یعنی اس زمین پر اللہ کے بندوں کے لیے اللہ کا آخری رسول تسلیم کیا جائے، آپ کی نبوت پر ایمانِ محض مسلمان ہونے کے لیے کافی نہیں ہے اور اس کا اعلان اللہ تعالیٰ نے خود قرآنِ مجید میں فرمایا:

ترجمہ: ''محمد ﷺ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں''۔(الاحزاب:41)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تکمیلِ دین کا اعلان فرمایا:

ترجمہ: ''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کردیا اور تمہارے لیے اسلام کو (بطورِ) دین پسند کرلیا''۔(المائدہ:03)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے تمام انبیائے کرام پر چھ چیزوں میں فضیلت عطا کی گئی ہے، (ان میں سے ایک آپ نے یہ بیان فرمائی کہ ماضی میں) کوئی نبی کسی خاص قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور دوسری روایت میں آپ نے فرمایا: ''مجھ پر نبوت کا سلسلہ ختم کردیا گیا ہے''۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''(اے نبی!) کہہ دیجیے، اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں''۔ (الاعراف:158)

1974ء میں ربوہ میں نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلبہ پر حملہ کیا گیا اور اس کے نتیجے میں ملک بھر میں تحریکِ ختمِ نبوت چلی۔ قائدِ ملّتِ اسلامیہ علامہ شاہ احمد نورانی نے ارتدادِ قادیانیت کی قرارداد قومی اسمبلی میں پیش کی اور اسمبلی میں موجود تمام علمائے کرام سمیت تقریباً پچاس کے قریب اراکینِ اسمبلی نے اس کی تائید وتوثیق کی۔ قادیانیوں کے اس وقت کے خلیفہ مرزا ناصر احمد نے استدعا کی کہ انہیں قومی اسمبلی میں اپنا موقف پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ ان کی اِس استدعا کو اس شرط کے ساتھ قبول کرلیا گیا کہ ان پر جرح بھی کی جائے گی، چنانچہ ایک ماہ سے کچھ زائد یہ کارروائی جاری رہی۔ مرزا ناصر احمد نے اس خوش فہمی میں اپنے آپ کو پیش کیا کہ تکفیر کا سلسلہ تو چلتا رہتا ہے، اگر مرزا غلام احمد یا قادیانیوں کی تکفیر کسی نے کردی ہے، تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ لیکن قومی اسمبلی کو بتایا گیا کہ نبوت کے جھوٹے مدعی اور اس کے ماننے والوں کی تکفیر ایک منفرد مسئلہ ہے، یہ کسی ایک فرد یا چند افراد کا تکفیری فتویٰ نہیں ہے، بلکہ سَلَف سے خَلَف تک اس پر پوری امت کا کلی اور قطعی اِجماع رہا ہے اور ہے، اس لیے اسے انفرادی فتووں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

مرزا ناصر احمد کی ایک خوش فہمی شاید یہ تھی کہ لفظی اور علمی بحثیں شروع ہوجائیں گی، جو اراکینِ اسمبلی کے سروں کے اوپر سے گزر جائیں گی، چند علماء کے سوا کسی کو اس میں دلچسپی نہیں ہوگی، چند دنوں میں سب اکتا جائیں گے، فائل داخلِ دفتر ہوجائے گی اور قصہ تمام ہو جائے گا۔ لیکن ان کی یہ خوش فہمی کافور ہوئی، پوری قومی اسمبلی نے نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ اس بحث میں حصہ لیا، اسے دلچسپی سے سنا اور آخرِ کار یہ نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور 7 ستمبر 1974ء کو پاکستان کی پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر ساتویں آئینی ترمیم منظور کی اور قادیانیوں کو مُرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا۔

اس تاریخی کارنامے میں اس وقت کی اسمبلی میں موجود تمام علمائے کرام کا بہت بڑا کردار ہے اور اس وقت کے اٹارنی جنرل جناب یحییٰ بختیار کا بھی نہایت احسن اور نتیجہ خیز کردار رہا۔ علما نے ارکانِ اسمبلی کو دقیق علمی بحثوں میں نہیں الجھایا، بلکہ مرزا غلام احمد قادیانی

کی تصانیف سے ان کی عبارات کے حوالے نکالے اور متعلقہ کتب برائے حوالہ پیش کیں اور ان کی بابت مرزا ناصر سے اٹارنی جنرل نے سوالات کیے۔ مرزا ناصر نے فرار کے بہت سے حیلے اختیار کیے، لیکن ان کے لیے حقائق سے فرار کی کوئی صورت نہ بن پائی۔ مرزا غلام احمد نے اپنی کتابوں میں خود پر ایمان نہ لانے والوں کو معاذ اللہ! ''نسلِ بدکاراں، چور، قزاق، حرامی، شیطان، کنجری کی اولاد، وَلدُ الحرام'' اور انتہائی غلیظ گالیوں سے نوازا ہے، ایک نبی تو کجا، ایک معمولی شریف النفس انسان کی زبان پر بھی یہ کلمات جاری نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح مرزا نے اپنی بیعت نہ کرنے والوں کو جہنمی قرار دیا، اپنے اوپر ایمان نہ لانے والوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا اور اپنے آپ کو ''مثیلِ محمد'' بلکہ ان سے بھی کامل ترین قرار دیا، اس نے کہا:

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں
اور آگے سے بڑھ کر ہیں اپنی شان میں
محمد دیکھنے ہوں جس نے اکمل
غلام احمد کو دیکھے قادیان میں

مرزا اپنی وحی بیان کرتا ہے: ''کل مسلمانوں نے مجھے قبول کیا اور میری دعوت کی تصدیق کرلی، مگر کنجریوں اور بدکاروں کی اولاد نے مجھے نہیں مانا''، وہ مزید لکھتا ہے: ''بلاشبہ تمہارے دشمن بیابانوں کے خنزیر ہوگئے اور ان کی عورتیں کتیوں سے بھی بڑھ گئیں''، وہ لکھتا ہے: ''جو شخص ہماری فتح کا قائل نہ ہوگا، صاف ظاہر ہے کہ اس کو ولد الحرام بننے کا شوق ہے''، (روحانی خزائن)''۔

اسلامی ریاست میں آئین وقانون کے پابند ہر غیر مسلم شہری کو جان ومال اور عزت وآبرو کے وہی تحفظات حاصل ہیں، جو کسی مسلمان کو حاصل ہیں۔ غیر مسلموں کو اپنی عبادت گاہوں میں اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ پاکستان کا دستور بھی انہیں یہ تحفظ دیتا ہے اور ہم اس کی مکمل تائید وتوثیق کرتے ہیں، غیر مسلموں کے

حوالے سے پاکستان کا ٹریک ریکارڈ اپنے پڑوسی ملک ہندوستان سے بہت بہتر ہے۔ اس کے باوجود جو اکّا دکّا واقعات ماضی میں ہوئے، اُن کی ہم شدید مذمت کرتے رہے ہیں، مسلمان اور پاکستانی کی حیثیت سے ہمیں ان پر افسوس ہے۔ آج بھی پاکستان میں ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور دیگر مذاہب کے ماننے والے امن وامان کے ساتھ رہ رہے ہیں اور مسلمانوں کا ان سے کوئی تصادم یا ٹکراؤ نہیں ہے۔

گوجرہ کا ناخوشگوار واقعہ ہوا، ''اتحادِ تنظیماتِ مدارس پاکستان'' کے تمام قائدین وہاں گئے، چرچوں میں گئے، اپنے عیسائی ہم وطنوں کو تسلی دی اور مسلمانوں اور عیسائی برادری کو ایک ساتھ بٹھا کر امن وعافیت کے ساتھ رہنے کی تلقین کی۔ قادیانیوں سے ہمارا صرف یہ مطالبہ ہے کہ دستورِ پاکستان کو تسلیم کریں اور دستور نے انہیں جو حیثیت دی ہے، اس پر قناعت کریں، ان کو بھی تمام دستوری اور قانونی تحفظات حاصل رہیں گے۔

5 ستمبر 2014ء

تمت بالخیر

ہمیں سکھایا گیا ہے کہ جب کوئی کام شروع کریں، تو یہ دعائیہ کلمات پڑھیں:

''اے اللہ! یہ مہم جو ہمیں درپیش ہے، اس کو ہمارے لیے آسان فرما، اس میں ممکنہ طور پر پیش آنے والی ہر دشواری سے ہمیں بچا اور اس کا انجام خیر پر فرما۔ اے ہر بند راستے کو کھولنے والے! ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں''۔ ''اے اللہ! اس کام کا آغاز اچھا فرما، اس میں درپیش ہر مشکل مرحلے میں ہم پر رحم فرما، اس کا انجام ہمارے لیے اچھا فرما''۔ ''اے اللہ! ہمارے دین و دنیا اور آخرت سے متعلق تمام امور میں ہماری اصلاح فرما اور ہماری عاقبت یعنی ہمارے ارادوں اور افعال کے نتائج کو ہمارے لیے بہتر فرما دے''۔

پوری قوم ایک مشکل صورتِ حال سے دوچار ہے اور عالمی سطح پر ملک کی رسوائی ہورہی ہے، ملکی معیشت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ حکومت اور پارلیمنٹ اِس کی ذمے داری دھرنے والوں پر ڈال رہی ہے اور وہ یک آواز ہوکر اِس صورتِ حال کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرا رہے ہیں۔ شاید بحیثیتِ مجموعی ہمارا پورا نظام اس کا ذمے دار ہے۔ یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ حکومت نے کافی تحمل (Restrain) کا مظاہرہ کیا، جذبات پر قابو رکھا، حالات کا رخ طاقت سے بدلنے کی حکمتِ عملی سے گریز کیا، مگر لاہور میں جو بے تدبیری اور سنگ دلی ہوچکی تھی، وہ ناقابلِ تلافی ثابت ہوئی اور اس کے اثرات سے نکلنا حکومت کے لیے لحہ بہ لحہ دشوار سے دشوار تر ہورہا ہے، اِدھر دھرنے والوں نے بھی غیر معمولی سکت (Stamina) دکھائی۔ اس لیے پوری قوم ایک بند گلی میں کھڑی ہے اور قوم پر ایک

ایک لمحہ پہاڑ بن کر ٹوٹ رہا ہے۔

ہم جیسے کمزور دل لوگوں کے لیے یہ لمحے اذیّت ناک ہیں، آج کل ٹیلی ویژن دیکھنا چھوڑ دیا ہے، دن میں صرف ایک دو بار چند Ticker دیکھ لیتے ہیں اور بس۔ بہت سے اہلِ نظر اور اہلِ درد ملتے ہیں، اُن کی بھی یہی کیفیت ہے، پوری قوم کو مایوسی کے اندھیروں میں دھکیلنا اور ان کے ملی جذبات کو پژمردہ اور مضمحل کرنا نجانے کس کے مفاد میں ہے، واللہ اعلم بِالصواب۔

ساٹھ اور ستر کے عشرے میں جب ٹریڈ یونین ازم (یعنی مزدوروں کی سودا کاری انجمنوں) کا زمانہ تھا، تو وہ ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے مزدور لیڈر بھی اتنا شعور رکھتے تھے کہ مثلاً ان کے پانچ بنیادی مطالبات ہوتے تو پانچ اضافی مطالبات شامل کر لیتے اور یہ اضافی مطالبات صرف دباؤ ڈالنے اور اپنی سودا کاری کی پوزیشن کو بہتر بنانے کے لیے ہوتے، ہڑتالیں ہوتیں، جلسے ہوتے، نعرے بازیاں ہوتیں اور آخر میں مذاکرات سے مسئلے کا حل نکل آتا، اضافی مطالبات سے یونین کے لیڈر دستبردار ہو جاتے اور اصل مسائل کو انتظامیہ مان لیتی اور کام رواں دواں ہو جاتا۔

چین کے صدر کا دورہ ملتوی ہو چکا، ملک سیلاب کی تباہ کاریوں کی زد میں ہے، انتظامیہ ایک طرح سے مفلوج یا جامد و ساکت ہے۔ ہماری دونوں طرف کی قیادت میں تقریری مقابلہ جاری ہے۔ شکوک وشبہات ہیں، ہر پاکستانی کی آنکھوں میں سوال ہے کہ اس سارے کھیل کا انجام کب اور کیا ہوگا؟ لیکن جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ بڑے بڑے ماہر لکھاریوں، کالم نگاروں اور تجزیہ نگاروں کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا کہ غزل کا مطلع کیا ہو اور مقطع کیا ہو، کہاں سے مضمون باندھیں اور کہاں ختم کریں؟ ہر ایک سوچتا ہے میں کچھ کہوں یا کچھ لکھوں، لیکن یہ سوچ کر قلم رُک جاتا ہے کہ میں کچھ لکھ دوں اور اگلے لمحے کچھ اور منظر سامنے آ جائے، تو خواہ مخواہ بھد اڑے گی۔ لہٰذا ہر ایک کے لیے اپنی دانش کی ساکھ اور اعتبار کو قائم رکھنے کا بھی مسئلہ ہے۔

پرائیویٹ ٹیلیویژن چینلز پر نجومی، جوتشی اور ماہرین مستقبلیات (Future Predictors) بیٹھ کر سب کی قسمت کا حال بتاتے تھے کہ کس کے ہاتھ میں اقتدار کی لکیر ہے اور کس کے ہاتھ میں نہیں ہے، کس کے ستارے گردش میں ہیں اور کس کے برج الٹ رہے ہیں، اُن کا روزگار بھی خطرے میں ہے۔ جب ان کی اصل مہارتوں اور بشارتوں کا وقت آیا، تو منظر کچھ یوں بنا کہ:

شیخ محشر میں جو پہنچے، تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے، وہی مال ندارد

یہاں پر مجھے قرآنِ مجید کی چند آیات یاد آ گئیں:

''(جنات کہتے ہیں:) ہم نے آسمان کی (خبریں جاننے کے لئے) کھوج لگائی، تو ہم نے دیکھا کہ وہ سخت محافظوں سے اور آگ کے گولوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور (اس سے پہلے) ہم (عالمِ بالا کے فرشتوں کی) باتیں سننے کے لیے گھات لگا کر بیٹھ جاتے تھے، سو اب جو سننے کی کوشش کرتا ہے، تو وہ اپنے عقب میں آگ کا شعلہ تیار پاتا ہے۔ اور ہمیں نہیں معلوم (اس تبدیلی سے) اہلِ زمین کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کیا گیا ہے یا بھلائی کا''۔

(الجن:8-10)

ان آیات کا پسِ منظر یہ ہے کہ شیاطین یا جنات کو عالَمِ بالا میں ایک حد تک جانے کی اجازت تھی۔ وہ وہاں گھات لگا کر بیٹھ جاتے اور ملائکہ کی آپس میں گفتگو کی سُن گُن لیتے اور پھر اُن نا تمام اور سیاق وسباق (Context) سے کٹی ہوئی خبروں میں اپنی طرف سے مرچ مصالحہ لگا کر یعنی اضافے کر کے کاہنوں تک پہنچاتے، جو ایک طرح سے شیطان کے چیلوں کا کام کرتے تھے اور پھر اس حربے کے ذریعے وہ لوگوں کو اپنے دامِ عقیدت میں پھنساتے، ان سے نذرانے لیتے اور ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی میں مبتلا کرتے۔

پس لگتا ہے کہ ہماری موجودہ پریشان کُن اور تشویش ناک صورتِ حال میں ہمارے عالَمِ بالا والوں نے بھی ناپختہ پیغام رسانوں سے شاید نجات حاصل کرنے کا سوچ لیا ہو کہ

اِن سے خیر کی بجائے شر ہی برآمد ہوا ہے اور اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج سب کچھ Stuck یعنی جامد و ساکت ہے۔

اب لازم ہے کہ تنازع کے دونوں فریق، جنہوں نے پوری قوم کو انتظار اور تشویش کی سولی پر لٹکایا ہوا ہے، اس مظلوم و بے ضرر قوم پر رحم فرمائیں اور ''تمت بالخیر'' کی کوئی آبرومندانہ صورت نکالیں، جس میں نہ کسی کی فتح ہو نہ شکست، کیونکہ اس وقت نقصان صرف پاکستان کا ہو رہا ہے، پاکستان کو مزید نقصان اور عالمی رسوائی سے بچائیں۔ پوری قوم ''دیر آید درست آید'' کے مصداق اِن سب کی شکرگزار ہوگی، کیونکہ حدیثِ پاک میں ہے:

''اعمال کے حتمی نتیجے (خیر یا شر) کا مدار انجام پر ہے، (بخاری:6607)''۔

انقلاب اور آزادی کے نام پر دھرنا دینے والوں کے بنیادی اہداف یہ تھے:

(۱) ماڈل ٹاؤن کی سفاکی کی ایف آئی آر ان کی مرضی کے مطابق درج ہو، ان کے تمام نامزد ملزموں کے نام اس ایف آئی آر میں درج کیے جائیں، ملزمان کے خلاف دیگر فوجداری دفعات کے ساتھ ساتھ دہشت گردی کی دفعات بھی لگائی جائیں، ان کی مرضی کے مطابق تمام تفتیشی اداروں کے ماہرین پر مشتمل تحقیقاتی ٹیم (Joint Investigation Team) مقرر ہو، وہ بے لاگ تحقیق کرے اور تمام معاملہ کسی حکومتی جبر اور دباؤ کے بغیر عدالتی مراحل سے گزرے۔

(۲) اس امر کی تحقیق ہو کہ آیا 2013ء کے قومی انتخابات میں منظم دھاندلی ہوئی ہے، جس میں ادارے یا بااختیار شخصیات ملوث ہوں۔ اس کے لیے سپریم کورٹ آف پاکستان کے تین ججوں پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیشن تشکیل دیا جائے اور ان کے دائرۂ اختیار Turms of Reference اور مدتِ کار کا قطعی تعین کر دیا جائے۔

(۳) وزیرِ اعظم اور وزیرِ اعلیٰ پنجاب کے استعفیٰ کا مطالبہ شاید قبول نہ ہو، پارلیمنٹ ان کے پیچھے کھڑی ہو گئی ہے اور یہ اُن کا مشترکہ مفاد ہے اور وہ بجا طور پر اسے جمہوریت اور نظام کے تسلسل اور پارلیمنٹ کی بالادستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ شاید یہ مرحلہ کسی ماورائے آئین

اقدام کے بغیر طے نہ ہو پائے۔

(۴) آئندہ قومی انتخابات کے لیے شفاف اور دھاندلی سے پاک (Rigging Proof) نظام وضع ہو اور ممکنہ طور پر بائیو میٹرک پولنگ سسٹم اختیار کیا جائے تاکہ صرف اصل (Genuine) ووٹر ہی ووٹ ڈال سکے اور اُس کے دوبارہ جعلی ووٹ ڈالنے کا امکان معدوم ہو جائے۔ اس کے لیے پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی تشکیل دی جا چکی ہے اور جناب عمران خان کو اس کمیٹی کی سربراہی کی پیشکش بھی کی جا چکی ہے۔

پس لازم ہے کہ ملک کے بہتر مستقبل، امن وامان کی بحالی اور معیشت کی روانی کے لیے تصادم میں الجھے ہوئے تمام فریق اپنی پوزیشن سے ایک قدم نیچے آئیں اور کسی قابل عمل اور قابل قبول معاہدے پر اتفاق رائے کریں، دھرنے کے سلسلے کا پُرامن اختتام ہو اور طے شدہ اُمور کی نگرانی اور مثبت پیش رفت پر نظر رکھنے کے لیے قومی جرگہ بدستور فعال رہے تاکہ کوئی فریق نہ فاؤل کھیل سکے اور نہ ہی معاہدے سے انحراف کر سکے، یعنی معاہدے پر لفظاً اور معنیً عمل ہو۔

ہمارے سیاستدان، الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کے لوگ ہمیشہ مذہبی لوگوں کو کوستے تھے کہ یہ مسلکی منافرت اور تعصّبات کو اس حد تک ابھارتے ہیں کہ ان کے اندر تحمل وبرداشت کی ایک رمق تک نہیں ہے، یہ لوگوں کو لڑاتے ہیں اور دوسروں کی عزت کے درپے ہوتے ہیں۔ آج کل ہمارے ہاں سیاسی عصبیت کے حاملین اس میدان میں اہل مذہب کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں اور لوگ ان سے اپنی عزت وآبرو کا تحفظ اور سلامتی مانگ رہے ہیں۔ لہٰذا سیاسی رہنماؤں کی بھی اخلاقی اور منصبی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں اور جاں نثاروں کو کچھ انسانی اَقدار اور ادب وآداب کی بھی تلقین فرمالیا کریں، ورنہ ہم آئندہ نسل کو اقدار واخلاقیات کا کون سا سیاسی اثاثہ اور سرمایہ منتقل کریں گے، ذرا سوچیے!

9 ستمبر 2014ء

سیلاب آمد

ملک میں بدقسمتی سے ایک بار پھر تباہ کن سیلاب آ گیا اور جانی نقصان کے ساتھ ساتھ بہت بڑے مالی نقصان کا بھی ملک وقوم کو سامنا ہے۔ اور ابھی تو سیلاب صوبہ سندھ کی حدود میں داخل بھی نہیں ہوا، اس لیے مجموعی نقصانات کا صحیح تخمینہ لگانا فوری طور پر ممکن نہیں ہے۔ ہم کراچی والوں کے بھائی الطاف حسین صاحب نے دھرنے والوں سے دردمندانہ اپیل کی کہ خدارا دھرنا موقوف کر کے پوری قوم سیلاب زدگان کی مدد میں جُت جائے اور سب مل کر اس قومی المیے کا سامنا کریں۔ مگر ہو سکتا ہے کہ دھرنے والوں نے سوچا ہو کہ پاکستان میں سیلاب تو چند سال کے وقفے سے آتا ہی رہتا ہے، انقلاب اور آزادی دھرنا تو بار بار نہیں آ سکتا، اس لیے اسے موقوف یا ملتوی کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔

حالانکہ دھرنے کے حوالے سے بھی کوئی ایسی مایوس کن صورتِ حال نہیں ہے۔ پہلا دھرنا 2012ء میں ہوا اور دو سال کے وقفے کے بعد اس دھرنے کے بطن سے دو دھرنے نمودار ہوئے، جن کی طوالت کا ابھی تک اللہ تعالیٰ اور دھرنے کی قیادت کے سوا کسی کو علم نہیں ہے۔ اور اگر دھرنوں کی افزائشِ نسل اسی رفتار سے جاری رہی، تو کوئی بعید نہیں ہے کہ ہمارا ملک ''دھرنستان'' کہلانے لگے اور ''گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ'' میں دھرنوں کے حوالے سے ہمارا ملک سرِ فہرست قرار پائے۔ انگریزی اخبارات والے دھرنے کو Sit In لکھتے ہیں، لیکن جو دہشت و ہیبت اور شکوہ ''دھرنے'' کے لفظ میں ہے، وہ Sit In میں کہاں؟۔ پہلے ہمارے ملک میں علامتی دھرنے ہوتے تھے، تو ان سے اتنا خوف نہیں آتا تھا، کیونکہ وہ

صرف احتجاج ریکارڈ کرانے کے لیے اور حکومت اور عوام کو اپنے مطالبات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہوتے تھے، اس لیے دھرنے کے سب فریق انہیں آسانی سے لیتے تھے۔ مگر اب صورتِ حال وحشت ناک ہوگئی ہے، کیونکہ حکومتِ پاکستان کے قلب یعنی پوری شاہراہِ دستور کو ''اہلِ دھرنا'' نے دَھر لیا ہے۔

اِس دوران ہمارے تمام ٹیلیویژن چینلز میں دھرنوں کی تمام تفصیلات اور جزئیات کی کورنگ کی میراتھن دوڑ لگ گئی، صرف زمین ہی سے نہیں بلکہ فضا سے بھی کوریج (Drone Camera Coverage) کے غیر معمولی انتظامات کیے گئے ہیں، معمول کی نشریات مُعطل ہوگئیں، نجومی، جوتشی اور ماہرینِ مُستقبلیات فارغ کردیے گئے ہیں اور وہ سینئر تجزیہ کار جن کے دربار معمول کے مطابق سرِ شام لگتے تھے، اب وہ چوبیس گھنٹے مصروف ہوگئے ہیں اور اُن کی مہارتوں، تجزیوں، تاویلات وتوجیہات کا فیض قوم کے لیے جاری وساری ہے۔ ہم تو جونیئر لوگ ہیں اور صرف ایک ہی شعبے میں سینئر ہیں اور وہ ہے: ''سینئر سٹیزن'' کا شعبہ۔ باقی ہم طالب علم ہیں اور اہلِ علم ودانش سے اپنی بساط کے مطابق استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ رَواں تبصروں کے پُرکشش نظارے تو ہم نے دامن کھینچ لیا ہے، کچھ عرصے کے لیے ٹیلیویژن اسکرین کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے تاکہ بلڈ پریشر نارمل رہے اور اِس ڈھلتی عمر میں نفسیاتی عوارض سے بچے رہیں، جو ہونا ہے وہ ہوکر رہے گا اور پوری قوم کے ساتھ ہم بھی نتائج کے مُستفیدین (Benificiaries) یا متاثرین (Affectees) میں شامل ہوں گے۔

دوسری طرف عالم یہ ہے کہ ایسے حالات میں حکومت تو قائم ہے، مگر حکم (Writ) چلتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ''ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے''۔ تاریخ میں پہلی بار پوری پارلیمنٹ تمام تر اختلافات کو بھلا کر حکومت کی پُشت پر کھڑی ہوگئی ہے، لیکن اِس کے باوجود بند گلی سے نکلنے کا راستہ کسی کو سجھائی نہیں دیتا۔ پارلیمنٹ، آئین اور جمہوری نظام کے تحفظ کی دُہائی دے رہی ہے اور مخالفین کے نزدیک آئین لفظاً ومعنیً رُوبہ عمل نہیں ہے۔ جو مطالبات ہیں، وہ

آئین کے دائرے میں پورے ہوتے دکھائی نہیں دے رہے اور آپس کی بے اعتمادی کی وجہ سے مسائل کو حل کرنے کے لیے درکار مدت اور طویل طریقۂ کار کی تکمیل تک اہلِ مطالبات انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ آئین وقانون کی نزاکتوں کو جاننے والے خوب سمجھتے ہیں کہ مطالبات کو آئینی وقانونی شکل دینے کے لیے وقت درکار ہوگا اور جو مطالبات آئینی ترمیم کا تقاضا کرتے ہیں، ان کے لیے آئین میں ترامیم کرانی پڑیں گی اور بعض کے لیے شاید قانون سازی کی ضرورت پڑے۔

آئینی ترمیم اور قانون سازی وزیر اعظم کے لیے پارلیمنٹ کی حمایت کے بغیر عملاً ممکن نہیں ہے، کیونکہ آئینی ترمیم کے لیے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں دو تہائی اکثریت درکار ہے، اور وہ وزیر اعظم کے پاس نہیں ہے، تاوقتیکہ اپوزیشن یا پارلیمنٹ کی سب جماعتیں اس کی حمایت نہ کریں۔ اسی طرح وزیر اعظم کے لیے تنہا اپنی پارٹی کے بَل پر سادہ قانون سازی بھی ممکن نہیں ہے، کیونکہ مسلم لیگ (ن) کے پاس سینٹ میں سادہ اکثریت بھی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر الیکشن کمیشن کی تشکیلِ نو کرنی ہے اور اس کے لیے کوئی نیا طریقۂ کار وضع کرنا ہے، موجودہ الیکشن کمیشن کے ممبران کو وقت سے پہلے فارغ کرنا ہے، تو اس گوہرِ مقصود کا حصول بھی دستوری ترمیم کے بغیر شاید ممکن نہ ہو۔ اِسی طرح اگر الیکشن کے طریقۂ کار کو بدلنا ہے، بائیومیٹرک سسٹم لانا ہے، تو اس کے لیے مطلوبہ قانون سازی کے ساتھ ساتھ انتظامات بھی درکار ہوں گے، پس تمام تر نیک نیتی کے باوجود اِس سارے پروسیس پر بھی یقیناً کچھ وقت لگے گا۔

مذاکرات کی صورتِ حال یہ ہے کہ یہ قومی جرگے کے توسط سے چیونٹی کی رفتار سے چل رہے ہیں، حالانکہ قومی اور ملکی مفاد کا تقاضا ہے کہ مذاکرات کو تیز رفتاری سے جلد از جلد کسی انجام تک پہنچایا جائے۔ جناب شاہ محمود قریشی دو تین روز سے یہ بشارت سنا رہے ہیں کہ معاملات حل ہونے کے قریب ہیں، لیکن دوسری طرف جو قیادتیں انقلاب مارچ اور آزادی مارچ کی مہم پر دھرنا جاری رکھے ہوئے ہیں، لگتا ہے کہ ان کا پروگرام طویل دورانیے کا ہے۔

قوم اس لیے کنفیوژڈ ہے کہ ان کے خطابات میں کسی مصالحت یا مفاہمت کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی اور ان کی بے قراری اور اضطراب کی تصویر بہت پہلے غالب نے اپنی غزل میں کھینچ دی تھی:

آہ کو چاہیے اک عُمر، اثر ہونے تک
کون جیتا ہے، تیری زُلف کے سر ہونے تک
دمِ ہر موج میں ہے، حلقۂ صد کامِ نہنگ دیکھیے
کیا گزرے ہے، قطرے پہ گُہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

سو مطالبات اور اَہداف کے لیے اگر آئینی اور قانونی ضمانتیں اور تحفظات درکار ہیں، تو عاشقی کو صبر طلب ہونا چاہیے، اس میں لازماً اور یقیناً وقت درکار ہوگا، صرف جذبات کے تموُّج، مزاج کی عُجلت پسندی اور عادت کی جلد بازی سے یہ ہمالیہ سر نہیں ہوگا، مگر مشکل یہ ہے کہ ''بے تاب تمنا'' میں انتظار کی سکت نہیں ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ کل کی بجائے آج اور آج کی بجائے اسی لمحے تصادم ہو جائے اور کچھ جانیں اس مشن کی نذر ہو جائیں اور پھر جس عالمِ غیب سے مداخلت (Intervention) کی توقعات ہیں، وہ مجبور ہو جائیں یا ان کے لیے جواز پیدا ہو جائے، لیکن یہ مرحلہ بھی دستوری نظام کی بساط لپیٹے بغیر سَر نہیں ہوگا، اس کے قومی، ملی اور ملکی فوائد کیا ہوں گے اور نقصانات کیا ہوں گے، یہ وقت آنے پر ہی معلوم ہوگا، کیا کسی کو خبر تھی کہ جنرل یحییٰ خان کے فوجی انقلاب کی قیمت مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں چکانی پڑے گی، سو خطابات کا پیغام تو یہ ہے کہ بقولِ شاعر:

مفاہمت نہ سکھا جبرِ ناروا سے مجھے!
میں سربکف ہوں، لڑا دے کسی بلا سے مجھے

بہت سے اہلِ نظر کے تاثرات اور تبصرے ہم بھی پڑھتے رہتے ہیں کہ اس گلے سڑے نظام کو غارت ہو ہی جانا چاہیے، اِس میں سڑاند ہے، بُساند ہے، تَعَفُّن (Septic) ہے، کرپشن ہے، ناانصافی ہے، ظلم ہے، جاگیرداری کا عفریت پھن پھیلائے اپنے زہر سے غریب مزارعین اور ہاریوں کا خون کشید کررہا ہے، پورا اجتماعی نَظم زہرآلود ہے، اس نے قوم کو کیا دیا ہے، لٰہذا جتنی جلد ممکن ہو اِس کی بساط لپیٹ دینی چاہیے۔ علامہ اقبال نے بھی یہی کہا تھا:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

مگر علامہ اقبال کے انقلابی اشعار سے بھی تاحال حقیقی انقلاب نہیں آیا اور آج تک کسی کی خطابت کی شعلہ نوائی سے آنِ واحد میں انقلاب نہیں آئے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ چند لمحات کے لیے انسان جھرجھری لیتا ہے، خون میں ایک برقی رَو (Current) سی دوڑ جاتی ہے اور انسان چاہتا ہے کہ جو نظام بے فیض (Undeliverable) ہے، اُسے یکسر نیست و نابود کر دیا جائے، لیکن نہایت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ انقلابی اشعار کہنے، انقلابی نثر پارے تخلیق کرنے اور محض انقلابی خطابات سے حقیقی انقلاب انسانی تاریخ میں نہیں آئے۔ انقلاب کے اجزائے ترکیبی اور تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں، یقین نہ آئے تو، انسانی تاریخ کے انقلابات کی داستانیں پڑھ لیجیے۔ ہم بہت کچھ بھی کر پائیں، توشکست وریخت کرسکتے ہیں، لیکن انقلاب تخریب کے بعد تعمیر کا نام ہے۔ اور نظام چلانے والی مقتدِرہ (Establishment) کا بدلنا آپ کے بھی اختیار میں نہیں ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکومت کے لیے کسی ایک اہم منصب پر اپنے مَن پسند فرد کا تقرر بھی دشوار ہے، آزاد عدلیہ نے جو کلچر متعارف کیا ہے، وہ بھی اب نظام کے پاوٗں کی زنجیر ہے۔ سو ایک بار پھر یہی کہا جا

سکتا ہے کہ: ”عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب“، یعنی کسی بڑے گوہرِ مقصود کو حاصل کرنے کے لیے بے تاب تمنا کو قابو میں رکھنا ہوگا اور صبر کے ساتھ منظم تدبیر، حکمت اور دانائی سے بھرپور جدوجہد کرنی ہوگی۔

ہمارے ملک کی تاریخ میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے جو بظاہر انقلابی نعروں کے ساتھ سیاسی منظر پر نمودار ہوئے تھے، مزدوروں اور کسانوں کو متحرک کیا، چند خاندانوں کے استحصال کو ختم کرنے کے لیے قوم کو آس دلائی اور اُنہیں سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد موجودہ پاکستان کا بلاشرکتِ غیرے اقتدار بھی ملا، مگر پھر کیا ہوا؟، بڑی صنعتیں، بینک، انشورنس کمپنیاں اور تعلیمی ادارے قومی ملکیت میں لے کر بیوروکریسی کے حوالے کر دیے گئے، چونکہ نئے نظام کو چلانے کے لیے نظریاتی کیڈر تیار نہیں کیے گئے تھے، اس لیے لوٹ مار کا بازار گرم ہوا، تعلیمی معیار زوال کا شکار ہوا، صنعتی ترقی کا پہیہ رُک گیا اور ملک آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے چلا گیا، سو جوش کی بجائے ہوش کی زیادہ ضرورت ہے۔

12 ستمبر 2014ء

بات کرنی مجھے مشکل، کبھی ایسی تو نہ تھی

فیض احمد فیض نے کہا تھا:

بات کرنی مجھے مشکل، کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل، کبھی ایسی تو نہ تھی

بہت سے کالم نگاروں اور میڈیا کے لوگوں کے دکھ بھرے شکوے شکایتیں سنتا اور پڑھتا ہوں کہ کچھ سیاسی پارٹیوں کے جیالے اور پُر جوش کارکن سوشل میڈیا پر اختلافِ رائے کے ''جرم'' کی پاداش میں مادر زاد گالیاں دیتے ہیں، دینی، اَخلاقی اور معاشرتی اَقدار سے گرے ہوئے جملے کستے ہیں، اُن کو ضمیر فروش اور بِکے ہوئے کے اَلقاب سے نوازتے ہیں، تو یہ سب کچھ سن کر سیاسی قیادت اور اُن کے پیروکاروں کے اَخلاقی زَوال پر دُکھ اور افسوس ہوتا ہے۔ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ میں اپنی داستان لے بیٹھا ہوں، مجھے ذاتی طور پر کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے، شاید مجھے بے ضرر یا بے اثر سمجھ کر معاف فرما دیتے ہوں گے یا کم اَز کم دین سے نسبت کی وجہ سے رعایت فرما دیتے ہوں گے۔ لیکن یہ بہر حال ہمارا قومی المیہ تو ہے اور اِس حد تک اَخلاقی زَوال ہمارے لیے دینی وتہذیبی لحاظ سے بہت بڑا نقصان ہے۔ ایک قائدِ محترم تو مجمعِ عام میں خطاب فرماتے ہوئے دوسروں کے لیے ناشائستہ زبان استعمال کرتے ہیں اور اسے ہمارا قومی میڈیا براہِ راست (Live) نشر کر رہا ہوتا ہے۔

اس لیے مجھے یہ عنوان قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کیا اب ہمارے

معاشرے میں کلمۂ حق کہنے یا آزادانہ اظہارِ رائے کو عملاً ناممکن بنادیا جائے گا۔ حالات کے جبر کے تحت وہی الفاظ لکھنے اور بولنے پڑیں گے، جو آپ کے منہ میں ٹھونسے جائیں گے، یا کسی بااَثر طبقے یا دادا گیر کو پسند ہوں گے، ورنہ جان کی اَمان نہیں ملے گی۔ اگر یہی شِعار کوئی مذہبی انتہا پسند گروہ اختیار کرے، تو ہمارا لبرل میڈیا آسمان سر پر اٹھالیتا ہے۔ انتہا پسندی ڈاڑھی، پگڑی اور زلفوں کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ذہنی نہاد اور Mindset کا نام ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حدیث پاک میں علاماتِ قیامت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''(ایک وقت آئے گا کہ) کسی شخص کی تکریم وتعظیم اُس کے شَر اور فساد کے خوف سے کی جائے گی''۔ (سُنن ترمذی:2211)

یعنی صلاحیتِ شر وایذا رسانی وجہِ تکریم بن جائے گی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ''اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا خوف کرو، تو پندارِ نفس اُسے گناہ پر اُبھارتا ہے''۔ (بقرہ:206)

(۲) ''اپنی پارسائی کے دعوے نہ کرو، بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے، پاکیزہ بنادیتا ہے''۔ (نساء:49)

پہلے کبھی ''اظہارِ رائے'' کی آزادی کے حوالے سے ریاستی جبر کا سامنا کرنا پڑتا تھا، وہ دور تو قصۂ ماضی بنا، لیکن اب اُس کی جگہ غیر ریاستی جبر نے لے لی ہے؟، علامہ اقبال نے کہا تھا:

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تری محفل میں؟
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

ہر ایک اپنی نیت اور عمل کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جواب دہ ہے، آپ کے پاس کسی کے بارے میں ٹھوس دلائل وشواہد موجود ہیں، تو ضرور حوالے کے ساتھ بات کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بدگمانی یعنی سوئے ظن سے منع فرمایا ہے، اِرشاد ہوا:

''اے اہلِ ایمان! بہت سے گمانوں سے بچو!، بے شک بعض گمان گناہ (کا سبب) ہوتے ہیں''۔ (الحجرات:12)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے: ''(بد) گمانی سے بچو! کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے''۔ (صحیح بخاری:6066)

اِسی طرح سورۃ الحجرات اور سورۃ الھُمَزہ میں لوگوں کا تمسخر اُڑانے، عیب نکالنے، طعن وتشنیع، برے ناموں سے پکارنے، پردہ دَری، غیبت اور دوسروں پر بہتان تراشی سے منع فرمایا ہے۔لیکن یہ الٰہی وعیدیں، تنبیہات اور اِنذار (Warnings) اُن پر اَثر انداز ہو سکتا ہے، جن کا آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں جواب دہی اور اُخروی حساب وکتاب اور جزاوسزا پر کامل ایمان ہو، ورنہ خدا خوفی سے عاری لوگوں کے لیے تو یہ ذہنی تفریح اور Enjoyment کا ذریعہ ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کو اَذیّت وآزار پہنچا کر خوش ہوتے ہیں، اُنہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی سخت گیری سے، جسے قرآنِ کریم میں ''بَطش'' (Striking) سے تعبیر فرمایا گیا ہے، ڈرنا چاہیے۔

بہتے ہوئے دھارے کے ساتھ چلنا، پاپولر یا مقبولِ عام بات کرنا تو بہت آسان ہے، مشکل کام تو اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنا ہے، سچ بولنا ہے، سیلابی ریلے کی مخالف سَمت میں چلنا ہے، حق کی راہ میں اور حق کی خاطر ہدفِ طَعن اور نشانۂ ملامت بنتا ہے، یہی انبیائے کرام کا شِعار رہا ہے اور یہی ہر دور میں اصلاح پسندوں کا وتیرہ رہا ہے جو کہ کارِ دشوار ہے۔ انبیائے کرام یہی کہتے رہے کہ (اِحقاقِ حق، اِبطالِ باطل اور دعوتِ حق کے لیے) میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہیں ہوں، میرا اجر تو بس اللہ کے ذمۂ کرم پر ہے۔

ہر دور کے مُتمرِّدِ دین اور سرکشوں نے اسی ''جرم'' کی پاداش میں انبیائے کرام علیہم السلام کو شہید کیا۔ امام الانبیاء سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اسی سبب سے ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ طائف میں آپ پر سنگ باری کر کے آپ کو لہولہان کیا گیا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ''سب سے شدید آزمائش انبیا کی ہوتی ہے اور پھر اُن کی جو مرتبے میں اُن سے قریب تر ہوں''، کیونکہ: ''جن کے رُتبے ہیں سوا، اُن کو سوا مشکل ہے''۔ اس لیے ہمارا پیغام یہی ہے کہ:

اَلحذَر! اے چیرہ دستاں اَلحذَر! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

دوسرا موضوع جس پر آج مجھے بات کرنی ہے، یہ ہے کہ میں نے ٹیلی ویژن پر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کا Ticker چلتا ہوا دیکھا کہ: ''قومی اسمبلی کی 70 فیصد مسند نشین یا ستر ارکان جعلی ہیں''۔ مجھے ان کی اس بات سے سو فیصد اتفاق ہے۔ لیکن ان ستر بالواسطہ نشستوں کا اضافہ جنرل پرویز مشرف نے ایک آمر کی حیثیت سے کیا، پھر اسے اپنے رسوائے زمانہ لیگل فریم ورک آرڈر (LFO) کا حصہ بنایا اور سترہویں آئینی ترمیم کے ذریعے اُسے پارلیمنٹ سے جبراً منظور کرا کے دستور کا حصہ بنا دیا۔ اتفاق یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب بھی اُس پارلیمنٹ کا حصہ تھے اور متحدہ مجلس عمل (MMA) سے ہمیشہ میرا یہی گلہ رہا ہے کہ اگر وہ مصلحت سے کام نہ لیتے اور اُنہوں نے عزیمت کی راہ کو اختیار کیا ہوتا، تو دورِ جدید کا یہ عجوبہ معرضِ وجود میں نہ آیا ہوتا۔ دنیا کی کسی کانگریس، پارلیمنٹ یا مُقنِّنہ (LegisLature) میں 60 بیگمات جبراً شامل نہیں کی گئیں۔ آبادی کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت انڈیا، اُمّ البرلیمان (Mother Parliament) یو۔کے، حتیٰ کہ امریکن کانگریس میں بھی ایسا نہیں ہے۔ یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ صرف پاکستان ہی میں ظہور پذیر ہو سکتا تھا اور ہو کر رہا۔

اگر 1973ء کا دستور اپنی اصل شکل میں نافذ رہتا، تو آج ہماری قومی اسمبلی کی 217 نشستیں ہوتیں، جن کا انتخاب براہِ راست ہوتا، کوئی مخصوص (Reserve) نشست نہ ہوتی۔ 1988ء تا 1997ء کے عرصے کے چار وسط مدتی (Mid Term) انتخابات میں بھی یہی تعداد تھی، کیونکہ 1973ء کے دستور میں قرار دیا گیا تھا کہ اس دستور کے نفاذ کے دس سال بعد یعنی 1983ء تک قوم جمہوری اعتبار سے بالغ نظر (Mature) ہو جائے گی اور اُس کے بعد پاکستان کی قومی اسمبلی میں کوئی مخصوص (Reserve) نشست نہیں ہوگی، اسی طرح سینٹ آف پاکستان بھی غالباً 45 نشستوں تک محدود تھی۔ چار صوبوں کی فی صوبہ دس دس نشستیں، فاٹا کی چار اور وفاقی دارالحکومت کی ایک، 1977ء، 1985ء اور 2002ء میں نشستوں کی تعداد میں اضافہ کر کے بالترتیب 63، 87 اور 100 کر دی

گئیں۔قومی اسمبلی کی نشستیں 2002ء میں براہِ راست انتخاب کے لیے 272 اور 70 مخصوص نشستیں (خواتین:60 اور غیر مسلم:10) کردی گئیں۔یہی وجہ ہے کہ برسرِاقتدار جماعتوں کی بیگمات بھی اسمبلیوں میں بیٹھی ہیں اور اس میں کسی کا استثنا نہیں ہے۔ حتّٰی کہ صوبۂ خیبر پختونخواہ کے وزیرِ اعلیٰ جناب پرویز خٹک کا خاندان بھی اِس اعزاز میں شامل ہے، یہی ہوتا رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔غیر مسلم بھی اپنی کمیونٹی کے نمائندہ نہیں ہوتے بلکہ جس جماعت کے کوٹے پر آتے ہیں، اسی کے نمائندہ ہوتے ہیں۔

ہمارے برعکس ہندوستان کی پارلیمنٹ میں، جس کی آبادی ہم سے چھ گنا یعنی ایک ارب اکیس کروڑ ہے، آزادی کے بعد سے اب تک پارلیمانی نشستوں کی کل تعداد 543 ہے اور اُنہوں نے قرار دیا ہے کہ 2020ء تک ان میں کوئی اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ جب ایک امیدوار اوسطاً 15 لاکھ ووٹرز کے پاس جائے گا، تو اتنی بڑی تعداد کو نہ دولت کے بَل پر خریدا جاسکتا ہے اور نہ ہی جبر، دھونس اور دھاندلی سے الیکشن جیتا جاسکتا ہے۔

موہن لال کرم چند گاندھی نے کہا تھا: ''جمہوریت کے تحت میری قوم کے کمزور ترین فرد کو وہی مواقع ملیں گے، جو طاقت ور ترین کو حاصل ہوں گے''۔

رسول اللہ ﷺ کے پہلے خلیفۂ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے اوّلین خطبۂ خلافت میں اپنا منشورِ خلافت بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''تم میں سے جو کمزور ہے، وہ میرے نزدیک طاقت ور ہے تاوقتیکہ میں طاقت ور سے اُس کا حق چھین کر اُسے لوٹا نہ دوں اور تم میں سے جو طاقت ور ہے، وہ میرے نزدیک کمزور ہے تاوقتیکہ میں اُس سے مظلوم کا حق چھین کر اصل حق دار کو لوٹا نہ دوں''۔

یعنی حق طاقت ہے، طاقت حق نہیں ہے، یہی تاریخ کا سبق ہے۔بدر تا کربلا ہر معرکۂ حق و باطل کا یہی پیغام ہے۔

15 ستمبر 2014ء

اک صورتِ عذاب

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”(اے نبی!) کہہ دیجیے! وہی اس بات پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں مختلف گروہوں میں بانٹ کر ایک دوسرے سے بھڑا دے اور تمہارے بعض کو بعض سے لڑائی کا مزہ چکھا دے، دیکھیے! ہم کس طرح نشانیاں بیان کرتے ہیں، تاکہ یہ سمجھیں“۔(الانعام:65)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عذاب کی مختلف صورتیں بیان فرمائی ہیں، یہ قدرت کی طرف سے تنبیہات (Warnings) ہوتی ہیں تاکہ لوگ سرکشی سے باز آجائیں، معصیت سے پلٹ کر اطاعت کی طرف آئیں۔ مفسرینِ کرام نے بیان کیا کہ اوپر سے عذاب کی ایک صورت طوفانی بارشیں، ہولناک آندھیاں، بجلی کی کڑک اور چنگھاڑ ہے جسے قرآن مجید میں ”صَیحَۃٌ“ ”صَآخَۃ“ سے تعبیر کیا گیا ہے، موسم کی شدت اور حِدّت بھی ایک صورت ہوسکتی ہے۔ اور نیچے سے عذاب کی صورت سیلاب ہیں، زلزلے ہیں، اچانک پھوٹ پڑنے والی مُہلک بیماریاں ہیں، جیسے ماضی میں مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کی امتوں پر طرح طرح کے عذاب نازل ہوئے۔ قومِ نوح، قومِ ہود، قومِ شعیب، قومِ صالح، قومِ لوط اور قومِ موسیٰ علیہ السلام پر عذاب کا تفصیلی بیان قرآن میں مذکور ہے۔

نظامِ حکومت کی ابتری، فساد، انتشار، لاقانونیت اور ظلم وعُدوان کا دور دورہ ہونا بھی ایک صورتِ عذاب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”اوپر کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ ظالم اور بے رحم حکمران مسلّط ہوجائیں گے اور نیچے کے عذاب سے مراد یہ

ہے کہ ماتحت ملازمین بے وفا، غدار، کام چور اور خائن ہو جائیں گے"۔

حدیثِ پاک میں فرمایا: "جیسے تمہارے کرتوت ہوں گے، ویسے ہی حکام تم پر مسلط کر دیے جائیں گے"۔ (شُعَبُ الایمان:3792)

عربی کا مشہور مقولہ ہے: "تمہارے اعمال ہی تم پر حاکم ہیں"۔ حضرت سفیان ثوری نے فرمایا: "جب میرے ماتحت اور خدّام میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں، تو مجھے احساس ہو جاتا ہے کہ مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوگئی ہے"۔

کسی صاحبِ اقتدار کے وزراء، مشیروں اور مصاحبین کا صداقت شِعار اور مخلص ہونا اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی تائید کی علامت ہے اور ان کا برا ہونا حاکم کے لیے تائیدِ الٰہی سے محرومی کی علامت ہے۔ حدیثِ پاک میں ہے:

"جب اللہ تعالیٰ کسی حاکم کے لیے خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے لیے صداقت شِعار وزیر مقدر فرما دیتا ہے تاکہ اگر اُس سے بھول ہو جائے، تو یہ اسے یاد دلا دے اور اگر اُسے اپنی ذمے داری یاد ہو تو یہ اُس کی مدد کرے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی حاکم کے لیے برائی کا ارادہ فرماتا ہے تو کسی برے شخص کو اس کا وزیر بنا دیتا ہے کہ اگر حاکم سے کسی اہم معاملے میں بھول ہو جائے، تو یہ اسے یاد نہیں دلاتا اور اگر حاکم کو اپنی ذمے داری یاد ہو تو یہ اس کی مدد نہیں کرتا"۔ (سنن ابی داؤد:2925)

عادل حکمران اللہ تعالیٰ کی زمین پر اُس کے بندوں کے لیے اُس کی غیر معمولی نعمت اور برکت کی علامت ہے اور حاکم کا ظالم و جابر ہونا عذاب کی صورت ہے۔ حدیثِ پاک میں فرمایا:

(ا) "تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں، تم اُن کے لیے دعا کرو کہ ان کے اقتدار کو دوام ملے اور وہ تمہارے لیے دعا کریں۔ اور تمہارے بدترین حاکم وہ ہیں کہ تم اُن سے نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں، تم اُن پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں"۔ (صحیح مسلم:1855)

(۲) ''جب تمہارے حاکم تمہارے بہترین لوگ ہوں اور تمہارے مال دار سخی لوگ ہوں اور تمہارے اجتماعی معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوتے ہوں، تو تمہارا زمین کے اوپر رہنا تمہارے لیے زمین کے اندر جانے سے بہتر ہے، (یعنی ایسی اجتماعی زندگی اللہ کی نعمت ہے)۔ اور جب تمہارے حاکم تم میں سے برے لوگ ہوں اور تمہارے مال دار بخیل ہوں اور تمہارے معاملات عورتوں کے ہاتھ میں چلے جائیں، تو تمہارے لیے زمین کے اوپر رہنے سے زمین کے نیچے چلے جانا بہتر ہے''۔ (سنن ترمذی:2266)، یعنی ایسی اجتماعی زندگی عذاب ہے۔

جب علمائے کرام ان ارشاداتِ باری تعالیٰ کی روشنی میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے حضور متوجہ ہونے کی ترغیب دیتے ہیں، اصلاحِ احوال کی دعوت دیتے ہیں کہ ہم سب مل کر اپنی اپنی جگہ توبہ واستغفار کریں، اپنے اندر جھانکیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی جانب متوجہ کریں، تو ہمارے بعض اہلِ دانش اسے غریبوں کے ساتھ مذاق سے تعبیر کرتے ہیں کہ لو جی! ''کرے کوئی اور بھرے کوئی''، جب کہ سرکش اور عیش ونشاط میں بدمست اور اقتدار کے نشے میں مدہوش لوگ تو اہل اقتدار اور خوش حال طبقات ہوتے ہیں، تو قدرت کا تازیانۂ عبرت بھی اُنہی پر برسنا چاہیے تاکہ زیردست طبقات ان کے انجام کو دیکھ کر ایک گونہ اطمینان محسوس کریں اور یہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور جب ہم کسی بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں، تو اس کے عیش پرستوں کو اپنے احکام بھیجتے ہیں، سو وہ ان احکام کی نافرمانی کرتے ہیں، پھر وہ عذابِ الٰہی کے حکم کے مستحق ہوجاتے ہیں، پھر ہم ان کو تباہ وبرباد کردیتے ہیں''۔ (بنی اسرائیل:16)

اس امت پر ایسا عذاب تو نہیں آئے گا کہ نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے، مگر اقوامِ عالم میں بے توقیری ہلاکت سے بھی بدتر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شام کے وقت اور صبح کے وقت

ان کلمات کے ساتھ دعا مانگنے کو ترک نہیں کرتے تھے: اے اللہ! میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کا سوال کرتا ہوں، اے اللہ! میں تجھ سے اپنے دین اور اپنی دنیا میں، اپنے اہل اور اپنے مال میں عفو اور عافیت کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! میرے عیوب پر پردہ فرما اور جن چیزوں سے مجھے خوف ہے، ان سے امان عطا فرما۔ اے اللہ! مجھے آگے اور پیچھے سے، دائیں اور بائیں سے، اوپر سے اور نیچے سے حفاظت میں رکھ اور میں نیچے کی مصیبت یعنی زمین میں دھنسا دینے سے تیری پناہ میں آتا ہوں''۔ (سنن ابن ماجہ: 3871)

زیرِ بحث آیت میں مسلمانوں کی باہمی آویزش اور ایسے اختلاف کو جو علمی بحث ومباحثے اور مکالمے کی حد سے نکل کر تصادم اور جدال وقتال کی حد تک پہنچ جائے، عذاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے ہمارے لبرل دانشور نہایت ذوق وشوق کے ساتھ مذہبی فرقہ واریت اور تصادم کو موضوعِ بحث بناتے تھے، مگر اب سیاسی محاذ آرائی اور منافرت نے سردست مذہبی منافرت کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور اب ہمارے الیکٹرونک میڈیا کی ساری رونقیں اسی کے دم سے قائم ہیں۔ یہ بات اگرچہ ناخوشگوار اور رُسوا کن ہے، مگر ہے حقیقت کہ ہم بحیثیتِ ملک وقوم دنیا کی نظر میں ناقابلِ حکمرانی ہیں اور بظاہر اصلاحِ احوال کے امکانات معدوم نظر آتے ہیں۔ پانچ ہفتوں سے ہم دنیا کے سامنے تماشا بنے ہوئے ہیں، بیرونی سفارت کار اپنے ملکوں کو پل پل کی خبریں بھیج رہے ہوں گے، وہ فریقین سے ملاقاتیں بھی کر رہے ہیں تاکہ جائزہ لیں کہ اپنی بربادی کا جشن منانے کے لیے ان میں کتنا دم خم باقی ہے۔ پاکستان کے ایک قابلِ اعتماد ہمسایہ ملک اور دنیا کی ایک ابھرتی ہوئی اقتصادی طاقت چین کے صدر کے دورے کا التوا سفارتی اعتبار سے غیر معمولی واقعہ ہے۔

حال ہی میں آئی ایس پی آر کے ترجمان نے جو پریس اسٹیٹمنٹ جاری کیا ہے، اس پر ہمارے اہلِ اقتدار خوشی کے شادیانے بجانا چاہیں، تو وہ بصد شوق ایسا کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ کیفیتِ جذب سے باہر آکر اسے پڑھیں، تو اس میں ایک جہانِ معانی پوشیدہ ہے۔ یہ معنوی اعتبار سے اسی طرح کا بیان ہے کہ جب تحریکِ طالبان پاکستان کو مذاکرات پر آمادہ

کرنے کے لیے علمائے کرام کے ایک طبقے سے حکومت نے مدد کی درخواست کی اور سہولت کار کا کردار ادا کرنے کے لیے بلایا، تو انہوں نے فریقین کے لیے ایک مختصر بیان جاری کیا تھا کہ: ''اللہ اور رسول کا واسطہ دونوں فریق جنگ بندی کر دیں''۔

اہلِ نظر بھی منقسم نظر آتے ہیں، ایک طبقہ اسے Status Quo یعنی موجودہ استحصالی اور غیر منصفانہ نظام کو برقرار رکھنے والی قوتوں کی مفاداتی جنگ اور آویزش سے تعبیر کرتا ہے، کیونکہ ان کے مطابق دونوں طرف ڈرائیونگ سیٹ پر اسی مفاداتی اور استحصالی طبقے کے افراد ہیں، بس صرف باری نہ دینے کا گلہ ہے۔ جناب عمران خان نے تو مینارِ پاکستان کے اپنے پہلے بڑے جلسۂ عام میں کہا تھا: ''میاں صاحب! آپ دو باریاں بھگتا چکے ہو، اب ہمیں بھی باری لینے دیں''۔

اس کے برعکس ایک طبقہ ایسا بھی ہے کہ جسے اُفق کے اُس پار سے امید کی کرن نظر آتی ہے، ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں، البتہ نوشتۂ دیوار اس کے برعکس ہے۔

19 ستمبر 2014ء

کیا ان حالات میں وہاں جانا ضروری ہے؟

اقوامِ متحدہ (UNO)، 24 اکتوبر 1945ء کو وجود میں آئی، یہ مجلس اقوام (League of Nations) کی ناکامی کے بعد اقوامِ عالَم کے ایک نئے فورم کی تشکیل تھی۔ اس پر بحیثیتِ مجموعی امریکا اور اس کے حلیف ممالک (Allies) کو روزِ اوّل سے مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ اس کے تحت ایک سیکورٹی کونسل ہے، جس کے پاس پالیسی تشکیل دینے اور اس کی تنفیذ کے مکمل اختیارات ہیں۔ اس کے پانچ مستقل ارکان ہیں، یعنی امریکا، روس، چین، برطانیہ اور فرانس، ان میں سے ہر ایک کو کسی بھی فیصلے یا قرارداد پر خطِ تنسیخ پھیرنے (Veto) کا مکمل اختیار حاصل ہے، باقی دس ارکان عارضی ہیں، جو دنیا کے مختلف خطوں سے عارضی طور پر دو دو سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں، لیکن ان دس کو مل کر بھی کسی فیصلے کے آگے سدِّ راہ بننے یعنی Veto کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ ویٹو پاور آج تک سب سے زیادہ امریکا نے استعمال کی ہے۔ انڈیا، جرمنی اور جاپان بھی مستقل رکنیت کے لیے کوشاں ہیں اور کسی حد تک انڈیا کے لیے طاقت کے بعض عالمی مراکز میں نرم گوشہ بھی موجود ہے۔

اقوامِ متحدہ کے بعض ذیلی ادارے بھی ہیں: مثلاً عالمی ادارۂ اطفال، عالمی ادارۂ صحت اور عالمی ادارۂ حقوقِ انسانی وغیرہ۔ اس کا سب سے بڑا فورم اس کی جنرل اسمبلی (مجلسِ عامّہ) ہے۔ اس کا ہر سال ستمبر کے تیسرے ہفتے (یعنی 16 تا 30 ستمبر) میں اجلاس شروع ہوتا ہے، جس میں تمام رکن ممالک شریک ہوتے ہیں، بعض اوقات اہم عالمی مسائل پر ہنگامی

اجلاس بھی طلب کر لیے جاتے ہیں۔

اس کے اجلاس میں سربراہانِ ریاست وحکومت (یعنی رکن ممالک کے صدور یا وزرائے اعظم) بھی شریک ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کی شرکت لازمی نہیں ہے، بلکہ اختیاری ہے، کئی ممالک کے وفود کی سربراہی ان کے وزرائے خارجہ کرتے ہیں۔ ہم جیسے بے توقیر اور بے اثر ممالک کے سربراہانِ ریاست وحکومت کو اس فورم میں شرکت کا شوق ہوتا ہے، چند منٹ خطاب کے لیے بھی مل جاتے ہیں، اس سے انہیں عالمی سطح پر نمود (Exposure) کا موقع مل جاتا ہے اور ایک اضافی فائدہ یہ مطلوب ہوتا ہے کہ اِس موقع پر بعض عالمی سربراہانِ ریاست وحکومت سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کا اعزاز مل جاتا ہے، لیکن اس کا انحصار اُس ملک کی اپنی اہمیت اور کامیاب سفارت کاری پر ہوتا ہے۔

یہ تمہیدی سطور میں نے اس لیے تحریر کی ہیں کہ وزیرِ اعظم جناب میاں محمد نواز شریف بھی اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے روانہ ہونے والے ہیں، یہ فیصلہ کرنا اُن کا منصبی حق ہے اور اِس حوالے سے ان پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتا۔ لیکن مقامِ غور یہ ہے کہ کیا ہمارے ملک کے داخلی حالات ایسے ہیں کہ انہیں وہاں جانا چاہیے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ کسی بھی ملک کا سربراہِ ریاست وحکومت کسی باقاعدہ (Arranged) میٹنگ میں یا سرِ راہ انہیں ملے گا تو وہ رسمی سلام کلام کے بعد پہلا سوال اُن سے ملک کے داخلی حالات کی بابت ہی پوچھے گا، کیا اس پر انہیں شرمساری نہیں ہوگی۔ اگر وہ پاکستانیوں کے کسی اجتماع سے خطاب کرتے ہیں، تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہاں ''گو نواز گو'' کے چند نعرے نہیں لگیں گے، خواہ یہ لوگ اس مقصد کے لیے خصوصی طور پر ہی کیوں نہ بھیجے گئے ہوں یعنی Planted ہوں۔ عام حالات میں یہ واقعات اتنے اہم نہیں ہوتے، لیکن موجودہ حالات کے تناظر میں ایسے واقعات کے منفی اثرات مرتب ہوں گے، ملک کے اندر ہوں یا بیرونِ ملک، ہم پاکستانی ایک منقسم قوم ہیں۔ ہم اپنے اپنے تعصُّبات، ترجیحات، پسند و ناپسند اور خواہشات کے اسیر ہوتے ہیں۔

ویسے تو عربی کا مقولہ ہے: ''گھر کا مالک اپنے اندر کے حالات کسی بھی دوسرے شخص کی بہ نسبت بہتر جانتا ہے''۔ سو وزیر اعظم اپنی حکومت اور حکمرانی کے احوال ہم سب کی بہ نسبت یقیناً بہتر طور پر جانتے ہوں گے۔ لیکن باہر سے بھی مشاہدہ اتنا متاثر کن نہیں ہے، بلکہ پریشان کن اور رسوا کن ہے۔ پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں اور حکمرانوں کی طرف سے ایک ٹیلی ویژن چینل کے حق میں آوازیں اٹھیں، لیکن حکومت کی بے بسی دیدنی ہے، حکومتی Writ یا اس کے بااختیار ہونے کی حقیقی تصویر یہی ہے۔ جب وفاقی حکومت کا بس وفاقی دارالحکومت میں بھی نہ چلے تو کیا یہ آئینہ پس پردہ اور باطن کے حقائق کے ادراک کے لیے کافی نہیں ہے؟۔

یقیناً حکومت کے اہم عناصر وزیر اعظم کو آئین اور قانون کی کتاب میں درج اُن کے بے پایاں اختیارات کا احساس دلاتے ہوں گے، لیکن دیوار پر اس کے برعکس لکھا ہے۔ صدر آصف علی زرداری کی بے بسی کا مذاق اڑایا جاتا تھا، شاید اب پسِ آئینہ حقائق منظرِ عام پر آنے سے بہت سے لوگوں کو ان کی مجبوریاں سمجھ آ رہی ہوں گی، یہ بھی اندازہ ہو رہا ہوگا کہ غیبی اشاروں کے نتیجے میں سیاسی قائدین اپنا موقف اور پینترے کس طرح بدلتے ہیں اور کیوں بدلتے ہیں۔

لہٰذا ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وزیر اعظم بیرونی دوروں کی بساط سر دست لپیٹیں اور اپنے گھر کی اصلاحِ احوال پر پوری توجہ مرکوز کریں۔ اپنے منصب کے مختارِ مطلق ہونے کے یوٹوپیا اور تخیلاتی دنیا سے نکلیں، عملیت پسندی (Pragmatism) کی طرف آئیں اور ریاستی طاقت کے اصل مراکز کے ساتھ ایک نئی حکمتِ کار (Working Relationship) بنائیں تاکہ ملک چلتا ہوا نظر آئے اور قومی بحران کا خاتمہ ہو۔

حدیثِ پاک میں ہے: ''اور جب تم سنو کہ ایک پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے، تو اس کی تصدیق کرو، لیکن اگر سنو کہ ایک شخص کی جبلّت اور سرشت تبدیل ہوگئی ہے، تو اس کی

تصدیق نہ کرو، کیونکہ انسان اپنی فطرت کی طرف پلٹ آتا ہے''۔ (مسند احمد:27499)

بدقسمتی سے یہ بات اب تقریباً درست ثابت ہو رہی ہے کہ ہمارے وزیر اعظم کے مزاج میں ایک طرح کی ضد ہے، اَڑیل پن ہے، وہ حقیقت پسند نہیں ہیں، ان میں تو اُفق اور تطابق (Adjustability) اور دوسروں کے ساتھ مل کر چلنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ کیا اپنی سیاست اور حکمرانی کے اس نازک ترین دور میں وہ اپنی اس جبلی کمزوری پر قابو پا سکتے ہیں۔ انہیں ادراک کرنا ہوگا کہ بعض حقائق ناخوش گوار اور انتہائی تلخ ہوتے ہیں، لیکن انہیں قبول کرنے کے سوا چارہ کار نہیں ہوتا۔ غالباً حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''اتنے نرم نہ بنو کہ تمہیں نچوڑ دیا جائے اور نہ اتنے سخت بنو کہ تمہیں توڑ دیا جائے''۔

پس اگرچہ شرکتِ اقتدار شریف برادران کا مزاج نہیں ہے، بلکہ ان کا مزاج ارتکازِ اقتدار کا ہے، لیکن اب شاید اُن کے لیے اس حوالے سے بہت زیادہ Options یا چناؤ کے مواقع نہیں ہیں، سوائے اس کے کہ ناخوش گوار حقائق کو قبول کر کے اپنے اندازِ حکمرانی کو تبدیل کریں اور ''شرکتِ اقتدار'' کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کریں۔ اور بادشاہت کے منصب سے نیچے اتر کر جمہوری اندازِ حکمرانی اختیار کریں۔ پارلیمنٹ کی حمایت کا مطلب یہ ہرگز نہ لیں کہ آپ محبوبِ خلائق ہو گئے ہیں، اس وقت آپ کی حمایت اُن کی مجبوری بن گئی ہے، اُن کے پاس آپشن نہیں رہا۔ دراصل پارلیمنٹیرین اور پارلیمانی جماعتیں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہیں، لیکن سیاسی حالات معمول پر آتے ہی یہ معاشقہ ختم ہو جائے گا اور وقت نے سب کو نئے رنگ ڈھنگ سکھا دیے ہیں اور دھرنوں کی قیادت کا یہ دعویٰ بجا ہے کہ پاکستان میں تبدیلی کی رو چل پڑی ہے اور اب یہ رک نہیں پائے گی بلکہ نئی جہتیں اختیار کرے گی۔ فَاعْتَبِرُوا یٰاُولِی الْاَبْصَار۔

اسی طرح انہیں ایک خاص طبقے کے لوگوں پر ہی اعتماد اور انہی کو اقتدار میں مؤثر حصہ دینے کا تاثر ختم کرنا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ طبقات کو اقتدار و اختیار میں شریک کرنا وفاقی پارلیمانی جمہوریت کی روح ہے، صدارتی نظام میں صدر یقیناً زیادہ بااختیار ہوتا ہے، کیونکہ

وہ براہِ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتا ہے۔ لیکن پارلیمانی نظام میں وزیرِ اعظم سیاسی طاقت وحمایت پارلیمان سے کشید کرتا ہے، لہٰذا پارلیمنٹ سے جڑے رہنے اور اس کے اعتماد کو برقرار رکھنے میں ہی وزیرِاعظم کی سیاسی قوت کا راز مضمر ہے۔

بجلی کے بحران ہی کو لیجیے، بالفرض آپ چند ہزار میگاواٹ بجلی مزید پیدا کرنے میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں، پھر بھی یہ بحران پوری طرح حل نہیں ہوگا، جب تک کہ تمام صوبائی حکومتوں کی تائید اور عملی حمایت سے بجلی چوری اور بل ادا نہ کرنے کے مسئلے پر قابو نہ پایا جائے۔ اٹھارہویں ترمیم کے نتیجے میں صوبوں کے اختیارات اور وسائل میں اضافہ ہوا ہے اور وفاق کا کنٹرول کمزور پڑ گیا ہے اور سابق وزیرِاعظم سید یوسف رضا گیلانی درست کہتے تھے کہ اب وفاق میں عملاً مخلوط حکومتیں ہی قائم ہوں گی، کسی ایک جماعت کا پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں مکمل کنٹرول مشکل ہوگا، چہ جائے کہ دو تہائی اکثریت کی توقع کی جائے۔

22 ستمبر 2014ء

سفر سے متعلق چند دعائیں

اہلِ ایمان کے لیے دعا حکمِ ربانی ہے، سنتِ انبیائے کرام اور رُسُلِ عِظام علیہم السلام ہے۔ دعا اسی طرح روحانی سبب ہے، جس طرح دوا ایک مادّی اور ظاہری سبب ہے۔ نہ ہر دوا کی تاثیر یقینی اور قطعی ہے اور نہ ہر طبیب کے علاج کا لازمی طور پر مؤثر ہونا ضروری ہے، اگر ایسا ہوتا تو کوئی مریض لقمۂ اَجَل نہ بنتا اور نہ کوئی مریض شفایاب ہوئے بغیر رہتا۔ کسی کی مہلتِ حیات دراز ہو جاتی ہے اور کسی کو اسے شفا نصیب ہو جاتی ہے اور کسی کے لیے نتیجہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی اسپتال میں چلے جائیں، دونوں مناظر آپ کو مل جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ دوا اور طبیب اسباب ہیں اور اسباب کی اثر آفرینی خداوندِ مسبب الاسباب کے قبضہ وقدرت میں ہے اور اس کی حکمت ومشیت کے تابع ہے۔ اسی طرح دعا بھی ایک روحانی سبب ہے، اس سے ایک تو دعا کرنے والے کو روحانی تسکین ملتی ہے، اپنے خالق سے روحانی اور قلبی رشتہ مستحکم ہوتا ہے اور دعا اس بات کا مظہر ہے کہ مختارِ مطلق اور سب کا مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ بعض صورتوں میں دوا کے بے اثر ہونے کی وجہ سے لوگوں نے طبیب سے رشتہ توڑ دیا ہو اور دوا کا استعمال ترک کر دیا ہو، تو پھر اللہ کی ذات سے رشتہ کیوں توڑا جائے؟۔

دوا اور دعا میں فرق یہ ہے کہ اگر دوا بے اثر ہوگئی، تو اس پر خرچ کیا ہوا سارا سرمایہ خاک ہوا اور ساری محنت رائیگاں گئی، لیکن دعا اگر ظاہری طور پر بندے کے معیار اور خواہش کے مطابق اثر نہ بھی دکھائے، تب بھی اس کا روحانی اور اُخروی فائدہ یقینی ہے۔ یہی

سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دعا کا حکم فرمایا ہے، دعا کی قبولیت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کی برکات کو بیان فرمایا ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں یہ بھی آیا کہ دعا اللہ کے پاس امانت ہے اور اس کا ثمر اگر دنیا میں نہیں ملا تو آخرت میں یقیناً ملے گا۔

میں نے کئی روشن خیال حضرات کی تحریریں پڑھیں کہ مسلمان کس سیارے کی مخلوق ہیں اور کس عہد میں جی رہے ہیں کہ کسی سواری یا ہوائی جہاز پر بیٹھو، تو پہلے دعا مانگو۔ کیا اللہ کی ہستی کے منکرین، ملحدین، کفار اور مختلف دیگر مذاہب کے ماننے والے اس دعا کے پڑھے بغیر جہاز نہیں اڑاتے اور ان کے جہاز منزل پر نہیں پہنچتے ؟۔ پس معلوم ہوا کہ اصل قدرت سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہے، تو سوال یہ ہے کہ جو قومیں اور ممالک آج سائنس اور ٹیکنالوجی میں دنیا کی قیادت کے منصب پر فائز ہیں، کیا ان کے منصوبے ناکام نہیں ہوتے، کیا ان کے جہاز کبھی بھی کریش نہیں ہوتے، کیا انہیں کبھی بھی خلافِ توقع نتائج کا سامنا کرنا نہیں پڑتا؟۔ اگر ان ناکامیوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی پر ان کے ایمان کو متزلزل نہیں کیا، تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی بے پایاں قدرت واختیار اور اس کی قضا وقدر پر کسی ناکامی کی صورت میں مومن کا ایمان بھی متزلزل نہیں ہونا چاہیے۔ کیا اللہ کی ذات پر ہمارا ایمان اتنا بھی قوی اور محکم نہیں ہے، جتنا کسی ملحد کا سائنس اور ٹیکنالوجی یا اپنی دانش اور وسائل پر بھروسا ہے۔

لہٰذا مومن کو حکم ہے کہ کسی بھی نیک مقصد کے لیے حسبِ توفیق ظاہری اسباب کو ضرور اختیار کرے، لیکن اسباب کے مؤثر ہونے کے لیے خداوندِ مسبب الاسباب کی قدرت اور تقدیر پر یقین رکھے۔ اگر اس پر کوئی ہمیں رجعت پسند یا دقیانوسی قرار دیتا ہے، تو یہ الزام ہمیں قبول ہے۔ یہ تو کسی نے نہیں کہا کہ اللہ کی ذات سے دعائیں مانگنے والے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں، بے عملی، تساہل اور کم ہمتی کو اپنا شعار بنالیں۔ دعا کا تو مقصد ہی یہی ہے کہ تمام تر دستیاب اسباب کو اختیار کرنے کے بعد ان کی اثر آفرینی کے لیے اللہ تعالیٰ سے رجوع کیا جائے۔ یہاں ہمارے پاس گنجائش نہیں ہے کہ دعا کے موضوع پر ساری آیات واحادیث نقل کی جائیں، بس یہ چند تمہیدی کلمات کافی ہیں۔

آج کل بڑی تعداد میں لوگ عازمِ سفر ہیں، سفر کہیں کا بھی ہو اور مقصدِ سفر کوئی بھی ہو، سواری پر بیٹھتے وقت یہ دعا مسنون ہے:

پہلے تین مرتبہ اللہ اکبر کہے، پھر یہ کلماتِ دعا پڑھے: ''پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارے لیے مسخر کر دیا، حالانکہ ہم اس پر (اپنی طاقت سے) قابو پانے والے نہ تھے اور ہمیں اپنے رب ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے''۔ (الزخرف: 14-13)

اس کے بعد یہ دعا مانگے: ''اے اللہ! ہم تجھ سے اس سفر میں نیکی اور تقوے اور ایسے عمل کی توفیق مانگتے ہیں جو تجھے پسند ہے۔ اے اللہ! اس سفر کو ہمارے لیے آسان فرما دے اور اس کی مسافت کو ہمارے لیے لپیٹ دے۔ اے اللہ! سفر میں بھی تو ہی ہمارا رفیق ہے اور پیچھے گھر کا نگہبان بھی تو ہی ہے۔ اے اللہ! میں سفر کی دشواریوں اور کوئی غمناک صورتِ حال پیش آنے اور پیچھے مال اور اہل میں کوئی بری تبدیلی آنے سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور جب سفر سے لوٹ کر آئے تو یہ دعا پڑھے: ہم (سلامتی کے ساتھ) واپس لوٹنے والے ہیں، اللہ سے توبہ کرنے والے ہیں، اس کی عبادت کرنے والے ہیں اور اپنے رب کی حمد کرنے والے ہیں''۔ (صحیح مسلم: 1342)

اسی طرح جب آپ سفر پہ روانہ ہوں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ ''سورۃ الکافرون، النصر، الاخلاص، الفلق اور الناس'' پڑھ کر آخر میں ایک بار پھر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھ لیں۔ اگر راستے میں کوئی خوف و خطر ہو، تو ''سورۃ القریش'' پڑھ لیا کریں۔

گھر سے نکلتے ہوئے یہ دعا پڑھا کریں: ''اللہ کے نام سے اور میں اللہ پر ایمان لایا اور میں نے اللہ پر توکل کیا اور برائی سے پھیرنے والا اور نیکی کی طاقت عطا کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے''۔ ''اے اللہ! ہم اس بات سے تیری پناہ چاہتے ہیں کہ ہم لغزش کھائیں یا کوئی ہمیں لغزش دے، ہم راہِ راست سے بھٹک جائیں یا کوئی ہمیں بھٹکا دے، ہم کسی پر ظلم کریں یا کوئی ہم پر ظلم کرے، ہم کسی پر زیادتی کریں یا کوئی ہم پر زیادتی کرے''۔ (کتاب ادعیۃ الحج والعمرۃ وما یتعلق بھما: علامہ قطب الدین حنفی)

"آیۃ الکرسی" کی بکثرت تلاوت کریں اور اگر کوئی چیز گم ہو جائے تو یہ دعا پڑھیں:
"اے قیامت کے دن لوگوں کو جمع کرنے والے، بے شک اللہ وعدے کے خلاف نہیں فرماتا، میرے اور میری گمشدہ چیز میں ملاپ فرمادے"۔

کسی مقام پر اترے تو یہ دعا مانگے:
"اے اللہ! اس بستی میں اور یہاں کے رہنے والوں میں جو خیر ہے، وہ ہمیں عطا فرما اور اس بستی میں اور یہاں کے رہنے والوں میں جو شر ہے، اس سے ہمیں امان عطا فرما"۔

سلامتی کے ساتھ گھر واپس آنے کے لیے یہ دعا مانگے:
"بے شک جس نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے، وہ آپ کو لوٹنے کی جگہ (مکہ مکرمہ) ضرور واپس لائے گا"۔ (القصص:85)

جب حج یا عمرہ یا کسی طویل سفر پر جائے تو اپنے والدین سے اجازت لے لے، یہ اس کے لیے سعادت کا باعث ہوگا اور اگر حجِ فرض کا سفر ہے اور خدانخواستہ ماں باپ اجازت نہ بھی دیں، تو بلا اجازت بھی سفر پر جا سکتا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:
"کسی بھی ایسے معاملے میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے، جس میں اللہ کی نافرمانی لازم آئے"۔ (مسلم:1840)

حج مشقت کا سفر ہے۔ قدیم زمانے میں مشقت موسم کی شدّت وحِدّت، سفر کی صعوبت، پیدل یا جانوروں کی سواری اور راحتوں کی کمی کی صورت میں تھی۔ اب وہ ساری صعوبتیں ختم ہو چکی ہیں، اللہ تعالیٰ نے بے شمار راحتیں مقدر فرمادی ہیں، ہوائی جہاز کا مختصر دورانیے کا سفر ہے، سواریاں ایئرکنڈیشنڈ ہیں، اسی طرح حجاجِ کرام اور مُعتمرین کی رہائش گاہیں بھی ایئرکنڈیشنڈ ہیں، حرمین طیبین بھی انتہائی پرآسائش اور ایئرکنڈیشنڈ ہیں، لیکن اس کے باوجود ہجومِ انسانی کی صورت میں مشقت کا عنصر آج بھی موجود ہے۔ جدّہ ایئرپورٹ پر کافی دیر تک امیگریشن کے لیے قطار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے، منیٰ، مزدلفہ اور عرفات آنے جانے کے لیے کافی وقت گاڑیوں میں گزارنا پڑتا ہے، رمیِ جمرات اور قربان گاہ کی مشکلات

ہیں۔ طواف، سعی اور نمازوں کے لیے آمد و رفت کے وقت دھکم پیل سے گزرنا پڑتا ہے، بعض صورتوں میں حادثات بھی ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں ہمارے لوگ سعودی عرب کے عُمّالِ حکومت، معلّمین اور سرکاری کارکنان کے رویوں کی شکایت کرتے رہتے ہیں اور اپنا وقت غیبت میں گزارتے ہیں اور اس سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بہتر ہے کہ اس کے بجائے اپنا وقت تلبیہ، دعاؤں، ذکر و اذکار، تسبیحات و درود اور تلاوت میں گزاریں تاکہ ذہن اللہ کی ذات کی طرف متوجہ رہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں حضوری کا تصور غالب رہے، یہی روحِ عبادت ہے۔

26 ستمبر 2014ء

ہمارا سیاسی منظر نامہ

دھرنوں کی روایت ہمارے ملک میں کافی پرانی ہے، اسے مجلسِ وحدت المسلمین نے ایک نیا رنگ دیا اور اپنے مطالبات کے حق میں بیک وقت کئی مقامات پر دھرنے دیے۔ اسلام آباد کے موجودہ دھرنے یقیناً پاکستان کی تاریخ کے طویل ترین دھرنے ہیں، عالمی ریکارڈ کے اعتبار سے بعض لوگ اس دعوے کو چیلنج کر رہے ہیں، لیکن شرکا کی تعداد کے اعتبار سے شاید یہ سرِ فہرست ہوں۔ ان دھرنوں نے ہماری تاریخ اور سیاسی رُجحانات کو نیا رخ دیا ہے۔ ہمیں کسی کے مافی الضمیر کا تو علم نہیں ہے، لیکن ظاہری شواہد، علامات اور دعووں کی حد تک کہا جاسکتا ہے کہ یہ دھرنے اپنے مطلوبہ اور مزعومہ مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ثابت نہیں ہوئے، اس کے ظاہری اور پوشیدہ اُسباب پر شاید طویل عرصے تک بحث ہوتی رہے گی۔

لیکن یہ دعویٰ بھی درست نہیں ہے کہ یہ دھرنے مکمل طور پر ناکام ہیں، ان کی کامیابی کی متعدد جہات بھی موجود ہیں۔ میڈیا نے ان دھرنوں اور ان کی قیادت کو بے پناہ اور بے مثال کوریج دی، اس کے محرکات پر بھی بحث ہوتی رہے گی۔ میڈیا کی اپنی حرکیات اور ترجیحات ہوتی ہیں اور الیکٹرونک میڈیا کے درمیان غیر تعمیری مسابقت بھی ایک مسئلہ ہے۔ پھر میڈیا کے لوگ بھی اسی سرزمین کی پیداوار ہیں اور ان کی اپنی ترجیحات اور تعصبات بھی یقیناً اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہاں میں لفافے کی اصطلاح اور بے پناہ سرمائے کے اثرات سے صَرفِ نظر کرتا ہوں، کیونکہ جس چیز کے بارے میں ٹھوس شواہد دستیاب نہ ہوں، محض

ظاہری قرینوں یا افواہوں پر مبنی بات کرنا قرینِ مصلحت نہیں ہے۔

ان دھرنوں نے ریاست، حکومت اور اَشرافیہ کو کمزور کیا ہے، قانون اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی توقیر تقریباً ختم ہوگئی ہے اور یہ ملک وقوم کے لیے ایک ناخوشگوار صورتِ حال اور بہت بڑی وارننگ ہے۔ جس ملک میں قانون اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی حُرمت قائم نہ رہے، اسے لاقانونیت اور اَنارکی کے سیلاب سے بچانا مشکل ہوتا ہے۔ یہ دھرنے کسی دوسرے مناسب مقام پر بھی ہوسکتے تھے اور موجودہ تناظر میں میڈیا کی کوریج ایسی ہی رہتی، لیکن حساس مقام اور ریڈ زون میں ان دھرنوں نے ریاست کو عالمی سطح پر بے توقیر کیا ہے، بعض غیر ملکی سربراہوں کے دورے بالخصوص پاکستان کے روایتی دوست اور ہمسایہ ملک چین کے صدر کا دورہ منسوخ یا ملتوی ہوا۔ ان دھرنوں سے یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ایک ایسی ریاست جس کی پارلیمنٹ، ایوانِ صدر، وزیر اعظم ہاؤس اور سیکریٹریٹ، سپریم کورٹ اور حساس مقامات محفوظ نہیں ہیں، تو اس کے بارے میں عالمی برادری کے اس خدشے کو کیوں نہ اہمیت دی جائے کہ یہ ملک ایٹمی اثاثوں کی حفاظت کا اہل نہیں ہے، جبکہ ہمارے بعض حساس مقامات پر پہلے بھی دہشت گردوں کے حملے ہوتے رہے ہیں۔

ان دھرنوں میں زیادہ عزیمت واستقامت کا ثبوت تو پاکستان عوامی تحریک کے کارکنوں نے دیا، لیکن میڈیا نے قیادت کے اعتبار سے جناب عمران خان کو زیادہ ترجیح دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حلقہ جاتی انتخابات اور پارلیمانی نظام میں اپنی حیثیت منوا چکے ہیں اور اپنے آپ کو مستقبل کا وزیر اعظم سمجھ رہے ہیں، جب کہ ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کا اکاؤنٹ اس شعبے میں خالی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی خواہش صدارتی نظام ہو اور وہ اپنے جوہرِ خطابت کے بل پر اپنے آپ کو ایک طاقت ور حریف سمجھتے ہوں، لیکن تا حال ملک پارلیمانی نظام کے تحت چل رہا ہے اور اس کا نظامِ انتخاب حلقۂ انتخاب کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے اور اس میں سیاسی جماعتوں کی مجبوری اور ضرورت قابلِ انتخاب (Electables)

امیدوار ہوتے ہیں، سوائے اس کے کہ کسی قیادت یا سیاسی جماعت کی مقبولیت کی غیر معمولی لہر چل جائے اور قائد یا جماعت کے نام پر لوگ گمنام یا بے نام لوگوں کو بھی ووٹ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ اگر دونوں اصحابِ دھرنا کا آپس میں کوئی معاہدہ ہے تو الگ بات ہے، ورنہ اپنا اکاؤنٹ کھولنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو دھرنوں کی سیاست سے ہٹ کر قریہ بہ قریہ، کُو بہ کُو والی سیاست اپنانی پڑے گی۔

پہلے تو اہلِ دھرنا کی غزل کا مَطلع اور مَقطع وزیر اعظم کا استعفیٰ ہی تھا، لیکن شاید کسی حد تک انہوں نے حقائق کا اِدراک کر لیا ہے اور آج شاہ محمود قریشی صاحب کا بیان نظر سے گزرا کہ مجھے انتخابات 2018ء سے پہلے نظر آرہے ہیں۔ اس تناظر میں لاہور اور کراچی جیسے عام جلسوں کا انعقاد محلِ نظر ہے، کیونکہ ان جلسوں پر بے پناہ وسائل خرچ ہوتے ہیں اور عام انتخابات کے انعقاد سے پہلے انتخابی تحریک چلانا سمجھ سے باہر ہے، جبکہ میڈیا کے ذریعے ویسے ہی ان کا پیغام گھر گھر پہنچ رہا ہے۔ مزید یہ کہ ساری سیاسی کشمکش کا مرکز پنجاب ہے، باقی تین صوبے اپنے حال پر صابر وشاکر ہیں۔ شہری اور دیہی سندھ خواستہ و ناخواستہ بالترتیب ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کراچی میں جناب عمران خان کا خطاب حدِ ادب کے اندر تھا اور لگتا ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کا عملاً اعتراف کر لیا ہے۔ پختونخوا کے ووٹر کسی کے ساتھ بندھے نہیں رہتے، وہاں تبدیلی آتی رہتی ہے اور ابھی اندازہ نہیں کہ آئندہ وہ اپنی نمائندگی کا اعزاز کسے عطا کریں گے، وہاں تحریک انصاف خود مرحلۂ امتحان میں ہوگی۔

موجودہ صورتِ حال میں اگر مسلم لیگ (ن) کی حکومت جاری وساری بھی رہتی ہے، تو سابق خود اعتمادی کی کیفیت باقی نہیں رہے گی، انہیں ہر لمحے بے رحمانہ تنقید اور مزاحمت کا سامنا کرنا ہوگا اور بیوروکریسی بھی پژمردہ اور اعتماد سے عاری رہے گی، کیونکہ اب اس نئی اپوزیشن نے بیوروکریسی کو بھی اپنے نشانے پر رکھا ہوا ہے، اگرچہ یہ شعار ملک کے لیے نیک شگون نہیں ہے، پس ایسے حالات میں کسی انتظامیہ سے بہتر حکمرانی یا آئیڈیل صلاحیتِ کار

کی توقع عبث ہے۔ پارلیمنٹ نے اپنے مفاد ہی میں سہی بلاشبہ حکومت کو وقتی طور پر سہارا دیا ہے، توانائی بخشی ہے اور اس کی پشت پناہی کی ہے، لیکن اب وہ درونِ خانہ اس کا صلہ اور انعام بھی چاہیں گے اور ریاست وحکومت کے وسائل میں اپنے حصے کے طلب گار ہوں گے، لہٰذا موجودہ حکمرانوں کو اپنی سابق روش کو بدلنا ہوگا، ورنہ ان کی مشکلات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

متحدہ قومی موومنٹ سے بعض سیاسی جماعتیں توقعات وابستہ کر لیتی ہیں، لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایم کیو ایم کے اپنے مقاصد اور اپنے اَہداف ہوتے ہیں اور وہ بہترین سیاسی سودا کار بھی ہیں، وہ بیک وقت اقتدار سے بھی لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں اور حزبِ اختلاف کے کردار سے بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ متحدہ قومی موومنٹ کے قائد نے حال ہی میں اپنا انداز بدلا ہے اور لگتا ہے کہ وہ اپنے ابتدائی دور کی طرف پلٹ رہے ہیں، جو ایک طرح سے محاذ آرائی کا دور تھا۔ یہ کسی بھی صورت میں ملک وقوم کے مفاد میں نہیں ہے، ملک اور قوم کا مفاد اسی میں ہے کہ کراچی کے حالات معمول کے مطابق رہیں، یہاں کی سماجی زندگی معمول کے مطابق رہے اور معیشت کا پہیہ رَواں دَواں رہے، ورنہ مشکلات بڑھیں گی اور تنازع کے تمام فریقوں سمیت ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔

ضرورت اس اَمر کی ہے کہ جلد اَز جلد بلدیاتی انتخابات کرائے جائیں اور بلدیہ عظمیٰ کراچی کی منتخب قیادت کو وسیع اختیارات سونپے جائیں اور انہیں بجٹ میں استحقاق کے مطابق حصہ دیا جائے تاکہ وہ اپنے آپ کو اقتدار میں برابر کے حصے دار سمجھیں اور ذمے داری میں بھی برابر کے شریک ہوں۔ حالیہ سیاسی تجربات نے بتایا کہ اب ہمارے ملک میں وہی طبقہ، گروہ یا سیاسی جماعت حکومت اور عوام کی توجہ کا مرکز ہوگی، جس کے پاس نظام کو مفلوج کرنے کی صلاحیت موجود ہے، مستقبل میں اس رَوِش کو انتہا پسند گروہ بھی اختیار کرسکتے ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ ان کے پاس صلاحیتِ فساد وانتشار سب سے زیادہ ہے۔ ان کے پاس ایک زیادہ ہیجان انگیز اور جذبات کو مشتعل کرنے والا نعرہ جہاد اور

نفاذِ شریعت کا بھی ہے اور اب یہ ایک عالمی رجحان بھی بن چکا ہے۔ ہمارا خطہ ہی نہیں، مشرقِ وسطیٰ بھی اس آگ میں جل رہا ہے اور حال ہی میں ایمن الظواہری کا اعلان سامنے آیا کہ انہوں نے القاعدہ کا سیٹ اپ انڈیا میں بھی قائم کرلیا ہے، سو اس کا ردِ عمل بھی ہمیں برداشت کرنا ہوگا، پس صورتِ حال یہی ہے کہ:

''کرے کوئی اور بھرے کوئی''۔

29 ستمبر 2014ء

اکتوبر2014ء

لبیک

آج دو سے تین ملین کے درمیان خوش قسمت اہلِ ایمان حج کا رُکنِ اعظم "وقوفِ عرفہ" ادا کرنے کے لیے میدانِ عرفات میں جمع ہوں گے، سب کے سب اپنا قومی لباس اتار کر حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل اور سید المرسلین سیدنا محمد رسول اللہ علیہم السلام کی سنت ادا کرتے ہوئے دو اَن سِلی چادروں پر مشتمل ایک ہی لباس پہنے ہوئے ہوں گے، سب اپنے قومی اور علاقائی امتیازات، وضع قطع اور لباس کو ترک کر کے ایک ہی رنگ میں رنگے ہوں گے۔ سب کی زبان پر تلبیہ کے یہ کلمات جاری ہوں گے:

"میں حاضر ہوں، اے اللہ! میں تیرے حضور حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بے شک سب تعریفیں تجھی کو سزاوار ہیں اور ہر نعمت کا منبع تیری ہی ذاتِ عالی صفات ہے اور ملک واقتدار کا مالکِ حقیقی تو ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں"۔

اگر واقعی حضوریِ بارگاہِ ربُّ العالمین کا تصور مومن کے دل ودماغ میں رَچ بس جائے، تو قیامت کے دن جیسا لرزہ اس پر طاری ہو جائے، ہیبت وجلالِ الٰہی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کا کامل مظہر بن جائے:

(۱) "درحقیقت کامل اہلِ ایمان وہی لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب ان کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کی جائے، تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جائے (یعنی ایمان ان کے دلوں میں مزید راسخ ہو جائے) اور وہ اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں، (انفال:02)"۔

(۲)"اللہ نے بہترین کلام کونازل کیا،جس کے مضامین ایک جیسے ہیں،بار بار دہرائے جاتے ہیں،جولوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں (اسے سن کر)ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، پھران کے دل اوران کے جسم اللہ کے ذکر کے لیےنرم ہوجاتے ہیں"۔(الزمر:23)

پس ہر حاجی اپنے اندر جھانک کر اپنا جائزہ لے سکتا ہے کہ کیا یہ کیفیت اس پر طاری ہے اور وہ اس روحانی تجربے سے گزر رہا ہے؟۔اگر وہ اس کیفیت سے سرشار نہیں ہے،تو اس کا حج حقیقت اور روحِ عبادت سے کوسوں دور ہے،اس نے صرف عبادت کی ظاہری صورت کواپنایا ہے،اُس کا اندراس کےنور سے خالی ہے۔ایک عارف باللہ ولی اللہ تعالیٰ کی حضوری میں ڈوبے ہوئے"لبیك اللّٰھم لبیك" کی صدائیں بلند کررہے تھے کہ غیب سے ندا آئی:"لَا لبّیك" (یعنی تیری حاضری قبول نہیں)۔ایک نوجوان نے اس ندائے غیبی کوسنا تو کہا:"بزرگوار!جب آپ کی حاضر قبول ہی نہیں،تو میدانِ عرفات میں آپ کی آمد کا کیا فائدہ؟"۔بزرگ نے جواب دیا:"یہ جواب تو میں چالیس سال سے سن رہا ہوں، لیکن کیا اللہ کی بارگاہ کے سوا کون سی بارگاہ ہے،جہاں میں رجوع کروں،ظاہر ہے کہ نہیں ہے،تو تا حیات مجھے تو یہیں حاضری دینی ہے"۔اس پر غیب سے ندا آئی:"اے میرے بندے!میں نے تیری حاضری قبول کی اور گزشتہ سالوں کی بھی سب حاضریاں قبول کرلیں"۔یعنی جب یہ حقیقت بندے کے قلب وروح میں جذب ہوجائے کہ حقیقی مالک ومختار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے،ساری نعمتوں اور تمام فیوض وبرکات کا منبع اسی کی ذات ہے اس کے مقابل کسی کے لیے کوئی جائے امان نہیں ہے،ہر حال میں بندے کو اسی سے رجوع کرنا چاہیے اور زندگی کے آخری سانس تک اسی کا ہوکر رہنا چاہیے،تو پھر اُس وقت بندہ حج کی معراج کو پالیتا ہے۔

اسی کو"حجِ مبرور" کہا جاتا ہے اور کامل اجروثواب کی ساری بشارتیں اسی کے لیے ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱)"جس نے حج کیا اور نہ کوئی جنسی آوارگی کی بے ہودہ بات کی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اور اس

کے رسولِ مکرم ﷺ کی کسی بات میں حکم عدولی کی، تو وہ گناہوں کی ہر میل سے پاک ہوکر اس حال میں لوٹے گا، جیسے اُس دن پاک تھا، جب اس کی ماں نے اسے جنا تھا''۔

(بخاری:1819)

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یکے بعد دیگرے حج اور عمرہ ادا کیا کرو، کیونکہ یہ دونوں فقر اور گناہوں کو اس طرح دور کردیتے ہیں، جیسے بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کی میل کو دور کردیتی ہے اور ''حجِ مقبول'' کا ثواب جنت کے سوا کچھ نہیں''۔ (سنن ترمذی:810)

اسلام میں حج نو ہجری کو فرض ہوا، مگر رسول اللہ ﷺ اس سال بذاتِ خود حج کے لیے نہ گئے اور حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کو ''امیر الحج'' مقرر فرمایا، بعد میں ضروری اعلانات کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے نمائندۂ خاص بنا کر بھیجا، ان اعلانات کا ذکر سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات میں موجود ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اُن مشرکوں سے براءت (یعنی بے زاری اور قطعِ تعلق) کا اعلان ہے، جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، پس (اے مشرکو!) تم زمین میں (صرف) چار ماہ تک (آزادانہ) چل پھر سکتے ہو اور خوب جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے اور یہ کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے حجِ اکبر کے دن سب لوگوں کے لیے اعلان ہے کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسول (بھی)، پس اگر تم توبہ کرلو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم (قبولِ حق سے) اعراض کروگے، تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، (اے رسول!) کافروں کو دردناک عذاب کی وعید سنادیجیے، ماسوا ان مشرکوں کے کہ جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، پھر انہوں نے اس معاہدہ کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ ہی تمہارے خلاف کسی کی مدد کی، پس تم ان سے مقررہ مدت تک اس معاہدے کی پوری پاس داری کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ تقوے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ پس جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو تم مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کردو، ان کو گرفتار کرو اور ان کا محاصرہ کرو اور ان کی تاک میں ہر جگہ گھات لگا کر

بیٹھو، (توبہ:5-1)"۔ اور مزید اعلان ہوا: "اے مومنو! تمام مشرک محض نجس ہیں، سو وہ اس سال کے بعد مسجدِ حرام کے قریب نہ آئیں، (توبہ:28)"۔

پھر دس ہجری کو رسول اللہ ﷺ بذاتِ خود حج کے لیے تشریف لے گئے اور یہ آپ کی ظاہری حیاتِ مبارکہ کا "حجۃ الاسلام" تھا، اسی میں آپ نے جبلِ رحمت پر اپنی ناقہ مبارکہ "قصوا" پر سوار ہو کر وہ عظیم الشان خطبہ ارشاد فرمایا، جو تاریخِ انسانی میں حقوقِ انسانی کا پہلا جامع منشور ہے، اسے "خطبۂ حجۃ الوَداع" کہا جاتا ہے۔ اس کے موضوعات پر الگ سے گفتگو کی جائے گی۔

سورۂ توبہ میں "حجِ اکبر" کا ذکر ہے۔ ملا علی القاری حنفی لکھتے ہیں:

"حجِ اکبر کے بارے میں چار اقوال ہیں ایک یہ کہ اس سے مراد "یومِ عرفہ" ہے، دوسرا یہ کہ اس سے مراد "یومِ نحر" ہے۔ تیسرا یہ کہ اس سے مراد "طوافِ زیارت" کا دن ہے، چوتھا یہ کہ حج کے تمام ایام "یومِ حجِ اکبر" ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ عمرے کے مقابلے میں ہر حج "حجِ اکبر" ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اگر حج جمعہ کے دن واقع ہو جائے، تو اسے "حجِ اکبر" کہتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے جب حج فرمایا تھا تو وہ جمعۃ المبارک کا دن تھا"۔

(الحظ الاوفر فی الحج الاکبر مع المسلک المتقسط، ص:481)

اگر حج جمعہ کے دن واقع ہو جائے تو اس پر "حجِ اکبر" کا اطلاق کرنا متفق علیہ مسئلہ نہیں ہے، کیوں کہ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی صریح حدیث ثابت نہیں ہے۔ تاہم اس کے بارے میں ایسے قرائن موجود ہیں کہ اس کی افضلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ملا علی قاری نے "اِتحاف السّادۃ المتقین" کے عنوان سے "حجِ اکبر" کے بارے میں ایک رسالہ لکھا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"جب یومِ عرفہ جمعہ کے دن واقع ہو تو اس پر حجِ اکبر کا اطلاق زبان زدِ خلائق ہے اور خلقِ خدا کی زبانیں حق کا قلم ہوتی ہیں اور پھر وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث بیان کرتے ہیں: "جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں، وہ اللہ کے نزدیک بھی حَسَن ہے

اور جس چیز کو مسلمان برا سمجھیں، وہ اللہ کے نزدیک بھی بُری ہے‘‘۔(مسند احمد:36000)

وہ مزید لکھتے ہیں:

’’امام رزین بن معاویہ نے ’’تجرید الصحاح‘‘ میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ’’افضل الایام یومِ عرفہ ہے اور جب یہ جمعہ کے دن واقع ہو، تو بغیر جمعہ کے ستر حج کے برابر ہے‘‘۔

یہ اعتقادی مسئلہ نہیں ہے، اس کا تعلق فضائلِ اعمال سے ہے اور فضائلِ اعمال میں ضعیف حدیث بھی معتبر ہوتی ہے۔ جمعہ کے دن یومِ عرفہ واقع ہونے کی صورت میں بلاشبہ جمعہ کی اضافی برکات بھی شامل ہو جاتی ہیں، کیونکہ جمعۃ المبارک کے فضائل احادیثِ مبارکہ میں بکثرت مذکور ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ’’جمعہ سید الایام ہے‘‘۔

(مصنف ابن ابی شیبہ:5507)

13اکتوبر 2014ء

شعائر اللہ

جو چیز کسی دین یا مذہب کی امتیازی شناخت بن جائے، اُسے ''شِعار'' کہتے ہیں اور اس کی جمع ''شعائر'' ہے، جیسے صلیب مسیحیت کا شِعار ہے، زنار ہندو مذہب کا شِعار ہے اور اذان، جمعۃ المبارک، حج وارکانِ حج وغیرہ اسلام کا شِعار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، سو جس نے بیت اللہ کا حج یا عمرہ کیا، اُس پر ان دونوں کا طواف (وسعی) کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے''۔ (البقرہ:158)

صفا اور مروہ بیت اللہ کے قریب دو پہاڑیاں ہیں، ''صفا'' کے معنی ہیں: چکنا پتھر اور ''مروہ'' کے معنی ہیں: سفید اور ملائم پتھر۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ صفا پر حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام بیٹھے تھے، اس لیے اس کا نام صفا قرار پایا اور مروہ پر ان کی بیوی (اِمْرءۃ) بیٹھی تھیں، اس لیے اس کا نام مَروہ قرار پایا۔ جب حج اور عمرے کے لیے صفا اور مروہ کی سَعی (سات پھیرے) کو واجب قرار دیا گیا تو مسلمانوں کو تردّد ہوا، کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں صفا پر ''اِساف'' نامی بت اور مروہ پر ''نائلہ'' نامی بت رکھے ہوئے تھے، فتح مکہ کے بعد یہ بت توڑ دیے گئے۔ افغانستان میں امریکا کے زیر قیادت ۲۸ ممالک کی اتحادی افواج کو بھی ''ایساف'' کا نام دیا گیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی، اسلام سے پہلے وہ مَنات (ایک بت کا نام) کے لیے احرام باندھتے تھے اور مُشلّل کے پاس وہ اس کی عبادت کرتے تھے تو جو شخص احرام باندھتا، وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی

کرنے کو گناہ سمجھتا۔ پس جب وہ اسلام لے آئے، تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں پوچھا، انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم صفا اور مروہ کے درمیان سعی کو گناہ سمجھتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔ (بخاری:1643)

حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا اپنے فرزند حضرت اسماعیل کو بیت اللہ کے سامنے بٹھا کر پانی کی تلاش میں نکلیں اور صفا سے مروہ تک چکر لگایا تو اللہ تعالیٰ نے اسے حج وعمرہ کے اعمال میں شامل فرمادیا اور اسے حج وعمرے کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا۔ اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ نے زم زم کا چشمہ جاری کردیا، یہ بھی اللہ کی نشانی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے اللہ کی نشانیوں میں سے بنادیا ہے، ان میں تمہارے لیے بھلائی ہے، پس تم ان کو قطار میں کھڑا کرکے (نحر کرنے کے وقت) اللہ کا نام لو، پس جب ان کے پہلو زمین پر گر جائیں تو تم خود (بھی) ان کو کھاؤ اور محتاج اور مانگنے والے کو بھی کھلاؤ''۔ (الحج:36)

اس آیت میں قربانی کے لیے نامزد کیے گئے اونٹوں کو اللہ کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح فرمایا:

''اے ایمان والو! اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو، نہ حرمت والے مہینے کی، نہ کعبہ میں بھیجی ہوئی قربانیوں کی اور نہ ان جانوروں کی جن کے گلوں میں (قربانی کی علامت کے) پٹے پڑے ہوں''۔ (المائدہ:02)

اس آیت میں حرمت والے مہینوں، نامزد کرکے حرم میں بھیجی گئی قربانیوں اور ان جانوروں کو جن کے گلے میں قربانی کی علامت کے طور پر پٹے ڈال دیے گئے ہوں، اِن سب کو اللہ کی نشانیاں قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''پس جب تم عرفات سے لوٹو تو مَشعرِ حرام (مُزدَلِفہ) کے پاس اللہ کا ذکر کرو''۔ (البقرہ:198)

مَشعَر بھی شِعار کے ہم معنی ہے، یعنی مُزدَلِفہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی امتیازی علامات کو شعار قرار دے کر ان کی تعظیم کا حکم فرمایا،
ارشاد ہوا:

''اور جس نے اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کی تو بے شک یہ دلوں کے تقوے (کے آثار) سے ہے۔(الحج:32)

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور عبادات کی امتیازی نشانیوں کی تعظیم کا حکم دیتے ہوئے، اُسے دلوں کا تقویٰ قرار دیا، کیونکہ تعظیم کا تعلق دل سے ہے۔ اہلِ دنیا کا شِعار یہ ہے کہ وہ کسی بڑی شخصیت کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے اس کے مجسمے بناتے ہیں، کسی بڑے واقعے کی یاد کو مدتوں تک زندہ وتابندہ رکھنے کے لیے اس مقام پر یادگاریں اور بڑے بڑے مینار تعمیر کرتے ہیں، تاکہ اسے دیکھتے ہی اس شخصیت یا واقعے کی یاد لوگوں کے دل ودماغ میں تازہ ہوجائے۔ اسلام میں مجسمے بنانا حرام ہے اور یادگاریں تعمیر کرنا شعائر اسلام میں سے نہیں ہے بلکہ ان تعلیمات کو زندہ وتابندہ رکھنا ہی مقاصد شریعت میں سے ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات ''مرکز الملل'' یعنی ملتِ اسلامیہ، ملتِ یہود اور ملتِ نصاریٰ کے لیے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، حتیٰ کہ مشرکینِ مکہ بھی اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کرتے تھے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''ابراہیم نہ یہودی تھے، نہ نصرانی، بلکہ ہر باطل نظریے سے الگ رہنے والے خالص مسلمان تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے''۔(آل عمران:67)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے بیت اللہ کی تعمیر کی، ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام اس تعمیر میں ان کے معاون بنے، اللہ تعالیٰ نے اس منظر کو قرآن مجید میں بیان فرمایا:

''اور (یاد کیجیے) جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے (اور یہ دعا کر رہے تھے): اے ہمارے رب! ہم سے (اس خدمت کو) قبول فرما، بے شک تو بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے''۔(البقرہ:127)

جس پتھر پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی، اللہ تعالیٰ نے اسے بھی اپنی نشانی قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"اور (یاد کیجیے) جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے مرکزِ عبادت اور جائے اَمن بنایا اور مقامِ ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔ (البقرہ:125)

پس اسے سنّت قرار دیا گیا کہ بیت اللہ کا طواف کرنے کے بعد مقامِ ابراہیم پر طواف کے شکرانے کے دو نفل بطورِ واجب ادا کیے جائیں۔

انہی منجملہ شعائر میں سے عبادتِ قربانی بھی ہے، جو کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی عظیم قربانی کی یادگار ہے۔ حج کے موقع پر منیٰ میں جو قربانی کی جاتی ہے، وہ دمِ قِران اور دمِ تمتّع ہے مگر عام قربانی حج کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں ہے بلکہ روئے زمین پر رہنے والے ہر صاحبِ استطاعت مسلمان مرد اور عورت پر واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"پس اپنے رب کے لیے نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے"۔ (الکوثر:02)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو مالی استطاعت رکھتا ہو اور (اس کے باوجود) وہ قربانی نہ کرے، تو ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے"۔ (سنن ابن ماجہ:3123)

ایک اور حدیث میں ہے کہ صحابۂ کرام نے عرض کی: "یا رسول اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے باپ ابراہیم کی سنّت ہیں، صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! ہمارے لیے اس میں کیا ہے؟، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (قربانی کے جانور کے) ہر بال کے بدلے میں نیکی ہے، صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ! اُون والے جانوروں کا کیا حکم ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُون کے ہر روئیں کے بدلے میں نیکی ہے"۔

(سنن ابن ماجہ:3127)

بہت سے حضرات جو اپنے آپ کو عقل و دانش کا امام سمجھتے ہیں، یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ایامِ قربانی میں اتنی کثیر تعداد میں جانوروں کا ذبح کیا جانا، ایک غیر دانش مندانہ اور اقتصادیات کے منافی عمل ہے، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس پیسے کو ضرورت مندوں، سیلاب زدگان

اور بے گھر لوگوں کی مدد پر خرچ کیا جائے، بلاشبہ ان لوگوں کی مدد احسن کام ہے اور پوری قوم کو دل وجان سے یہ کام کرنا چاہیے، لیکن قربانی عبادت ہے اور عبادت صرف اسی طریقے پر ادا کی جاسکتی ہے، جو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مقرر فرمایا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایام قربانی میں بندۂ مومن کا کوئی بھی نیک کام قربانی کے جانور کا خون بہانے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو محبوب نہیں ہے اور قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنے سینگوں، کھروں اور بالوں سمیت حاضر ہوگا اور قربانی کے جانور کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقامِ قبولیت کو پالیتا ہے، سو (اے مسلمانو!) تم خوش دلی سے قربانی کیا کرو''۔

(سنن ابن ماجہ:3126)

اگر محض مادی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو ذرا سوچیے! کتنے لوگوں کا روزگار مویشی بانی سے وابستہ ہے، وہ سال بھر محنت ومشقت کرکے جانور پالتے ہیں کہ ایامِ قربانی میں انہیں فروخت کرکے اپنے سال بھر کا خرچ نکالیں گے، کتنے قصاب ہیں جن کی روزی اس سے وابستہ ہے، جانوروں کی کھالیں خام اور تیار شدہ چرمی اشیاء ملک کے زرِمبادلہ کمانے کا ایک ذریعہ ہے اور دیگر شہروں، قصبوں اور گاؤں کی بات تو چھوڑیے کراچی جیسے شہر میں ضرورت مند لوگ قربانی کے گوشت کے طلب گار رہتے ہیں اور اتنی بڑی تعداد میں قربانیوں کے باوجود لوگوں کی ضرورت اور طلب پوری نہیں ہوتی، ہم نے کہیں بھی قربانی کے گوشت کو رُلتے ہوئے نہیں دیکھا، بہت سے مخیر رفاہی اور تعلیمی اداروں کے وسائل کا یہ ایک ذریعہ ہے، انہی قربانی کے جانوروں کو دور دراز علاقوں تک پہنچا کر ذبح کیا جاتا ہے، جہاں آفت زدگان اور مصیبت زدگان زیادہ تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔

6اکتوبر 2014ء

خطبۂ حج

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت کے تیرہویں سال مکۂ مکرمہ سے مدینۂ منورہ ہجرت فرمائی۔ آٹھ ہجری کو فتحِ مکہ کا اعزاز اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا، اس کے مابعد کے منظر کو سورۃ النصر میں اللہ تعالیٰ نے ان کلماتِ طیبات میں بیان فرمایا:

"جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہورہے ہیں، تو (اس فتحِ مبین کے تشکر کے طور پر) آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں اور اس سے مغفرت طلب کریں، یقیناً وہ بہت توبہ قبول فرمانے والا ہے"۔

(النصر1-3)'

چنانچہ اس قرآنی بشارت کے نتیجے میں بہت جلد اسلام حجاز میں غالب آگیا اور کفر کا نام ونشان مٹ گیا۔ اس کی نوید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ بنی اسرائیل میں پہلے ہی دے دی گئی تھی: "اور آپ کہیے: حق آگیا اور باطل نابود ہوگیا، بے شک باطل کو نابود ہونا ہی تھا"۔

(بنی اسرائیل:81).

اس کے بعد سن نو ہجری میں پہلا "حجۃ الاسلام" فرض ہوا۔ اس اعتبار سے 1435ھ کا حج اسلام کا چودہ سو ستائیسواں حج تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس ہجری میں اپنی حیاتِ ظاہری کا پہلا اور آخری حج ادا فرمایا، اسے محدِّثین اور سیرت نگاروں کی اصطلاح میں "حجۃ الوَداع" کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے اشارات فرمائے تھے کہ شاید آئندہ حج کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے درمیان موجود نہیں ہوں گے،

اور آپ ﷺ نے فرمایا:

"میری باتیں توجہ سے سنو، شاید میں آئندہ حج نہ کر پاؤں، شاید اس سال کے بعد اس مقام پر میری تم سے ملاقات نہ ہو"۔ پس آپ ﷺ نے اپنے خطبۂ حجۃ الوَداع میں عالَمِ انسانیت کے لیے حقوقِ انسانی کا پہلا جامع اور مدوَّن منشور جاری فرمایا۔ ہم اسی خطبے کو آپ ﷺ کی آخری وصایا سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

ہر سال کا خطبۂ حج، اسی خطبۂ حجۃ الوَداع کا توارُث اور تسلسل ہے۔ اس سال یہ خطبہ امام الحج شیخ عبدالعزیز آلِ شیخ نے دیا اور اخبارات سے معلوم ہوا کہ یہ ان کا مسلسل چھتیسواں خطبۂ حج تھا، بلاشبہ یہ بڑے اعزاز کی بات ہے۔ اس خطبے میں انہوں نے عقائد، اُمت کی وحدت، صلاح وفلاحِ اُمت، حکمرانوں کی ذمے داریوں کے بارے میں بیان فرمایا۔ قتلِ ناحق اور جہاد کے عنوان سے اُمت کو جس صورتِ فساد کا سامنا ہے، اس کی کھل کر مذمت کی، ان لوگوں کو لادین قرار دیا اور رسول اللہ ﷺ نے خوارج کے بارے میں جو مستقبل کی خبریں دی تھیں اور ان کا جو شعار بیان فرمایا تھا، اُس کا حوالہ دیا اور آج کے مفسدین کو اس کا مَظہر ومِصداق قرار دیا۔ ہم امام الحج کے اس موقف کی تحسین وتائید کرتے ہیں، لیکن نہایت ادب کے ساتھ یہ بھی عرض گزار ہیں کہ:

"بہت دیر کی مہرباں آتے آتے"

جہاد کے نام پر یہ رُجحان (Phenomenon) آج پہلی بار مَنصّۂ شُہود پر نہیں آیا بلکہ یہ گزشتہ تین دہائیوں پر مشتمل ہے اور اس کی سرپرستی سعودی عرب اور اس کے زیرِ اثر ممالک کی حکومتوں کی جانب سے سرکاری طور پر اور وہاں کے رُؤسا اور اُمرا کی جانب سے غیر سرکاری طور پر کی جاتی رہی ہے۔ ان لوگوں کو وہیں سے توانائی، وسائل اور ترغیب دی جاتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی اصل فکری، روحانی اور عملی قیادت عرب اسکالرز کے پاس رہی۔ باقی خطوں سے اس کے لیے خام مال اور اَفرادی قوت میسر آتی رہی، جدید ترین اسلحہ اور اس کی فنی مہارت امریکا اور مغرب سے فراہم ہوتی رہی۔ یہ آگ ہمیں گزشتہ کئی

دہائیوں سے بھسم کر رہی ہے اور اس کا سب سے زیادہ نقصان بھی ہم نے اٹھایا۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ دولتِ اسلامیہ عراق وشام (داعش) یا اسلامک اسٹیٹ آف عراق اینڈ سیریا (ISIS) سعودی عرب کی سرحدوں پر دستک دے رہی ہے، اس آگ کا الاؤ اُن کے پڑوس میں شعلہ زن ہے، اس لیے اب اس کی تپش وہاں شدت سے محسوس ہو رہی ہے اور امام الحج کے خطبۂ حج کا یہ حصہ اُسی دَرد کی صدا ہے۔ امام الحج نے اپنے خطبے میں وحدتِ اُمّت کا بھی درس دیا اور اس حدیث کا حوالہ دیا:

''ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے ایک جسم کی طرح ہے، اگر جسم کے کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف پہنچے تو سارا بدن بخار اور بیداری کے کرب میں مبتلا ہوجاتا ہے''۔

کاش کہ جب ہم اس آگ میں جَل رہے تھے، تو ہمیں بھی جسدِ ملّی کا ایک عُضو سمجھا گیا ہوتا اور کسی خطبۂ حج میں یہ درد بھی اُمّت اور مِلّت کا درد بن کر امام الحج کی زبان پر آتا، تو شاید اس فساد کے پھیلاؤ کو روکنا نسبتاً آسان ہوتا، اُس وقت امام الحج کی آواز میں بڑی تاثیر ہوتی۔ اب مشکل یہ ہے کہ ان مجاہدین یا امام الحج کے ارشاد کے مطابق خوارج کے نزدیک مسلم ممالک کے وہ تمام علما جو اپنی اپنی حکومتوں کے خلاف برسرِ پیکار، سراپا احتجاج اور میدانِ عمل میں مصروفِ جہاد نہیں ہیں، وہ ان حکمرانوں اور اس نظام کے معاون و مددگار اور اس سے فیض پانے والے ہیں اور اسی لیے اب یہ سب اُن کے لیے قابلِ نفرت ہیں۔ اب اس کے لیے کسی مؤثر حکمتِ عملی کی ضرورت ہے، ورنہ ایسے تمام خطبات، جن کے پیچھے قوتِ نافذہ نہ ہو، بہت جلد ہوا میں تحلیل ہوجاتے ہیں۔

امام الحج نے حکمرانوں کو ان کی ذمے داریوں کا احساس دلایا اور رعایا کے حقوق کی جانب متوجہ کیا، ہم اس کی دل وجان سے تحسین کرتے ہیں اور امام الحج، ائمۂ حرمین طیبین اور وہاں کے تمام سرکردہ علمائے کرام سے نہایت ادب واحترام کے ساتھ عرض گزار ہیں کہ وہ اپنی راحتوں اور عشرتوں سے نکل کر ذرا دیکھیں آج وہاں غیر ملکی مزدوروں کے لیے ''کفالت'' کا جو ادارہ ہے، آیا وہ عہدِ قدیم کی غلامی کی جدید شکل تو نہیں ہے؟۔ ہمارے ہم

وطن جن کا وہاں سالہاسال سے وسیع کاروبار ہے ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ کسی بھی وقت ہمارے ہاتھ میں خروج (Exit) لگا ہوا پاسپورٹ تھما کر ہوائی جہاز میں بٹھایا جا سکتا ہے اور ہمیں اپنی کمائی میں سے کچھ بھی ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، کیونکہ یہ سب کچھ ''کفیل'' کے نام پر ہے۔ لہٰذا ان مظلوم ومجبور انسانوں کے حقوق کے تحفظ کی طرف بھی امام الحج کو توجہ فرمانی چاہیے، کیونکہ میدانِ عرفات میں مسجد نمرہ کے جس منبر پہ کھڑے ہو کر وہ خطبہ ارشاد فرما رہے ہوتے ہیں، اس کے مُورِثِ اعلیٰ رحمۃ للعالمین، خاتم النّبیین، امام الانبیاء والمرسلین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کی جان ومال اور آبرو کی حُرمت وتقدیس کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''اے لوگو! توجہ سے سنو! بے شک تمہاری جانیں، تمہارے مال اور تمہاری آبرو کو وہی حُرمت اور تقدیس حاصل ہے، جو آج کے دن (یومِ عرفہ)، اس ماہِ ذوالحجہ اور اس بلدِ امین (مکۂ مکرمہ) کو حاصل ہے''۔

امام الحج نے سعودی عرب کی سرحدوں کے قریب داعش اور القاعدہ کے شکار ممالک عراق، شام اور یمن کے لیے دعا فرمائی۔ ہم اس کی دل وجان سے تحسین کرتے ہیں اور پورے اخلاص کے ساتھ ''آمین'' کہتے ہیں، لیکن ان سے نہایت ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ مقبوضہ کشمیر، فلسطین، غزہ کے مظلومین اور سِسک سِسک کر پیوندِ خاک بننے والے بچوں، برما اور دیگر خطوں کے مظلوم مسلمانوں کے لیے بھی اپنے خطبۂ حج میں چند دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے ہوتے، تو ان کی ڈھارس بندھتی، انہیں حوصلہ ملتا کہ وقوفِ عرفہ کے دن مسجد نمرہ کا منبر بھی ان کے درد کو محسوس کر رہا ہے اور مسلم حکمرانوں اور مسلم رُؤساء واُمراء کو اُن کی جانب متوجہ کر رہا ہے، انسانیت تک ان کی آہیں اور سسکیاں پہنچ رہی ہیں اور انسانیت کے ضمیر کو ان کی خاطر جھنجھوڑا جا رہا ہے۔

یہ سطور میں نے اس لیے لکھیں کہ ائمۂ حرمین اور امام الحج کا بڑا مقام ہے، وہاں سے بلند ہونے والی آواز کو پوری دنیا توجہ سے سنتی ہے۔ ورنہ یہ وہی سرزمین ہے جہاں اعلانِ

نبوت سے پہلے بتوں کی پرستش ہوتی تھی، بیت اللہ میں بت سجے ہوئے تھے، لات ومنات کی پرستش ہوتی تھی، صفا پر اِساف اور مروہ پر نائلہ نامی بت سجے ہوئے تھے، ان پہ چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے اور ان کے نام پر قربانیاں دی جاتی تھیں۔ نسلی ونسبی اور قبائلی نخوت وتفاخر (Arrogance) کے نظریاتی بت اِس سے سوا تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد منیٰ کے مقام پر ذوالمجنۃ اور عُکاظ کے میلے سجتے تھے، جن میں قریش کے خطباء اور شعراء اپنے اجداد کے کارنامے بیان کرتے تھے۔ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن نظریاتی بتوں کو پامال کیا اور فرمایا:

''سنو! جاہلیت کی نخوت وغرور، قبائلی اور نسلی ونسبی تفاخر کو آج میں اپنے قدموں تلے روندرہا ہوں''۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''پس جب تم ارکانِ حج ادا کرچکو، تو جس طرح تم (ماضی میں) اپنے آباواجداد کا ذکر کرتے تھے، (اب) اسی طرح اللہ کا ذکر کرو یا اس سے بہت زیادہ''۔ (البقرہ:200)

19 اکتوبر 2014ء

مقامِ صحابہ

دین کا مدار نقل اور روایت پر ہے اور روایت کے مستند اور معتبر ہونے کے لیے ثقہ شہادت ضروری ہے۔لہٰذا پورے دین کے قطعی اور لائقِ اعتبار ہونے کا مدار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ثقاہت (Authenticity)، عدالت، صداقت اور دیانت وامانت پر ہے۔یعنی صحابۂ کرام ہی دین کی پوری عمارت کے معتبر ومستند ہونے کے لیے خشتِ اوّل کا درجہ رکھتے ہیں۔صحابی اسے کہتے ہیں جس نے ایمان کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کی حیاتِ ظاہری میں دیکھا ہو اور ایمان پر اُس کا خاتمہ ہوا ہو، خواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ دیدار اور رفاقت وصحبت تھوڑے وقت کے لیے ہی کیوں نہ ہو، بقولِ شاعر:

ہر کوئی فدا ہے بِن دیکھے، دیدار کا عالَم کیا ہوگا
جب حُسن تھا اُن کا جلوہ نُما، انوار کا عالَم کیا ہوگا

سو آج اگر کوئی یہ کہے کہ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی ہے، پس اگر وہ سچا ہے تو یہ بہت بڑی سعادت ہے اور اگر وہ جھوٹا ہے، تو اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی سخت وعید فرمائی ہے:

’’جس نے مجھے خواب میں دیکھا، تو اس نے درحقیقت مجھ ہی کو دیکھا، کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کرسکتا اور جس نے قصداً مجھ پر جھوٹ بولا (یا جھوٹی بات میری طرف منسوب کی)، تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے‘‘۔(بخاری:110)

تاہم خواب میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت سے کوئی صحابی ہونے کا اعزاز

نہیں پا سکتا۔ صحابۂ کرام کا یہ اعزاز و افتخار اس لیے ہے کہ انہوں نے جاگتی آنکھوں سے رُخِ مصطفیٰ ﷺ کا دیدار کیا، آپ کو جلوت و خلوت میں، سوتے جاگتے، بزم میں رزم میں، کیفیتِ غضب و جلال اور کیفیتِ جمال میں، الغرض ہر حال اور ہر انداز میں دیکھا۔ انہوں نے آپ پر وحیِ ربانی اترنے کی کیفیات کو دیکھا، جبریلِ امین کو لباسِ بشری میں آپ ﷺ کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کر کے تعلیمِ صحابہ کے لیے سوالات کرتے اور جوابات کی تصدیق کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ وہ مقدّس و مبارک نفوس تھے، جن کے دل و دماغ اور روح و باطن کا تزکیہ رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا تھا اور آپ ﷺ ہی اُن کے براہِ راست مُربّی تھے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو سورۃ البقرہ: 129 میں دعائے ابراہیمی کی صورت میں اور سورۂ آلِ عمران: 164 میں اہلِ ایمان پر ربِّ ذوالجلال کی طرف سے بعثتِ مصطفیٰ ﷺ کا احسان جتاتے ہوئے اور البقرہ: 151 اور الجمعہ: 2 میں امرِ واقعہ کے طور پر مقاصدِ بعثتِ رسالت کو بیان کرتے ہوئے ذکر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ان (صحابہ) کو آیاتِ الٰہیہ پڑھ کر سناتے ہیں، اُن کے (باطن کا) تزکیہ کرتے ہیں اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے رسولِ مکرم ﷺ نے ایسا بے مثال اور باکمال تزکیہ فرمایا کہ تمام صحابۂ کرام اِن آیاتِ باری تعالیٰ کا مصداقِ کامل بن گئے:

(۱) ''اللہ نے کسی آدمی کے لیے اس کے پہلو میں دو دل نہیں بنائے (کہ کبھی اس کا دل رحمٰن کی بندگی سے سرشار ہو اور کبھی شیطان کا ٹھکانا بن جائے)''۔ (الاحزاب: 04)

(۲) ''اہلِ ایمان میں سے کچھ مردانِ (باوفا) ایسے ہیں کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا، اسے سچا کر دکھایا، اُن میں سے بعض نے (شہادت پر فائز ہو کر) اپنی نذرِ (وفا) پوری کر دی اور کوئی (نہایت بے قراری کے ساتھ) اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں''۔ (الاحزاب: 23)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اصحابِ رسول اللہ ﷺ کا مقامِ مدح میں شاندار انداز میں ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو اُن کے اصحاب ہیں، وہ

کفار پر بڑے سخت ہیں، آپس میں (ایک دوسرے کے لیے) نہایت نرم دل ہیں، (اے مخاطب!) تو انہیں (ہمیشہ اللہ کی بارگاہ میں) رکوع کرتے ہوئے (اور) سجدہ کرتے ہوئے دیکھے گا، وہ (صرف) اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے طلب گار ہیں۔ اُن کی نشانی اُن کے چہروں پر سجدوں کا اثر ہے (یعنی ان کے چہرے قیامت میں نورانی ہوں گے)، اُن کی یہ صفات تورات میں (بیان ہوئی) ہیں اور انجیل میں اُن کی صفت یہ (بیان ہوئی) ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو، جس نے اپنی باریک کونپل نکالی، پھر اس نے طاقت پکڑی، پھر وہ موٹی ہوئی، پھر اپنے تنے پر (مضبوطی کے ساتھ) سیدھی کھڑی ہوگئی، (یہ منظر) کاشت کاروں کو بھلا لگا تاکہ (اسے دیکھ کر) کافروں کے دل جلائے، جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، اللہ نے اُن سے بخشش اور اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے"۔ (الحجرات:29)

یہاں کھیتی سے مراد صحابۂ کرام کے قلوب ہیں، بیج سے مراد ایمان ہے اور کاشت کار سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے کہ جنہوں نے اپنی دعوتِ حق کا ثمر بہت جلد صحابۂ کرام کی وفا و اخلاص، ورع و تقویٰ، صداقت و عدالت، دیانت و امانت اور عزیمت و استقامت کی صورت میں دیکھا اور روحانی و قلبی مسرت سے سرشار ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے اُن کے بارے میں یہ بھی قطعی فیصلہ فرما دیا کہ:

(۱) "اور مہاجرین و انصار (صحابہ) میں سے (ایمان لانے میں) سبقت کرنے والے اور اوّلیت (کا شرف) حاصل کرنے والے اور وہ جنہوں نے (درجۂ) احسان میں ان کی پیروی کی، اللہ اُن (سب) سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے اور (اللہ نے) ان کے لیے ایسی جنتیں تیار کر رکھی ہیں، جن کے نیچے دریا جاری ہیں، وہ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہی بہت بڑی کامیابی ہے"۔ (التوبہ:19)

(۲) "یقیناً اللہ مومنوں سے اُس وقت راضی ہوگیا، جب وہ (حدیبیہ میں) درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے"۔ (الفتح:18)

عربی زبان اور آج کل بھی قانونی دستاویزات میں عقود (Contracts) اور

انشاءات (قصداً کسی فعل کو صادر کرنا، جیسے نکاح وطلاق) کو ماضی کے صیغے سے تعبیر کیا جاتا ہے، اگرچہ یہ عقد یا ارادی عمل اب وقوع پذیر ہورہا ہے، لیکن یہ اتنا یقینی امر ہے کہ گویا یہ پہلے ہی واقع ہوچکا ہے۔ اصحابِ رسول کو رضائے الٰہی کی قطعی اور یقینی نوید دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اصحابِ رسول کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ پہلے ہی طے ہوچکا ہے کہ وہ اُن سے راضی ہے اور یہ اُس سے راضی ہیں۔

انبیائے کرام اور رُسلِ عِظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی طرح صحابۂ کرام میں آپس میں درجہ بندی اور ایک دوسرے پر فضیلت ایک مسلّمہ امر ہے، چنانچہ سب سے اوّلین درجہ ابتدائی مرحلے میں اسلام قبول کرنے والوں کا ہے، پھر اُن کا جو اُس وقت ایمان لائے جب مسلمانوں کی کل تعداد چالیس تھی، پھر اُن کا جنھوں نے راہِ خدا میں ہجرت کا شرف حاصل کیا۔ انصار میں سے وہ جو ''بیعتِ عقبۂ اولیٰ'' اور ''بیعتِ عقبۂ ثانیہ'' میں شریک ہوئے، پھر اُن کا جو بدر میں شریک ہوئے، پھر اُن کا جن کو دونوں قبلوں (بیت المقدس وکعبۃ اللہ) کی طرف نماز پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، پھر وہ جو صلح حدیبیہ میں شریک رہے، پھر اُن کا جو فتحِ مکہ میں شامل تھے، پھر وہ جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے، جنھیں ''طُلَقاء'' کہا جاتا ہے۔

پس صحابۂ کرام کی ایک دوسرے کے مقابل تفضیل کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے:

''تم میں سے کوئی اُن کے برابر نہیں ہوسکتا، جنھوں نے فتحِ (مکہ) سے پہلے (اللہ کی راہ میں) مال خرچ کیا اور (کافروں سے) قِتال کیا، اُن کا درجہ اُن (صحابہ) سے بہت بڑا ہے، جنھوں نے (فتح مکہ کے) بعد (اللہ کی راہ) میں مال خرچ کیا اور جہاد کیا، (مگر یاد رکھو) اللہ نے اُن سب سے اچھے انجام کا وعدہ فرمایا ہے''۔ (الحدید:10)

لہٰذا صحابۂ کرام کے مابین بعض شعبوں میں یا بحیثیتِ مجموعی فضیلت کا بیان کرنا تو جائز ہے، مگر کسی بھی صحابی کی تنقیص اور تحقیر (Insult) کسی بھی درجے میں رَوا نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خبردار! میرے اصحاب کے بارے میں (کسی اہانت کا تصور کرتے ہوئے) اللہ سے ڈرو، میرے بعد انھیں (اپنی ملامت کا) ہدف نہ بنانا، سوجس

نے اُن سے محبت کی، تو (سراسر) میری محبت کی خاطر کی اور جس نے اُن سے بغض رکھا تو مجھ سے بغض کے سبب ایسا کیا اور جس نے انہیں اذیت پہنچائی تو اُس نے (درحقیقت) مجھے اذیت پہنچائی اور جس نے مجھے اذیت پہنچائی تو اس نے اللہ تعالیٰ کو اذیت پہنچائی اور جس نے اللہ کو اذیت دی تو وہ یقیناً اُسے اپنے (عذاب کی) گرفت میں لے گا''۔

(سنن ترمذی:3862)

امت میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عصمت کا کوئی بھی قائل نہیں ہے، وہ سب بشر تھے اور امکانِ خطا سے معصوم نہیں تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ نبوت کے فیضان اور آپ کی تربیت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے انہیں گناہوں سے محفوظ رہنے کی سعادت عطا فرمائی۔ ایسی متعدد مثالیں احادیثِ مبارکہ میں موجود ہیں کہ اگر بشری تقاضے کے تحت اُن میں سے معدودے چند افراد سے خطا کا صدور بھی ہوا، تو اللہ تعالیٰ کے کرم سے وہ جلد اِس پر متنبہ ہوگئے، خوف وخشیتِ الٰہی کا اُن پر غلبہ ہوا اور توبۂ مقبولہ مَرضِیَّہ کی سعادت انہیں نصیب ہوئی اور وہ گناہوں اور معصیتوں سے پاک ہوکر دارِ آخرت میں گئے۔

12 اکتوبر 2014ء

مقامِ اہلِ بیتِ اَطہار

اسلام میں تمام دینی عظمتوں، رفعتوں، عنداللہ قُربت اور محبوبیت و مقبولیت کا مرکز و محور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے، جس کو جتنی زیادہ آپ سے قربت ہے، نسبت ہے، محبت ہے اور اطاعت و اتباع کا تعلق ہے، وہ اسلام میں اتنا ہی عظیم المرتبت قرار پاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر نکاح اور نسبت کا رشتہ قیامت کے دن منقطع ہو جائے گا، سوائے میرے سبب اور نسب کے''۔ (مسند احمد: 18930) اور ایک روایت میں آپ نے رشتہ مصاہرت کا بھی ذکر فرمایا۔

گزشتہ کالم میں ہم نے ''مقامِ صحابہ'' پر قرآن وسنت کی روشنی میں گفتگو کی تھی، اہلِ بیت میں سے جنہیں شرفِ صحابیت حاصل ہے، وہ اُن تمام فضیلتوں کے حق دار ہیں اور اہلِ بیتِ نبوت ہونے کا شرف اس سے سوا ہے۔ قرآنِ مجید میں ''اہل'' اور ''آل'' کے کلمات آئے ہیں، بالعموم یہ دونوں کلمات ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔ مفسرینِ کرام نے یہ بھی کہا ہے کہ ''آل'' شرفِ نسبت کے لیے بولا جاتا ہے، خواہ یہ شرف محض دُنیاوی اعتبار سے ہو یا دینی اور اُخروی ہر اعتبار سے، آج کل بھی ''آلِ سعود'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ قرآن میں ''آل'' محض پیروکاروں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور (یاد کرو) جب ہم نے تمہارے لیے سمندر کو چیر دیا، پھر ہم نے تم کو نجات دی اور ہم نے ''آلِ فرعون (فرعون اور اس کے متبعین)'' کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے''۔

(البقرہ:50)

سب کو معلوم ہے کہ فرعون کی اولاد نہیں تھی اور یہاں آلِ فرعون سے مراد فرعون اور اس کے پیروکار ہیں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اسلام لائے، تو وہ سرزمین عرب میں اجنبی تھے، فارس کے رہنے والے تھے، مہاجرین نے کہا: سلمان ہم سے ہیں، انصار نے کہا: سلمان ہم سے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سلمان ہمارے اہلِ بیت میں سے ہیں''۔

(تاریخ طبری:2/92-91)

اللہ تعالیٰ نے اہلبیتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت کو قرآن مجید کے ان کلماتِ طیبات میں بیان فرمایا: ''اے اہلبیتِ رسول! اللہ یہی ارادہ فرماتا ہے کہ تم سے ہر قسم کی ناپاکی کو دور فرما دے اور تمہیں پاک کر کے خوب پاکیزہ بنا دے''۔ (الاحزاب:33)

اس کا مصداق حضرت علی وسیّدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور ان کی اولادِ اَمجاد بہ درجۂ اَتم ہیں، لیکن اہل بیت کے اطلاق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواجِ مُطہّرات اُمّہات المومنین رضی اللہ عنہن بھی شامل ہیں۔ قرآن مجید میں صرف بیوی پر بھی اہل بیت کا اطلاق کیا گیا ہے:

''(جب فرشتوں نے بڑھاپے میں حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت سنائی، تو وہ اس پر سراپا حیرت بن گئیں اور کہا:) ہائے افسوس! کیا میں بچہ جنوں گی، حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرے شوہر (بھی) بوڑھے ہیں، بے شک یہ عجیب بات ہے، فرشتوں نے کہا: کیا آپ اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہیں، اے اہلِ بیتِ (ابراہیم!) آپ پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں''۔ (ہود:73)

اس وقت تک حضرت سارہ سے کوئی اولاد نہ تھی، تو قرآن نے صرف بیوی پر اہل بیت کا اطلاق فرمایا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کو لے کر کنعان سے مصر کی طرف جارہے ہیں، انہیں دور سے آگ نظر آئی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جب انہوں نے آگ کو دیکھا، تو اپنی بیوی سے کہا: (یہاں) ٹھہرو، بے شک میں نے آگ دیکھی ہے، شاید میں اس سے تمہارے پاس کوئی انگارہ لے آؤں یا میں آگ سے راستے کی کوئی نشانی پاؤں''۔ (طٰہٰ:10)، یہاں بھی صرف بیوی پر ''اہل'' کا اطلاق کیا

گیا ہے۔

اہلِ بیتِ رسول اور آلِ رسول ﷺ کی شرافت وتکریم مسلّم ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی صاحبزادی سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور اپنے نواسوں حضراتِ حسنینِ کریمین رضی اللہ عنہما کے بارے میں ارشاد فرمایا:

(۱) ''فاطمہ میرے وجود کا ٹکڑا ہے، سو جس نے اسے غضب ناک کیا، اس نے مجھے غضب ناک کیا''۔ (صحیح بخاری:1051)

ایک بار رسول اللہ ﷺ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو اپنے دوشِ مبارک پر اٹھائے ہوئے فرما رہے تھے:

(۲) ''اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں، تو بھی اس سے محبت فرما''۔ (صحیح بخاری:3749)

دوسری حدیثِ مبارک میں ان الفاظ کا اضافہ ہے:

(۳) ''(اے اللہ!) جو اِس سے محبت کرے، تو بھی اُس سے محبت فرما''۔ (بخاری:2122)

ایک اور حدیث میں حسنینِ کریمین رضی اللہ عنہما کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

(۴) ''یہ دونوں میرے لیے دنیا میں دو خوشبودار پھول ہیں''۔ (صحیح بخاری:3753)

(۵) ''حسن اور حسین نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں''۔ (ترمذی:3768)

(۶) ''ایک بار رسول اللہ ﷺ (مسجدِ نبوی میں) خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ دو بچے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما سرخ قمیصیں پہنے لڑکھڑاتے ہوئے چلے آ رہے تھے، آپ ﷺ (خطبہ موقوف فرما کر) منبر سے اترے، ان دونوں بچوں کو اٹھایا، پھر منبر پر آ کر بیٹھے اور ان دونوں بچوں کو اپنی گود میں بٹھایا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے: ''تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش ہیں''، میں نے ان دو بچوں کو دیکھا کہ یہ لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے تھے تو مجھ سے صبر نہ ہوا، میں نے اپنی گفتگو کو روکا اور ان دونوں کو اٹھا لیا، (اس کے بعد آپ ﷺ نے خطبہ دوبارہ شروع کیا)''۔ (ترمذی:3774)

(۷) ''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام حسن کو اپنے دوشِ مبارک پر اٹھائے ہوئے تھے، ایک شخص نے (رَشک بھری نظروں سے دیکھا اور کہا: (اے خوش نصیب لڑکے!) کتنی اچھی سواری ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (یہ بھی تو دیکھو) سوار کتنا پیارا ہے''۔(سنن ترمذی:3783)

(۸) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''حسین مجھ سے ہیں (یعنی میری اولاد سے ہیں) اور میں حسین سے ہوں (یعنی وہ میرے کمالات کا مَظہر بنیں گے)، جو حسین سے محبت کرے اللہ اسے اپنا محبوب بنائے، حسین میری اولاد سے ہیں''۔(ترمذی:3775)

(۹) ''میرے اہلِ بیت کی مثال سفینۂ نوح کی سی ہے، جو اس میں سوار ہوا، نجات پا گیا اور جو اس میں سوار ہونے سے رہ گیا وہ ہلاک ہو گیا (یعنی جس نے ان کی محبت واطاعت کو اپنا شِعار بنایا، وہ نجات پا گیا اور جس نے ان سے تعلق توڑا، اس نے اپنی عاقبت کو برباد کیا)''۔(المستدرک للحاکم:151/3)

نجران کے نصاریٰ نے جب حق پر مبنی دلائل سننے کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوتِ حق کو قبول نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا:

''آپ کہیے! آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے آپ کو اور تمہیں (بھی)، پھر ہم (سب) عاجزی سے اللہ کے حضور دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں''۔(آل عمران:61)

اسے اصطلاح میں ''مُباہَلہ'' کہتے ہیں۔یعنی تنازع کے دونوں فریق مل کر یہ دعا کریں اے اللہ! ہم میں سے جو فریق جھوٹا ہو، اس پر لعنت فرما۔جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران کے نصاریٰ کے وفد کو ''مُباہَلہ'' کے لیے دعوت دی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حسین کو گود میں اٹھائے ہوئے اور حضرت حسن کا ہاتھ پکڑے ہوئے نکلے اور حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما آپ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے اور آپ ان سے فرما رہے تھے کہ جب میں دعا کروں تو تم آمین کہنا۔نصاریٰ کے چیف پادری نے کہا: اے

نصاریٰ! میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا کہ اگر وہ اللہ سے دعا کریں کہ وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا دے، تو اللہ ان کی دعا کو قبول کر کے پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا دے گا، سو تم ان سے مُباہلہ نہ کرو، ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے اور قیامت تک روئے زمین پر کوئی عیسائی باقی نہیں بچے گا، پھر انہوں نے جزیہ دینا قبول کیا اور مباہلہ کیے بغیر واپس چلے گئے''۔

(المستدرک، جلد:02، ص:594)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''آپ کہہ دیجیے، میں اِس (تبلیغِ رسالت) پر تم سے کوئی اجرت طلب نہیں کرتا، سوائے قرابت کی محبت کے''۔ (الشوریٰ:23)

اس کے ایک ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ میں اپنی تبلیغِ رسالت کے صلے میں تم سے اپنے قرابت داروں (یعنی اہل بیت) کے ساتھ محبت طلب کرتا ہوں اور بعض نے یہی معنی مراد لیے ہیں۔

ہماری رائے میں یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے شایانِ شان نہیں ہے، قرآن مجید کی متعدد آیاتِ کریمہ میں حضرات نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کے اقوال نقل فرمائے گئے ہیں:

''میں تم سے اس (تبلیغ) رسالت پر اجرت کا طلب گار نہیں ہوں، میرا اجر تو اللہ کے ذمۂ کرم پر ہے''۔

سو یہ ہم کیسے تصور کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے دعوتِ حق کے مشن کا کوئی مادّی اجر طلب کریں گے، لہٰذا عبداللہ بن عباس سے اس کے ایک معنی یہ روایت کیے گئے ہیں کہ ''قرابت کے رشتوں میں محبت کو شعار بناؤ''۔

خطبۂ حجۃ الوداع میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''اے لوگو! میں تمہارے درمیان قدر و منزلت والی دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر تم انہیں مضبوطی سے تھامے رہے، تو میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے، ان دونوں میں ایک

دوسری سے بہت بڑے مرتبے والی ہے، یعنی کتاب اللہ، اللہ کی رسی جو آسمان سے زمین تک دراز ہے اور میری عِترت یعنی میرے اہل بیت''۔(سنن ترمذی:3788)، اور مؤطا امام مالک کی حدیث میں کتاب اللہ کے ساتھ سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکر ہے۔

16اکتوبر2014ء

نوِشتۂ دیوار

اس وقت مسلم لیگ (ن) کی حکومت وفاق میں واضح اکثریت اور صوبہ پنجاب میں بھاری اکثریت کے ساتھ قائم ہے، مگر اتھارٹی کا فقدان ہے۔ جب قانون نافذ کرنے والے اداروں کے افسران کو تلاشی دے کر اور اپنا سرکاری لائسنس یافتہ ریوالور دھرنے والوں کے حوالے کرکے اپنی ڈیوٹی کے مقام پر جانا پڑے، تو اس سے قانون کی بے بسی کا ہر کوئی بہ آسانی اندازہ لگا سکتا ہے۔ یہ ایک المیہ بھی ہے اور لمحۂ فکریہ بھی، اس امر کی سنگینی اور دیرپا اثرات کے بارے میں کوئی غور نہیں کر رہا کہ ہمارے جمہوری نظام کے لیے کیسی روایت قائم کی جارہی ہے اور اس کے نتائج کیا ہوں گے، اور جو دام بچھایا جارہا ہے، اُس میں آگے چل کر کون کون پھنسے گا؟۔ سرِ دست اس پر غور کرنے کی کسی کے پاس فرصت نہیں ہے۔ بہرحال یہ نوشتۂ دیوار ہے۔

حکومتی ترجمان اپنے بیانوں میں بظاہر با اعتماد ہونے کا تأثر دیتے ہیں اور کبھی استہزا کا انداز بھی اختیار کرتے ہیں، لیکن اندر سے وہ بھی بے یقینی کا شکار ہوں گے۔ ایسے حالات میں بیوروکریسی بھی تذبذب کا شکار ہوجاتی ہے، کیونکہ جب پبلک اجتماعات میں برسرِ عام حکومتی منصب پر فائز کسی سول سرونٹ یا قانون نافذ کرنے والے ادارے کے ذمے دار کو نام لے کر دھمکی دی جارہی ہو کہ "تمہیں بھی دیکھ لیں گے"، تو وہ کب تک استقامت دکھائے گا۔

ایسے حالات میں معیشت کا پہیہ بھی یک سوئی کے ساتھ رواں دواں نہیں رہ سکتا۔

سرمایہ دار، صنعت کار اور تاجر طبقہ ویسے بھی بہت زیادہ حساس ہوتا ہے اور اگر وہ عدمِ تحفظ کا بھی شکار ہو جائے، تو وہ طویل المیعاد منصوبوں میں سرمایہ کاری کرنے سے گریز کرتا ہے کہ:

"کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے"

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں سرمایہ دار بین الاقوامی شہری ہوتا ہے، یہ اُڑتی چڑیا ہوتی ہے اور محفوظ گھونسلے کی تلاش میں رہتی ہے، جہاں اسے تحفظ اور امان ملے، یہ اپنا سرمایہ لے کر وہاں پہنچ جاتا ہے، سرمائے اور سرمایہ دار کا استقبال کرنے کے لیے ساری دنیا تیار رہتی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور امریکا وغیرہ میں بھی کوئی تارکِ وطن ایک مقررہ مقدار میں سرمایہ لے کر جائے، تو اسے وہاں فوراً قانونی حیثیت مل جاتی ہے۔ افریقا و دیگر پسماندہ ممالک میں تو وہاں کے حکمران حصہ دار بھی بن جاتے ہیں یا رشوت لے کر ہر ممکن تحفظ دینے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ بنگلا دیش، سری لنکا، دبئی، جنوبی افریقا اور تنزانیہ وغیرہ کی طرف ہمارے سرمائے کی پرواز کا سلسلہ جاری ہے، کیونکہ وہاں انہیں عزت بھی ملتی ہے اور تحفظ بھی۔

لہٰذا جناب عمران خان اور اُن کی پالیسی ساز ٹیم سے گزارش ہے کہ وہ بڑے صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کو یقین دلائیں کہ وہ بے دھڑک سرمایہ کاری کے منصوبے بنائیں، اُن سب کو اِن کے مجوزّہ "نئے پاکستان" میں پورا پورا تحفظ ملے گا اور بیرونِ ملک سے سرمایہ لے کر آنے والے پاکستانیوں کو مراعات اور ہر قسم کا تحفظ دینے کے لیے باقاعدہ قانون سازی کی جائے گی۔ اس اعتماد سازی کے لیے انہیں ٹیکس نہ دینے، یوٹیلٹی بلز نہ دینے اور اپنے سول نافرمانی کے اعلان کو برسرِ عام واپس لینا چاہیے۔ نتائج پر غور کیے بغیر دیرپا اور منفی اثرات کے حامل کسی اقدام کا اعلان اول تو ہونا نہیں چاہیے اور اگر ایسا اعلان کر بھی دیا گیا ہے، تو غلطی کا احساس ہونے پر بلاتاخیر اس کی تلافی ضروری ہے۔ یہ سُبکی کی بات نہیں ہے بلکہ یہ قیادت کی بالغ نظری اور بڑے پن کی علامت ہوتی ہے، کیونکہ آپ کو اختلاف کا حق حکمراں سیاسی قیادت سے ہے، نہ کہ ملک و قوم اور اس کے دیرپا مفادات سے۔

حکمرانوں سے بھی ہماری گزارش ہے کہ وہ نوشتۂ دیوار پڑھیں، وزیراعظم پاکستان اور وزیراعلیٰ پنجاب کا رُجحان میگا منصوبوں کی طرف ہے، کیونکہ ان کے نقوش تادیر برسرزمین ثبت رہتے ہیں اور عام حالات میں فی نفسہٖ یہ ملک کے اقتصادی ڈھانچے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میٹروبس، کراچی تا لاہور اور گوادر تا چین موٹروے کے اعلانات اُن کی ایسی سوچ اور اُفتادِ طبع (Mindset) کا مَظہر ہیں۔

اس وقت سیلاب سے تحفظ کا میگا پروجیکٹ بھی ملک کے لیے ناگزیر ترجیحی صورت بن چکا ہے، یعنی سیلابی دریاؤں کے اطراف ایسے مضبوط بند باندھنا جو ممکنہ طور پر آئندہ عشروں میں آنے والے سیلابوں کو اپنے بطن میں سَمو سکیں اور اُن کی تباہی کے امکانات کو معدوم یا انتہائی حد تک محدود کرسکیں۔ ذاتی طور پر تو میں خود بھی میگا پروجیکٹس کے حق میں ہوں۔ ذرا سوچیے! اگر آج تربیلا ڈیم اور منگلا ڈیم نہ ہوتے تو زراعت کے لیے پانی کی دستیابی تو دور کی بات ہے، کراچی سمیت بہت سے علاقے پینے کے پانی کو ترس رہے ہوتے، لیکن اس کے لیے پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی ہونی چاہیے، جو اعلیٰ بیوروکریٹس اور اچھی ساکھ رکھنے والے محبِ وطن معاشی ماہرین کی مشاورت سے ایسے میگا منصوبوں کی ترجیحی فہرست مرتب کرے۔

اسی طرح ملک میں بڑے شہروں کے انفراسٹرکچر یعنی بنیادی ترقیاتی ڈھانچے کو آئندہ دس بیس سال کی ضروریات کا پیشگی تخمینہ لگا کر ترقی دینا اور شہری ضروریات کے ڈھانچے کو اپ گریڈ کرنا بھی ضروری ہے۔ لیکن اس کے لیے لازم ہے کہ صوبے اپنے ہر پنج سالہ منصوبے میں کم از کم ہر سال ایک بڑے شہر کو اپنا ہدف بنائیں، اس سے دوسرے شہروں کے رہنے والوں میں احساسِ محرومی بھی پیدا نہیں ہوگا، بلکہ ہر ایک کو پیشگی معلوم ہوگا کہ ہماری باری بھی آنے والی ہے اور یہ بھی کہ کب آئے گی، اس طرح سے منفی پروپیگنڈے کا بھی سدِّ باب ہوگا۔

اسی طرح بجلی کی پیداوار کے منصوبے بھی ناگزیر ہیں، بلکہ یہ اس وقت کا سب سے اہم شعبہ ہے، جو پوری قوم کی توجہ کا محتاج ہے اور اس کی تفصیلات اور ترجیحی فہرست بھی

پارلیمنٹ کی کمیٹی کے توسط سے ہونی چاہیے اور ایسی کمیٹی کے اجلاس مسلسل اور کسی تعطل کے بغیر جاری رہنے چاہییں، کیونکہ ہمارے ملک میں کمیٹی اور کمیشن کا نام بہت بدنام ہے۔ لوگوں کو پختہ یقین ہوتا ہے کہ یہ معاملات کو ٹالنے، صیغۂ راز میں رکھنے اور عوام کے جذبات کو فرو کرنے کا ایک حربہ ہے، عوام کا یہ خدشہ یا الزام کافی حد تک درست بھی ہے۔

اس کالم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ حکومت کو باور کرایا جائے کہ بنیادی ضرورت کی اشیاء کی قیمتیں لوگوں کی پہنچ یا قوتِ خرید سے ماورا ہوتی جارہی ہیں۔ ان اشیائے ضرورت میں سر چھپانے کے لیے مکان، اشیائے خوراک، بجلی، گیس اور علاج کے لیے دوائیں اور بچوں کی تعلیم شامل ہیں۔ ایک وقت تھا کہ ملک کے بیشتر علاقوں میں بجلی اور گیس نہیں تھی، مگر اب صورتِ حال اِس کے برعکس ہے۔ حالات بدلنے سے راحت کی بہت سی چیزیں لوگوں کی ضرورت بن جاتی ہیں اور کسی نعمت کے ملنے کے بعد اس سے محرومی لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہوجاتی ہے۔ دراصل اب لوگ آسائش کے طلب گار ہیں اور جب وہ حکمرانوں اور معاشرے کے بالائی طبقات، جن کو آج کل اشرافیہ کہا جاتا ہے، کے طرزِ زندگی کو دیکھتے ہیں تو ان کا جذبۂ محرومی دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہوجاتا ہے اور کوئی بھی اسے بہ آسانی بے قابو جذبات میں ڈھال سکتا ہے اور آج کل ہم یہی منظر دیکھ رہے ہیں۔ جذبات کی رو میں بہنے والوں کے پاس یہ سوچنے کی فرصت نہیں ہوتی کہ آنے والے دودھ اور شہد کی نہریں کہاں سے جاری کریں گے، نہ ہی وہ قول و فعل اور گفتار اور کردار کے تضاد پر نظر رکھتے ہیں، جس کی طرف ہمارے بعض اہلِ نظر متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ پس معاشرے کے زیریں طبقات کو اشیائے ضرورت میں زرِ اعانت دینے کے بارے میں حکومت کو سوچنا چاہیے۔

عامر ڈوگر صاحب ملتان سے جیت کر ایم این اے بن گئے اور اِسے پاکستان تحریک انصاف کی قیادت نے تبدیلی کی لہر سے تعبیر کیا ہے، بلکہ دعویٰ کیا ہے کہ تبدیلی آگئی ہے۔ نہ کسی نے عامر ڈوگر صاحب کے ماضی کو کھنگالا اور نہ ہی ان کے ماضی کی سیاسی وابستگی پر توجہ دی ہے۔ آپ غور کریں کہ اگر بالفرض یہی عامر ڈوگر صاحب پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر

جیت کر اسمبلی میں پہنچتے، تو دھاندلی زدہ پارلیمنٹ میں بیٹھے ڈاکوؤں، چوروں اور کرپٹ لوگوں کے ساتھی کہلاتے، لیکن اب ماشاء اللہ ان کا سیاسی بپتسما ہوگیا ہے اور وہ نئے پاکستان کے معماروں کی صف میں شامل ہوگئے ہیں:

"تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا، خوب ہوا"

لہٰذا آنے والے دنوں میں قومی انتخاب خواہ موجودہ حکومت کے دورانیے کی تکمیل پر 2018ء میں ہوں یا اس سے پہلے وسط مدتی انتخاب ہوجائیں، آپ تحویلِ قبلہ اور مرجعِ عقیدت کی تبدیلی کے یہی مناظر دیکھیں گے۔ یہی قابلِ انتخاب (Electables) پرندے مختلف آشیانوں کی طرف آپ کو محوِ پرواز نظر آئیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ بہت بڑی توقعات نہ باندھی جائیں، کیونکہ پھر جب امیدوں کا آبگینہ ایک ایک کر کے کرچی کرچی ہوگا، تو اُس کا صدمہ بھی اتنا ہی شدید ہوگا۔

20 اکتوبر 2014ء

مشورہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”پس آپ اللہ کی رحمت ہی کے سبب اُن کے لیے نرم ہو گئے اور اگر آپ تُند خو اور سخت دل ہوتے تو وہ ضرور آپ کے گرد سے تتر بتر ہو جاتے، سو آپ اُن کو معاف کر دیں اور اُن کے لیے استغفار کریں اور (اہم) امور میں اُن سے مشورہ کر لیا کریں، پھر جب آپ کسی کام کا پختہ ارادہ کر لیں تو (کامیابی کے لیے) اللہ پر بھروسا کریں، بے شک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے“۔ (آل عمران:159)

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ”اور ان کے کام باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں“۔ (الشوریٰ:38)

اہم امور میں دوسروں سے مشاورت کرنا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنّت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے مختلف مواقع پر تعلیمِ امت کے لیے صحابۂ کرام سے مشورہ فرمایا۔ اِس آیتِ مبارکہ کے نزول پر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تھا:

ترجمہ: ”بے شک اللہ اور اس کے رسول مشورہ سے مستغنی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے مشورہ کو میری امت کے لیے رحمت بنا دیا ہے“۔ (روح المعانی، جلد:4، ص:107)

ظاہر ہے مشورہ اُن امور میں ہوگا، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے صریح احکام نہ ہوں، ورنہ اللہ اور رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکام کی اطاعت ہر حال میں لازم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے جنگی امور میں صحابۂ کرام سے مشاورت کی۔ جب بدر میں

مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور کفارِ مکہ کے جنگی قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے، تو آپ ﷺ نے اُن کی بابت مسلمانوں سے مشورہ کیا کہ اُن سے کیا سلوک کیا جائے، کیونکہ اُس وقت جنگی قیدیوں کی بابت اَحکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ حدیثِ پاک میں ہے:

ترجمہ: ''(بدر کے موقع پر) قیدی لائے گئے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان قیدیوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟۔ صحابی بیان کرتے ہیں: میں نے کسی شخص کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اپنے رفقاء سے مشورہ لینے والا نہیں دیکھا''۔ (ترمذی: 1714)

اسی طرح غزوۂ احزاب میں آپ ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے کو قبول فرماتے ہوئے دفاع کے لیے خندق کھودنے کا فیصلہ فرمایا اور وہ اچھے نتائج کا حامل رہا، کفار کو نامراد ہوکر واپس جانا پڑا۔

لیکن ظاہر ہے کہ مشورہ اہلِ رائے سے کرنا چاہیے یا اگر معاملہ کسی خاص شعبے سے متعلق ہے تو اُس کے ماہرین سے مشورہ لینا چاہیے، کیونکہ مشاورت اور اجتماعی رائے میں برکت ہوتی ہے۔ بعض اوقات کسی معاملے میں صحیح اور غلط کے درمیان انتخاب کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات اگر ایک رائے فی نفسہٖ درست ہے، تو دوسری اس سے بہتر ہوسکتی ہے اور تیسری بہترین ہوسکتی ہے۔ کسی نیک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک سے زیادہ تدبیریں (Tactics) ہوسکتی ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک موقع پر اُس وقت کے مخصوص حالات کے تحت ایک تدبیر کارگر ثابت ہوتی ہے، لیکن دوسرے موقع پر وہی تدبیر یا چال ناکامی سے دوچار ہوجاتی ہے۔ اس لیے مختلف مواقع پر ایک سے زیادہ آراء سامنے آنے سے مسئلے کے حل کی احسن صورت نکل آتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو بندہ مشورہ لے، وہ کبھی بدبخت نہیں ہوگا اور جو بندہ اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھے وہ کبھی نیک بخت نہیں ہوتا''۔ (الجامع لاحکام القرآن، جلد: 14، ص: 250)

رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین بھی مباح اُمور میں امین لوگوں سے مشاورت کرتے تھے تاکہ مسئلے کے حل کے لیے کوئی آسان صورت سامنے آجائے اور

وہ اسے اختیار کرلیں، ہاں! اگراُن پر واضح ہوجاتا کہ درپیش معاملے کے بارے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکام موجود ہیں، تو پھر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اِتباع میں یکسو ہوکر اس پر عمل پیرا ہوجاتے اور کسی اور جانب نہ دیکھتے، (کیونکہ جب قطعی طور پرحق معلوم ہوجائے تو پھر کسی اور جانب دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی)''۔

(سنن ابوداؤد: باب المشورہ)

لیکن یہ امر بھی لازم ہے کہ جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہو، خیر خواہ ہو، اپنی اور سب کی فلاح چاہتا ہو، دھوکا نہ دے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس سے مشورہ مانگا جائے، وہ امین ہوتا ہے''۔ (سنن ابی داؤد: 5087)، یعنی اس پر لازم ہے کہ دیانت داری سے رائے دے۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی جماعت کے لیے لوگوں کو مطلع کرنے کے بارے میں صحابۂ کرام سے مشورہ کیا کہ کیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے، پھر خواب میں ایک صحابی ابن عبدربّہ کو فرشتے نے کچھ کلمات اِلقاء کیے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند فرمایا اور انہی کلماتِ مبارکہ پر مشتمل اذان کو مشروع کردیا، جو آج مسلمانوں کا شِعار ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تمام اہم معاملات میں صحابۂ کرام سے مشورہ کیا کرتے تھے اور ہر درست مشورے کو قبول کرتے تھے۔ انہوں نے شراب کی حد کے بارے میں صحابۂ کرام سے مشورہ کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورے پر شراب کی حد اَسّی کوڑے مقرر کی۔ طواف کے دوران کچلے جانے کی وجہ سے ایک شخص کی موت واقع ہوگئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مومن کا خون رائیگاں نہیں جاتا، اس کی دِیَت بیت المال سے ادا کی جائے''۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اِس مشورے کو قبول کیا اور کہا: ''اگر علی نہ ہوتے، تو عمر ہلاک ہوجاتا''، یعنی اِس پر اُن کا شکریہ ادا کیا۔

اہم امور میں مشاورت کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا شِعار قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابۂ کرام سے مباح امور میں مشاورت کا حکم فرمایا۔ مشاورت میں برکت ہے، خیر ہے،

اجتماعیت ہے اور اس کے نتیجے میں انسان عُجبِ نفس، خود فریبی اور خود رائی میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اجتماعی امور میں مشاورت سے سب میں احساسِ شرکت پیدا ہوتا ہے اور اجماعی یا اکثری فیصلوں کی ذمے داری سب پر عائد ہوتی ہے اور اس کے نتائج کے ذمے دار بھی سب ہوتے ہیں، کسی ایک فرد پر تنہا ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں سے مشاورت کا حکم دینے کے بعد فرمایا: "جب آپ (کسی کام کا) پختہ ارادہ کرلیں، تو پھر اللہ پر توکل کریں"، یعنی پھر یکسو ہوکر اور اللہ پر توکل کر کے اس کام میں لگ جانا چاہیے۔

مشورہ کرنے میں خیر ہے، مگر ہر حال میں مشورہ ماننا ضروری نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کسی سے مشورہ لیا جائے، تو وہ کہتا ہے: "مشورہ دینے کا کیا فائدہ، کوئی مانتا تو ہے نہیں"۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابیہ حضرت بَرِیرہ رضی اللہ عنہا کو اپنے سابق شوہر کے ساتھ نکاح میں رجوع کرنے کا مشورہ دیا، انہوں نے عرض کی: "یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! کیا یہ آپ کا حکم ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، یہ میری سفارش ہے، اس نے عرض کی: پھر مجھے ان سے کوئی حاجت نہیں ہے"۔ (بخاری:5283)

رسول اللہ ﷺ نے یہ مثال تعلیمِ امت کے لیے قائم فرمائی تاکہ معلوم ہوجائے کہ ہر حال میں مشورہ ماننا ضروری نہیں ہے، مشورے کو رَد بھی کیا جاسکتا ہے اور مشورہ دینے والے کو اسے اپنی توہین پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔

یہ چند سطور میں نے اس لیے لکھیں کہ ہمارے ہاں حکمرانوں پر تو شاہانہ مزاج رکھنے کا طعن کیا جاتا ہے، جو کسی حد تک درست ہے۔ لیکن مستقبل میں حکمرانی کے امیدوار رہنماؤں کی ذہنی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہے، یعنی سب ہی اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھتے ہیں اور عملی طور پر اپنے آپ کو خطا سے محفوظ گردانتے ہیں، اس لیے انہیں صرف وہی مشورہ یا رائے اچھی لگتی ہے، جس میں ان کے ہر قول وفعل کی غیر مشروط طور پر تحسین کی جائے اور ان کے کسی اقدام پر انگلی نہ اٹھائی جائے۔ کوئی کتنی ہی نیک نیتی سے رائے دے یا تنقید کرے، وہ اسے اپنی

توہین پر محمول کرتے ہیں، بلکہ ایک معروف قائد کا ٹکر میں نے ٹیلی ویژن اسکرین پر چلتے ہوئے دیکھا کہ ''مشورہ دینے والے فیس دیں''۔

پس یہ مت سمجھیے کہ آپ سے اختلاف رائے رکھنے والا ہر شخص آپ کا دشمن یا آپ کا مخالف ہے، وہ آپ کا خیر خواہ اور آپ کا ہمدرد بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ منہ پر مدح وستائش کرنے والا ہر شخص آپ کا بہی خواہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''جب تم (کسی کے منہ پر اس کی) تعریف کرنے والوں کو دیکھو، تو اس کے منہ پر مٹی ڈالو''۔ (بخاری: 7495)

23 اکتوبر 2014ء

قول وفعل کا تضاد

امتِ مسلمہ کا المیہ یہ ہے کہ ہم قول وفعل کے تضاد کا شکار ہیں، اس میں حکمران اور عوام سب ہی درجہ بہ درجہ شامل ہیں۔ اسی دوعملی، منافقت اور تضاد کی وجہ سے ہم دنیا میں ناقابلِ اعتبار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو بندے کی یہ خصلت ازحد ناپسند ہے، ارشاد فرمایا:

''اے ایمان والو! تم وہ بات کہتے کیوں ہو، جس پر تم خود عمل نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات بڑی ناراضی کا سبب ہے کہ تم کہو کچھ اور کرو کچھ''۔ (الصّف:3-2)

قرونِ وسطیٰ میں یہود کے علماء کا یہی شِعار تھا، جس کی قرآن مجید نے سختی سے مذمت فرمائی: ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، سو کیا تم (قول وفعل کے اس تضاد کو) سمجھتے نہیں ہو''۔ (البقرہ:44)

مزید فرمایا: ''پس عذاب ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے تاکہ اس کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت لے لیں، سو ان کے لیے عذاب ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور جو کچھ انہوں نے کمایا، اس کے سبب سے ان کو عذاب ہوگا''۔ (البقرہ:79)

یعنی ان کی یہ دوعملی اور دنیا کے عارضی مفادات کا طمع انہیں کتابِ الٰہی میں تحریف پر بھی آمادہ کردیتا تھا۔ تھوڑی قیمت سے یہ مراد نہیں ہے کہ زیادہ ملے تو پھر یہ سودا کرلینا چاہیے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت کی اَبدی اور دائمی نعمتوں کے بدلے میں ساری دنیا کی دولت بھی مل جائے، تو وہ حقیر ہے اور یہ سودا خسارے کا سودا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’’قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا پھر اس کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا، اس کی انتڑیاں دوزخ میں بکھر جائیں گی اور وہ اس طرح گردش کررہا ہوگا جس طرح چکی کے گرد چکر لگاتا ہے، دوزخی اس کے گرد جمع ہوکر اس سے کہیں گے: اے فلاں! کیا بات ہے؟ تم تو ہم سب کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور بُرائی سے روکتے تھے، وہ کہے گا: میں تم کو تو نیکی کا حکم دیتا تھا، مگر خود نیک کام نہیں کرتا تھا اور میں تم کو تو بُرائی سے روکتا تھا، مگر خود بُرے کام کرتا تھا‘‘۔ (بخاری: 3267)

چنانچہ آج اُسی عملی منافقت اور تضاد کی سزا بھگت رہا ہے۔ اس حوالے سے ہر دور کے خطباء، واعظین، ذاکرین اور قومی رہنمائی کے منصب پر فائز ہونے والوں کی ذمے داری سب سے زیادہ ہے اور آخرت میں ان کی دو عملی کا وبال بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

’’معراج کی شب میں ایسے لوگوں کے پاس سے گزرا، جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جارہے تھے، جب بھی ان کو کاٹا جاتا وہ جڑ جاتے اور پھر ان کو کاٹا جاتا، میں نے پوچھا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟۔ انہوں نے کہا: یہ آپ کی امت کے وہ واعظین ہیں جو لوگوں کو تو خیر کی دعوت دیتے تھے، مگر خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے، وہ کتاب اللہ کو پڑھتے تھے، مگر اس پر عمل نہیں کرتے تھے‘‘۔ (مسند ابویعلی: 3992)

ہمارے اندر ایک بڑی خرابی یہ دَر آئی ہے کہ ہم اسلام اور اپنے اکابر کے شان دار ماضی کے سہارے جینا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو اس اعزاز واکرام اور افتخار کا حق دار گردانتے ہیں، جس کے معیار پر ہم کسی بھی طور پر پورا نہیں اترتے۔ ہمیں اپنی معاصر دنیا سے بہت شکوہ اور شکایت ہے کہ مسلمانوں کے حوالے سے ان کا طرزِ عمل اور اپروچ عداوت اور بغض پر مبنی ہے، حالانکہ اسلام اتنا خوبصورت، پر امن، عافیت اور سلامتی کا دین ہے۔ ہم اس حقیقت کا ادراک نہیں کرپارہے کہ اکیڈمک یا ٹیکسٹ بک یا کتابی اسلام اور آج کے مسلمان کے کردار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آئیڈیل اور کتابی اسلام کچھ اور

ہے اور پریکٹسنگ اسلام یا مسلمانوں کی عملی تعبیر وتصویر اس سے بہت مختلف ہے۔ اسی لیے فارسی میں کہتے ہیں: ''اسلام در کتاب و مسلمان در گور''۔ یعنی حقیقی اسلام تو کتاب (قرآن وسنت) میں ہے اور جو مسلمان اس کی عملی تعبیر وتصویر تھے، وہ اپنی قبور میں آرام فرما ہیں۔

ہماری ایک غلط فہمی یا ناقص اندازِ فکر یہ بھی ہے کہ ہم آئیڈیل اسلام کا مقابلہ مغرب کے عملی حکمرانوں سے کر رہے ہوتے ہیں اور ان کی تہذیبی شکست وریخت، جنسی واَخلاقی زوال اور خاندانی نظام کے منتشر ہونے کو دیکھ کر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ تہذیبِ مغرب رو بہ زوال ہے اور جلد یا بدیر یہ تہذیب ناکامی سے دوچار ہوگی، لیکن ہم یہ نہیں سوچتے کہ آیا ہم اس خلا کو پُر کرنے کے لیے پوری طرح سے تیار ہیں اور یہ کہ آیا ہم موجودہ دنیا کی قیادت کرنے کی اہلیت کے حامل ہیں؟۔ پس سامنے کی حقیقت یہ ہے کہ یہ عمل کی دنیا ہے، مفروضوں اور موہوم تصورات (Perceptions) کی دنیا نہیں ہے۔

علامہ اقبال نے مسلم نوجوان سے خطاب کرتے ہوئے، اپنے اسی دردِ دل کو انتہائی مؤثر انداز میں بیان کیا ہے:

کبھی اے نوجوان مسلم! تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے؟
جہاں گیر و جہاں بان و جہاں آرا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے، وہ نظارا
تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا
گنوا دی ہم نے، جو اَسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر، آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلَّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں، تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ان اَشعار میں علامہ اقبال مسلم نوجوان کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ذرا دنیا کی رنگینیوں اور چمک دمک سے کچھ دیر کے لیے نکلے اور چشمِ تصور میں اسلام کے شان دار ماضی کا جائزہ لے اور اس حقیقت کا تجزیہ کرے کہ اس کے عروج کے اسباب کیا تھے اور وہ کیا اسباب ہیں کہ جن کے باعث مسلمان عبرت ناک زوال سے دوچار ہوئے۔ وہ مسلم نوجوان کو بتانا چاہتے ہیں کہ تمہارے آباء کردار کے غازی تھے اور تم فقط گفتار کے غازی ہو، ان کا سفر ہر آن رفعتوں اور سرفرازیوں کی جانب تھا اور تم جمود کا شکار ہو، تو پھر سوچو تمہیں اپنے آباء سے کوئی حقیقی اور عملی نسبت ہے کہ تم ان کی سطوت وشوکت اور عزّ وجاہ کی وراثتوں کے وارث اور امین ہونے کا دعویٰ کرو۔

وہ بتاتے ہیں کہ ہم نے اپنے اَسلاف کی علمی اور عملی عظمت کو جب گنوادیا اور عزت وافتخار کا اعزاز کھو بیٹھے، تو آسماں نے ہمیں ثریا کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں میں پٹخ دیا۔ وہ بتانا چاہتے ہیں کہ صرف حکومت کا چھن جانا ہی ہمارا المیہ نہیں ہے، وہ تو ہونا ہی تھا، کیونکہ دنیا کا مسلّمہ دستور ہے کہ آپ کو دنیوی امامت اور قیادت کے لیے بھی میرٹ پر پورا اترنا ہوگا، ورنہ دنیا کی ٹھوکروں میں پڑے رہو گے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقوامِ عالَم کے ارتقا کا راز علم میں مضمر ہے، لیکن علم کے جن خزینوں اور مآخذ سے اہلِ مغرب نے استفادہ کیا اور سائنس وٹیکنالوجی میں دنیا کی رہنمائی اور اجارہ داری کے منصب پر فائز ہوگئے، جب میں اپنی اس علمی وراثت (یعنی اَسلاف کی علمی، سائنسی اور فنی کتب) کو یورپ کی لائبریریوں میں دیکھتا ہوں، تو میرا جگر پارہ پارہ ہوجاتا ہے۔

علامہ اقبال آج کے مسلم نوجوان کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ تمہاری آدرش، تمہارا

آئیڈیل، تمہاری خواہشات اور تمہاری ترجیحات کا رخ غلط سمت میں ہے، تم اگر اسی روش پر گامزن رہے تو تمہیں رفعت و سرفرازی کی منزل کبھی نہیں مل سکتی، اگر اپنے آباء واجداد کی علمی وراثت اور دنیا میں مقامِ افتخار کو پانا چاہتے ہو تو تمہیں اپنے آرزوئیں بدلنی ہوں گی اور اپنی ترجیحات کا قبلہ درست کرنا ہوگا۔ فطرت کے قوانین اٹل ہیں اور وہ کسی کے لیے بدلتے نہیں ہیں، بدلنا تمہیں خود ہوگا، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

تری دعا ہے کہ ہو تری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

25 اکتوبر 2014ء

ناروے میں تین دن

ناروے کے مسلمانوں کی دعوت پر مجھے تین روز کے لیے اوسلو جانے کا موقع ملا۔ جمعرات ۲۳ راکتوبر کو صبح ساڑھے پانچ بجے روانگی ہوئی اور مقامی وقت کے مطابق سہ پہر سوا پانچ بجے اوسلو پہنچا۔ ناروے آمد کا مقصد اوسلو میں ''سندرے نورا سترند مسلم سنٹر'' کی سنگِ بنیاد کی تنصیب اور اس عظیم الشان منصوبے کے لیے عطیات جمع کرنے (Fund Raising) کی تقریب میں شرکت کرنا تھا۔ الحمدللہ! یہ تمام پروگرام احسن طریقے سے انجام پائے۔

جمعۃ المبارک کی نماز کے بعد مجوّزہ اسلامک سنٹر کے سنگِ بنیاد کی تنصیب کی تقریب میں مسلمان مردوں اور عورتوں نے بڑی تعداد میں حصہ لیا۔ میرے علاوہ برطانیہ سے علامہ محمد فاروق چشتی کو بھی اس تقریب میں مدعو کیا گیا تھا۔ اتوار کی شام اس مجوّزہ منصوبے کے لیے عطیات جمع کرنے کی خاطر ایک عشائیے کا اہتمام تھا، جس میں بڑی تعداد میں مردوں اور عورتوں نے حصہ لیا اور تعمیر کے پہلے دو مراحل کے لیے مطلوبہ فنڈ جمع ہو گیا۔ اس منصوبے کے اخراجات کا مجموعی تخمینہ پینتالیس ملین کرونا لگایا گیا ہے اور تقریباً پچاس فیصد وسائل مسلمانوں کے فراخ دلانہ عطیات سے جمع ہو گئے ہیں۔ اب تعمیری کام شروع کیا جا رہا ہے اور امید ہے کہ تعمیری مراحل کے دوران مزید مطلوبہ مالی وسائل دستیاب ہوتے رہیں گے۔ طاہر سلام، راجا اقبال، غلام سرور، سید محمد زبیر، افتخار محمود، محمد منشا خان اور معصوم زبیر صاحبان اس تنظیم کے اہم ارکان ہیں۔ کراچی کے جناب اظہر حسین نے

انتظامیہ کی جانب سے مجھے اس سفر کی دعوت دی تھی۔

اوسلو میں مختلف اسلامی مراکز و مساجد میں علمائے کرام اور انتظامیہ کے ذمے داران کے ساتھ مفید اجلاس ہوئے، ان میں مرکزی جماعتِ اہلسنّت، اسلامک کلچرل سنٹر، ورلڈ اسلامک مشن اور اسلامک کونسل آف ناروے سے وابستہ علماء موجود تھے۔ اسلامک کونسل ناروے سے ساٹھ ہزار مسلمان اپنے چالیس مراکز کے توسط سے وابستہ ہیں۔ جن علمائے کرام سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں، اُن میں مولانا نعمت علی شاہ، مولانا محبوب الرحمٰن، مفتی محمد زبیر تبسم، مولانا سید اشرف علی، مولانا نجیب الرحمن ناز، پروفیسر عطاء المصطفیٰ اور مولانا نور احمد نور شامل ہیں۔

ناروے کے مسلمانوں کو درپیش اہم مسائل میں رمضان المبارک، شوال المکرم، ذوالحجہ اور دیگر اسلامی مہینوں کے آغاز یعنی رویتِ ہلال کا مسئلہ شامل ہے۔ ناروے کی آبادی تقریباً باون لاکھ ہے، ان میں سے مسلمانوں کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہے، اس میں تمام خطوں کے مسلمان شامل ہیں۔ پاکستانی مسلمانوں کی تعداد تقریباً پینتیس تا چالیس ہزار ہے اور ان میں غالب اکثریت گجرات، لالہ موسیٰ، کھاریاں، جہلم اور ملحقہ علاقے کے لوگوں کی ہے۔ دوسری بڑی آبادی صومالیہ کے مسلمانوں کی ہے، جو اپنے ملک کی خانہ جنگی کے دوران سیاسی پناہ کے لیے ناروے آئے تھے۔

پاکستانی مسلمانوں کے مراکز کے علماء اور انتظامیہ کے ذمے داران رویتِ ہلال کے مسئلے پر ایک فارمولے پر متفق ہوگئے ہیں کہ اگر سائنسی اعتبار سے نئے قمری مہینے کا چاند قابلِ رویت (Visible) ہو اور کسی مسلمان ملک سے رویت کی اطلاع آجائے، تو قمری مہینے کے آغاز کا اعلان کردیا جائے گا۔ تاحال اس سے تبلیغی جماعت کے مرکز والے متفق نہیں ہوپائے، وہ آنکھیں بند کر کے سعودی عرب کے فیصلے پر عمل کرتے ہیں اور ان کا فکری مرکز ڈیوز بری، برطانیہ ہے۔ رائیونڈ میں تبلیغی جماعت کے بڑوں کو چاہیے کہ وہ اوسلو کے تبلیغی مرکز کو وہاں کے تمام مسالک کے پاکستانی مسلمانوں کے ساتھ مل کر چلنے کی ہدایت

کریں، کیوں کہ دنیا بھر میں تبلیغی جماعت والے بالعموم پاکستان میں رائیونڈ یا دہلی کے مرکز سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ وہاں کے مسلمانوں نے بتایا کہ ان کے لیے مشکل سعودی عرب کے فیصلے سے پیدا ہوتی ہے، جو اکثر کسی بھی دینی یا سائنسی معیار پر پورا نہیں اترتا۔

تمام مسالک کے اسلامی مراکز کے علماء اور انتظامیہ کے ذمے داران نے تجویز پیش کی کہ جون میں آپ اور مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب یہاں آئیں اور اس مسئلے پر اتفاقِ رائے پیدا کرنے میں تعاون کریں، میں نے انہیں ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی ہے اور امید ہے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب بھی تعاون کے لیے تیار ہوں گے۔ میں نے انہیں تجویز پیش کی کہ رائیونڈ سے تبلیغی جماعت کے کسی ذمے دار عالم کو بھی اس موقع پر دعوت دیں تاکہ پاکستانی مسلمانوں کی حد تک یہ مسئلہ مکمل اتفاقِ رائے سے حل ہو جائے۔

ناروے کے مسلمانوں کا دوسرا اہم مسئلہ سال کے بعض دنوں میں نمازِ عشا کے وقت کا تعین ہے، کیوں کہ اُن ایام میں مغرب کے فوراً بعد فجر کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور عشا کا وقت داخل ہی نہیں ہوتا۔ پس ضروری ہے کہ نمازِ عشاء کے لیے اتفاقِ رائے سے ایک ایسا نظام الاوقات طے کیا جائے جو وہاں کے مسلمانوں کے لیے قابلِ عمل ہو۔ اس میں گرمیوں کے موسم میں سحری کے اوقات کا مسئلہ بھی شامل ہے۔

ناروے کے مسلمانوں کا تیسرا اہم مسئلہ قطبِ شمالی (North Pole) میں پنج وقتہ نمازوں کے اوقات اور رمضان المبارک میں سحر اور افطار کے اوقات کا تعین ہے، کیوں کہ وہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے۔ جب چھ ماہ کا دن ہوتا ہے تو سورج غروب ہی نہیں ہوتا اور جب چھ ماہ کی رات ہوتی ہے، تو سورج طلوع ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ پنج وقتہ نمازوں اور سحر و افطار کے اوقات کے تعین کے لیے معیار کیسے بنایا جائے۔ شرعی طور پر کسی مُوقّت عبادت (Time Bound Obligation Fixed Time Obligation/) کے وجوبِ ادا کے لیے اس وقت کا پایا جانا ضروری ہے اور بعض ممالک میں سال کے بعض دنوں میں عشاء کا وقت پایا ہی نہیں جاتا اور قطبین میں سال

بھر تک کسی بھی نماز کا وقت نہیں پایا جاتا۔ اسی لیے ہمارے قدیم فقہائے کرام بھی اس سلسلے میں مُتَرَدِّد (Indecisive) رہے ہیں کہ آیا کسی مقام پر وقت نہ پائے جانے کی صورت میں اُس وقت کی نماز سرے سے واجب ہی نہیں ہوگی اور اگر وجوب کا قول کیا جائے، تو ادا کی نیت سے پڑھی جائے گی یا قضا کی نیت سے؟۔

اس عہد کے علمائے کرام بالعموم وجوبِ ادا کے قائل ہیں، کیونکہ عدمِ وجوب کا قول اختیار کرنے کی صورت میں دین کا ایک فریضہ بعض صورتوں میں مطلقاً ساقط قرار پائے گا اور یہ ذمے داری قبول کرنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہے، کیونکہ کسی عبادت کو مطلقاً ساقط قرار دینا شارع کا حق ہے، اگرچہ ظاہری دلائل اس کے حق ہی میں کیوں نہ ہوں۔ اسی لیے بالعموم ''وجوبِ ادا'' کے قول ہی کو اختیار کیا جاتا ہے۔ نیت دل کے ارادے کا نام ہے، اس لیے بہ نیتِ ادا پڑھ لینی چاہیے، حتمی معاملہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر چھوڑ دینا چاہیے۔

چنانچہ ناروے کے مسلمانوں نے تجویز پیش کی کہ آپ حضرات جون کے مہینے میں آئیں اور عملاً قطبِ شمالی میں جاکر حالات کا مشاہدہ کریں اور ایک متفقہ رائے دیں کہ روزے کی سحر وافطار اور پنج وقتہ نمازوں کے لیے اس خطے میں رہنے والے مسلمان کس مقام کے اوقات کو اپنے لیے معیار بنائیں، کیونکہ زندگی کے باقی معمولات یعنی ملازمت وروزگار اور آرام کے لیے ان کے ہاں بھی چوبیں گھنٹے کے دورانیے پر مشتمل ایک دن کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

ناروے میں ایک مقام ایسا بھی ہے، جسے وہ انتہائے عالَم (End of the World) سے تعبیر کرتے ہیں، وہاں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ بھی ایک اعتباری نام ہے، کیونکہ جب زمین گول ہے، تو کسی بھی مقام کو حساب کتاب یا پیمائش وغیرہ کے لیے ابتدا یا انتہا قرار دیا جاسکتا ہے، کہا جاتا ہے کہ ایسا ہی ایک مقام اٹلی میں اور ایک امریکا میں بتایا جاتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

جنگِ عظیم کے دوران ناروے پر حملے کے لیے جرمنی کے بحری جنگی جہاز آتے تھے، تو

ناروے والوں نے ان کے مقابلے کے لیے پہاڑ میں آٹھ منزلہ سرنگ (Tunnel) کھودی اور وہاں سے توپیں پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر جرمنی کے حملہ آور بحری جہازوں پر بمباری کرتے تھے، اب وہ سرنگیں پختہ بنادی گئی ہیں، اُس مقام کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا. جنگِ عظیم میں ناروے پر جرمنوں نے قبضہ کیا اور 1945ء میں جب یہ ملک جرمنی کے قبضے سے آزاد ہوا، تو جو سیاست دان محکومیت یا غلامی کے زمانے میں قابض ملک جرمنی کے حامی بنے تھے، انہیں سزائے موت دی گئی۔ ماضی میں ناروے کافی عرصے تک ڈنمارک کی کالونی رہا، پھر سویڈن کے ساتھ الحاق ہوا اور بالآخر انہوں نے 1905ء میں ایک آزاد مملکت کی حیثیت اختیار کی۔ اِس وقت ناروے اقتصادی اعتبار سے دنیا کی مال دار ترین ریاستوں میں سے پہلے یا دوسرے نمبر پر ہے۔ عالمی سطح پر کسی ملک کو مال دار یا غریب قرار دینے کے لیے اس ملک کی مجموعی سالانہ آمدنی کو مجموعی آبادی پر تقسیم کرتے ہیں اور اس سے فی کس آمدنی (Per Capita Income) نکل آتی ہے اور پھر اسی بنیاد پر ملکوں کی امارت (Richness) کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔

اسکنڈے نیویا کے دیگر ممالک کی طرح ناروے بھی ایک فلاحی ریاست ہے، ہر پیدا ہونے والے بچے کی کفالت ریاست کی ذمے داری ہے اور ہر معذور (Handicap) بچے پر حکومت پاکستانی کرنسی کے اعتبار سے فی کس تقریباً ایک لاکھ روپے سے زیادہ ماہانہ خرچ کرتی ہے۔

31 اکتوبر 2014ء

نومبر 2014ء

مقامِ شہادت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید کی سب سے پہلی سورت ''الفاتحہ'' میں اپنے بندوں کو اپنی بارگاہ میں یوں دعا کرنے کا سلیقہ بتایا:

''(اے اللہ!) ہمیں سیدھی راہ چلا، اُن لوگوں کی راہ جن پر آپ نے انعام فرمایا''۔ (الفاتحہ:5-6)

قرآن مجید کی تفسیر کا سب سے بلند درجہ ''تفسیر القرآن بالقرآن'' ہے، چنانچہ قرآن نے اللہ کے ان انعام یافتہ بندوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''اور جو اللہ اور (اُس کے) رسول کی اطاعت کرے، تو وہ آخرت میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے، جن پر اللہ انعام فرمایا ہے، جو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں اور یہ (سب) کیا ہی عمدہ ساتھی ہیں''۔ (النساء:69)

اللہ تعالیٰ نے اپنی قربت کے جن مقامات کو اپنے خصوصی انعامات سے نوازا ہے، اُن میں شہداء کی جماعت بھی شامل ہے۔ قرآن مجید میں اِسے ''قتل فی سبیل اللہ'' سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا:

(۱) ''اور جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے، اُسے مُردہ نہ کہو، (البقرہ:154)''۔

(۲) ''اور جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیے جائیں اُنہیں مردہ گمان نہ کرو''۔ (النساء:169)

یعنی جس شخص کی ظاہری اور طبی معیار کے مطابق موت واقع ہو چکی، اُسے راہِ خدا میں قتل کر دیا گیا ہو، اُس کو قرآن نے مردہ کہنے اور مردہ گمان کرنے سے بھی منع کرتے ہوئے

فرمایا:

(۳) ''بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں اُن کی زندگی کا شعور نہیں ہے''۔ (البقرہ:154)

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

(۴) ''بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے''۔ (النساء:169)

لفظ ''شہید'' کے معنی ''گواہ'' اور ''حاضر ہونے'' کے ہیں، ''مقتول فی سبیل اللہ'' پر اِس کلمے کے اِطلاق کی معنوی مناسبت یہ ہے کہ شہید زندہ ہوتا ہے اور ظاہری موت کے فوراً بعد اُس کی روح جنّت میں حاضر اور موجود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اُس کے حق میں جنت کی شہادت دیتے ہیں، گویا شہید وہ ہے، جس کے جنتی ہونے کی گواہی دی جائے۔ ایک وجہ مناسبت یہ ہے کہ ظاہری موت کے واقع ہوتے ہی فرشتے اس کی روح کے استقبال اور اِکرام کے لیے حاضر ہوجاتے ہیں، کیوں کہ اس کا ظاہرِ حال اس کے ایمان اور ''خاتمہ بالخیر'' پر گواہ ہوتا ہے۔

اللہ کی مخلوق میں رسالت و نبوت سے بڑھ کر کوئی منصب نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے شہادت کو اعزاز عطا فرماتے ہوئے تکرار کے ساتھ اس کی تمنا فرمائی اور ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے، میں تمنا کرتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں''۔ (بخاری:2797)

رسول اللہ ﷺ سے سوال ہوا: ''ایک شخص دادِ شجاعت پانے کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص (ذاتی یا قبائلی یا گروہی) عصبیت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص نام وَری اور شہرت کے لیے لڑتا ہے، تو اِن میں سے اللہ کی راہ میں لڑنے والا کون ہے؟۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو اس لیے لڑے کہ اللہ کا کلمہ (یعنی اللہ کا دین) غالب آجائے، تو صرف اس کا لڑنا اللہ کی راہ میں شمار ہوگا''۔ (سنن ابن ماجہ:2778)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کے ظاہری معیارات کے اعتبار سے جسم کے ساتھ روح کا

رشتہ قائم رہنا زندگی ہے اور انسان دنیا میں ساری تگ ودو اور جِدّ و جُہد اسی حیاتِ فانی کی بقا اور فلاح کے لیے کرتا ہے، لیکن بہر صورت یہ زندگی فانی ہے اور ایک دن یہ شمع لازمی طور پر بجھ جائے گی، کیوں کہ قانونِ قدرت یہی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”جو بھی اِس (زمین) پر ہے، وہ فنا ہونے والا ہے اور آپ کے رب کی ذات باقی ہے، جو عظمت اور بزرگی والا ہے“۔ (الرحمٰن:27)

اس کے برعکس بندگی کا مرتبۂ کمال یہ ہے کہ دنیا کی ساری نعمتیں یہاں تک کہ متاعِ حیات کو بھی اُس کے نام پر اور اُس کی رضا کے لیے قربان کردیا جائے، جس نے یہ نعمتیں عطا کی ہیں، یہی مرتبۂ کمالِ ایمان ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اور لوگوں میں سے ایک شخص ایسا ہے، جو اللہ کی رضا جوئی کے بدلے میں اپنی جان کو فروخت کردیتا ہے“۔ (البقرہ:207)

یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے وہ جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”مومنوں میں سے کچھ ایسے (وفاشِعار) مرد ہیں، جنہوں نے اللہ سے اپنے کیے ہوئے عہد کو سچا کردکھایا، سواُن میں سے بعض نے (شہید ہوکر) اپنی نذرِ (وفا) پوری کردی اور ان میں سے بعض (اپنی باری کے) مُنتظِر ہیں“۔ (الاحزاب:23)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، (کبھی) وہ (دشمنانِ دین کو) قتل کرتے ہیں اور (کبھی) خود شہید ہوجاتے ہیں، اِس پر تورات، انجیل اور قرآن میں اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہے؟، پس تم اِس بیع کے ساتھ خوش ہوجاؤ جو تم نے (اللہ سے) کی ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے“۔ (التوبہ:111)

اس لیے کبھی تو رشتۂ جان کو قائم رکھنا حیات ہے اور کبھی اس نعمتِ جان کو جاں آفریں کی

رضا کے لیے قربان کر دینا ہی حیاتِ ابدی اور دوامِ حیات ہے، علامہ اقبال نے اسی مفہوم کو اپنے منظوم کلام میں بیان کیا ہے

برتر از اندیشۂ سُود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ اِمروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دَوَاں، ہر دم جواں ہے زندگی

جن کی نظر میں اسی دنیا کی زندگی، یہاں کی عشرتیں، راحتیں اور نعمتیں ہی مقصودِ کل اور مطلوبِ کامل ہیں، اُن کے لیے موت سے آنکھیں چار کرنا ناقابلِ تصور ہوتا ہے، چناں چہ قرآن مجید نے یہود کی اسی نفسیات کی کمزوری کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''(اے رسول!) کہہ دیجیے: اے یہودیو! اگر تمہیں یہ خوش فہمی ہے کہ تمام لوگوں کے سوا تم ہی اللہ کے دوست ہو، پس اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو تو موت کی تمنا کرو (تاکہ جلد اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملو) اور وہ اپنے پہلے سے بھیجے ہوئے کرتوتوں کے سبب کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے''۔ (الجمعہ:07)

دوسرے مقام پر فرمایا:

''آپ کہیے: (اے یہود!) اگر اللہ کے نزدیک اور لوگوں کی بجائے دارِ آخرت خالص تمہارے لیے ہے، پس اگر تم (اپنے اس دعوے میں) سچے ہو تو موت کی تمنا کرو، (قرآن نے پیشین گوئی کی) اور وہ جو اعمال پہلے کر چکے ہیں، اُن کی وجہ سے وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے اور آپ تمام لوگوں اور مشرکین سے بھی زیادہ انہیں زندگی کا ضرور دل دادہ پائیں گے، ان میں سے ہر ایک یہ خواہش رکھتا ہے کہ کاش اس کی عمر ہزار سال ہو جائے۔ اور اگر یہ عمر اسے دے بھی دی جائے تو یہ اس کو عذاب سے دور کرنے والی نہیں ہے''۔ (البقرہ:96)

علامہ اقبال نے حیاتِ ابدی کے اسی تصور کو اور زیادہ وضاحت سے بیان کیا:

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

جب محرم الحرام کا مہینا آتا ہے تو آج سے 1375 سال قبل دس محرم الحرام سن اکسٹھ ہجری میں امام عالی مقام حسین، آپ کے اہلِ بیتِ اَطہار اور اَعوان وانصار رضی اللہ عنہم کی عظیم اور بے مثال قربانیوں اور شہادتوں کی یاد ہر مسلمان کے دل میں تازہ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں عزیمت واستقامت اور ایثار وقربانی کے جتنے عنوانات اور دینِ حق کی سربلندی کے لیے ابتلاوآزمائش کی جتنی بھی صورتیں انسان کے حاشیۂ خیال میں آسکتی ہیں، کربلا والوں نے ان سب کا سامنا کیا اور اللہ تعالیٰ کے حضور سرخ رُو رہے اور قیامت تک کے لیے عزیمت واستقامت کی ایک لازوال داستان سرزمین کربلا پر اپنے خون سے رقم کر گئے۔ مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ محبتِ حسین کے دعوے دار بھی بہت ہیں اور یا حسین کا نعرہ لگانے والی بھی بے شمار، مگر اَقدارِ حسین کا اِحیا کرنے والے اور شِعارِ حسین پر مر مٹنے والے کم ہیں۔ اُس یزید کو، جو آج سے پونے چودہ سو سال پہلے ہو گزرا، کوسنے والے اور ملامت کرنے والے تو بہت ہیں، لیکن آج کی یزیدی اَقدار کو چیلنج کرنے والے کم یاب بلکہ نایاب ہیں، اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا:

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار اب بھی گیسوئے دجلہ وفرات

اور انھوں نے پیغام دیا کہ:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری

3 نومبر 2014ء

عصبیتِ جاہلیہ کا مُہلِک مرض

عربی زبان میں ''عصب'' کے معنی ہیں: ''مضبوطی سے باندھنا''، ''عُصبَہ'' اور ''عِصابہ'' ایک مضبوط جماعت کو کہتے ہیں، جیسا کہ برادرانِ یوسف نے کہا تھا: ''یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہیں، حالانکہ ہم پوری جماعت (عُصبَہ) ہیں''۔ (یوسف:08)

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

''عصبیت یہ ہے کہ ایک شخص کو اپنی قوم (یا گروہ) کی مدد کے لیے بلایا جائے تا کہ وہ ان کے ساتھ مل کر ان کے مخالفین کے مقابل صف آرا ہو، اس بات سے قطعِ نظر کہ مخالفین ظالم ہیں یا مظلوم؟''۔ (لسان العرب، جلد:10، ص:167)

یعنی حق اور ناحق سے آنکھیں بند کر کے اپنی قوم یا گروہ کی حمایت کے لیے بلایا جائے۔ باپ کی طرف سے اَقارب کو بھی ''عَصَبَہ'' کہتے ہیں، کیونکہ وہ مشکل میں مددگار بنتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی درج ذیل احادیثِ مبارکہ میں عصبیت کی حقیقت کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے:

(۱) ''جو گمراہی کے جھنڈے تلے لڑا کہ عصبیت کی طرف بلا رہا ہے یا عصبیت کی بنیاد پر غضب ناک ہو رہا ہے، تو یہ جاہلیت کا لڑنا ہے''۔ (سنن ابن ماجہ:3948)

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: ''یا رسول اللہ! ایک شخص اپنی قوم سے محبت کرتا ہے

کیا یہ عصبیت ہے؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ عصبیت یہ ہے کہ ایک شخص ظلم میں اپنی قوم کی مدد کرے"۔ (سنن ابن ماجہ:3949)

(۳) واثلہ بن اسقع نے دریافت کیا: "یا رسول اللہ! عصبیت کیا ہے؟، فرمایا: عصبیت یہ ہے کہ تو ظلم میں اپنی قوم کا مددگار بن جائے"۔ (سنن ابوداؤد:5048)

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا: "تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے قبیلے کا دفاع کرے، بشرطیکہ یہ حمایت گناہ کا سبب نہ ہو"۔ (سنن ابوداؤد:5079)

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص ناحق بات پر اپنی قوم کی مدد کرے تو اس کی مثال اُس اونٹ کی سی ہے، جو گہرے گڑھے میں گر چکا ہے اور اسے اُس کی دم پکڑ کر نکالا جارہا ہے"۔ (سنن ابوداؤد:5076)

(٦) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جس نے عصبیتِ (جاہلیہ) کی طرف بلایا، وہ ہم میں سے نہیں اور جو شخص عصبیتِ (جاہلیہ) کی خاطر لڑا وہ ہم میں سے نہیں اور جو شخص عصبیتِ (جاہلیہ) پر مرا، وہ ہم میں سے نہیں"۔ (سنن ابوداؤد:5080)

ان احادیثِ مبارکہ سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ناحق اور ظلم پر اپنی قوم، قبیلے یا گروہ کی حمایت عصبیتِ جاہلیہ ہے۔ اور یہی وہ خصلت ہے جو انسان کو ظلم پر آمادہ کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی قوم یا گروہ کی اس حد تک بے جا حمایت سے منع فرمایا کہ جس کے نتیجے میں ظلم کو روا سمجھا جائے، قرآن مجید میں فرمایا: "اور کسی کی عداوت تمہیں ترکِ انصاف پر نہ ابھارے"۔ (المائدہ:08)

اور فرمایا: "اور کسی کے ساتھ عداوت تمہیں اس پر نہ اکسائے کہ (اپنے غلبے کے زمانے میں) اُنہوں نے تمہیں مسجد حرام میں آنے سے روک دیا تھا کہ (اب اُن پر غلبہ پانے کے بعد) تم بھی اُن کے ساتھ زیادتی کرو، تم نیکی اور تقوے پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے"۔ (المائدہ:02)

ان آیات واحادیث مبارکہ میں جہاں ظلم وزیادتی پر اپنی قوم، قبیلے یا گروہ کی حمایت کو "عصبیتِ جاہلیہ" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی مذمت فرمائی گئی ہے، وہاں خیر اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد اور ظلم وعدوان کے خلاف صف آرا ہونے کی ترغیب بھی دی گئی ہے اور اس کی تحسین بھی فرمائی گئی ہے۔ اسی طرح تعصُّب بلاشبہ قابلِ مذمت ہے، لیکن دین پر تصلُّب یعنی مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا ایک قابلِ تحسین وصف ہے اور دونوں میں فرق کو ہر صورت ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یعنی ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکنا درست نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے تعصب کی مذمت کو انتہا پر پہنچاتے ہوئے قرآن مجید میں جس شجر کے قریب جانے سے حضرت آدم وحوّا علیہما السلام کو منع کیا تھا، اسے بھی فرقہ واریت سے استعارہ قرار دے دیا، اگرچہ یہ معنی اجماعِ مفسرین کے خلاف ہے، وہ لکھتے ہیں:

شجر ہے فرقہ واریت، تعصّب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

ہمارے ملک میں جب بھی دہشت گردی کا کوئی واقعہ ہوتا ہے، تو اس کا رُخ فرقہ واریت کی طرف موڑ دیا جاتا ہے اور الیکٹرونک میڈیا میں اس پر مکالمہ شروع کر دیا جاتا ہے، میں ان مکالموں میں شریک ہوتا رہا ہوں اور دوٹوک شرعی موقف ہر بار بیان کیا، مگر اس کے باوجود ہر بار علماء سے رجوع کرنے کا ایک معنی یہ بھی نکلتا ہے کہ فرقہ واریت کے فروغ میں شاید علماء ہی کا حصہ ہے۔ اسی لیے میں اب اس طرح کے مکالموں اور تبصروں سے اجتناب کرتا ہوں۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ سب کا دامن پاک ہے تو پھر ذمے دار کون ہے؟۔

مزید یہ کہ عصبیت کی مذمّت کا دائرہ مذہب تک محدود نہیں رکھنا چاہیے، کیا یہ درست نہیں ہے کہ ہمارے ہاں سیاسی عصبیت اب مذہبی عصبیت سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔ ہر جماعت (خواہ وہ اقتدار میں ہو یا حزبِ اختلاف میں) کے منتخب ممبران، اراکین وعہدیداران اور ارکان کی حیثیت سیاسی مزارعین کی سی ہے، وہ آنکھیں بند کر کے اور حق اور ناحق سے

بے نیاز ہوکر اپنی قیادت کی حمایت پر کمر بستہ ہوجاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں حق اور ناحق اور عدل وظلم کے معیارات اور پیمانے جدا جدا ہیں۔ ایسے ماحول میں حق اور عدل کی حیثیت ثانوی ہوجاتی ہے۔ سب اپنے اپنے شعبوں میں اپنی اپنی عصبیتوں، پسند وناپسند اور ترجیحات کا شکار ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ دوسروں کو ہدف بنانا آسان ہوتا ہے اور اپنے گریبان جھانکنا مشکل، بلکہ بہت مشکل ہوتا ہے۔

پس حق یہ ہے کہ ہر مکتبۂ فکر یا گروہ کے لیے اپنے انتہا پسندوں کی تعیین کے ساتھ مذمت انتہائی دشوار ہے، اس لیے ہمارے خطابات اور تقریریں بھی تاثیر سے عاری ہوتی ہیں اور ہماری مذمتیں بھی ہوا میں ایسے تیر چلانے کے مترادف ہوتی ہیں، جن کا ہدف متعین نہیں ہوتا۔ اور سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کے مِصداق سب اپنی ذمے داری سے عہدہ برا ہوجاتے ہیں۔ اسلام آباد میں ایک این جی او نے آئینی وقانونی حکومت کے خلاف خروج یا بغاوت کے موضوع پر کئی سیمینار منعقد کیے، تمام مکاتبِ فکر کے علماء اور دیگر اہلِ علم اور دانش وَروں کو بلایا، پھر سب کی منتخب نگارشاتِ قلم کو ایک کتابی شکل میں مدوّن کیا۔ میں نے اُن سے گزارش کی کہ یہ مجرّد اور غیر اِطلاقی حکم اور موقِف تو آپ نے نقل کردیے اور بلاشبہ آپ کی یہ علمی اور فکری مساعی قابلِ تحسین ہیں۔ اب ذرا ایک نشست میں ان سب کو بلا کر ہماری یہ بھی رہنمائی فرمادیں کہ ہمارے ملک کے تناظر میں حکومت سے متصادم، برسرِ پیکار اور خروج وبغاوت پر آمادہ عناصر کا حکم کیا ہے؟ صرف اسی صورت میں اس ساری علمی اور فکری کاوش کا کوئی عملی نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے، ورنہ جو کچھ اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے، وہ ہمارے دینی اور علمی ذخیرے میں نہایت بسط وتفصیل کے ساتھ پہلے سے موجود ہے، سو خطاب وبیان اور مجرد ومطلق تحریر تو آسان ہے، لیکن اپنے حالات پر انطباق (Application) کارے دارد ہے، یعنی از حد دشوار ہے۔

آج بھی اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ بعض دینی، ملّی اور ملکی امور کے بارے میں قوم یکسو ہو، ہمارے لیے مشکل یہ ہے کہ مذہبی خلافیات کو تو سب ہی کوستے رہتے ہیں اور

ہدفِ ملامت بناتے ہیں، لیکن یہی صورتِ حال ہمارے ملّی، ملکی اور قومی مسائل کی ہے۔ ہمارا کوئی متفقہ ترجیحی مرتب شدہ قومی ایجنڈا نہیں ہے۔

اتوار کو لاہور میں المناک سانحہ رونما ہوا، یہ امر مسلّم ہے کہ اس طرح کے سانحات کا سو فیصد سدِ باب مشکل ہے، لیکن اس سانحے نے سب کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور اب پوری سیاسی و دینی قیادت اور قوم کو ذہنی طور اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ قبائلی علاقہ جات میں برپا کیے جانے والے آپریشن ''ضربِ عضب'' کے ردِّ عمل میں جوابی یا انتقامی کارروائیاں ہوسکتی ہیں، اس لیے داخلی اختلافات کو سرِ دست کم سے کم کر کے یا پسِ پشت ڈال کر اس ممکنہ صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری قوم کو متحد اور منظم کرنا نہایت ضروری ہے۔

4 نومبر 2014ء

ہمارے اعداد و شمار

آج کل جدید دنیا کے ممالک اور اَقوام اپنی منصوبہ بندی اور ترقی کا مدار اعداد و شمار (Statistical Data) پر رکھتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں تو کم و بیش ہر شہری کے بارے میں مطلوبہ معلومات کہیں نہ کہیں محفوظ ہوتی ہیں اور کسی جرم یا قانون شکنی کے ارتکاب کی صورت میں سارا ریکارڈ چھن کر سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح امریکا میں صدارتی امیدوار کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا جاتا ہے اور بعض اوقات امیدواروں کو مقابلے سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، کیونکہ ان کے ہاں دیانت و امانت، جنسی آوارگی اور اخلاقیات کے حوالے سے قیادت کے منصب پر فائز ہونے والے کے لیے معیارات نہایت سخت ہوتے ہیں، اس حوالے سے میڈیا بھی بے رحم ہوتا ہے اور قوم بھی کسی رُو رعایت کی رَوادار نہیں ہوتی۔ الغرض جو باتیں عام زندگی میں عام آدمی کے لیے معیوب نہیں سمجھی جاتیں، قومی رہنمائی کے منصب پر فائز ہونے والے کے لیے اُن میں بھی کوئی رعایت نہیں برتی جاتی۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں معاملہ یکسر مختلف ہے۔

اَقوام اور ممالک درست اعداد و شمار کی بنیاد پر اپنا حال بھی مُنظم کرتے ہیں اور مستقبل کی بھی بہتر منصوبہ بندی کرتے ہیں، یورپین یونین کے ممالک کا ایک مشترکہ فورم یا ڈھیلے ڈھالے وفاق (Confederation) کی ایک صورت ہے، وہ پورے یورپ کو ایک مشترکہ منڈی (Common Market) اور مربوط معیشت کی صورت میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ یورپین یونین کے بجٹ سے مختلف رکن ممالک کے پسماندہ علاقوں،

شہروں اور قصبات کے لیے خصوصی اعانتی فنڈ مخصوص کیے جاتے ہیں تاکہ کم از کم بنیادی شہری سہولتیں سب کو حاصل ہوں۔ چونکہ اکثر یورپی ممالک اپنی آبادی کے لحاظ سے اور بعض اپنے رقبے کے لحاظ سے چھوٹے ہیں، اس لیے شاید وہ اپنی اجتماعیت، اجتماعی قوت وصلاحیت اور امکانات (Potentials) کو امریکا کے مقابل لانا چاہتے ہیں۔

اس موضوع کی طرف میرا ذہن اس لیے متوجہ ہوا کہ آئے دن ہم اخبارات اور الیکٹرونک میڈیا پر ذیابیطس، کینسر، اَمراض قلب و دماغ اور نفسیاتی عوارض کے حوالے سے اعداد و شمار پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی اعداد و شمار شرحِ خواندگی (Literacy Ratio) اور ناخواندگی کے حوالے سے اور غربت (Poverty) و اِمارت کے حوالے سے پڑھنے اور سننے کو ملتے ہیں۔ یہی صورتِ حال آبادی کے اعداد و شمار کی ہے۔ کراچی کی آبادی کے تخمینے ڈیڑھ کروڑ سے شروع ہوتے ہیں اور دو کروڑ سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ ہمارے سالانہ بجٹ اور مالیاتی وصول یابیوں (Revenue Recoveries) کی صورتِ حال بھی چنداں مختلف نہیں ہے۔ ماضی میں ہم عالمی مالیاتی اداروں آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کو غلط مالیاتی اعداد و شمار پیش کرنے پر جرمانے بھی ادا کر چکے ہیں۔

الغرض ہمارے کسی بھی شعبے کے بارے میں درست یا اُس سے قریب تر اَعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں، نہ ہی ہمارے ہاں مختلف شعبوں کے بارے میں درست ڈیٹا مرتب کرنے کا کوئی سائنٹیفک نظام موجود ہے۔ ہمارے پاس تو پولیو، ڈینگی اور ملیریا کے بارے میں بھی صحیح معلومات نہیں ہیں، ہمیں انہی معلومات پر انحصار کرنا ہوتا ہے جو عالمی میڈیا یا عالمی ادارے ہمیں فراہم کرتے ہیں۔ بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارے ہاں مردم شماری (Census) بھی باقاعدگی سے ہر دس سال کے بعد نہیں ہو پارہی، جو مردم شماری 2000ء میں ہونا تھی، وہ 2014ء کے اختتام تک بھی نہیں ہو پائی اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ 2020ء تک بھی ہو پائے گی یا نہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم ذمے دار قوم نہیں بن پا رہے، ہم ایک دوسرے کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے، ایک دوسرے کو دھوکا دینا اور

دھوکا کھانا ہمارا شعار بن چکا ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

"مومن نہ دھوکا دیتا ہے اور نہ دھوکا کھاتا ہے"۔

اسی طرح جھوٹ کو بھی ہم نے ایک شعار کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ آپ جلسوں، ریلیوں اور دھرنوں کے بارے میں اعداد و شمار کے مختلف اور متضاد دعوے سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں۔ ایک ہی جلسے کے شرکاء کی تعداد پچیس تیس ہزار سے لے کر دو لاکھ یا بعض اوقات ملین تک بتائی جاتی ہے، کون سچا اور کون جھوٹا ہے، کسی کو خبر نہیں اور نہ ہی خوفِ خدا ہے۔ اس اِعزاز یعنی تعداد کی تقلیل (Minimizing) اور تکثیر (Multiplication) میں پارسا اور پاپی سب شامل ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا: (یارسول اللہ!) کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! پھر سوال ہوا: کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں، پھر سوال ہوا: کیا مومن جھوٹا ہوسکتا ہے؟، فرمایا: نہیں"۔ (شُعَب الایمان للبیہقی: 4732)

جب 2013ء کے قومی انتخابات کے لیے رائے دہندگان کی فہرست (Voters List) نادرا کے ذریعے مرتب کی گئی تو جماعتِ اسلامی کی کراچی کی قیادت نے اس میں گھپلوں کا واویلا کیا۔ دوسری جانب نادرا نے میڈیا کے ذریعے اپنے ووٹ کے اندراج کی تصدیق کا ذریعہ بتایا۔ میں نے اس کے مطابق اپنے ووٹ کی تصدیق کی، تو جواب مثبت مل گیا۔ اس دوران جماعتِ اسلامی کے ذمے داران سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں اپنا تجربہ بتایا اور ان سے کہا کہ آپ لوگ اتنا واویلا کیوں کر رہے ہیں؟۔ انہوں نے بتایا کہ کراچی کے تین تا چار لاکھ ووٹ اِدھر اُدھر کر دیے گئے ہیں۔ میں نے اُن سے پوچھا: وہ کیسے؟۔ انہوں نے بتایا کہ بہت سے لوگ کراچی میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہیں، لیکن روایتی طور پر وہ اپنے شناختی کارڈ پر ایک رہائشی پتا اور ایک مستقل پتا لکھواتے ہیں، سو جن کے شناختی کارڈ پر مستقل پتا کراچی کے علاوہ کہیں اور کا درج تھا، ان کو کراچی کی ووٹرز لسٹ سے نکال دیا گیا اور بعض جو اِس زد میں نہیں آتے تھے، ووٹرز لسٹ میں ان کے نام ان کے

رہائشی حلقوں سے نکال کر دوسرے حلقے میں ڈال دیے گئے ہیں۔ پھر جب ووٹر لسٹ کی تصدیق کے لیے کچھ سرکاری اہلکار ہمارے مکان پر آئے تو ہمارے گھر میں دو مردانہ اور دو خواتین کے ووٹ تھے، لیکن نہ مردانہ ووٹ فہرست میں ایک ساتھ تھے اور نہ ہی خواتین کے۔ اسی طرح ووٹر زلسٹ میں مکانات بھی صحیح ترتیب کے مطابق نہیں تھے۔

سو اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ہم سچ بولیں اور سچ کو مانیں، ایک دوسرے کو دھوکا بھی نہ دیں، ایک قوم بنیں اور قوم کے ہر فرد کو وہ جہاں کہیں بھی ہے، اپنا سمجھیں اور اس حقیقت کو دل و جان سے قبول کریں کہ ہماری آن، ہماری شان، ہماری پہچان اور ہماری بقا پاکستان سے وابستہ ہے۔ ہماری اور پاکستان کی ترقی لازم و ملزوم ہے۔ اور لازم ہے کہ نہایت شفاف طریقے سے اور پوری دیانت داری کے ساتھ مردم شماری کی جائے تا کہ مالیاتی وسائل کی تقسیم انصاف پر مبنی ہو اور ہم اپنے حال اور مستقبل کی ضروریات کا صحیح اندازہ لگا سکیں، اس کے بغیر حقیقی منصوبہ بندی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے بڑے شہروں کا بنیادی ڈھانچہ (Infrastructure) اتنی آبادی کے لیے نہیں تھا، جو اَب ہے۔ اس لیے ایک نئے وژن کے ساتھ وسائل کے اندر رہتے ہوئے بتدریج بجلی کی ترسیل، پانی کی سپلائی لائنوں اور سیوریج لائنوں کی Upgradation کی ضرورت ہے۔ اسی طرح الیکشن کمیشن یا نادرا پر لازم قرار دیا جائے کہ جس علاقے کی فہرست مرتب کریں، اس علاقے کے مکانات کی واقعاتی ترتیب کے مطابق کریں اور اس کے لیے وہ متعلقہ ادارے مثلاً ڈی ایچ اے، سی ڈی اے، بحریہ ٹاؤن، ایل ڈی اے، کے ڈی اے اور ہاؤسنگ کے دیگر اداروں سے ان کے نقشے طلب کریں اور اُن کے مطابق رائے دہندگان کی فہرستیں مرتب کریں تا کہ ہر ایک کو اپنا نام تلاش کرنے اور حلقۂ انتخاب اور پولنگ اسٹیشن معلوم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

پاکستان میں دنیا کے کسی بھی حصے سے کوئی بھی شخص آ کر بلا روک ٹوک رہ سکتا ہے، جائیداد خرید سکتا ہے، شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں بالعموم

قانونی ذرائع سے جائز کام کرانا دشوار ہوتا ہے، جب کہ غیر قانونی ذرائع سے غیر قانونی کام کرانا آسان ہے۔ قانون اور قانون نافذ کرنے والے ادارے غیر مؤثر ہو چکے ہیں اور حالیہ سیاسی بحران نے تو اس مسئلے کی سنگینی کو اور نمایاں کر دیا ہے۔ جب بزعمِ خویش نیا پاکستان بنانے والی قیادت اپنے حامیوں کے ساتھ پولیس تھانوں پر چڑھائی کر کے حوالات سے لوگوں کو زورِ بازو اور دہشت سے چھڑا کر لے جائے گی اور میڈیا اس کی رواں کوریج کرے گا، تو پھر کیسی حکومت اور کیسا نظام؟۔ چند دانوں سے ہی چاول کی پوری دیگ کا پتا چل جاتا ہے اور ذہن میں یہ خدشات جنم لیتے ہیں کہ کیا موعود (Promised) یا مزعوم (Supposed) نئے پاکستان میں یہی نظام ہوگا۔

8 نومبر 2014ء

STATUS QUO

''اسٹیٹس کو'' کے عربی لغت میں معنی ہیں ''اَبْقٰی عَلٰی حَالَۃِ مَاقَبْل''، یعنی کسی چیز کو پہلی حالت پر برقرار رکھنا یا حالات کو جوں کا توں رکھنا۔ انسانی تاریخ میں Status Quo کی حامل قوتوں نے یا نظمِ اجتماعی سے مُراعات یافتہ طبقات نے کبھی بھی تبدیلی کی قوتوں کے آگے آسانی سے سرِ تسلیم خم نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ بھرپور مزاحمت کی۔ انبیائے کرام اور رُسُلِ عظام علیہم السلام اپنے اپنے عہد کے کفر و شرک اور باطل کے مقابل تبدیلی کے علم بردار تھے اور اسی لیے ان کی شدید مزاحمت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ''اور جب اُن (مشرکینِ مکہ) سے کہا جاتا ہے: اس دین کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول (کی شریعت) کی طرف آؤ تو وہ کہتے ہیں: ہمارے لیے وہی شِعارِ (زندگی) کافی ہے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، خواہ اُن کے باپ دادا کسی چیز کا علم نہ رکھتے ہوں اور ہدایت سے عاری ہوں''۔ (المائدہ:104)

(۲) ''جب (ابراہیم علیہ السلام) نے اپنے (عرفی) باپ اور اپنی قوم سے کہا: یہ کیسی مورتیاں (بت) ہیں، جن کی پرستش پر تم جمے ہوئے ہو؟ تو انہوں نے کہا: ہم نے اپنے باپ دادا کو اِنہی (بتوں) کی عبادت کرتے ہوئے پایا تھا''۔ (الانبیاء:53-52)

(۳) ''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اُن احکام کی پیروی کرو جن کو اللہ نے نازل کیا ہے، تو وہ کہتے ہیں: بلکہ ہم اِسی طریقے کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، خواہ شیطان اُن کو دوزخ کے عذاب کی طرف بلا رہا ہو''۔ (لقمان:21)

الغرض ہر دور میں Status Quo کے علم بردار تبدیلی کے آگے سدِّ راہ بن کر کھڑے ہوگئے اور حق کے علم برداروں کا ہر قیمت پر راستہ روکنے کی کوشش کی، چنانچہ روایات میں آیا ہے کہ قیامت کے دن بعض انبیائے کرام کے پیروکار چند نفوس پر مشتمل ہوں گے۔ پھر عام طور پر اپنے اپنے عہد کے فارغ البال اور خوش حال طبقات اور خاص طور پر اس نظام کے مُستفیدین (Beneficiaries) اور مراعات یافتہ طبقات نے تبدیلی کو اپنے مفادات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا اور ہر قیمت پر اُسے ناکام بنانے کی کوشش کی۔

بالعموم دَرماندہ، پسے ہوئے اور مظلوم طبقات (Oppressed Class) نے تبدیلی کو خوش دلی سے خوش آمدید کہا، چناں چہ جب رسول اللہ ﷺ کا مکتوبِ گرامی لے کر حضرت دِحیہ رضی اللہ عنہ قیصرِ روم ہرقل کے دربار میں گئے، تو ہرقل نے اپنے درباریوں سے کہا کہ اِن کی قوم کا کوئی فرد ہے، جس سے حقائق معلوم کیے جائیں۔ چنانچہ ابوسفیان، جو تجارت کی غرض سے شام گئے ہوئے تھے، کو چند افراد کے ہمراہ شاہی دربار میں بلایا گیا۔ اس موقع پر ابوسفیان اور قیصر کے درمیان حضرت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں مندرجہ ذیل مکالمہ ہوا:

قیصر: ان کا خاندان کیسا ہے؟۔

ابوسفیان: یہ عرب کے شریف ترین خاندان (بنو ہاشم) کے فرد ہیں۔

قیصر: کیا ان کے اَسلاف میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟۔

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: ان کے پیروکار غریب لوگ ہیں یا دولت مند؟۔

ابوسفیان: غریب اور زیریں طبقات کے لوگ ہیں۔

قیصر: اِن کے ماننے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟۔

ابوسفیان: بڑھ رہی ہے۔

قیصر: کیا ان کا دین قبول کرنے کے بعد کوئی شخص ان کے دین سے بیزار ہو کر مرتد بھی ہوا ہے؟۔

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: نبوت کے دعوے سے پہلے کیا لوگ ان پر جھوٹ بولنے کا الزام بھی لگاتے تھے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: کیا انہوں نے کبھی کسی سے عہد شکنی کی ہے؟۔

ابوسفیان: اب تک نہیں کی۔

قیصر: کیا تمہاری آپس میں کبھی جنگ بھی ہوئی ہے؟۔

ابوسفیان: ہمارے درمیان جنگیں ہوئی ہیں۔

قیصر: ان کا نتیجہ کیا نکلا؟۔

ابوسفیان: کبھی وہ غالب آئے اور کبھی ہم۔

قیصر: وہ تمہیں کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟۔

ابوسفیان: وہ ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، وہ ہمیں نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، صدقہ کرنے، سچ بولنے، عفت اور صلۂ رحمی کا حکم دیتے ہیں۔

ان سوالات وجوابات کے بعد ہرقل نے یہ تبصرہ کیا:

''میں نے تم سے پوچھا کہ کیا تم میں سے کسی اور نے یہ بات کہی ہے، یعنی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ تم نے کہا: نہیں۔ میں نے خیال کیا: اگر ان سے پہلے کسی اور نے یہ دعویٰ کیا ہوتا، تو میں سمجھتا کہ یہ شخص اُس کی اقتدا کر رہا ہے۔ میں نے تم سے پوچھا: اُن کے آباواجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟ تم نے کہا: نہیں۔ میں نے خیال کیا کہ اگر اُن کے آباواجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہوتا، تو میں یہ گمان کرتا کہ وہ بادشاہت کو حاصل کرنے کے لیے یہ دعویٰ کر رہا ہے۔ تم نے بتایا: اُن پر کبھی جھوٹ بولنے کا الزام نہیں لگا، تو مجھے یقین ہو گیا کہ جو شخص

لوگوں پر جھوٹ نہیں بولتا، وہ اللہ کے بارے میں کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔ تم نے بتایا: کمزور لوگ اُن کی پیروی کر رہے ہیں اور اللہ کے رسولوں کی پیروی ابتدا میں ہمیشہ کمزور لوگوں نے ہی کی ہے۔ تم نے بتایا: ان کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے اور حق کے مشن کی روایت یہی رہی ہے۔ تم نے بتایا کہ: ان کے دین میں داخل ہونے کے بعد کوئی مرتد نہیں ہوا، یعنی ان کے دین سے پھرا نہیں اور اہلِ ایمان کا حال ہمیشہ یہی رہا ہے۔ ایک دفعہ ایمان جس دل میں گھر کر جائے، پھر اس سے نکلتا نہیں ہے۔ تم نے بتایا کہ: وہ اللہ کی عبادت کا حکم دیتے ہیں، شرک سے روکتے ہیں، نماز، روزہ اور صدقے کا حکم دیتے ہیں، سچائی کی تلقین کرتے ہیں اور پاک دامنی اور صلۂ رحمی کا حکم دیتے ہیں۔ سو اگر تمہارا بیان سچا ہے، تو مجھے یقین ہے کہ عنقریب وہ میرے اِن دونوں قدموں کی جگہ کے بھی مالک بن جائیں گے اور پھر عہدِ فاروقی میں ایسا ہی ہوا۔

اس عنوان پر میں نے گفتگو اس لیے شروع کی کہ آج کل حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے مابین جاری سیاسی کشمکش میں ایک فریق دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ Status Quo کو بدلنے آیا ہے اور Status Quo کی حامی سیاسی قوتیں اُس کی حریف ہیں۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ تبدیلی کے وہی علم بردار اور دعوے دار اپنے مشن میں سرخ رُو رہے ہیں، جن کا ظاہر و باطن اور گرد و پیش اُن کے دعوے سے مطابقت رکھتا ہو، ورنہ جب انسان کا اپنا کردار اس کے دعوے کی اور اپنا فعل اس کے قول کی تردید کر رہا ہو، تو پھر مجرد دعوے سے تبدیلی نہیں آتی۔

ہم جو منظر دیکھ رہے ہیں، وہ تو یہی ہے کہ تبدیلی کے دعوے داروں کے گرد و پیش وہی لوگ ہیں جو Status Quo کے نمائندے ہیں اور ماضی میں بھی وہ Status Quo کی حامی قوتوں یا اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ رہے ہیں۔ اور ہمارے پاس اُن کی قلبِ ماہیت (یعنی نظریات کی تبدیلی) کے کوئی شواہد نہیں ہیں۔

مثلاً: ہم کنٹینر سے سنتے ہیں کہ نئے پاکستان میں نظامِ تعلیم کو ایک کر دیا جائے گا اور

برابر میں جناب خورشید قصوری نظر آتے ہیں کہ ان کا پورے پاکستان میں بیکن ہاؤس اسکول سسٹم ہے اور شنید ہے کہ ان کی بہن کا سٹی اسکول کا نیٹ ورک ہے، جہاں پہلی اور دوسری کلاس کے بچے سے اوسطاً پندرہ ہزار روپے ماہوار لیے جارہے ہیں۔ ڈاکٹر اظہر جدون جو تحریک انصاف کے ایم این اے ہیں، ان کا ایبٹ آباد میں وومن میڈیکل کالج ہے، جہاں فی طالبہ اوسطاً دس لاکھ روپے سالانہ لیے جارہے ہیں۔ اِسی طرح کے اداروں کا ایبٹ آباد میں اور صوبۂ خیبر پختونخوا کے دیگر علاقوں میں جال بچھا ہوا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صوبۂ خیبر پختونخوا کی ڈیڑھ سالہ حکومت میں اِس حوالے سے کوئی تبدیلی آئی ہے؟۔ کیا یہ لوگ اپنے مفادات کو قربان کرنے کے لیے سیاست میں حصہ لے رہے ہیں، یہ تو تعلیم کے بہت بڑے کاروباری ہیں۔ اور اس وقت ہمارے ملک میں سب سے بڑی منفعت بخش صنعت تعلیم ہی کی ہے اور اس پر ریاست وحکومت کی طرف سے کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں ہے۔ آج نام وَر (Prestigious) پرائیویٹ کالجوں اور جامعات میں جتنی ماہانہ فیس دے کر طلبہ اور طالبات پڑھ رہے ہیں، کیا ان کو تعلیم سے فراغت کے بعد اس سے آدھی یا چوتھائی ماہانہ تنخواہ کی بھی کوئی گارنٹی ہے؟۔

جب ہم یہ حقائق کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور بیان کرتے ہیں تو بہت سے ہمارے معزز کالم نگار ناگواری کا اظہار کرتے ہیں کہ گویا ہم تبدیلی کے مخالف ہیں۔ حاشا وکلّا! ہم تبدیلی کے حامی ہیں، تبدیلی کے حق میں ہیں، لیکن تبدیلی کے کچھ شواہد اور آثار وعلامات بھی نظر آنی چاہییں، تاکہ لوگ شرحِ صدر کے ساتھ اور دل وجان کے ساتھ اُس کی حمایت کرسکیں اور حال یہ ہے کہ آپ تنقید سننے کے رَوادار نہیں ہیں اور سابق امریکی صدر جارج ہربرٹ بش کے ڈاکٹرائن کو اپنائے ہوئے ہیں کہ تم یا تو ہمارے دوست بنو یا دشمن؟، یعنی بیچ کا راستہ کوئی نہیں ہے۔

10 نومبر 2014ء

لِلّٰہ! پاکستان پر رحم فرمایئے!

مانا کہ ترقی درجات (Rating) رہنمایانِ سیاست وصحافت کی ضرورت ہے، مُسابقت (Competetion) اُن کی مجبوری ہے اور قبولِ عام ہونا (Popularity) اُن کی خواہش ہے، اِن خواہشات وحاجات کے حصول کے لیے وہ جہاں تک جاسکتے ہیں، ضرور جائیں۔ اپنے دل میں خواہشات پالنا ہر ایک کا حق ہے، غالب نے کہا تھا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دَم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں، لیکن پھر بھی کم نکلے

لیکن نہایت اَدب کے ساتھ گزارش ہے کہ: لِلّٰہ! پاکستان پر رحم فرمایئے۔ ہم ایک خود ملامتی (Self Blaming) قوم بنتے جارہے ہیں اور دنیا کے سامنے اپنی رسوائیوں کو مُشتہر کرنا ہمارا مَن پسند مَشغلہ ہے، یہی ہماری ہیڈ لائن نیوز اور بریکنگ نیوز ہوتی ہیں۔

کوٹ رادھا کشن کا واقعہ بلاشبہ انتہائی تکلیف دِہ ہے اور اذیّت ناک ہے، یہ یقیناً ایک سنگین انسانیت دُشمن جرم ہے اور اسلام کی مُسلّمہ تعلیمات واَقدار کے خلاف ہے، اِن جیسے واقعات سے عالمی سطح پر پاکستان کی رُسوائی ہوتی ہے۔ لیکن ہم اِس طرح کے واقعات کو ایک خاص رُخ دے دیتے ہیں کہ گویا پاکستان میں غیر مسلموں کے خلاف کوئی نفرت انگیز مُہم جاری ہے اور یہ اُسی کا شاخسانہ ہے، حاشا وکلّا ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ اُسی طرح کا انسانیت دُشمن جرم ہے، جیسا اُس سے چند دن پہلے واہگہ بارڈر پر رُونما ہوا اور ایک خودکُش یا ریموٹ کنٹرول بم بلاسٹ کے ذریعے ساٹھ سے زائد افراد کو موت کی نیند سلا دیا

گیا اور درجنوں شدید زخمی ہیں اور زیرِ علاج ہیں۔ اگر یہ بے قصور انسانوں کو آتشیں اسلحہ سے بھسم کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟۔

پس میری گزارش ہے کہ اس طرح کے تمام سانحات کو پاکستان کے تناظر میں اور ایک پاکستانی قوم کی حیثیت سے دیکھا جائے اور بیان کیا جائے، ایک خاص رُخ دینا ہمارے لیے مزید رسوائی کی بات ہے۔ 20 فروری 2013ء کو اسلام آباد میں اُس وقت کی ''وفاقی وزارتِ قومی ہم آہنگی'' کے زیر اہتمام ایک ''قومی کانفرنس برائے بین المذاہب ہم آہنگی'' کا انعقاد ہوا تھا، جس میں مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر اور پاکستان میں موجود دیگر مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے اور ایک متفقہ اعلامیے کی منظوری دی۔

22 فروری 2013ء کو ایوانِ صدر اسلام آباد میں اُس وقت کے صدرِ پاکستان جناب آصف علی زرداری کی صدارت میں منعقدہ اختتامی اجلاس میں یہ اعلامیہ جاری ہوا۔ اِس کا انگلش Version وزارت کے سیکریٹری جناب اعجاز چوہدری اور اُردو متن میں نے پڑھ کر سنایا۔ الحمدللہ اِس کے انگلش اور اردو متن کی تیاری میں میرا بھی کردار تھا۔ اُس وقت اسٹیج پر اِس وزارت کے وفاقی وزیر جناب پال بھٹی اور وزیرِ مملکت جناب اکرم گِل دونوں موجود تھے اور دونوں کا تعلق مسیحی برادری سے ہے۔ اُن کے علاوہ جناب جسٹس (ر) رانا بھگوان داس بھی موجود تھے اور اِن سب نے اِس کی حمایت کی۔

اِس اعلامیے کی پہلی شِق میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ اقلیت (Minority) کی اصطلاح کو ترک کیا جائے، کیوں کہ اقلیت ایک اضافی اصطلاح (Relative Term) ہے، پاکستان میں آبادی کے تناسب کے اعتبار سے اگر مسیحی اقلیت میں ہیں، تو ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ کسی بھی چیز کی تعداد اپنے مقابل کے اعتبار سے اقلیت یا اکثریت بنتی ہے اور یہ نسبت بدلتی رہتی ہے۔ پس ہم سب پاکستانی ہیں اور تمام غیر مسلم بھی ہماری ہی طرح پاکستانی ہیں اور ہماری ریاست میں جان و مال اور آبرو کے تحفظ کے اعتبار سے سب کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ جو بھی پاکستانی شہری ایسا غیر قانونی جرم کرے گا، جس سے

سزائے موت لازم آئے، تو اُس کی جان قانون کی نظر میں مباح ہوجائے گی۔ لیکن سزا کو نافذ کرنا ریاست وحکومت کا دائرۂ اختیار ہے، افراد یا گروہوں کا نہیں ہے، اس میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے اَحکام برابر ہیں۔

ہم کئی دہائیوں سے فساد اور دہشت گردی کا شکار ہیں اور اِس کا نشانہ مختلف اوقات میں مذہب ومسلک کی تمیز کے بغیر تمام پاکستانی شہری حتّٰی کہ ہماری مُسلّح اَفواج اور قومی سلامتی کے اداروں کے اہلکار بھی بنتے رہے ہیں۔ ہندوستان سے ہماری دو باقاعدہ جنگیں ہوئیں، لیکن دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اَفرادی نقصان تعداد اور معیار ہر اعتبار سے اُن دونوں جنگوں سے زیادہ ہے، پس اِس قومی نقصان کو مسالک اور مذاہب کے خانوں میں نہیں بانٹنا چاہیے، بلکہ اِسے پوری قوم اور ملت کا نقصان سمجھنا چاہیے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں لاقانونیت برداشت کی آخری حدوں کو بھی عبور کرچکی ہے اور حالیہ سیاسی خلفشار نے اِس لاقانونیت کے رُجحان میں اور اضافہ کردیا ہے، ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ غیر یقینی صورتِ حال آگے کہاں تک جائے گی؟۔ اور ہماری قوم کی قیادت کے دعوے داروں کو اِس کی سنگینی کا احساس کب ہوگا اور وہ اِس انتشار، لاقانونیت اور بے یقینی کا حل نکالنے کے لیے کب سر جوڑ کر بیٹھیں گے؟۔ سرِ دست تو وہ ایک دوسرے کو زیر کرنے اور ایک دوسرے کی تذلیل وتحقیر میں مصروفِ عمل ہیں اور یہ اُن کا محبوب مشغلہ بن گیا ہے، خواہ اِس میں ملک وقوم کا وقار پامال ہی کیوں نہ ہو، یہ ہمارا قومی المیہ ہے اور سیاسی قیادت کا غیر ذمہ دارانہ رَوِیّہ ہے۔ امریکا کے 2000ء کے صدارتی انتخاب میں بے قاعدگیوں کا انکشاف ہوا، جارج بش کا انتخاب مشکوک اور مُشتبہ نظر آنے لگا اور مسئلہ طول پکڑنے لگا، تو ڈیموکریٹک پارٹی کے صدارتی اُمیدوار الگور نے یہ اِدراک کرتے ہوئے شکست تسلیم کرلی کہ اِس سے اُن کے ملک کی رسوائی ہورہی ہے، لیکن ہمارے ہاں شخصی اَنا (Ego) کے بت اتنے بلند ہیں کہ اُن کے آگے قومی، ملکی اور ملّی وقار ہیچ نظر آتا ہے۔

سو ہمیں مسائل کو سمجھنے اور اُن کی تعبیر کا انداز (Approach) بدلنا ہوگا اور قوم جو پہلے

ہی منقسم ہے، اُس کی مزید تقسیم در تقسیم کا سلسلہ روک کر اصل مسئلے کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینی ہوگی اور وہ ہے لاقانونیت کا راج اور قانون کی حکمرانی کا فقدان۔ اِس کلچر کے فروغ میں تمام طبقات کا حصہ بقدرِ جُثّہ ہے۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں اعلیٰ عدلیہ کی بحالی کے لیے ایک مثالی تحریک برپا ہوئی اور بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ مگر وُکلا برادری جو اِس تحریک کے سرخیل اور مُقدِمۃُ الجیش تھے اور سمجھا جارہا تھا کہ وُکلاء عدلیہ اور قانون کی حکمرانی کے لیے نمونۂ عمل اور رول ماڈل ہیں، مگر بدقسمتی سے بعد میں اِسی طبقے سے عدلیہ اور قانون کی بے حرمتی کے مُتعدد واقعات رُونما ہوئے، جنہوں نے پوری قوم کو حیران کردیا اور ہمارے حددرجہ قابلِ احترام سینیر وُکلاء بھی ندامت محسوس کرنے لگے اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے، اس رُجحان کو مزید مہمیز سیاسی قیادت نے عطا کی۔

بہت سے لبرل طبقات ان مواقع پر چھری کانٹے تیز کرکے قانونِ تحفظِ ناموسِ رسالت کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ اِس قانون کا استعمال غلط ہورہا ہے۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ ملک میں کسی بھی قانون کا استعمال غلط نہیں ہونا چاہیے، قانون کو شخصی یا گروہی عداوت اور جذبۂ انتقام کی تکمیل کے لیے آلۂ کار نہیں بنانا چاہیے۔ مگر ہمارے ملک میں کیا صرف اِسی قانون کا استعمال غلط ہوتا ہے، باقی قوانین کا غلط استعمال نہیں ہوتا، تو کیا پورے نظامِ آئین وقانون کی بساط محض اِس الزام پر لپیٹ دی جائے گی کہ قوانین کا استعمال غلط ہورہا ہے یا غلط استعمال کو روکنے کے لیے آئین وقانون کے دائرے میں رہتے ہوئے کوئی تدبیر یا حکمتِ عملی اختیار کی جانی چاہیے۔

ماضی میں ممتاز مسیحی رہنماؤں سے ہمارے مذاکرات ہوتے رہے ہیں اور وہ اِس بات سے اِتفاق کرتے رہے ہیں کہ مذہبی مُقدّسات (Sacreds)، خواہ وہ شخصیات ہوں یا الہامی کُتب وشعائر ہوں، کی بے حُرمتی نہیں ہونی چاہیے۔ لہٰذا اصولی طور پر اُنہیں اِس قانون سے کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن ان کا کہنا ہے کہ اِس کا غلط استعمال نہیں ہونا چاہیے، ہمیں بھی اِس سے سوفیصد اتفاق ہے۔

اِس مسئلے میں خرابی کی بنیادی وجہ اِس کے ضابطۂ کار (Procedure) میں سابق صدر جنابِ جنرل پرویز مُشرف کی طرف سے تبدیلی ہے۔ اُنہوں نے یہ قرار دیا کہ جب تک ایس پی کی سطح کا افسر مطمئن نہ ہو، اِس کی FIR درج نہ کی جائے۔ سب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں عام آدمی کی رسائی SHO تک مشکل ہے، SP تو بہت دور کی بات ہے، اس لیے ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ FIR درج نہ ہونے کی صورت میں لوگوں نے قانون کو ہاتھ میں لینا شروع کر دیا۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ FIR کے اندراج کو آسان کر دیا جائے تا کہ ملزم قانون کی حفاظتی تحویل میں چلا جائے۔ اُس کا ٹرائل براہِ راست وفاقی شرعی عدالت میں کیا جائے اور عدالت کم از کم وقت میں اس کا فیصلہ کرے۔ اگر ملزم بے قصور ہے تو اُسے رہا کر دیا جائے اور اگر قصوروار ہے تو قانون کے مطابق اُسے سزا دی جائے۔

14 نومبر 2014ء

سپریم کورٹ آف پاکستان کاالارمنگ مختصر فیصلہ

ہمارے ہاں سیاسی سطح پر چھیڑ چھاڑ کے لیے اور قومی مناصب پر فائز، خواہ وہ اقتدار میں ہوں یا حزبِ اختلاف میں، بعض شخصیات کو زِچ کرنے کے لیے سپریم کورٹ آف پاکستان میں شوقیہ مُقدمات بھی دائر کیے جاتے ہیں اور کچھ لوگ اِس کے لیے کافی معروف ہیں، حالانکہ اُن کا اِن معاملات سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔لیکن دستور کے آرٹیکل 184 یعنی بنیادی حقوق کی آڑ لے کر یہ کارِ خیر انجام دیا جاتا ہے اور ہم کئی عشروں سے اس طرح کی عدالتی پٹیشنز کی داستانیں اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں اور آج کل تو الیکٹرونک میڈیا پر بھی اِن اُمور سے متعلق رپورٹنگ ہوتی رہتی ہے۔قومی اسمبلی وسینیٹ آف پاکستان (مجلسِ شوریٰ) کے اَرکان، صوبائی اسمبلیوں کے اَرکان اور کابینہ کے اَرکان کی اہلیت کے بارے میں دستورِ پاکستان میں آرٹیکل 62 اور 63 موجود ہیں۔

اِن آرٹیکلز میں جو اَہم شرائط ہیں، وہ یہ ہیں:

(الف) ایسا شخص مالی بدعنوانی میں مُلوّث نہ ہو، (ب) نظریۂ پاکستان پر یقین رکھتا ہو، (ج) وہ عملی (Practicing) مسلمان ہو، (د) اسلام کے فرائض وواجبات کا پابند ہو، (ح) کبیرہ گناہوں کا مرتکب نہ ہو، (و) اچھے کردار کا حامل ہو اور اسلامی اَحکام کی حکم عدولی کرنے والے کے طور پر معروف نہ ہو، (ز) اسلام کی کافی معلومات رکھتا ہو، (ح) عدالت سے اُسے دیوالیہ قرار نہ دیا گیا ہو، (ط) عدالت نے اُسے کسی جرم کا مرتکب (Convict) قرار نہ دیا ہو، (ی) اُس نے ملکی سالمیت کے خلاف کام نہ کیا ہو، (ک) وہ صادق اور امین

ہو، (ل) پاکستان کا شہری ہو، (م) وہ دماغی طور پر صحیح اور راست باز ہو، وغیرہ۔

ہم نے لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ ترجمانی کرتے ہوئے اہم نکات کو نمایاں کیا ہے اور بعض ایسی شرائط جو معہود (Understood) ہوتی ہیں، قارئین کرام کا وقت بچانے کے لیے اُن کے ذکر سے احتراز کیا ہے۔ آرٹیکل 62-63 میں بعض شرائط ایسی ہیں کہ اگر نیت صحیح ہو تو وہ Self Explanatory یعنی اپنی وضاحت آپ ہیں، ورنہ گرفت سے بچنے کے لیے اِن میں سے گریز کے دسیوں راستے نکل آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرائط لکھنے والوں کی نیت بھی صالح اور صادق نہیں تھی بلکہ ان میں سے بعض شرائط کو ڈَرَاوے (Threat) اور بلیک میلنگ کے لیے استعمال کرنا مقصود تھا۔ چناں چہ سابق صدر جنرل محمد ضیاء الحق، جنہوں نے اِن شرائط کو آئین میں شامل کیا تھا، کے زیرِ اقتدار جب 1985ء میں پہلے انتخابات ہوئے، تو انہوں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ سب ہی پاپی ہیں اور کسی کا دامن بھی پاک نہیں ہے، یعنی کوئی بھی طیب وطاہر (Mr.Clean) نہیں ہے۔

اِس کے واضح معنی یہ ہیں کہ اِن شرائط کو ڈالنے والوں کی نیت یہ نہیں تھی کہ پارلیمنٹ کا ممبر بننے والے ہر فرد کو اِن کی چھلنی سے چھان پھٹک کر گزارا جائے تاکہ پاکیزہ کردار کے لوگ قومی نیابت (Representation) کے مَناصِب پر فائز ہوں اور ہر معیار سے صادق اور امین ہوں یا یوں کہیے کہ اُن کی نظر میں ہمارا معاشرہ ایسے پاکیزہ کردار لوگوں سے خالی ہے اور اِس حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔

چونکہ اِن آرٹیکلز میں جو شرائط لگائی گئی ہیں، اُن کی وضاحت نہیں کی گئی، اِس لیے کوئی اُن کی زد میں نہیں آتا۔ یہ جو جلسوں میں سیاسی رہنما ایک دوسرے پر مالی بدعنوانی (Corruption) کا الزام لگاتے ہیں، وہ سب جانتے ہیں کہ جب تک عدالت کسی کو بدعنوانی کے الزام میں مجرم (Convict) قرار نہ دے، محض الزام سے وہ نااہل نہیں قرار پاتا۔ اور یہ بات اُن جماعتوں کے سینیئر وُکلا بھی جانتے ہیں جو اِن رہنماؤں کے دائیں بائیں کھڑے ہوتے ہیں۔ اِسی طرح قرض کا نادہندہ (Defaulter) وہ قرار پائے گا،

جسے عدالتِ عالیہ یا عدالتِ عظمیٰ نادہندہ قرار دے۔ ہمارے ملک کا ضابطۂ قانون (Procedural Law) یہی ہے، باقی سب رونقِ محفل کی باتیں ہیں اور یہ ضوابط بنانے والے اپنا برا کب چاہیں گے۔

حال ہی میں وزیرِ اعظم پاکستان جناب محمد نواز شریف کے خلاف سپریم کورٹ میں نااہلی کی پٹیشن دائر کی گئی ہے۔ چنانچہ جناب جسٹس جواد ایس خواجہ کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے ڈویژن بنچ نے کہا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آرٹیکل 62-63 کی تشریح کر دی جائے، پھر بعد میں جس کی بھی گردن پھنسے پروا نہیں ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے چیف جسٹس آف پاکستان سے کہا ہے کہ بہتر ہے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کا بڑا عدالتی بنچ تشکیل دیا جائے، جو اِن آرٹیکلز کو لفظاً اور معنیً (In Letter & Sprit) واضح کرے تاکہ آئندہ یہ آرٹیکلز تطبیق (Application) کے حوالے سے جامد وساکت، بے جان اور بے معنیٰ نہ رہیں، بلکہ چنگھاڑ کر بولیں۔ لیکن اگر ایسا ہو گیا اور اللہ کرے ایسا ہو جائے، تو پھر روایتی طور پر ہماری نمائندگی کرنے والے سب پھنسیں گے اور شاید کوئی بھی نہ بچے یا بہت کم بچیں، کوئی Default میں گھر جائے گا، کوئی کسی ڈی این اے ٹیسٹ کی زد میں آئے گا اور کوئی کسی شراب خانے یا قحبہ خانے سے نکلتا ہوا گرفت میں آئے گا، کوئی اختیارات کے غلط استعمال کی زد میں آئے گا، کسی کے محلے سے شہادتوں کا اَنبار لگے گا کہ اِسے کبھی کسی نے نماز پڑھتے دیکھا ہی نہیں۔ جہاں پارلیمنٹ اور کیبنٹ کے بعض نامی گرامی ارکان کو سورۂ اخلاص یعنی ''قُل ھُوَاللہُ اَحَد'' بھی نہ آتی ہو، اُن کے بارے میں آپ یہ حسنِ ظن کیسے قائم کر سکتے ہیں کہ اُنہوں نے کبھی نماز پڑھی ہوگی۔ الغرض یہ ایک ایسا اژدھا ہوگا جس کے درجنوں پھن ہوں گے اور ہر پھن سے ہمارے پارسا رہنما ڈسے جائیں گے۔ پس ایک دوسرے کو چھیڑ خانی کا شوق گلے بھی پڑ سکتا ہے اور پاؤں کی زنجیر بھی بن سکتا ہے۔

جب یہ حقائق سامنے آئیں گے تو پھر سب پناہ کی تلاش میں ہوں گے۔ سرِ دست تو صورتِ حال یہ ہے کہ بندہ خود ہی مدّعی، خود ہی گواہ اور خود ہی مُنصِف ہے، لہٰذا اُس کو کوئی

بھی فیصلہ صادر کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔لیکن حتمی فیصلے کے لیے آخر کار کسی نہ کسی عدالت میں پیش ہونا پڑے گا اور اُس کے فیصلے کو ماننا پڑے گا۔ابھی تو مائیک ہمارے ہاتھ میں ہے،سو جو فیصلہ ہمارے حق میں آئے،وہ عادلانہ ہے اور جو فیصلہ ہمارے خلاف آئے وہ ظالمانہ ہے۔جس کی سوچ ہماری سوچ سے نہ ملے وہ بکاؤ مال ہے،ضمیر فروش ہے یا حقیر انسان ہے۔کیا دفاع اور انٹیلی جنس اداروں سمیت ریاست کے مختلف اداروں کے لیے بجٹ میں رقوم مُتعین نہیں ہوتیں اور وزارتِ خزانہ اُن رقوم کا اجرا نہیں کرتی۔سو اس طرح کے کاغذ لہرانا محض شعبدہ بازی ہے اور وقت آنے پر ایک دوسرے پر ڈالا جاتا ہے۔ چنانچہ آج میں ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کا ٹکر ٹیلی ویژن اسکرین پر دیکھ رہا تھا کہ میں نے تو محض رقم کے اِجراء کی بات کی تھی۔میڈیا ہاؤسز،صحافیوں،اینکر پرسنز اور کالم نگاروں کے ضمیروں کی خریداری کی بات عمران خان صاحب نے کی ہے اور اس کا بارِ ثبوت اُن پر ہے۔سو یہ سیاسی قیادت کی ثقاہت (Authenticity) اور ساکھ (Credibility) کا حال ہے۔

آج ہمارے ملّی اور قومی انتشار کا عالم یہ ہے کہ ہماری بڑی سیاسی جماعتیں بطور چیف الیکشن کمشنر کسی ایک شخص پر مُتفق نہیں ہو پا رہیں،ہر جماعت اپنے پاس ویٹو پاور رکھنا چاہتی ہے،جب کہ یہ شِعار جمہوری روایات واَقدار کے مُنافی ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستان کی 20 کروڑ کی آبادی میں ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے جس کی دیانت وامانت، صداقت،عدالت،قوتِ فیصلہ اور اِصابتِ رائے اور ساکھ پر سب کو اتفاق ہو۔سو ہر ایک کا مزاج اپنی جگہ آمرانہ ہے اور سیاسی جماعتیں بھی اِسی مزاج کے مطابق چلائی جارہی ہیں۔

خدشہ ہے کہ اگر ہمارے سیاسی رہنما کسی معقولیت کی طرف نہ آئے اور مل بیٹھ کر مسائل کا حل تلاش نہ کیا،تو ملک یا تو اَنارکی اور لاقانونیت کا شکار ہو جائے گا یا ایک بار پھر آمریت کی آغوش میں چلا جائے گا اور اُس کے بعد سب خواستہ وناخواستہ اپنی اپنی تحدیدات میں سمٹ جائیں گے۔

پس نوشت: اخبارات سے معلوم ہوا کہ سعودی حکومت کے توسیعی منصوبے کی تکمیل کے لیے مکۂ مکرمہ میں ''مولدُ النبی ﷺ'' (یعنی رسالت مآب ﷺ کے مقامِ پیدائش) کو شہید کر کے اُس کی جگہ محلات اور عالی شان عمارات بنائی جارہی ہیں۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے اور اہلِ عقیدت ومحبت کے لیے باعثِ اَذِیّت بھی ہے۔ ایک جانب ریاض میں سعودی سلطنت کے بانی ملک عبدالعزیز کے آثار کو قومی یادگار کے طور پر محفوظ کیا جارہا ہے اور دوسری جانب تاج دارِ کائنات ﷺ کے آثارِ مبارکہ کا نام ونشان مٹایا جارہا ہے، فَیَا اَسَفٰی وَیَا لَلْعَجَب۔ او آئی سی اور مسلم ممالک کو اس جانب توجہ دینی چاہیے اور مسلم حکمرانوں کو مسلم عوام کے جذبات سے کھیلنے کا مشغلہ اختیار نہیں کرنا چاہیے، ان کے لیے اور بھی بے شمار مسائل ہیں، مزید مصائب کو دعوت دینا دانشمندی نہیں ہے۔

نوٹ: ارکانِ اسمبلی کی اہلیت یا صادق وامین کا کوئی نپا تُلا معیار متعین کرنے کے لیے جناب جسٹس جواد ایس خواجہ نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس صاحب کو بڑا بنچ تشکیل دینے کی سفارش کی، پھر جناب چیف جسٹس صاحب کی سربراہی میں بنچ تشکیل بھی دے دیا گیا، مگر بعد میں اُس فل بنچ نے بھی اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا۔

18 نومبر 2014ء

پولیو ویکسین کا مسئلہ

پولیو ایک خطرناک بیماری ہے، جس کے نتیجے میں انسان جسمانی طور پر معذور ہو جاتا ہے اور وہ اپنی پوری جسمانی استعداد کے مطابق کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ طبی ماہرین کے مطابق یہ ایک مُتعدی (Contagion) مرض ہے۔ عالمی برادری پولیو کی بیماری کے خاتمے کی کوشش کر رہی ہے اور اِس سلسلے میں عالمی ادارۂ صحت (WHO)، عالمی ادارۂ اطفال (Unicef) فعال ہیں۔ اسلامی ترقیاتی بینک جدہ گروپ اور امریکا کی بل گیٹس فاؤنڈیشن اس کے لیے مُعتد بہ مالیاتی وسائل فراہم کر رہے ہیں۔ عالمی برادری کو تشویش ہے کہ پاکستان اِس مرض کے خاتمے میں ناکام ہے اور وقتاً فوقتاً یہاں پولیو سے متاثرہ بچوں کے شواہد ملتے رہتے ہیں۔ ہمارے قبائلی علاقے اور ملک کے دیگر حصوں میں افغان مہاجرین اور قبائلی علاقے کے لوگوں کی آبادیاں بطورِ خاص اِس بیماری کے خاتمے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ خیبر پختونخوا، بلوچستان اور ملک کے بعض دیگر علاقوں میں پولیو ویکسین کی طبی ٹیموں کی مزاحمت اور اُن پر حملوں کے واقعات بھی رپورٹ ہوتے رہتے ہیں۔ گزشتہ سال صوبہ خیبر پختونخوا کی حکومت نے ''صحت کا انصاف'' کے عنوان سے بڑے پیمانے پر سیکورٹی اداروں کی نگرانی میں بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے کی مہم بھی چلائی، لیکن اب اُن کی قیادت کی ترجیح بدل گئی ہے اور سرِ دست ''نیا پاکستان'' بنانے میں مصروفِ عمل ہو گئے ہیں۔

ہم بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے کے حامی ہیں۔ الحمدللہ ہمارے خاندان میں

ڈیڑھ درجن کے قریب ڈاکٹر ہیں اور اِن میں مختلف شعبوں کے اسپیشلسٹ بھی شامل ہیں، اِس لیے ہمارے لیے اِس کی اہمیت کو سمجھنا آسان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی مہلک امراض سے بچاؤ کے لیے حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کی تعلیم فرمائی ہے:

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"یہ طاعون ایک صورتِ عذاب ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلی اُمتوں پر یا بنی اسرائیل پر مُسلط فرمایا، سو جب کسی جگہ یہ بیماری پھیل جائے، تو (اُس بستی کے لوگ) وہاں سے بھاگ کر نہ جائیں اور جو اُس بستی سے باہر ہیں، وہ اُس میں داخل نہ ہوں"۔

(صحیح مسلم:2218)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فتحِ بیت المقدس کے موقع پر شام کے سفر پر جارہے تھے کہ سَرغ نامی بستی سے گزر ہوا۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح اور اُن کے ساتھیوں نے بتایا کہ اِس بستی میں طاعون کی وَبا پھیل گئی ہے۔ حضرت عمر فاروق نے مہاجرین و انصار صحابۂ کرام اور اکابرِ قریش (جو فتحِ مکہ کے موقع پر موجود تھے) سے مشورہ کیا اور اجتماعی مشاورت سے اُنہوں نے بستی میں داخل نہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے کہا: آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟، حضرت عمر نے جواب دیا: ہاں! اللہ کی تقدیر سے بھاگ کر اللہ کی تقدیر کی آغوش میں پناہ لے رہا ہوں۔ پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف آئے اور اُنہوں نے کہا: اِس حوالے سے میرے پاس رسول اللہ ﷺ کی ہدایت موجود ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

"جب تم کسی بستی میں اِس وبا کے بارے میں سنو، تو وہاں نہ جاؤ اور جس جگہ تم پہلے سے موجود ہو، اگر وہاں یہ وبا آجائے تو بھاگ کر نہ جاؤ"۔ یہ سن کر حضرت عمر بن خطاب نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اپنا سفر آگے کی طرف شروع کردیا"۔ (صحیح مسلم مُلخصاً:2219)

اِس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو کسی وبا سے بچنے کے لیے حفاظتی تدابیر اختیار کرنی چاہییں اور حفاظتی تدابیر کا اختیار کرنا توکُّل اور تقدیر پر ایمان کے منافی نہیں ہے، بلکہ یہی

حقیقتِ توکّل ہے کہ اسباب کو اختیار کیا جائے اور اَسباب کو مُؤثِّر بِالذّات ماننے کی بجائے ذاتِ مُسبّبُ الاسباب پر ایمان رکھا جائے، کیوں کہ اسباب میں تاثیر اُسی نے پیدا کی ہے اور اُسی کے حکم سے یہ مؤثر ہوتی ہے اور تقدیرِ الٰہی پر ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے۔ چنانچہ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیمار کو تن درست سے دور رکھا جائے''۔ (صحیح مسلم:2221)

ظاہر ہے کہ اِس سے مراد یہی ہے کہ وبائی امراض سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جذام کے مریض سے بچو جیسے تم شیر سے بچتے ہو''۔ (صحیح بخاری:5707)

دوسری حدیث میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے جذام کے مریض کو اپنے ساتھ بٹھا کر ایک برتن میں کھانا کھلایا''۔ رسول اللہ ﷺ کے اِس شِعار کا مقصد یہ ہے کہ کسی وبائی مرض میں مبتلا مریض سے احتیاط تو کی جائے، لیکن اُس سے نفرت نہ کی جائے تاکہ اُسے حوصلہ ملے اور اُس کے دل میں احساسِ محرومی پیدا نہ ہو۔ چنانچہ آج بھی ڈاکٹر اور طبی عملہ ایسے مریضوں کا علاج کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرتے ہیں۔ ایک حدیثِ پاک میں ہے کہ ''کوئی مرض مُتعدی نہیں ہوتا۔ (صحیح مسلم:2220)

اِس حدیث کی شرح میں علامہ یحییٰ بن شرف نووی لکھتے ہیں:

''بظاہر اِن دونوں حدیثوں میں تعارض (Contradiction) ہے کہ ایک حدیث میں مرض کے مُتعدی (Infectious) ہونے کی نفی ہے اور دوسری حدیث میں ایسے بیمار کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے، اِن دونوں حدیثوں میں تطبیق ضروری ہے۔ پہلی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مرض میں چھوت چھات کی تاثیر اللہ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ مؤثر ہوتی ہے، کسی چیز میں کوئی تاثیر ذاتی نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو دوا استعمال کرنے والا اور طبیب سے رجوع کرنے والا ہر مریض شفایاب ہو جاتا، لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ پس جس کے لیے اللہ کا حکم ہوتا ہے، اُس کے حق میں

ڈاکٹر کی تشخیص درست اور دوا وسیلۂ شفا بن جاتی ہے۔

چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے مرض کے بذاتہٖ مُتعدی ہونے کی نفی فرمائی تو ایک اَعرابی نے سوال کیا: یارسول اللہ! اُونٹ ریگستان میں ہرن کی طرح اُچھل کود کررہے ہوتے ہیں کہ خارش زدہ (Scabious) اُونٹ وہاں آتا ہے اور ریوڑ میں گھس جاتا ہے اور اُس کے نتیجے میں سارے اُونٹ خارش کی بیماری میں مبتلا ہوجاتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پہلے اُونٹ کو خارش کہاں سے لگی؟''۔ (صحیح مسلم:2220)

اِس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرض کے مُتعدی ہونے کی نفی نہیں فرمائی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف متوجہ فرمایا اور بتایا کہ سارا نظامِ اسباب، مُسبِّبُ الاسباب کے حکم کے تابع ہے، لہٰذا اسباب کو ضرور اختیار کیا جائے، مگر ہر چیز کو قادرِ مُطلق کے حکم کے تابع سمجھا جائے۔ صرف سبب اور مُسبَّب اور عِلّت اور معلول کے تانے بانے کو ہی مؤثرِ حقیقی ماننا الحاد ہے اور ایسے ہی لوگوں کو Ethiest کہا جاتا ہے۔

اب آیئے! اصل مسئلے کی طرف، حکومت اور ساری دنیا کو معلوم ہے کہ پولیو کے حوالے سے ایک مزاحمت موجود ہے، جب امریکا نے ڈاکٹر شکیل آفریدی کے ذریعے اُسامہ بن لادن کی تلاش میں پولیو کے قطرے پلانے کی مہم کو جاسوسی کے مقاصد کے لیے استعمال کیا، تو مخالفین کے ہاتھ ایک مزید حربہ آگیا۔ اِس کا مداوا کسی حد تک اِس طرح ہوسکتا تھا کہ امریکا عالمی برادری کو یقین دلاتا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا اور اَقوامِ مُتحدہ بھی اِس کی مذمت کرتی، لیکن ظاہر ہے کہ امریکا کے سامنے کھڑے ہونے کا حوصلہ کسی میں نہیں ہے۔

ہماری حکومتیں اور عالمی ادارے بھی سہل پسند لوگ ہیں، اِس لیے اُن کی ساری تگ ودَو اُن علما تک رسائی حاصل کرنے میں ہوتی ہے، جو نہ صرف یہ کہ اس کی مزاحمت نہیں کرتے بلکہ اس کے حامی ہیں۔ حال ہی میں کراچی کے ایک اخبار نے ایک بڑے اشتہار کی صورت میں قوم کو بتایا کہ اُنہوں نے عالمی ادارۂ صحت، عالمی ادارۂ اطفال اور محکمۂ صحت کو پولیو کے قطرات کے حوالے سے اپنے تحفظات پیش کیے، مگر اُنہوں نے اس کا کوئی جواب

نہیں دیا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ حقیقت پسندی سے کام لیا جائے اور اِس طرح کے لوگوں کے خدشات کا اِزالہ کیا جائے تا کہ منفی پروپیگنڈا کرنے والوں کو حقائق و شواہد کے ساتھ علمی اور فکری سطح پر اطمینان بخش جواب دیے جائیں۔ اِن خدشات میں پولیو ویکسین کا معیاری اور مُصدّقہ (Certified) ہونا بھی شامل ہے، کیونکہ اِس طرح کے واقعات بھی حال ہی میں رپورٹ کیے گئے ہیں کہ پولیو کے قطرے پلانے سے بچہ معذور ہو گیا یا اُس کی موت واقع ہو گئی، اگر اِس طرح کی رپورٹس خلافِ واقعہ ہوں اور محض جھوٹے پروپیگنڈے پر مبنی ہوں، تو ثبوت کے ساتھ اُس کی تردید کی جاسکتی ہے۔ حقائق سے آنکھیں بند کر کے کامیابی کی منزل کو پانا دشوار ہے، بلکہ حقائق کا سامنا کرنے سے ہی یہ گوہرِ مقصود حاصل ہوگا۔

اگر اِس مسئلے کو سنجیدگی سے نہ لیا گیا تو جہاں دنیا بھر کے ایئر پورٹس پر امیگریشن کے حوالے سے پاکستانیوں کو خصوصی جانچ پڑتال (Special Search) سے گزرنا پڑتا ہے، وہاں ہر پاکستانی کو پولیو کے قطرے بھی پلائے جائیں گے اور ایک طرح سے عالمی سطح پر یہ رُسوائی کا اضافی اہتمام ہوگا۔

22 نومبر 2014ء

شگون

لغت میں اِس کے معنیٰ ہیں: اچھی یا بری فال نکالنا۔ ہندو معاشرت کے اثرات کے تحت ہمارے ہاں نیک و بد شگون کی بہت سی روایات چلی آ رہی ہیں۔ صفرالمظفر قمری سال کا دوسرا مہینا ہے، ظہورِ اسلام سے پہلے اہلِ عرب میں بھی اِس مہینے کے بارے میں بہت سی روایات موجود تھیں، بعض لوگ اِس کی طرف بیماری یا مالی نقصان یا مصیبتوں کے نزول کی بدشگونی منسوب کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اِن تمام باتوں کی نفی فرمائی، اِس حوالے سے کُتبِ احادیث میں متعدد روایات ہیں، ہم اُن تمام روایات کو یک جا کر کے درج کر رہے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

''بدشگونی کی کوئی حقیقت نہیں، کوئی مرض اپنی ذات سے مُتعدی نہیں ہوتا، اُلّو کی نحوست کی کوئی حقیقت نہیں، ماہِ صفر کی نحوست کی کوئی حقیقت نہیں، ستاروں (کی چالوں) کا انسانوں کی تقدیر میں کوئی دخل نہیں اور بھوت پریت کی تاثیر کی کوئی حقیقت نہیں ہے''۔

قرآن مجید میں بدشگونی کے معنیٰ میں ''نَحس'' اور ''طِیَرَہ'' کے کلمات آئے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ''بے شک ہم نے اُن پر تُند و تیز مسلسل چلنے والی آندھی منحوس دن میں بھیجی، جو اُن کو اٹھا کر اِس طرح مارتی تھی جیسے وہ جڑ سے کٹے ہوئے کھجور کے تنے ہیں''۔ (القمر: 20-19)

(۲) ''سو ہم نے (اُن کے) منحوس دنوں میں اُن پر خوف ناک آواز والی آندھی بھیجی تاکہ ہم اُنہیں دنیا کی زندگی میں ذلّت کے عذاب کا مزا چکھائیں اور آخرت کا عذاب سب سے

زیادہ رُسوا کُن ہے‘‘۔(حم السجدہ:16)

(۳)’’اور رہے عاد، تو اُن کو گرجتی ہوئی تیز آندھی سے ہلاک کر دیا گیا، (اللہ نے) اِس آندھی کو اُن پر مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن تک مُسلّط رکھا، پس تم دیکھتے کہ یہ لوگ زمین پر کھجور کے کھوکھلے تنوں کی طرح گر گئے‘‘۔(الحاقہ:7-6)

(۴)’’پس جب اُن پر خوشحالی آتی تو وہ کہتے یہ ہماری وجہ سے ہے۔اور اگر اُن پر کوئی بدحالی آتی، تو وہ موسیٰ اور اُن کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے، سنو! اِن کافروں کی نحوست اللہ کے نزدیک ثابت ہے، لیکن اِن میں سے اکثر نہیں جانتے‘‘۔(اعراف:131)

(۵)’’کافروں نے (اپنے عہد کے رسولوں سے) کہا: ہم تم سے براشگون لیتے ہیں اور اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور ہماری طرف سے تم کو ضرور دردناک عذاب پہنچے گا، اُنہوں نے کہا: تمہاری بدشگونی تمہارے ساتھ ہے، کیا تم نصیحت کو برا سمجھتے ہو، بلکہ تم حد سے گزرنے والے ہو‘‘۔(یٰس:19-18)

ابتدائی تین آیات میں ’’نحس‘‘ کا کلمہ آیا ہے۔اِن آیات میں قومِ عاد پر عذاب کے دنوں کو منحوس قرار دیا گیا اور حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ قومِ عاد پر عذاب بدھ کے دِن آیا تھا اور وہ اِس دن کو منحوس کہتے تھے۔اس کی تفسیر میں علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں:

’’میں کہتا ہوں کہ تمام ایام برابر ہیں اور بدھ کا دن نحوست کے لیے خاص نہیں ہے (یعنی اُن پر عذاب اُن کی سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے آیا نہ کہ بدھ کے دن کی وجہ سے)۔ اور ہر گزرنے والی ساعت کسی شخص کے لیے اچھی اور مبارک ہوتی ہے اور وہی ساعت دوسرے شخص کے لیے بری اور منحوس ہوتی ہے اور ہر دن کسی شخص کے لیے خیر اور دوسرے شخص کے لیے شر ہوتا ہے (یعنی ایک ہی دِن کہیں جنازہ اٹھتا ہے اور کہیں شادیانے بج رہے ہوتے ہیں) یعنی نحوست یا ناسازگار ہونے کا تعلق زمانے کے ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ افراد کے اعتبار سے ہوتا ہے۔اور اگر کسی شخص پر عذاب یا کوئی مصیبت نازل ہونے کی وجہ سے بدھ کا دن منحوس ہے تو ہر دن بلکہ ہر ساعت میں کسی نہ کسی شخص پر کوئی نہ کوئی مصیبت اور بلا نازل

ہوتی ہے، تو اِس طرح تو تمام ساعتیں منحوس قرار پائیں گی''۔ (روح المعانی، جلد 27، ص: 86)

آخری دو آیات میں کُفار نے بالترتیب دعوتِ حق دینے والوں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کی طرف نحوست کی نسبت کی، تو اُنہیں جواب دیا گیا کہ تمہاری نحوست، تمہاری بداعمالیوں کے سبب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مُقدر ہے۔

حدیث پاک میں فرمایا: ''لَا طِیَرَۃَ''، یعنی کسی خاص مقام، دِن یا وقت کے حوالے سے شریعت میں نحوست یا بدشگونی کا کوئی تصور نہیں ہے، بلکہ ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص کسی چیز سے بدشگونی لے کر اپنے مقصد سے لوٹ آیا، اُس نے شرک کیا''۔ یہ اُس صورت میں ہے کہ اُس کا یہ عقیدہ ہو کہ اِس چیز یا واقعے کے ظاہر ہونے سے یقیناً ناکامی ہوگی اور اِس کی بنا پر اُس نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا، تو گویا اُس نے اعتقادی طور پر شرک کا ارتکاب کیا کہ غیر اللہ کو مؤثر بالذات مانا، جیسے ہمارے ہاں بلی کے راستہ کاٹنے کو بھی نحس سمجھا جاتا ہے۔ اِس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام میں بدشگونی تو نہیں ہے، (البتہ) نیک فال لینا بہتر ہے۔ صحابہ نے پوچھا: ''نیک فال کیا ہے؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر وہ اچھی بات جو تم میں سے کوئی سنے''۔ (صحیح بخاری: 5754)

چنانچہ جب صلح حدیبیہ کے موقع پر سہیل بن عمرو قریشِ مکہ کے نمائندے کے طور پر مذاکرات کے لیے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کے نام سے نیک فال لیتے ہوئے فرمایا: ''تمہارا کام آسان ہو گیا ہے''، سہیل کا مادّہ ''سہل'' ہے، جس کے معنی ہیں: آسانی۔ اِسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفرِ ہجرت کے موقع پر کفارِ مکہ نے آپ کو گرفتار کرنے والے کے لیے سو اونٹ کا انعام مقرر کیا، بُریدہ انعام کی لالچ میں قریش کے 70 شہسواروں کے ساتھ روانہ ہوا اور راستے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جا پہنچا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: تم کون ہو؟، اُس نے کہا: بُریدہ، آپ نے اپنے رفیقِ سفر حضرت ابوبکر کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ہمارے معاملے میں ٹھنڈک مقدر ہوگئی، کیونکہ برد کے معنی ٹھنڈک کے ہیں۔ پھر

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُس سے پوچھا: تمہارا خاندان کیا ہے؟، اُس نے کہا: ''اسلم''، اِس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ہمیں سلامتی مل گئی'' (کیونکہ اسلم کا مادّہ ''سَلِم'' بمعنیٰ سلامتی ہے)، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پوچھا: تمہارا قبیلہ کیا ہے؟، اُس نے جواب دیا: بنو سہم، آپ نے فرمایا: تمہارا تیر نکل گیا (سہم کے معنیٰ ہیں: تیر)، چنانچہ بُریدہ اور اُن کے سب ساتھی اسلام لے آئے''۔(سُبُل الھدیٰ والرشاد، جلد9،ص:356)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اچھے ناموں کو پسند فرماتے تھے اور بعض مواقع پر ناموں کو تبدیل فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ''بَرّہ'' نام کو تبدیل کر کے زینب اور جویریہ رکھا، اَصرم کو بدل کر زُرعہ رکھا۔ اِسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ''عاص، عزیز، عَتَلہ، غُراب، حُباب اور شِہاب'' ناموں کو بھی بدلا۔ سعید بن مُسیّب نے بتایا کہ اُن کے دادا کا نام ''حَزن'' تھا، وہ حضور کے پاس آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تمہارا نام سَہل ہے، اُنہوں نے کہا: میں اپنے باپ کے رکھے ہوئے نام کو نہیں بدلوں گا، چنانچہ اِسی کا اثر ہے ہمارے خاندان کے مزاج میں سختی چلی آرہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ فرمان کہ ''صفر کی کوئی حقیقت نہیں ہے''، اِس کے معنی یہ ہیں کہ ماہِ صفر کو جو لوگ منحوس تصور کرتے ہیں اور اِس ماہ کی تیرہ تاریخ کو بعض لوگ تیرہ تیزی کہتے ہیں اور اِس مہینے میں شادی نہیں کرتے، شریعت کی رُو سے یہ سب باتیں بالکل بے اصل اور باطل ہیں۔

امام احمد رضا قادری سے سوال ہوا کہ صفر کے آخری بدھ کے متعلق لوگوں میں مشہور ہے کہ اُس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحت پائی تھی، لہٰذا وہ اِس خوشی میں شیرینی تقسیم کرتے ہیں، بعض لوگ اِس دن کو نحس جان کر برتن توڑتے ہیں۔ اُنہوں نے جواب دیا:

''آخری بدھ کی شریعت میں کوئی اصل نہیں اور اس دن برتن توڑنا مال ضائع کرنا ہے اور گناہ کا سبب ہے۔ اُس دن آپ کی صحت یابی کا بھی کوئی ثبوت نہیں، بلکہ جس مرض میں آپ کا وصال ہوا، اُس کا آغاز صفر 11 ہجری کے آخری بدھ کے دن ہوا تھا اور ایک روایت

کے مطابق حضرت ایوب علیہ السلام کی ابتلا بھی بدھ ہی کے دن شروع ہوئی تھی‘‘۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ فرمان کہ ’’ستارے کی کوئی اصل نہیں‘‘، اِس کے معنی یہ ہیں کہ بعض نجومیوں کے یہ نظریات کہ ستاروں کی چالیں انسانوں کی تقدیر پر اَثر انداز ہوتی ہیں یا یہ کہ فلاں کا ستارہ یہ ہے اور برج یہ ہے اور اُس کا دن یا سال اِس طرح گزرے گا، یہ سب باتیں شریعت کی نظر میں باطل ہیں، علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

ستارہ کیا تری تقدیر کی خبر دے گا؟
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے، خوار و زبوں

یعنی جو ستارہ اپنی مرضی سے حرکت نہیں کرسکتا، وہ خود قادرِ مُطلق کے حکم کا پابند ہے اور کسی کی کیا مجال، کہ اُس کے حکم سے سرتابی کرے یا بال برابر اِنحراف کرے، اِسی لیے اُنھوں نے کہا تھا:

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عَبَث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

24 نومبر 2014ء

دعوت بالحکمت

اللہ تعالیٰ نے دعوتِ دین کو اِس اُمت پر فرضِ کفایہ قرار دیا ہے اور اِس اُمت کا شِعار بھی بتایا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ دعوتِ دین کا اُسلوب بھی تعلیم فرمایا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''آپ (لوگوں کو) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلایئے اور احسن طریقے سے اُن کے ساتھ بحث کیجیے''۔ (النحل:124)

امام رازی نے بتایا کہ حکمت سے مراد اپنے موقف کو یقینی، قطعی اور ناقابلِ تردید دلائل کے ساتھ پیش کرنا ہے اور موعِظۂ حَسَنہ سے مراد خُلوص اور شفقت بھرے انداز میں دین کی بات دوسروں تک پہنچانا، یعنی مُخاطب کو لگے کہ آپ کو اُس سے ہم دردی ہے، اِسی اندازِ دعوت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

''جو بات دل سے نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے'' یا: ''شاید کے ترے دل میں اُتر جائے مری بات''۔

مَوعِظۂ حَسَنہ میں ترغیب یعنی جزا کی اُمید اور ترہیب یعنی سزا کا ڈر دونوں شامل ہوتے ہیں، اِسی کو قرآنِ مجید میں اِنذار اور تبشیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض اوقات مکالمے اور بحث ومباحثے کی نوبت آجاتی ہے، لیکن اِس میں بھی جدال اور لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آنی چاہیے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور (اے مسلمانو!) اہلِ کتاب سے صرف عمدہ طریقے سے بحث کرو''۔ (عنکبوت:46)

مناظرے اور مکالمے کا مقصد فریقِ مخالف پر غلبہ پانے کی خواہش نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ اِس میں نفسانیت غالب آجاتی ہے، بلکہ مُخاطب کو قائل (Convince) کرنے کی نتیجہ خیز کوشش ہونی چاہیے۔ اگر انداز جارحانہ ہوگا تو مُخاطب بھی ضد اور ہٹ دھرمی پہ اُتر آئے گا اور قبولِ حق سے محروم ہو جائے گا، جبکہ مومن کی کامیابی فریقِ مخالف کو قبول حق پر آمادہ کرنے میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی سے فرمایا:

''اللہ کی قسم! اگر تمہارے ذریعے اللہ تعالیٰ ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے، تو یہ تمہارے لیے سُرخ اونٹوں (پر مشتمل گراں قدر دولت) سے بہتر ہے''۔ (صحیح بخاری:3701)

الغرض مناظرے اور مُجادلے میں فریقِ مخالف پر غلبہ پانے کی خواہش نہیں بلکہ ہدایت مقصود ہونی چاہیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نمرود سے مناظرے کو قرآن نے اِن کلمات میں بیان فرمایا:

''کیا آپ نے اُس شخص کو نہیں دیکھا، جس نے ابراہیم سے اُن کے رب کے بارے میں اِس بات پر جھگڑا کیا کہ اُسے بادشاہت اللہ نے دی ہے، جب ابراہیم نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے، اُس نے کہا: میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں، ابراہیم نے کہا: بے شک اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو اِسے مغرب سے نکال، تو کافر حیرت زدہ ہو کر لاجواب ہو گیا''۔ (بقرہ:258)

چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد محض فتح پانا نہیں تھا بلکہ نمرود کے سارے پیروکاروں پر حقانیت کو واضح کرنا تھا، اِس لیے اُنہوں نے اِماتت (Mortification) اور قتل (Murder) کی علمی بحث نہیں کی کہ بظاہر قاتل تو کوئی فرد ہوتا ہے لیکن زندگی عطا کرنا اور سلب کرنا صرف اور صرف اللہ کا اختیار ہے، باقی ظاہری اَسباب ہیں۔ لہٰذا آپ نے فوراً بحث کا رُخ بدلا اور ایک ایسی مشاہداتی دلیل پیش کی کہ نمرود کے پاس نہ اُس کا کوئی رَد تھا اور نہ ہی گریز (Avoidance) کا کوئی راستہ، لہٰذا قرآن نے بتایا کہ وہ حیرت زَدہ (Confounded) ہو کر رہ گیا۔

حکمتِ دین کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ بعض اوقات اَفضل واَولیٰ چیز کو اعلیٰ تر مقصد کے لیے یا سَدِّ ذرائع کے لیے چھوڑنا پڑتا ہے۔حدیثِ پاک میں ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پوچھا: کیا حطیم (بیت اللہ کا وہ حصہ جسے عمارت میں شامل نہیں کیا جاسکا) بیت اللہ کا حصہ ہے؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ہاں! میں نے پوچھا: پھر کیا وجہ ہے کہ لوگوں نے اس کو بیت اللہ میں داخل نہیں کیا؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تمہاری قوم کے پاس خرچ کم تھا، میں نے پوچھا: پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کا دروازہ اونچا ہے؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تمہاری قوم نے یہ اس لیے کیا ہے کہ جس کو چاہیں کعبہ میں داخل کریں اور جس کو چاہیں منع کردیں۔ اگر تمہاری قوم کا زمانۂ جاہلیت ابھی تازہ تازہ نہ ہوتا اور اس کے دلوں کے بگڑ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں حطیم کو بیت اللہ میں شامل کردیتا اور اُس کا دروازہ زمین سے متصل بناتا''۔(صحیح بخاری:1584)

ایک اور حدیث میں ہے:''میں اُس کے دو دروازے بناتا''۔ایک اور روایت میں ہے:''میں پیچھے کی جانب بھی ایک دروازہ بناتا''۔

اِس کا پس منظر یہ ہے کہ اعلانِ نبوت سے پہلے بیت اللہ کی عمارت سیلاب کے نتیجے میں مخدوش ہوگئی تھی، تو قریش نے بیت اللہ کی اَزسرِ نوتعمیر کے لیے عطیات جمع کیے اور یہ شرط لگائی کہ صرف حلال مال دیا جائے، تو اتنا حلال مال جمع نہ ہوسکا کہ بیت اللہ کی پوری حدود کو شامل کرکے تعمیرِ نو کریں۔تو اُنہوں نے شمال کی جانب کے کچھ حصے کو عمارت سے خارج کردیا،لیکن اُس کی نشاندہی کے لیے آج بھی ایک چھوٹی سی دیوار موجود ہے، جسے حطیمِ کعبہ کہتے ہیں۔اب ماشاء اللہ وسائل دستیاب تھے، مکہ فتح ہوچکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حجاز کے بلاشرکتِ غیرے حاکم تھے اور آپ کی خواہش بھی تھی، لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دین کی عظیم مصلحت کو ترجیح دیتے ہوئے بیت اللہ کی عمارت کو نہیں چھیڑا اور تعمیرِ نو نہیں کی کہ کہیں لوگوں کا ایمان مُتزلزل نہ ہوجائے کہ بیت اللہ پر کُدال یا ہتھوڑا (Hammer) کیسے چلایا جاسکتا ہے۔

اِسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں اور قریشِ مکہ کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا، اُس موقع پر سُہیل بن عَمرو، جو بعد میں اسلام لائے، قریشِ مکہ کے نمائندے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے معاہدے کی دستاویز لکھنے کے لیے حضرت علی کو بلایا اور فرمایا: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھو۔ سُہیل نے کہا: میں الرحمن الرحیم کو نہیں جانتا، آپ ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' لکھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' لکھو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: لکھو یہ معاہدہ ''محمد رّسول اللہ'' اور قریش کے درمیان طے پایا۔ سُہیل نے کہا: اگر ہم آپ کو رسول اللہ مانتے، تو آپ کا راستہ نہ روکتے، ہاں! آپ محمد بن عبد اللہ ہیں، آپ نے فرمایا: ''میں رسول اللہ ہوں اور میں محمد بن عبد اللہ ہوں، پھر حضرت علی سے فرمایا: رسول اللہ کے الفاظ مٹادو''۔ حضرت علی نے عرض کیا: میری کیا مجال کہ آپ کے نام سے رسول اللہ کے کلمات مٹادوں، پھر حضور نے خود وہ الفاظ مٹائے''۔ (صحیح بخاری: 2698)

اب آپ غور فرمایئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نام سے ''رسول اللہ'' کے کلمات کو مٹانا مسلمانوں کے لیے کتنا جذباتی مسئلہ تھا کہ آج بھی مسلمان ایسے مسائل پر مُشتعل ہوجاتے ہیں اور اُن کے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا دشوار ہوتا ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دین کی عظیم تر مصلحت کی خاطر صحابۂ کرام کے جذبات کو کنٹرول کیا اور یہ معجزانہ کارنامہ صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی سرانجام دے سکتے تھے۔

بعض اوقات ہم کسی خلافِ اَولیٰ کام کے خلاف ڈٹ جاتے ہیں اور آپس میں لڑائی جھگڑے کی نوبت آجاتی ہے، جیسے یہ حق وباطل کا معرکہ ہو اور اِس میں کسی کے لیے رخصت یا رُورعایت کی گنجائش نہیں ہے، حالاں کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ چنانچہ امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

''ان امور میں قاعدہ کلیہ جسے ضرور یاد رکھنا چاہیے یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی اور حرام کاموں سے بچنے کو مخلوق کی خوشنودی پر ترجیح دے اور ان امور میں کسی کی ناراضی کی پروا نہ کرے، دینی حکمت کے تحت مخلوق کی دل داری اور ان کے جذبات کو مستحب کاموں پر ترجیح

دے، یعنی لوگوں کی دل داری کی خاطر افضل کاموں کو چھوڑا جاسکتا ہے اور دینی مصلحت کے تحت بعض اوقات ایسے کاموں کو جن کا کرنا محض افضل واَولیٰ ہے، یعنی فرض، واجب یا سنّت نہیں ہے، چھوڑا جاسکتا ہے۔ دین کے مبلغ کو لوگوں کے درمیان نفرت پیدا کرنے سے گریز کرنا چاہیے، وہ لوگوں کے لیے اذیت اور دل آزاری کا سبب نہ بنے۔ اسی طرح لوگوں میں جو رسوم اور طریقے جاری ہیں، اگر وہ شریعت کے خلاف نہیں ہیں اور نہ ہی ان میں کوئی شرعی عیب ہے، تو محض اپنی بڑائی ظاہر کرنے اور اپنی پاک دامنی ثابت کرنے کے لیے عام لوگوں سے ہٹ کر کوئی شعار اختیار نہ کرے، بلکہ لوگوں کے ساتھ ان رسوم میں شامل ہو۔ اگر وہ لوگوں کی عام روِش سے ہٹ کر کوئی الگ راستہ اپناتا ہے، تو یہ لوگوں کے دلوں کو دین کی طرف مائل کرنے کے مقصدِ خیر کے بالکل خلاف ہے۔ خبردار رہو، اس بات کو خوب توجہ سے سنو کہ یہ بہت خوب صورت باریک علمی نکتہ اور حکمت کی بات ہے اور دین کے معاملے میں سلامتی اور وقار کا راستہ ہے، جس سے بہت سے خشک مزاج زاہد اور باطنی کشف کا دعویٰ کرنے والے غافل اور جاہل ہوتے ہیں، وہ اپنے فاسد گمان میں بڑے دین دار بنتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ دین کی حکمت اور شریعت کے مقاصد سے بہت دور ہوتے ہیں، حکمت ودانش کے اس پیغام کو مضبوطی سے پکڑو، یہ چند سطور ہیں، مگر اس میں علم کا بڑا خزانہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے فہمِ دین کی ایسی توفیق نصیب ہوتی ہے اور سب کو اسی طرف لوٹ کر جانا ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد4، ص:528)

آپ کی اصل عبارت الفاظ وتراکیب کے اعتبار سے نہایت دقیق اور مشکل ہے، میں نے نسبتاً آسان الفاظ میں اُس کا مفہوم بیان کیا ہے۔

28 نومبر 2014ء

دسمبر2014ء

خواہشات اور حقائق

پروفیسر حفیظ تائب مرحوم نے بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک استغاثہ کی صورت میں نعت پیش کر کے عرض کی تھی:

سچ میرے دور میں، جرم ہے، عیب ہے
جھوٹ فنِ عظیم، آج لاریب ہے
ایک اعزاز ہے، جہل و بے رہ روی
ایک آزار ہے، آگہی یا نبی!

عربی زبان میں ایک لفظ "جہل" ہے، جس کے معنی ہیں: "لاعلمی ونادانی" اور ایک "تجاہُل" ہے، جس کے معنیٰ ہیں: "جان بوجھ کر نادان بننا"، اسے انگریزی میں آپ To Feign Ignorance کہہ سکتے ہیں، جیسے ایک بینا کے جان بوجھ کر اندھا بن جانے کو عربی "تعامی" اور ایک جعلی شاعر اور بے معنی تک بندی کرنے والے کو "مُتشاعِر" اور تصوف کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے والے کو حضرت سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے "مُتَصَوِّف" کہا ہے۔ الغرض ہمارے عہد میں سچ بولنا جرم ہے اور سچ سننے کا کوئی روادار نہیں ہے۔ اکثر نے بالعموم متنازع معاملات میں ایک پوزیشن اختیار کر رکھی ہے، اس کے محرکات کا ہمیں علم ہونا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی کسی کے بارے میں ثبوت وشواہد کے بغیر بدگمانی کرنا جائز ہے، ذاتی پسند اور ناپسند بھی ہوسکتی ہے اور ہر ایک کے اپنے ترجیحی دلائل بھی ہوسکتے ہیں۔

ہمارا ملک گزشتہ چار ماہ سے ایک بے یقینی اور سیاسی تناؤ کی کیفیت سے دوچار ہے۔ سیاسی کشمکش کا اصل سبب 2013ء کے قومی انتخابات میں دھاندلی کا الزام ہے اور اِسی کے سبب دھرنوں اور جلسوں کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ صرف ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کا نعرہ انقلاب کا تھا، لیکن انہوں نے اپنے دھرنوں کے تجزیے اور نتائج کے بعد انہیں موقوف کر دیا اور باندازِ دگر اپنی سیاسی تحریک جاری رکھنے کا اعلان کیا اور مروّجہ انتخابی نظام میں شمولیت کو بھی بر سبیلِ تنزّل اختیار کر لیا۔ اِس کا مطلب ہے اپنے اصولی موقف میں تھوڑی نرمی پیدا کر کے حالات سے مطابقت پیدا کرنا۔ سو بے نتیجہ تصادم کی راہ پر مسلسل چلتے رہنے کے مقابلے میں یہ ایک دانش مندانہ بات ہے۔ آج کل اُن کی طبیعت ناساز ہے، ہم اُن کی جلد صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں۔

اس عرصے میں اس موضوع کے حوالے سے ہمارے ٹیلی ویژن چینلوں پر بے شمار سیاسی مباحثے بھی ہوئے اور قومی اخبارات میں کالموں کا تو شمار ہی مشکل ہے۔ اس پر ایک اعلیٰ درجے کا پی ایچ۔ ڈی ہونا چاہیے کہ آیا جو لوگ ہماری رہنمائی کے منصب پر فائز ہیں، وہ خود یکسو ہیں، اُن کا کوئی وژن ہے، انہیں اپنی سَمت کا پتا ہے یا اندھیری راہوں میں نامعلوم منزل کی طرف بگٹٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے اہلِ قلم، جنہیں معاشرے کا باشعور طبقہ سمجھا جاتا ہے، مختلف کیمپوں میں منقسم ہیں اور خود بھی یکسو نہیں۔ اور جو ہمیں عشروں سے جمہوریت کا درس دے رہے ہیں، بقولِ غالب ان کی کیفیت کچھ یوں ہے:

دردِ دل لکھوں کب تک؟، جاؤں اُن کو دکھلا دوں
انگلیاں فِگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

یعنی جمہوریت کے فضائل لکھتے لکھتے ان کی انگلیاں زخمی ہو چکیں اور قلم سے خون ٹپک رہا ہے، لیکن جب وہ تبدیلی اور انقلاب کی حمایت کرنے لگے اور امپائر کی اُنگلی اٹھنے کی باتیں ہونے لگیں، چوک میں کھڑے ہو کر استعفیٰ کا مطالبہ تکرار در تکرار کے ساتھ ہونے لگا،

تو جمہوریت کو عقیدے کا درجہ دینے والوں میں سے بھی اکثر غیبی تبدیلی کی آس لگا بیٹھے اور اپنی تمام تر علمی اور فکری کاوشیں اِس مُہم کی پُرجوش تائید میں صرف کرتے رہے۔ سو ہم خوابوں کی دنیا میں جینے والے لوگ ہیں، حقائق کا سامنا کرنے والے نہیں ہیں، خواب بھی ایسے جن کی تعبیر کبھی نصیب نہ ہو۔

ہم نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ جو لوگ نظامِ جمہوریت کے تسلسل کے خواہاں ہیں، انہیں اصلاحِ اَحوال کے لیے نظام کے Mechanism کو استعمال کرنا چاہیے اور اسی حوالے سے دباؤ ڈالنا چاہیے، لیکن شروعات ہی جب استعفے کے مطالبے اور امپائر کی انگلی اٹھائے جانے سے ہوئیں، تو انجام واضح تھا۔ سراج الحق صاحب نے بھی سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا، بلکہ وہ اِن حالات سے ایک طرح سے محظوظ ہوتے رہے اور ایک آدھ مطالبہ متناسب طرزِ انتخاب کا اپنی طرف سے تبرک کے طور پر بھی شامل کر دیا، یہ جانتے ہوئے کہ سینٹ میں حکومت کے پاس کوئی قانون (Act) پاس کرانے کے لیے سادہ اکثریت بھی نہیں ہے، آئینی ترمیم تو بہت دور کی بات ہے، جس کے لیے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی دو تہائی اکثریت کی تائید و توثیق لازمی ہوتی ہے اور یہ کسی باوقار جامع متفقہ سیاسی معاہدے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں موجود تمام جماعتوں کے رہنماؤں کو On Board لینا اور ان کی حمایت حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ حال یہ ہے کہ آپ سب کو گالیوں سے نواز رہے ہیں، چور اُچکے اور ڈکیت قرار دے رہے ہیں، سیاست اور اخلاقیات کو ایک دوسرے کی ضد بنا دیا گیا ہے اور نفرتوں کا گراف اس درجے پر پہنچا دیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھنے اور آنکھیں چار کرنے میں یقیناً ہچکچاہٹ محسوس ہوگی، براہِ راست رابطہ کے فقدان کی وجہ سے بھی معاملات طوالت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے رہنماؤں پر مشتمل کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں، جو ہدایات کہیں اور سے لیتی ہیں اور ان کے پاس حتمی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہوتا اور معاملات مزید الجھاؤ کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

مسائل کا حل یہ ہے کہ ہم خواہشات اور مفروضات (Assumptions) کی دنیا سے نکلیں اور حقائق کا سامنا کریں، آئین وقانون کی تحدیدات (Limitations) کا بھی اِدراک کریں، قانون سازی کے میکنزم کو بھی ذہن میں رکھیں۔ ہمارا اصل ہدف آئندہ نظام انتخابات کی شفافیت، اعتبار اور بہتری ہونی چاہیے۔ کچھ تو سپریم کورٹ آف پاکستان نے ڈنڈا گھمایا اور سیاسی رہنماؤں نے بھی ذرا سی سنجیدگی دکھائی تو باہمی مشاورت اور مفاہمت سے چیف الیکشن کمشنر کے تقرر کی منزل قریب آگئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کوئی مسئلہ لاینحل نہیں ہوتا، بس نیت میں اخلاص ہونا چاہیے اور سَمت (Direction) درست ہونی چاہیے۔

وزیرِ خزانہ جناب اسحاق ڈار کو ٹیلی ویژن پر یہ کہتے سنا کہ ''میثاقِ جمہوریت'' کی طرح قومی سطح پر ایک ''میثاقِ معیشت'' بھی اتفاقِ رائے سے طے ہونا چاہیے تاکہ قومی سیاست اور معیشت ایک طے شدہ ٹریک پر چل پڑیں اور آئندہ کوئی بھی سیاسی جماعت برسراقتدار آئے، وہ ماضی کا نوحہ پڑھنے اور جاری نظام کی شکست وریخت کرنے کی بجائے اسے آگے بڑھائے، یہ نہ ہو کہ ''ہر کہ آمد عمارت نو ساخت'' والا معاملہ ہو۔ پی آئی اے اور پاکستان اسٹیل کو دیمک لگ چکا ہے اور قومی ٹیکسوں کی آمدنی، جو ملکی ترقی پر صرف ہونی چاہیے، وہ اِن اداروں کو ''آکسیجن'' فراہم کرنے پر صرف ہو رہی ہے اور ان کی حقیقی بحالی اور اِحیاء کی منزل روز بروز ناممکن ہوتی چلی جارہی ہے۔ جناب رضا ربانی اور جناب سراج الحق ان دونوں اداروں کی نجکاری کی نہایت شدت سے مخالفت کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہمارا مخلصانہ اور پُرزور مشورہ ہے کہ یہ دونوں قومی ادارے اِن دونوں معزز صاحبِ بصیرت رہنماؤں کے سپرد کیے جائیں اور اگر یہ اپنی دانش اور انتظامی صلاحیت سے اِن اداروں کی بحالی کے مشن میں کامیاب ہوجائیں تو یہ بہت بڑی قومی خدمت ہوگی، اس کامیابی پر انہیں قومی اعزازات سے نوازا جائے۔

ریل کے ذریعے سفر کرنے والے لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ جو ٹرینیں یعنی نائٹ

کوچ، شالیمار اور بزنس ٹرین پرائیویٹ کنٹرول میں دی گئی ہیں، ان کے آمد و رفت کے نظام الاوقات میں بہت بہتری آئی ہے اور ٹرینوں میں مسافروں کے لیے خدمات اور سہولتوں کا معیار بھی بہتر ہوا ہے، کوئی ہمیں بتائے کہ اِس سے ریاست و حکومت اور قوم کو کیا نقصان ہوا ہے اور آیا بلا جواز کسی ملازم کو نکالا گیا ہے؟۔ پس ہمارے حکمرانوں اور رہنماؤں کو حقیقت پسند بننا چاہیے اور نصف النہار کو شبِ دیجور قرار دینے سے حقیقتیں تبدیل نہیں ہوتیں۔ اور اگر کسی کے پاس اس کے برعکس معلومات ہوں تو ازراہِ کرم ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ ہماری رائے اگر غلط معلومات پر مبنی ہے تو ہم اپنی رائے پر نظرِ ثانی کر سکیں، کیونکہ غلط موقف پر اَڑے رہنا ہٹ دھرمی کہلاتا ہے۔

ہمارے تضادات کا عالَم تو یہ ہے کہ ایک ہی جلسے کے حاضرین کی تعداد کے بارے میں مختلف دعوے اور تخمینے میڈیا میں پڑھنے اور سننے کو ملتے ہیں، بعض اوقات یہ تعداد مختلف دعووں کے مطابق دس پندرہ ہزار سے شروع ہوتی اور ایک دو لاکھ سے متجاوز ہو جاتی ہے اور کسی کو بھی اپنے دانستہ جھوٹ یا غلط بیانی پر ندامت نہیں ہوتی۔

5 دسمبر 2014ء

ایک اچھی علامت

کل تحریک انصاف کے چیرمین جناب عمران خان کی پریس کانفرنس چند منٹ کے لیے ٹیلی ویژن اسکرین پر سنی، معمول کے برعکس اُن کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا، وہ اپنے سیاسی حریفوں کا نام قدرے معقولیت کے ساتھ لے رہے تھے اور یہ بھی کہا کہ ہم وزیراعظم کے استعفے کے مطالبے سے پیچھے ہٹے ہیں اور یہ کہ ہم جوڈیشل کمیشن کے فیصلے کو تسلیم کریں گے، خواہ ہمارے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے پہلے وہ الیکشن ٹریبونل پر بھی اعتماد کا اظہار کر چکے ہیں، مزید یہ کہ وہ اب ''میں'' کی بجائے ''ہم'' کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ایک اچھی علامت ہے اور اچھا Gesture ہے۔

عمران خان صاحب ذرا اور بھی احتیاط فرمائیں، اُن کے بعض جملے دینی اعتبار سے بھی قابلِ اعتراض ہوتے ہیں اور آج کل الیکٹرونک میڈیا، سوشل میڈیا اور پرنٹ میڈیا بڑا بے رحم ہے اور منہ سے نکلا ہوا کوئی بھی لفظ یا جملہ ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ اور یہ آڈیو/ویڈیو ریکارڈ پبلک پراپرٹی بن جاتا ہے اور پھر اُس سے جان چھڑانی مشکل ہوتی ہے، جس طرح کمان سے نکلا ہوا تیر اور بندوق سے نکلی ہوئی گولی واپس نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح ایک حدیثِ پاک کی رُو سے منہ سے نکلے ہوئے کلمات سے جو فساد برپا ہوتا ہے، اسے دیکھ کر بندہ اپنے الفاظ واپس لینا چاہتا ہے، مگر یہ اسی طرح ناممکن ہے جیسے اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزرنا۔ اور عربی کا شعر ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

''تیر کے لگے ہوئے زخم تو وقت گزرنے کے ساتھ مُندمِل (Heal Up) ہوجاتے

ہیں، مگر زبان کا لگا یا ہوا گھاؤ کبھی نہیں بھرتا"۔

دانا لوگوں کا یہ بھی قول ہے کہ: "کُتّے کی طرف پتھر مارو تو وہ پلٹ کر پتھر پر حملہ آور نہیں ہوتا، بلکہ پتھر مارنے والے پر حملہ کرتا ہے"۔

لہٰذا آپ کے اسٹیج سے جو گالی گلوچ کسی کے خلاف ہوگی، وہ آپ کے کھاتے میں جائے گی، گالی دینے والا تو محض اپنی فطرت کی نمود کرتا ہے، اس کا معاملہ تو "بیگانے کی شادی میں عبداللہ دیوانہ" والا ہوگا، مگر نفع نقصان آپ کا ہی ہوگا۔ آج خان صاحب کے خلاف حکومت یا مسلم لیگ (ن) کی جو جارحانہ اشتہاری مُہم ہے، وہ سب اُن کے اپنے فرمودات عالیہ ہیں۔

ایسے ہی مواقع کے لیے آغا شورش کاشمیری کا کالم اُن کے ہفت روزہ چٹان میں ہوتا تھا، جس کا عنوان تھا: "آنکھیں میری باقی اُن کا"۔ سو آپ کے فریق مخالف کا کمال فقط یہ ہے کہ انھوں نے آپ کے فرامین کے ٹوٹے، جنہیں آج کل الیکٹرونک میڈیا کی اصطلاح میں Clip کہتے ہیں، نہایت حکمت سے (Scientifically) جوڑ دیے ہیں اور وہ انہیں بلا تبصرہ بھی نشر کریں، تو اُن کا مقصد پورا ہوجاتا ہے، اسے اردو محاورے میں کہتے ہیں: "جس کی جوتی اسی کا سر"۔

ہماری حکومت سے بھی درخواست ہے کہ وہ بھی اپنے رَدِّ عمل اور رویے میں ٹھہراؤ پیدا کرے اور جناب اسحاق ڈار اور جناب شاہ محمود قریشی، باہم مل کر ایک ضابطۂ اخلاق وضع کریں اور ایک نسبتاً بہتر فضا میں مذاکرات کو کسی اچھے اور متفقہ نتیجے پر پہنچائیں تاکہ قوم کو اس اضطراب اور بے یقینی سے نجات ملے۔ ٹھہراؤ کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان جذبات کو قابو میں رکھتا ہے، جوش پر ہوش غالب ہوتا ہے اور وہ مغلوب الغضب نہیں ہوتا، اس لیے اپنے موقف جسے قانونی زبان میں Locus standi کہتے ہیں، کو زیادہ موثر اور مدلل انداز میں بیان کرتا ہے۔ چناں چہ اسپیکر جناب ایاز صادق کے فرزند نے عدالت سے باہر آکر اپنی اس صلاحیت کا بہتر طور پر مظاہرہ کیا اور کسی بھی غیر جانب دار شخص کو قائل کرنے

کے لیے یہ انداز شریفانہ اور متاثر کن تھا۔

جناب عمران خان کی قانونی ٹیم کے وکلا، جن میں حامد خان صاحب بھی ہیں، نہیں معلوم کیوں انہیں قائل کرنے میں ناکام ہیں کہ ملک اور عدالتیں ایک نظامِ قانون کے تحت چل رہی ہیں اور الیکشن کمیشن، الیکشن ٹرائی بیونل، عدالتِ عالیہ اور عدالتِ عظمیٰ میں اسی میکنزم سے اپنے موقف کو ثابت کیا جا سکتا ہے اور منوایا جا سکتا ہے، یک طرفہ پرجوش خطابات اور مفروضوں کے بل پر ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اعلیٰ عدالتوں کے چیف جسٹس صاحبان، جج صاحبان اور چیف الیکشن کمشنر جو بھی شخصیت ہوں، اُنہیں آئین وقانون کے دائرے میں رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ جناب عمران خان کی تحریک کسی انقلابی ایجنڈے کی حامل نہیں ہے، بلکہ نظام کے اندر رہتے ہوئے ان کے خیال میں یا ان کے دعووں کے مطابق 2013ء کے انتخابات میں ہونے والی دھاندلی کے ازالے اور حصولِ انصاف کے لیے ہے۔

ہمارے ہاں نادرا کے ذریعے ووٹرز کے انگوٹھوں کی جانچ کو ابتدا میں بنیاد بنایا گیا، مگر بعد میں الیکشن کمیشن نے اس ساری بنیاد کو ہی مسمار کر دیا۔ اور یہ بھی ایک اہم سوال ہے کہ آیا الیکشن قوانین میں نادرا کے ذریعے ووٹرز کے انگوٹھے کے نشان کو جانچ کر ووٹ کو بوگس قرار دینے کا قانون موجود ہے، تو پھر کیا ایسے کسی فیصلے کو عدالتوں میں چیلنج نہیں کیا جائے گا۔ سو ہمیں جامع اور دھاندلی پروف انتخابی قوانین کی ضرورت ہے، ایسے قوانین پارلیمنٹ میں نمائندگی رکھنے والی تمام قابلِ ذکر سیاسی جماعتوں کے اتفاقِ رائے ہی سے بنائے جا سکتے ہیں۔ محض فساد اور انارکی سے ملک وقوم اور سب کا نقصان ہوگا۔ ابھی تک تو اس قوم نے حقیقی انقلاب کی صورت نہیں دیکھی، صرف بعض خوش فہم حضرات خواب ضرور دیکھتے ہیں، مستقبل کے پردے میں کیا مستور ہے، غیب کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

سابق چیف الیکشن کمشنر جناب جسٹس (ر) فخر الدین جی ابراہیم کی طرح موجودہ چیف الیکشن کمشنر جناب جسٹس (ر) سردار رضا خان بھی تحریکِ انصاف سمیت تمام سیاسی جماعتوں کے مکمل اتفاقِ رائے سے اس عہدے پر فائز ہوئے ہیں۔ لیکن انہیں بھی پہلے

سے موجود قوانین کے دائرے میں رہ کر کام کرنا ہوگا، تاوقتیکہ کوئی نیا قانونی نظام آجائے، سو خدشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ:

پہلے جس بات پہ اُسے پسند کیا
پھر اُسی بات پہ اُسے ناپسند کیا

پوری قوم کی دلی خواہش ہے کہ آنے والے انتخابات منصفانہ، شفاف اور لاقانونیت، دھاندلی اور جُھرلو کی ہر مکروہ صورت سے پاک ہوں، بائیومیٹرک سسٹم بھی لاگو کیا جائے، لیکن ایسا نظام پارلیمان سے باہر رہ کر طعن وتشنیع سے نہیں بن پائے گا، سب کو اس میں پوری فعالیت، بیدار مغزی اور اخلاص کے ساتھ حصہ لینا چاہیے، ورنہ بعد اَز مرگ واویلا بے سود ہوتا ہے۔

اگرچہ اہلِ دانش کا ایک مؤثر طبقہ آج بھی موجود ہے، جو کہتا ہے اس نظامِ جمہوریت نے ملک وقوم کو کیا دیا؟، درست ہے، تسلیم ہے کہ جمہور کو جمہوریت کی برکات نہیں ملیں، مگر سوال یہ ہے کہ فوجی حکم رانی نے کیا دیا؟۔ کچھ حضرات کے فرمودات کے بین السطور میں یا اشارات وکنایات میں یہ پیغام بھی مضمر ہوتا ہے کہ کوئی داعش بھی آتی ہے، تو آئے، ڈر کس بات کا؟۔ سرکشوں کے سر ہی تو قلم ہوں گے اور ہم لطف اٹھائیں گے۔ لیکن حضور! کسے معلوم کہ وقت آنے پر کس کی گردن پہلے کٹے گی اور کس کی بچے گی؟۔

دین کی تعلیم یہ ہے کہ آفات وبلیات کو دعوت نہ دی جائے، امتحان وآزمائش اور فتنوں کی دعائیں نہ کی جائیں۔ اگر قضائے الٰہی سے ناگہانی طور پر آجائے تو پھر استقامت اور عافیت کی دعا مانگی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی آخری آیتِ مبارکہ میں یہ دعا مانگنے کی تعلیم دی ہے:

"اللہ کسی نفس (جیتے جاگتے انسان) کو اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا (یہاں تکلیف سے مراد احکام اور آزمائشیں ہیں)، (پھر ربِّ ذوالجلال بندے کو اِس دعا کی تلقین فرماتا ہے): اے ہمارے پروردگار! ہم سے اگر بھول یا خطا ہوجائے، تو ہماری

گرفت نہ فرمانا، اے ہمارے پروردگار! ہم پر (احکام کا) وہ بوجھ نہ ڈال جیسا کہ تو نے ہم سے پہلی (امتوں) پر ڈالا تھا، اے ہمارے پروردگار! ہم پر (آزمائشوں اور احکام کا) وہ بوجھ (یعنی ذمے داری) نہ ڈال، جس سے (کامیابی کے ساتھ) عہدہ برا ہونے کی ہم میں طاقت نہ ہو، ہمیں معاف فرما اور ہماری (ہر تقصیر کو) بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور قومِ کفار کے مقابل ہماری نصرت فرما''۔ (البقرہ: 286)

''رسول اللہ ﷺ ناقابلِ برداشت آزمائش، بدبختی میں مبتلا ہونے، بُری قضا اور دشمنوں کی بدخواہی سے اللہ کی پناہ طلب کرتے تھے''۔ (بخاری: 6347)

اسی طرح آپ ﷺ سے یہ دعا بھی منقول ہے: ''ہم تمام فتنوں سے، خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ، اللہ کی پناہ چاہتے ہیں''۔

اور یہ بھی مسنون ہے: ''اے اللہ! میں (ہر قسم کے) غم واندوہ، (مشکلات کے آگے) بے بس ہو جانے، سستی، بخل، بزدلی، قرض کے بوجھ تلے دب جانے اور (ظالم) لوگوں کے غلبے سے تیری پناہ چاہتا ہوں''۔ (بخاری: 6363)

نوٹ: یہ کالم 7 دسمبر کی شام کو تحریر کیا گیا ہے اور ہم 8 دسمبر کے خیر و عافیت سے گزر جانے کی دعا کرتے ہیں۔

9 دسمبر 2014ء

امام الصوفیہ حضرت سید علی ہجویری نور اللہ مرقدہم

امام الصوفیہ حضرت ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسن کے توسط سے امام الاولیاء و امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ آپ کا عہد مشہور روایات کے مطابق 400ھ تا 465ھ ہے، آپ کا مزارِ پرانوار 24 گھنٹے مرجعِ خلائق رہتا ہے۔

تصوف بنیادی طور پر صفائے قلب اور روح کی جلا کا نام ہے۔ اسے قرآن و حدیث میں تزکیہ، احسان اور عرفان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت سید علی ہجویری نے تصوف کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

(۱) صوفی (۲) مُتصوِّف (۳) مُستَصوِف

حضرت سید علی ہجویری لکھتے ہیں:

(۱) صوفی وہ ہے جو اپنے وجود سے فانی ہو کر حق کے ساتھ باقی ہو گیا ہو، نفسانی خواہشات اور ان کے تصرف سے آزاد ہو کر حقیقت الحقائق یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ واصل ہو گیا ہو۔

(۲) مُتصوِّف وہ ہے جو مجاہدے اور ریاضت کے ذریعے اِس مقام کے حصول کے لیے کوشاں ہے اور راہِ حقیقت کی تلاش میں اپنے آپ کو صوفیہ کے طریقے پر کاربند رکھتا ہے۔

(۳) مُستَصوِف وہ ہے جو دنیوی منفعت کے حصول اور جاہ و مرتبے کی لالچ میں صوفیہ کی نقالی کر رہا ہو، اسے نہ تو اوپر والے دونوں گروہوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی اسے طریقت کے بارے میں کوئی ادنیٰ سی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مشائخ کرام نے ایسے

لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے: ''مُستَصوِف صوفیہ کے نزدیک مکھی کی مانند ہے اور غیر صوفیہ (عوام) کے لیے بھیڑیا ہے''۔

صوفیائے کرام مُستَصوِف کو مکھی سے اس لیے تشبیہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ صوفیہ کی نقالی ہوا و ہوس کی خاطر کرتے ہیں جیسے مکھی کسی چیز پر بھنکتی رہتی ہے اور عوام کے حق میں اس لیے بھیڑیے ہیں کہ بھیڑیے کا کام بھی چیرنا پھاڑنا اور مردار کھانا ہے، یعنی ناجائز طریقے، حیلے اور مکر و فریب سے مفادات سمیٹنا ہے۔ الغرض صوفی صاحبِ وصول ہوتا ہے اور متصوف واصل باللہ ہوتا ہے اور مُستَصوِف صاحبِ فصول یعنی ذاتِ حقِ تعالیٰ اور راہِ حق سے دور ہوتا ہے، وہ مزید لکھتے ہیں:

''صوفیہ سے متعلق آج کل یہ مصیبت عام ہوگئی ہے، ملحدین کے ایک گروہ نے جب حقیقی صوفیہ کی شان اور قدر و منزلت دیکھی، تو اپنے آپ کو بھی ان کا ہم شکل بنالیا اور کہنا شروع کردیا کہ طاعت و عبادت کی تکلیف اس وقت تک ہے، جب تک معرفت حاصل نہیں ہوجاتی۔ جب معرفت حاصل ہوگئی تو عبادات و طاعت کی تکلیف جسم سے اُٹھ جاتی ہے (یعنی انسان اللہ تعالیٰ اور رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام اور شریعت کا مکلّف (جواب دِہ) نہیں رہتا)''۔

حقیقی صوفیائے کرام کی شکل اختیار کرنے یا حلیہ بنانے یا لبادہ اوڑھنے کا تکلف بھی حضرت داتا صاحب کے عہد یعنی اسلام کی قرونِ اولیٰ اور قرونِ وُسطیٰ کی مجبوری تھی، ورنہ آج کل اس طرح کے کسی تکلف کی بھی قطعاً کوئی حاجت نہیں ہے اور نہ ہی ظاہری اعتبار سے تدیُّن اور تشرُّع کی صورت اختیار کرنے کا تکلف کیا جاتا ہے، ہر قسم کا شکار خود ہی شکاری کے جال میں پھنسنے کے لیے بے قرار ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی حقیقت کو منظوم انداز میں بیان کیا ہے

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

حضرت سید علی ہجویری نے بتایا کہ روحانی ارتقاء کی راہ میں دو چیزیں حائل ہوتی ہیں: ایک ''رَین'' اور دوسری ''غَین''۔ دراصل قلبی اور روحانی خرابیوں میں ایک تو کفر، شرک اور نفاق ہے اور اس کے سبب انسان کے دل و دماغ پر ہدایت کے انوار و تجلیات کا فیضان مستقل طور پر رک جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: حجاب کی دو قسمیں ہیں: ایک ''رَینی'' اور یہ کبھی نہیں اٹھتا، وہ مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: بعض لوگوں کی ذات خود حق سے حجاب کا سبب ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کے نزدیک حق اور باطل یکساں ہو جاتا ہے۔ اسی حجاب کو ''رَین'' کہتے ہیں اور اسے قرآن میں ختم، طبع، اِغفال، اَکِنہ اور قساوت سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے: ''ہرگز نہیں، بلکہ ان کے کرتوتوں کے سبب ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے''۔ (المطففین: 14)

یہ لوگ ناقابلِ اصلاح ہوتے ہیں اور ہدایت سے ہمیشہ محروم رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور اُنہوں (کافروں) نے کہا: جس دین کی طرف آپ ہمیں بلا رہے ہیں، اُس کی (قبولیت کی) راہ میں ہمارے دلوں پر پردے چڑھے ہوئے ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان حجاب ہے''۔ (حٰم السجدہ: 05)

دوسری قسم کے حجاب کو ''غَین'' کہتے ہیں۔ دراصل یہ انسان کے دل میں حرص و طمع، بُخل، ہوا و ہوس، حسد، کِبر و نخوت، ریا اور دیگر اَخلاقی اَمراض ہوتے ہیں، جن کے سبب انسان کے دل پر پردہ پڑ جاتا ہے، مگر یہ حجاب عارضی ہوتا ہے اور توبہ و استغفار سے زائل ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''میرے دل پر کبھی (انوار کے غلبے سے) اَبر چھا جاتا ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے ایک دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں''۔ (صحیح مسلم: 42)

بعض شارحین نے لکھا ہے کہ:

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سید المرسلین ﷺ کے مقاماتِ عالیہ کے ارتقاء کا سفر جاری رہتا ہے اور جب وہ اپنے اگلے مقامِ رفیع سے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں، تو ایک

غُبار سا چھا جاتا ہے اور مقامِ نبوت کے حوالے سے اسی کو ''غین'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

''رَین'' کی مثال وطن کی سی ہے، جو مستقل ہوتا ہے اور ''غین'' سے وہ خیالات وخَطرات ہیں، جو دل پر طاری ہوتے ہیں اور کبھی دل میں جگہ بھی پالیتے ہیں، لیکن توبہ واستغفار سے ان کے اثرات مٹ جاتے ہیں۔

حدیثِ پاک میں مرتبۂ احسان کو ان کلمات میں بیان فرمایا گیا ہے: ''(احسان یہ ہے کہ) تم اللہ کی عبادت اس قدر حضوریِ قلب (Presence of Mind) سے کرو کہ گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم (اپنی بشری نارسائی کے سبب) اسے نہیں دیکھ پاتے، تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے''۔ (صحیح بخاری:50)

چنانچہ حضرت سید علی ہجویری اسی مقامِ احسان کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''میں نے حاتمِ اَصَم رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: آپ نماز کس طرح ادا فرماتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: جب نماز کا وقت آتا ہے، تو پانی سے ظاہری وضو کرتا ہوں (یعنی اس سے اعضائے وضو کی پاکیزگی حاصل کرتا ہوں) اور توبہ کے ذریعے باطنی وضو کرتا ہوں، یعنی توبہ سے قلب وروح کی طہارت حاصل ہوتی ہے۔ مسجد میں نماز پڑھتے وقت خانۂ کعبہ کو اپنے سامنے، مقامِ ابراہیم کو دونوں ابروں کے درمیان، بہشت کو دائیں، دوزخ کو بائیں، پلِ صراط کو قدموں کے نیچے اور فرشتۂ موت کو اپنے پیچھے تصور کرتا ہوں۔ اس کے بعد اللہ کی عظمت وجلالت کو اپنے ظاہر وباطن پر طاری کر کے اللہ اکبر کہتا ہوں، اعزاز ووقار کے ساتھ قیام کرتا ہوں، قراءت کے وقت اللہ کی ہیبت دل پر طاری رہتی ہے، تواضع اور انکسار کے ساتھ رکوع اور از حد تضرُّع اور عاجزی کے ساتھ سجدہ کرتا ہوں، حِلم ووقار کے ساتھ قعدہ کر کے شکر کے ساتھ سلام پھیرتا ہوں''۔

جنت کو دائیں اور دوزخ کو بائیں رکھنے کی حقیقت کو اس قول میں بیان کیا گیا ہے کہ: ''ایمان خوف ورجا کے درمیان ہے''، یعنی حقیقتِ ایمان اور کمالِ ایمان یہ ہے کہ

انسان کے دل پر خشیت وہیبتِ الٰہی بھی طاری ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عفو ومغفرت پر اس کا یقین بھی مرتبۂ کمال پر ہو، اسی کو وعظ وتذکیر کے عنوان پر مجموعۂ احادیث میں ترغیب وترہیب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرشتۂ اَجل کو پیچھے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندۂ مومن کو ہر آن موت کے لیے تیار رہنا چاہیے اور پل صراط کو سامنے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے جادۂ مستقیم پر ایک ایک قدم ہزار بار سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے، ورنہ ذرا سی بے احتیاطی اور لغزش سے انسان گہرے ظلمت کدے میں گر سکتا ہے یا جہنم کا ایندھن بن سکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے اپنی پناہ عطا فرمائے۔

پس تحریر: ''ایک اچھی علامت'' کے عنوان پر میرا کالم پیر 8 دسمبر کو شائع ہوا، اس کا Feed Back بہت مثبت آیا۔ ایک قاری نے میری ایک فروگزاشت کی نشان دہی کی، میں ان کا از حد شکر گزار ہوں، وہ یہ کہ میں نے چیف الیکشن کمشنر کا نام جناب جسٹس (ر) شاکر اللہ جان لکھ دیا تھا، حالانکہ جناب جسٹس (ر) سردار رضا خان چیف الیکشن کمشنر کے منصب پر فائز ہوئے ہیں، جج صاحب سے بھی بصد ادب معذرت۔ عام طور پر ہمارے ادارتی صفحے کے ذمے داران اس طرح کی فروگزاشتوں کی تصحیح کر دیتے ہیں، لیکن اس بار اُن سے بھی صرفِ نظر ہو گیا۔

12 دسمبر 2014ء

حرفِ مُدّعا

الیکٹرونک میڈیا کے حوالے سے میری گزارشات پر مشتمل ایک کالم طبع ہوا تھا۔ حیدرآباد سندھ سے ایک محب و مشفق سید منیر احمد صاحب کا اُس پر مفصل تبصرہ ایک موقر روزنامہ میں شائع ہوا ہے، ممکن ہے اُنہوں نے روزنامہ دنیا کو بھی ارسال کیا ہو، لیکن کسی وجہ سے نہ چھپ سکا ہو۔ میں نے الیکٹرونک میڈیا کے ذمے داران سے گزارش کی تھی کہ وہ پاکستان کی دینی، ملّی، تہذیبی اور سماجی اَقدار کے حوالے سے اَخلاقیات کا کوئی کم اَزکم معیار باہمی اتفاقِ رائے سے وضع کریں اور اسے رضا کارانہ طور پر اپنے اوپر نافذ کریں، کیونکہ وہ بھی مسلمان اور پاکستانی ہیں اور قوم کی موجودہ اور آنے والی نسلوں کی دینی واَخلاقی تربیت کی ذمے داری اُن پر بھی عائد ہوتی ہے، کیونکہ پاکستان میں پیدا ہونے والا ہر بچہ قوم کا اثاثہ اور قیمتی سرمایہ ہے۔

ہر ایک کو معلوم ہے کہ اب مختلف و متنوع تضادات، سیاسی آویزش اور خلافیات کے سبب حکومتوں کی گرفت، جو پہلے ہی کم زور تھی، ہر گزرتے دن کے ساتھ کم زور تر ہوتی نظر آرہی ہے۔ لہٰذا اب حکومت سے بالخصوص اس شعبے میں اصلاحِ احوال کی توقع عبث ہے۔ میڈیا کی مثال اب بے لگام منہ زور گھوڑے کی سی ہے جو نہ تو کسی ضابطے اور اَخلاقی حدود و قیود کا پابند ہے اور نہ ہی اس کی کوئی سَمت یا منزل واضح ہے، البتہ کبھی کبھی بعض مؤثر طبقات یا تنظیموں کا غیر سرکاری جبر اور دباؤ مؤثر نظر آتا ہے، لیکن اس کا تعلق دینی یا ملّی اقدار سے نہیں، بلکہ ان کی کورتیج سے ہوتا ہے۔ اور بہر حال اُن کے سامنے یہی آزاد میڈیا

سراپا مائل بہ اطاعت ہو جاتا ہے، کیونکہ حق کی طاقت تو کم لوگوں کے لیے قابلِ تسلیم ہوتی ہے، مگر طاقت کی زبان ہر کوئی آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔

سید منیر احمد صاحب نے لکھا ہے کہ آپ نے پرنٹ میڈیا کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کر دیا ہے، جبکہ اس دوڑ میں یہ بھی الیکٹرونک میڈیا سے کم نہیں ہے۔ اُن کی یہ بات سو فیصد درست ہے اور بالواسطہ سب ہی میرے مخاطَب تھے۔ لیکن اب ہم دن بہ دن اَخلاقی وتہذیبی اَقدار کے حوالے سے زوال کی طرف جارہے ہیں اور ہمارا یہ سفر نہایت تیز رفتاری سے جاری ہے اور کہیں اس کے رکنے کے آثار نظر نہیں آرہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی کی بات پھیلے، اُن کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے، (النور:19)''۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا نام ونشان اسی اَخلاقی پستی کے سبب صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''سو جب ہمارا عذاب آپہنچا، تو ہم نے ان کی بستی کو تہ وبالا کر دیا اور ہم نے اُن پر پتھر کے کنکر لگا تار برسائے، جو آپ کے رب کے نزدیک (ہر مجرم کے لیے) نشان زدہ (Guided) تھے اور یہ سزا اُن ظالموں سے کچھ دور نہ تھی''۔ (ہود:82)

اُن کا یہی انجام ''سورۃ الحجر'' آیات:75-74 اور ''سورۃ الذّاریات'' آیات:34-33 میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اُن کا جو جرم بیان فرمایا، وہ یہ ہے: ''اور ہم نے لوط کو بھیجا، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: بے شک تم بے حیائی کا وہ کام کرتے ہو، جو تم سے پہلے جہان والوں میں سے کسی نے نہیں کیا اور تم ڈاکے ڈالتے ہو اور تم اپنی مجلسوں میں (کھلے عام) بے حیائی کا کام کرتے ہو''۔ (سورۃ العنکبوت:29)، اسی مضمون کو ''سورۃ الاعراف'':81-80، ''سورۃ الشعراء'':165-164 اور ''سورۃ النمل'':55-54 میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (ا) ابنِ آدم پر زنا کا حصہ لکھ دیا گیا ہے، جسے وہ لازماً پائے گا۔ پس آنکھ کا زنا دیکھنا ہے اور جب مرد کی نامَحرم پر نظر پڑتی ہے، تو (نامَحرم سے

رخ پھیر لینے سے (اس کی پاک بازی کی) تصدیق ہوتی ہے۔اور زبان کا زنا (شہوت انگیز) باتیں کرنا ہے اور دل میں (زنا کی) تحریک پیدا ہوتی ہے اور شرم گاہ (گناہ میں مبتلا ہوکر) کبھی اس کی تصدیق کرتی ہے اور کبھی (گناہ سے بچ کر) اس کی تکذیب کرتی ہے، یعنی پہلی صورت میں تصدیق مستحسن ہے اور دوسری میں مذموم ہے''۔(مسند احمد:8215)

(۲) جو شخص مجھے اپنی زبان اور شرم گاہ (کو شریعت کے تابع رکھنے) کی ضمانت دے، میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں''۔(بخاری:6474)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے اوّلین خطبۂ خلافت میں فرمایا تھا: ''جس قوم میں بے حیائی فروغ پالے، اس پر بلیات یعنی آزمائشوں اور آفات کا نزول ہوتا ہے''۔

الغرض اسلام بندۂ مومن کو فواحش ومُنکرات سے بچانے کے لیے سدِّ ذرائع کو اختیار کرتا ہے اور گناہ کے اسباب اور ترغیبات کا راستہ روکتا ہے، جن کو انسان پہلے پہل محض معمولی چیز سمجھ کر اختیار کرتا ہے اور آخر کار گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''حلال واضح ہے اور حرام (بھی) واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں، جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچا اس نے اپنے دین اور آبرو کو بچالیا اور جو شخص شبہات میں ملوث ہو گیا، وہ اس چرواہے کی طرح ہے، جو ممنوعہ چراگاہ کے گرد اپنے مویشی چرائے، خدشہ ہے کہ وہ اس میں داخل ہو جائیں گے۔ سنو! ہر بادشاہ کی ایک ممنوع چراگاہ ہوتی ہے، سنو! اس زمین میں اللہ کی ممنوع چراگاہ اس کے حرام قرار دیے گئے احکام ہیں، سنو! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہو تو پورا جسم درست ہوتا ہے اور جب اس میں خرابی پیدا ہو تو پورا جسم فاسد ہو جاتا ہے، سنو! وہ دل ہے''۔(بخاری:52)

اسی لیے فرمایا: کسی گناہ کو معمولی نہ سمجھو اور کسی نیکی کو بڑا نہ سمجھو، کیونکہ گناہ کو معمولی سمجھنے سے اس کے ارتکاب کا حوصلہ پیدا ہوتا اور نیکی کو بڑا سمجھنے سے انسان میں تقوے اور

پارسائی کا زعم (گھمنڈ) پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جو اپنی پارسائی کا دعویٰ کرتے ہیں، بلکہ اللہ ہی جس کو چاہے پاکیزہ بنادیتا ہے''۔ (النساء:49)

(۲) ''سو تم اپنی پارسائی کا دعویٰ نہ کرو، اللہ متقین کو خوب جانتا ہے''۔ (النجم:32)

پس انسان اللہ تعالیٰ کا ایک عجب تخلیقی شاہکار ہے، جو متضاد صفات کا حامل ہے۔ انسان کی سرشت میں اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ ملکوتی صفات کا ملکہ (Potential) بھی ودیعت فرمایا ہے اور اَدنیٰ اور رَذِیل خواہشات کے میلانات (Motives) بھی اس کی جِبلّت میں رکھے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ضمیر میں خیر وشر کی یہ کشمکش ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ اگر انسان کی ملکوتیت غالب آجائے، تو وہ رشک ملائک بن جاتا ہے، ایک حدیثِ پاک میں ہے:

رسول اللہ ﷺ کا اپنے صحابہ کے ایک حلقے کے پاس سے گزر ہوا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم (یہاں) کیوں بیٹھے ہو؟ اُنہوں نے عرض کی: ہم (یہاں) بیٹھ کر اللہ کا ذکر کررہے ہیں اور اس نے جو ہمیں دین کی ہدایت عطا فرمائی اور ہم پر احسان فرمایا، اِس پر اس کی حمد بیان کرتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! کیا تم صرف اسی نیک مقصد کے لیے یہاں بیٹھے ہو؟ صحابہ نے عرض کی: جی ہاں! اللہ کی قسم ہم صرف اسی نیک مقصد کے لیے یہاں بیٹھے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے کسی بدگمانی کی بنا پر تمہیں قسم نہیں دی، بلکہ میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور مجھے بتایا کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ کے سامنے تم پر فخر ومباہات کا اظہار فرمارہا ہے''۔ (سنن نسائی:3441)

اور اگر انسان کی ملکوتی صلاحیت مغلوب ہوجائے اور شر کی تحریکات وترغیبات (Motives) غالب آجائیں، تو پھر اس کا نفس، ''نفسِ امّارہ'' بن جاتا ہے اور شیطنت کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(۱) ''اور بے شک ہم نے جہنم کے لیے بہت سے ایسے جن اور انسان پیدا کیے، جن کے

دل ہیں مگر وہ اُن سے (حق کو) سوچتے سمجھتے نہیں اور اُن کی آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے (آیاتِ حق کو) دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر وہ ان سے (پیغامِ حق کو) سنتے نہیں، (درحقیقت) وہ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ''۔(الاعراف:179)

(۲) ''بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا، پھر ہم نے اس کو (اس کی سرکشی کے سبب) سب سے نچلے طبقے میں لوٹا دیا''۔(التین:5-4)

پس ہر ایک نے اپنے ایمان واعمال کا اپنے رب کے حضور جواب دینا ہے اور اس سے کسی کے لیے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ہرگز نہیں! اُس دن کہیں پناہ نہ ہوگی، اُس دن آپ کے رب کی طرف ہی (سب کے) ٹھہرنے کی جگہ ہوگی، اُس دن انسان کو اس کے تمام اگلے اور پچھلے کاموں کی خبر دی جائے گی''۔(القیامہ:11 تا 13)

بعض کی بداعمالیوں کے اثرات ان کی ذات تک محدود رہتے ہیں اور بعض کے اثرات پورے معاشرے یا معاشرے کی غالب اکثریت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور آج کل میڈیا کی صورتِ حال یہی ہے کہ اُس کے خیر وشر کے اثرات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا، انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور اس کے تمام شعبہ جات شامل ہیں۔

15 دسمبر 2014ء

16 دسمبر کا انتخاب

16 دسمبر 1971ء پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ اور المیہ ہے کہ اس دن پاکستان دولخت ہوا، مشرقی پاکستان ہم سے کٹ کر بنگلا دیش بنا اور پلٹن میدان ڈھاکا کا المیہ شاید کبھی نہ بھلایا جاسکے۔ یہ المیہ ہماری بے تدبیری اور ناکامیوں کے علاوہ دشمن کی سازشوں کا نتیجہ تھا۔ اس دن بانیانِ پاکستان کی روح کو یقیناً شدید اذیت پہنچی ہوگی، جب ان کے جانشین اُن کی چھوڑی ہوئی امانت کی حفاظت نہ کرسکے۔ آج بھی بنگلا دیش میں پاکستان کی سالمیت کے لیے لڑنے والوں اور پاکستان کی مسلح اَفواج کا ساتھ دینے والوں کو سزائے موت دی جارہی ہے اور ہماری پارلیمنٹ اِس حوالے سے ایک قرار دادِ مذمت بھی منظور کرنے کی جسارت نہ کرسکی۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے کے ٹھیک 43 سال بعد دہشت گردوں اور پاکستان کے دشمنوں نے ورسک روڈ پشاور میں آرمی پبلک اسکول پر سفاکانہ اور ظالمانہ حملے کے لیے اسی تاریخ کا انتخاب کیا۔ دہشت گردوں کے اِس ظالمانہ حملے کے نتیجے میں 132 نوعمر طلبہ اور اسکول کے عملے کے 9 افراد شہید ہوگئے، ان کے علاوہ بڑی تعداد میں افراد زخمی ہوئے اور بہت سے زخمیوں کی حالت تشویش ناک بتائی جارہی ہے۔ اس حملے کی ذمے داری تحریکِ طالبان پاکستان نے قبول کی ہے۔ لیکن اس تاریخ کا انتخاب اِس حقیقت کا عکاس ہے کہ اس کی منصوبہ بندی، وسائل کی فراہمی میں کہیں نہ کہیں متعصّبانہ ہندو ذہنیت کارفرما ہے تاکہ یہ پیغام دیا جائے کہ ہندوستان کی آتشِ انتقام ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی، بلکہ یہ

بدستور شعلہ زن ہے اور اس کے اثرات بلوچستان میں بھی محسوس کیے جارہے ہیں۔

وقتاً فوقتاً ہمارے ملک میں دہشت گردی کے واقعات رونما ہو رہے ہیں اور ان واقعات میں ہماری سلامتی کے اداروں، دفاعی اداروں اور حساس اداروں کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے اور یہ اس اَمر کا ثبوت ہے کہ ہمارے اداروں کی کمین گاہوں میں دشمن کے ہم درد کہیں نہ کہیں چھپے بیٹھے ہیں، جو اندرونی معلومات دشمنوں تک پہنچاتے ہیں اور اس طرح کے واقعات کی منصوبہ بندی میں ان کے مُمِد ومعاون بنتے ہیں۔ اس لیے ایک بے رحم اور بڑے عملِ جراحی (Surgery) کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے اداروں میں جو دشمن کے ایجنٹ گھسے بیٹھے ہیں اور یہ ایک Tumor کی صورت اختیار کر چکے ہیں، ان کو جڑ سے اکھیڑا جائے، ورنہ یہ آگے چل کر کینسر اور ناسور بنتا چلا جائے گا اور ہمارے جسدِ ملّی کے لیے تباہ کن ہوگا۔

یہ تو کہا جاتا ہے کہ خودکش حملے کو روکا نہیں جا سکتا، لیکن مؤثر، مربوط اور سائنٹیفک حکمتِ عملی سے ان کا سدِ باب کیا جا سکتا ہے، ان کا راستہ روکا جا سکتا ہے یا کم از کم ایسی وارداتوں کے امکانات کو کم کیا جا سکتا ہے۔ ہماری مسلح افواج پہلے ہی دفاعِ پاکستان کے حوالے سے نیا نظریہ (Doctrine) جاری کر چکی ہے کہ ہماری سلامتی کو سب سے بڑا خطرہ داخلی ہے اور ظاہر ہے کہ دشمن کی سب سے کامیاب حکمتِ عملی یہی ہوتی ہے کہ فریقِ مخالف کو اس کے گھر میں اتنا مصروف رکھا جائے کہ اُسے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملے۔ اس شاطرانہ ابلیسی کھیل میں دشمن کو ایک طرح سے بالا دستی (Advantage) حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ہدف کا تعین کرتا ہے، مہرے بدلتا ہے اور چالیں چلتا ہے۔ اِس حکمتِ عملی کو ناکام بنانے (To Counter) کا سب سے مؤثر طریقہ تو یہ ہے کہ دشمن کو اس کے گھر میں جواب دیا جائے، ورنہ برسبیلِ تنزل کم از کم یہ ہے کہ اپنے گھر کو اس قدر مضبوط بنایا جائے تاکہ دشمن کو سازشوں کے لیے کمین گاہیں فراہم نہ ہو سکیں۔

امریکا اور اہلِ مغرب نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی جنگ کو ہماری طرف دھکیل دیا، وہ اپنی جنگ ہماری سرزمین پر لڑ رہا ہے، اس کا ایندھن ہمارے لوگ بن رہے ہیں اور بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ دہشت گردی کا سب سے بڑا شکار بھی پاکستان ہے اور دہشت گردی کا سب سے بڑا الزام بھی پاکستان کے سر ہے۔ پوری دنیا نے دہشت گردوں کے خلاف اپنی نام نہاد جنگ میں وہ نقصان نہیں اٹھایا جو پاکستان نے اٹھایا ہے۔ اس آفت کو پاکستان کے سر پر مسلط کر دیا گیا ہے اور اس سے بچاؤ کی کوئی مؤثر تدبیر بھی نظر نہیں آ رہی۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے ایمان والو! غیروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ، وہ تمہاری بربادی میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے، انہیں (تو) وہی چیز پسند ہے جس سے تمہیں تکلیف پہنچے، ان کی باتوں سے تو دشمنی عیاں ہو چکی ہے اور جو (عداوت) وہ اپنے سینوں میں چھپائے بیٹھے ہیں، وہ اِس سے بھی بڑی ہے، ہم نے تمہارے لیے نشانیوں کو وضاحت سے بیان کر دیا ہے، اگر تم عقل سے کام لیتے ہو، سنو! تم ان سے محبت کرتے ہو، حالانکہ وہ تم سے محبت نہیں کرتے اور تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے اور جب وہ (آپس میں) تنہائی میں ہوتے ہیں، تو تمہارے خلاف غصے سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ آپ کہیے! تم اپنے غصے میں جل مرو، بے شک اللہ دلوں کی باتوں کو خوب جاننے والا ہے۔ اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو اُن کو بری لگتی ہے اور اگر تمہیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو اس سے انہیں فرحت ملتی ہے اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، تو ان کا مکروفریب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، بے شک اللہ (کی قدرت) ان کی تمام کارستانیوں پر محیط ہے''۔ (آلِ عمران: 118 تا 120)

ان آیات میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اپنے دشمنوں پر بھروسا نہ کریں، انہیں جب بھی موقع ملے گا، وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔ اور انہیں کبھی بھی اپنا رازدار نہیں بنانا چاہیے، خواہ وہ کتنی ہی ملمّع کاری کر کے اور دوستی کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آئیں۔ اگر مسلمان کا آئینۂ دل صاف ہو تو اللہ تعالیٰ اُس پر حقائق کو منکشف

فرما دیتا ہے اور وہ کسی سے دھوکا نہیں کھاتا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: بے شک اس میں اہلِ فراست کے لیے نشانیاں ہیں''۔(الحجر:75)،(سنن ترمذی:3127)

ہمارے سیاسی رہنما آج پشاور میں وزیراعظم کی صدارت میں طلب کیے گئے ایک اجلاس میں اظہارِ یکجہتی کے لیے جمع ہورہے ہیں۔ عام طور پر اس طرح کے اجلاسوں میں یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ چند تقاریر ہوتی ہیں اور پھر ایک قرارداد میڈیا کے لیے جاری کردی جاتی ہے، یعنی ایک رسمی کارروائی ہوتی ہے، جسے ہم اَشک شوئی سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ یہ حضرات قومی سوگ کے یہ تین دن پوری صورتِ حال کے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں پر تمام تر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ یک سُو ہوکر غوروفکر کریں اور پھر مکمل اتفاقِ رائے سے ایک حکمتِ عملی ترتیب دیں، جو قومی وحدت کی آئینہ دار ہو اور برسرِ اقتدار کوئی بھی فرد یا جماعت ہو، وہ اسے اپنانے اور جاری رکھنے کی پابند ہو۔ ہم بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان اٹھا چکے ہیں اور ہمارے بہت سے وسائل داخلی سلامتی پر خرچ ہورہے ہیں۔ اس لیے اس صورتِ حال کو نتیجہ خیز بنانا ازحد ضروری ہے۔

ہم ترقی یافتہ ملکوں میں دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی سیاسی جماعت یا شخص برسرِ اقتدار ہو، اہم قومی امور کے بارے میں ان کا ایجنڈا طے شدہ ہوتا ہے اور اقتدار مین تبدیلی سے قومی پالیسی میں کوئی بڑی معنوی تبدیلی رونما نہیں ہوتی، بلکہ متفقہ طور پر طے شدہ قومی ایجنڈے کا تسلسل جاری رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اُن کی حکمتِ عملی اُن کے قومی مقاصد واَہداف کے اعتبار سے کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ 9/11 کے بعد اس وقت کے امریکی صدر جارج بش نے جو حکمتِ عملی اختیار کی، وہ آج صدر اوباما کے دوسرے دور میں بھی جاری وساری ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں قومی مقاصد واَہداف کی ترجیحات اور سَمتِ قبلہ واضح نہیں ہوتیں، اس لیے یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ حکمران بھی کنفیوزڈ ہیں اور یہی فکری انتشار اور یک سُوئی کا فقدان عوام کو بھی منتشر رکھتا ہے۔ سرِ دست فوج کی پالیسی متعین اور طے شدہ

نظر آتی ہے اور بادی النظر میں سانحۂ پشاور کے بعد پہلی بار وزیر اعظم نے بھی کھل کر فوج کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کیا ہے، لیکن اس معرکے کو سر کرنے کے لیے قومی اتفاقِ رائے کی اشد ضرورت ہے، اس کے لیے وزیر اعظم کو اپنی لاتعلقی کی روش کو ترک کر کے قوم اور پوری قیادت کو اعتماد میں لینا ہوگا۔

19دسمبر 2014ء

چمن کی فکر کرو، آشیاں کا غم نہیں

پاکستان اکیسویں صدی کے آغاز ہی سے بوجوہ شدید مشکلات کا شکار رہا ہے۔ 9/11 کے بعد اُس وقت کے ہمہ مُقتدِر صدرِ پاکستان نے امریکا کی غیر مشروط اطاعت قبول کی، اُس کے مابعد (Post 9/11) اثرات سے ابھی تک ہمارا ملک نکل نہیں پایا۔ بڑے زلزلے کے بعد جو جھٹکے (After Shocks) آتے ہیں، اُن کا سلسلہ ابھی تک جاری وساری ہے۔ حکومتیں بیک وقت داخلی اور خارجی مشکلات کا شکار رہی ہیں۔ 9/11 کے بعد امریکا نے اپنی تمام سرگرمیوں کا مرکز ہمارے خطے کو بنایا اور جو جنگ ابتدا میں امریکا کی جنگ تھی، اب وہ ہماری جنگ بن چکی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد عالمی جنگ کے سب سے زیادہ اثرات بھی پاکستان پر پڑے ہیں۔ آج تک ہمارے جانی ومالی نقصان کے صحیح اور مُصدَّقہ اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں، حکمران اور میڈیا بھی صرف تخمینوں اور اندازوں پر مبنی بات کرتے ہیں۔ امریکا اور اہلِ مغرب، جن کی خاطر پاکستان نے یہ جنگ اپنے سر لی، کبھی بھی ہم سے مطمئن نہ ہو پائے، علامہ اقبال کے بقول:

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا، یہ کمالِ نَے نوازی

16 دسمبر کو آرمی پبلک اسکول پشاور کے سانحے نے پوری قوم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، ہر دل مَلول ہوا اور ہر آنکھ اشک بار ہوئی۔ اِس کا واحد اطمینان بخش پہلو یہ ہے کہ ہماری سیاسی قیادت نے پہلی بار بالغ نظری (Maturity) کا ثبوت دیا اور باہمی نفرتوں کو بالائے طاق

رکھ کر ملکی اور قومی مفاد میں بروقت سر جوڑ کر بیٹھے، اللہ کرے کہ یہ علامتی یک جہتی ہمارے حقیقی ملی اتحاد میں تبدیل ہو جائے۔ ہمارے سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں کی آپس کی مُنافرت اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خواہش کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، یہ حقیقت سب پر عیاں ہے۔لیکن اگر ہمیں یہ راز سمجھ میں آجائے کہ ایک قوم کی حیثیت سے ہماری عزت وآبرو پاکستان کے وقار سے وابستہ ہے تو ہماری مشکلات کافی آسان ہو سکتی ہیں، بقول شخصے:

''چمن کی فکر کرو، آشیاں کا غم نہیں''

چمن شاد وآباد رہے تو ہر ایک اپنی پسند کا آشیانہ بنا سکتا ہے، لیکن اگر خدانخواستہ چمن ہی ویران ہو جائے اور بادِ سَموم کی نذر ہو جائے تو آشیانے کہاں بنیں گے۔

جناب عمران خان نے قومی مفاد میں یک طرفہ طور پر اپنا 126 دنوں پر محیط دھرنا ختم کیا اور اپنی تحریک کو موقوف کیا، یہ اُن کی طرف سے ایک اچھا اِقدام (Gesture) ہے اور اِس کی وزیرِ اعظم نواز شریف کی طرف سے پذیرائی بھی کی گئی ہے، جو مناسب طرزِ عمل ہے، لیکن وہ اپنے مطالبات سے دست بردار نہیں ہوئے۔لہٰذا اب حکومت کی ذمے داری ہے کہ فریقین کے درمیان جواُمور طے پائے تھے، وہ حالات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن سے پیچھے نہ ہٹے۔فریقین کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ سنجیدگی کے ساتھ جاری رہنا چاہیے۔اگرچہ حکومت وقتی طور پر دباؤ سے نکل آئی ہے، لیکن جناب عمران خان نے یک طرفہ اقدام کرکے ایک طرح سے اَخلاقی اعتبار سے برتری (Edge) حاصل کی ہے اور اس کا جواب بھی اُسی انداز سے دینا چاہیے۔

پہلے حکومت کا واویلا یہ تھا کہ خان صاحب گن پوائنٹ پر باتیں منوانا چاہتے ہیں، اُنہیں چاہیے کہ مذاکرات کے دوران احتجاج کو موقوف کریں۔اب قدرت کی طرف سے سرِ دست تلوار نیام میں ڈال دی گئی ہے اور گن اَن لوڈ کردی گئی ہے، اب حکومت پر لازم ہے کہ وہ شرحِ صدر کے ساتھ اِس مسئلے کے حل کی طرف قدم بڑھائے اور اِس میں دو چار

غیر جانب دار ماہرِ آئین وقانون شخصیات کو سہولت کار (Facilitator) کے طور پر شامل کیا جائے۔اِن شخصیات کی غیر جانب داری اور حق پسندی اِس قدر واضح ہو کہ وہ کسی بھی فریق کے غلط کو غلط کہہ سکیں اور دو انتہاؤں میں درمیانی راہ نکال سکیں۔

ہماری فہم کے مطابق سرِ دست حکومت کا موقف یہ ہے کہ اگر کسی اتھارٹی کی جانب سے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت 2013ء کے قومی انتخابات میں دھاندلی ثابت ہو جائے، تو پھر یقیناً مجموعی طور پر انتخابات کے منصفانہ اور غیر جانب دارانہ ہونے کا اعتبار (Crediblity) قائم نہیں رہے گا اور نئے انتخاب کی طرف جانا ہوگا۔اور اگر دھاندلی بعض مقامات پر افراد کی طرف سے ہوئی ہے، تو جہاں جہاں دھاندلی ثابت ہو، اُس حلقۂ انتخاب کا فیصلہ مُروّجہ عدالتی نظام کے ذریعے از خود ہو جائے گا، بظاہر حکومت کا موقف مناسب معلوم ہوتا ہے۔البتہ اگر انتخابی قوانین میں کہیں اِبہام ہے، تو اُسے قانون سازی کے ذریعے دور کیا جانا چاہیے۔جبکہ اِس حوالے سے جناب عمران خان کا موقف کچھ واضح نہیں ہے، اُنہیں اِس مسئلے میں جنابِ جسٹس (ر) وجیہہ الدین احمد اور جسٹس (ر) ناصر اسلم زاہد کو پورے اختیارات دے کر مذاکراتی عمل میں شریک کرنا چاہیے، صرف سیاسی رہنماؤں کے مذاکرات سے مسئلہ حل نہیں ہوگا، اِسی طرح حکومتی ٹیم میں بھی آئینی وقانونی ماہرین شامل ہونے چاہییں، کیوں کہ قدم قدم پر قانونی موشگافیاں پیدا ہوں گی۔

مزید گزارش یہ ہے کہ وزیرِ اعظم میاں نواز شریف پارلیمنٹ سے باہر کی جماعتوں کے ساتھ بھی دہشت گردی کے مسئلے پر ایک نشست کا اہتمام کریں تاکہ کسی کو یہ احساس نہ ہو کہ ایک طبقے کو نظر انداز کیا جارہا ہے اور نہ ہی کسی میں احساسِ محرومی پیدا ہو۔قوم کے تمام عناصرِ ترکیبی کو عظیم تر دینی، ملی اور قومی مقاصد کے لیے آپس میں جوڑے رکھنا اور سب کو ایک لڑی میں ممکن حد تک پروئے رکھنا حاکمِ وقت کی ذمہ داری ہوتی ہے، ایسا نہ ہو کہ بقولِ علامہ اقبال:

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے
کہ میرِ کارواں میں نہیں، خُوئے دل نوازی

ہماری سیاسی ساخت کا المیہ یہ ہے کہ انتخابی سیاست اور احتجاجی سیاست کے عناصر جدا جدا ہیں اور یہ تقسیم شاید کافی عرصے تک جاری رہے گی، کیونکہ جن معاشروں میں قانون کی حکم رانی کا فقدان ہوتا ہے، وہاں یہ سیاسی کلچر جاری رہتا ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ حکومت کے لیے پہلی ترجیح پارلیمانی سیاسی جماعتوں کا اعتماد حاصل کرنا اور اُن کے مابین ایک اِجماعی سوچ پیدا کرنا ہوتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ لیکن پارلیمنٹ سے باہر کے عناصر اور تنظیموں کو بھی اعتماد میں لے لیا جائے اور اُنہیں یہ احساس دلایا جائے کہ قومی اتفاقِ رائے حاصل کرنے کے لیے اُن کی اہمیت بھی مُسلّم ہے، تو اِس میں بظاہر کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

پشاور کے سانحے کے حوالے سے بعض سرکردہ علماء کا بیان قومی اخبارات میں اِس سُرخی کے ساتھ شائع ہوا ہے کہ: ''مسلمانوں کا باہمی قتال کافروں والا کام ہے''۔ قتال کے معنیٰ ہیں: ''دو افراد یا دو جماعتوں کا ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہونا''۔ اب اِس وقت جس قِتال کی صورت کا پاکستان کو سامنا ہے، وہ بعض عناصر یا تنظیموں کا حکومت کے خلاف یا پاکستان کی مُسلّح افواج کے خلاف لڑنا ہے، تو سوال یہ ہے کہ کیا دونوں کا شرعی حکم ایک ہے؟۔

پاکستان میں حکومت یا مُسلّح افواج سے برسرِ پیکار عناصر جو وقتاً فوقتاً مُسلّح افواج اور دفاعی تنصیبات کے علاوہ سویلین کو بھی نشانہ بناتے ہیں، اُن کا موقف یہ ہے کہ یہ لوگ چوں کہ حکومت کے خلاف لڑنے کے لیے اُن کے ہم نوا نہیں ہیں یا حکومت کے حامی ہیں، لہٰذا ایسے سب لوگ اِن کے نزدیک واجب القتل ہیں۔ اِس لیے حکومت کی ذمے داری ہے کہ اِس مسئلے میں تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء سے فتویٰ حاصل کریں کہ آیا حکومت اور مُسلّح افواج اور اُن سے مُحارِب (Combatant) گروہوں کی حیثیت ایک ہے؟۔

عام طور پر اِن مواقع پر حکومت سہل پسندی سے کام لیتی ہے اور جو علماء بھی آسانی سے دستیاب ہو جائیں، اُن کو جمع کر کے ایک بیان جاری کرا دیا جاتا ہے۔ اِس طرح کے بیانات کی نتیجہ خیزی (Productivity) صِفر ہوتی ہے۔ پس لازم ہے کہ اُن علماء سے

رابطہ کیا جائے جو اپنے اپنے مسالک میں مُسَلَّم ہیں اور جنہیں اپنے مسلک کے علماء اور عوام میں یکساں طور پر علمی اور فقہی استناد (Authority) کا درجہ حاصل ہے۔ اِس مسئلے کی طرف متوجہ کرنا میں نے اِس لیے ضروری سمجھا کہ ہمارا وطنِ عزیز گزشتہ ڈیڑھ عشرے سے امریکا کی مُسلّط کردہ داخلی جنگ میں اُلجھا ہوا ہے اور ہماری مُسلّح افواج کا اَفرادی نقصان ہندوستان کی مُسلط کی ہوئی 1965ء اور 1971ء کی باقاعدہ جنگوں سے بھی زیادہ ہے۔ ایک عام سپاہی سے لے کر جنرل کے Rank تک ہماری اَفواج نے قربانیاں دی ہیں اور دشمنوں کا نشانہ بنی ہیں، اِسی طرح دفاعی تنصیبات کا نقصان بھی غیر معمولی ہے۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے محدود مالی وسائل کا ایک مُعتَدبِہ (Sizeable) حصہ ہماری داخلی سلامتی پر خرچ ہو رہا ہے، اِس میں اہم سرکاری وغیر سرکاری اَفراد، اِداروں، سفارت کاروں، سفارت خانوں اور تنصیبات سب کا تحفظ شامل ہے اور اس کے باوجود بے امنی کا سلسلہ جاری ہے، لٰہذا اِس مسئلے کا پائیدار حل تلاش کیا جانا چاہیے۔

20 دسمبر 2014ء

فلسفۂ حدود وتعزیرات

اللہ تعالیٰ انسان اور اُس کی فطرت کا خالق ہے۔ اس نے انسان کی جبلّت میں بیک وقت غضبانی اور ملکوتی استعداد (Potential) ودیعت فرمائی۔ اسی لیے خیروشر کی ایک کشمکش نیکی اور بدی کی ترغیبات (Motives) کی صورت میں انسان کے وجود کے باہر اور ایک خود انسان کے اپنے وجود کے اندر برپا رہتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو ہونٹ پیدا نہیں کیے اور اسے نیکی اور بدی میں تمیز کا شعور عطا نہیں کیا''۔ (البلد: 8 تا 10)

اور فرمایا: ''اور نفس کی قسم اور جس نے اس کو درست بنایا، پھر بدی اور پرہیزگاری میں تمیز کا ملکہ اس کو الہام فرمادیا، سو جس نے اپنے نفس کو گناہوں سے پاک کرلیا، وہ کامیاب ہوا اور جس نے اپنے نفس کو گناہوں سے آلودہ کرلیا وہ ناکام رہا''۔ (الشمس: 7 تا 10)

ان آیاتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ہدایت کے دو اسباب پیدا فرمائے۔ ایک انسان کے وجود کے اندر ہے اور وہ اس کا ضمیر یا نفسِ لوّامہ (Conscience) ہے، یعنی انسان کی فطرت میں وہ ملکہ جو اُسے نیکی اور بدی میں تمیز کا شعور عطا کرتا ہے۔ اور انسان کے وجود سے خارج بھی ہدایت کے دو اسباب مقدر فرمائے، ایک انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت اور دوسرا اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ الہامی اور سماوی کتابیں۔

انسان اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا تخلیقی شاہکار ہے، ارشاد فرمایا:

(ا) ''اور بے شک ہم نے انسان کو عزت وتکریم سے نوازا''۔ (الاسراء: 70)

(۲) ''اور ہم نے انسان کو سب سے بہترین ساخت میں پیدا کیا''۔(التین:4)

لہٰذا اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی رحیم وکریم نہیں ہوسکتا۔ حدیثِ پاک میں ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قیدی آئے، قیدیوں میں ایک عورت اپنے پستان سے بچے کو دودھ پلا رہی تھی، جب وہ اپنے بچے کو دیکھتی تو اس کو پکڑ کر اپنے سینے سے چمٹاتی اور اس کو دودھ پلاتی، تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے فرمایا: کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے گی؟، ہم نے کہا: اگر اس کا بس چلے گا تو یہ اپنے بچے کو آگ میں (ہرگز) نہیں ڈالے گی، تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ ماں اپنے بچے پر جتنی مہربان ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے بہت زیادہ مہربان ہے''۔(صحیح بخاری:5995)

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ نے رحمت کو پیدا کیا، تو اس نے سو رحمتیں پیدا کیں، پس اس نے ننانوے رحمتیں اپنے پاس رکھ لیں اور ایک رحمت تمام مخلوق میں بھیج دی، اگر کافر کو ان تمام رحمتوں کا علم ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں، تو وہ جنت سے مایوس نہیں ہوگا اور اگر مومن کو اس تمام عذاب کا علم ہو جائے، تو وہ دوزخ سے بے خوف نہیں ہوگا''۔(بخاری:6469)

حدیث کے یہ معنی نہیں لینے چاہییں کہ پوری کائنات میں تمام حیوانات کی ماؤں کو اپنی اولاد پر جو رحمت ورأفت ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا 100 واں حصہ ہے، ہرگز نہیں! یہ نسبت بھی محض سمجھانے کے لیے ہے، ورنہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی لامتناہی اور لامحدود (Infinite) رحمت کے ساتھ سرے سے کوئی نسبت ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ کائنات میں جو بھی چیز ہے، اُس کی ایک انتہا اور حد ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کی کوئی حد نہیں ہے۔ پس سوچنے کا مقام ہے کہ ایک ماں کے حصے میں پوری کائنات کی مجموعی رحمت میں سے کتنا حصہ آتا ہوگا اور جب اس کا عالَم یہ ہے کہ ایک ماں اپنے بچے کو آگ میں جلانے کا سوچ بھی نہیں سکتی، تو اللہ تعالیٰ کیوں اپنی مخلوق کو عذاب دینا پسند فرمائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا، اگر تم شکر ادا کرو اور (خالص) ایمان لے

آؤ"۔(النساء:147)

یعنی عذاب دینا اللہ تعالیٰ کی رضا نہیں ہے، مگر یہ اس کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے، جو اس کے حکم سے نافذ ہوتا ہے۔ اسی کو مشیتِ باری تعالیٰ کہتے ہیں۔

یہ چند تمہیدی کلمات میں نے اس لیے عرض کیے کہ پاکستان میں سزائے موت کی بحالی کے بعد بعض اخبارات نے یہ بحث چھیڑی کہ آیا سزائے موت اپنے نتائج اور اثرات کے اعتبار سے اصلاحِ معاشرہ کے لیے مفید ہے یا نہیں؟۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے بڑھ کر اپنی مخلوق کے لیے کوئی بھی رحیم وکریم نہیں ہوسکتا اور اگر ظالم، قاتل، جابر، مُفسد، دہشت گرد اور مشرک وکافر کو سزا دینا رحمتِ باری تعالیٰ کے منافی ہوتا تو جہنم کو پیدا ہی نہ کیا جاتا اور عقوبت وسزا کا کوئی نظام ہی نہ بنایا جاتا۔ اہلِ مغرب نے تو اپنی عقلِ اجماعی (Collective Wisdom) یا اکثریتی دانش کو حاکم علی الاطلاق مان لیا ہے اور انہوں نے طے کرلیا ہے کہ ان کے لیے خیر کیا ہے اور شر کیا ہے، جزا کیا ہے اور سزا کیا ہے؟، اس کا فیصلہ انہوں نے خود ہی کرنا ہے اور اسے انہوں نے مذہب انسانیت یا انسانیت نوازی (Humanism) کا نام دے رکھا ہے۔ مگر مغرب میں بھی جیل خانے، عقوبت خانے اور کسی نہ کسی درجے میں جزا وسزا کا نظام بہر حال موجود ہے۔ اور حال ہی میں امریکی سینٹ سے چھ ہزار صفحات پر مشتمل سی آئی اے کی رپورٹس کا خلاصہ جو مختلف چھلنیوں سے چھن کر یعنی Filter ہو کر تقریباً پانچ سو صفحات کی صورت میں سامنے آیا ہے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بڑھ کر جلّاد اور سفاک کوئی نہیں اور ظلم وعُدوان کا شاید ہی کوئی عنوان رہ گیا ہو، جو انہوں نے گوانتانا موبے، ابوغُریب اور بگرام کے عقوبت خانوں میں اپنے قیدیوں پر نہ آزمایا ہو اور یہی لوگ انسانیت کو رحمت ورأفت کا درس دینے بیٹھ جاتے ہیں۔

حیرت کا مقام ہے کہ سفاک، بے رحم اور درندہ صفت قاتلوں اور دہشت گردوں پر تو انہیں رحم آتا ہے، مگر اُن ہزاروں مظلوم اور بے قصور بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں پر

رحم نہیں آتا، جنہیں کسی قصور کے بغیر ان کی زندگی کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ اسلام کی رُو سے انسانی جان کی حرمت اور تحفظ ہر انسان کا انفرادی حق بھی ہے اور پوری انسانیت کا اجتماعی حق بھی، اس حق کے تحفظ کے لیے اسلام نے ''قانونِ قصاص'' نافذ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے اہلِ دانش! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے''۔ (البقرہ:179)

اگرچہ بظاہر قصاص میں ایک شخص کی جان لی جاتی ہے، لیکن اس قانون کے بلاامتیاز نفاذ میں تمام بے قصور لوگوں کی جانوں کے تحفظ کا راز مضمر ہے، چنانچہ اس زمین پر اولادِ آدم میں رونما ہونے والے سب سے پہلے قتل کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لازم کر دیا کہ جس شخص نے حقِ قصاص یا فساد فی الارض کے بغیر کسی (بے قصور) شخص کو قتل کیا، تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے کسی ایک (بے قصور) شخص کی جان کو بچالیا، تو گویا اس نے تمام انسانوں کو بچالیا''۔

(المائدہ:32)

آج کی دنیا میں اپنی عقل و دانش کی بنیاد پر حق و باطل کا فیصلہ کرنے والے صرف ظالمانہ قتل اور فساد و دہشت گردی کی مذمت کو کافی سمجھتے ہیں اور ظالم قاتل اور دہشت گرد کی جان کو بچانے کے درپے ہو جاتے ہیں اور اسے انسانیت نوازی اور ترحُّم (Mercy) سے تعبیر کرتے ہیں، اس نظریے کا مدار اس پر ہے کہ ایک جان تو چلی گئی ہے، دوسری جان کو بچالیا جائے، بھلے قاتل دندناتا پھرے، جبکہ حیاتِ انسانی کا خالق یہ فرماتا ہے کہ بے قصور انسانی جانوں کا تحفظ ''قانونِ قصاص'' کے نفاذ میں ہے۔ مقامِ حیرت ہے کہ اپنی نوعیت کے اس منفرد ''جذبۂ ترحُّم'' کا پرچار کرنے والوں کی ہمدردی کے مستحق بھی ظالم، قاتل، مفسد اور دہشت گرد قرار پاتے ہیں۔ کیا کوئی اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر بھی اس کی مخلوق پر مہربان ہوسکتا ہے، جبکہ وہ ایسے ظالموں اور سرکشوں کے بارے میں فرماتا ہے:

''(جہنم میں) جب بھی ان کی کھالیں جل کر پک جائیں گی، انہیں دوسری کھالوں سے بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کو (ہمیشہ) چکھتے رہیں''۔ (النساء:56)

موجودہ دنیامیں بھی ہم سعودی عرب کے نظامِ حکومت کی اچھائیوں یابرائیوں سے قطع نظر دیکھتے ہیں کہ وہاں چونکہ حدود وقصاص کے قوانین نافذ ہیں، اس لیے وہاں ان جرائم کی شرح دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے میں کم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت تو یہ ہے کہ بعض سزائیں برسرِ عام دی جائیں تاکہ لوگ ان سے عبرت پکڑیں اور جرائم سے باز رہیں، چناں چہ زانی کی سزا بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''اور ان پر شرعی حکم کو نافذ کرنے میں تمہارے لیے جذبۂ رحم رکاوٹ نہ بنے''۔(النور:02)

اسی طرح فرمایا: ''چوری کرنے والے مرد وزن کے (دائیں) ہاتھ کو کاٹ دو، یہ ان کے کرتوت کا بدلہ ہے (اور) اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا ہے''۔(المائدہ:38)

الغرض اللہ تعالیٰ کے مقررہ قانونِ حدود وقصاص میں انسانیت کی فلاح ہے اور سب کے لیے عافیت وسلامتی کی ضمانت ہے اور اسی میں سب کے حقوق کا تحفظ ہے۔

27دسمبر2014ء

مسئلے کی جڑ

سانحۂ پشاور کے بعد سیاسی جماعتوں، مذہبی تنظیموں اور مختلف سطح کے رہنماؤں کے ردِ عمل اور بیانات کا سلسلہ جاری ہے، یہ ہمارے ہاں کی رسم ہے۔ اخبارات کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ماضی کے مقابلے میں ان کے صفحات کی تعداد بھی زائد ہے، لہٰذا انہیں اپنے صفحات پُر کرنا ہوتے ہیں اور جماعتوں، تنظیموں اور رہنماؤں کو اپنی حاضری لگوانا ہوتی ہے۔ بعض کی طرف کنایات میں اشارے کیے جاتے ہیں، تو انہیں اپنی صفائی پیش کرنی ہوتی ہے اور اپنی پوزیشن واضح کرنا ہوتی ہے، یہی صورتِ حال الیکٹرونک میڈیا کی ہے۔ بعض حضرات کے مذمتی بیانات تو کسی سانحہ کے رونما ہونے کے فوراً بعد اتنی جلدی جاری ہوتے ہیں کہ جیسے پہلے سے کمپیوٹر میں Feed تھے، بس Click کرنے کی دیر تھی، اسی لیے ایک شہید بچے کی ماں نے جناب عمران خان سے کہا کہ: ''ان مذمتی بیانات سے ہمیں آگ سی لگ جاتی ہے اور گھن آتی ہے''۔

صورتِ حال چونکہ انتہائی حساس ہے، اس لیے اصل مسئلے سے نظریں چرا کر گریز کے حیلے اختیار کیے جاتے ہیں اور یہ سارا کام محض وقت گزاری (Time Passing) یا وقتی دباؤ سے نکلنے کے لیے ہوتا ہے تاوقتیکہ کوئی اور سانحہ یا المیہ پیش آجائے اور پھر اس درپیش مسئلے سے توجہ ہٹ جائے۔ جہاں تک اس سانحے کے ذمے داروں کا تعلق ہے، اُن پر ان مذمتوں اور ملامتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، بلکہ وہ تو اپنے ہاتھوں سے برپا کیے ہوئے اِن مظالم کا جشن مناتے ہیں، انہیں اپنے انتقام سے تعبیر کرتے ہیں، نہایت ڈھٹائی کے ساتھ ان کا

کریڈٹ لیتے ہیں اور دہشت گردی کے ان دہلا دینے والے واقعات کی ذمے داری قبول کرتے ہیں۔ لہٰذا ہماری یہ ساری کاوشیں ایک طرح کی خود کلامی یا اپنی پوزیشن کی وضاحت، ذاتی تسکین اور اشک شوئی کی حد تک محدود رہتی ہیں۔

جو لوگ اس میدان میں مصروفِ عمل ہیں، ان کی ذہن سازی نہایت مہارت سے کی گئی ہے اور اس طرح کے ردِ عمل سے ان کی سوچ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ عربی کے کلاسیکل شاعر، ابوالطیب احمد بن حسین الجعفی، جو متنبی کے نام سے مشہور ہیں، کے دیوان کا پہلا شعر ہے:

عَذْلُ الْعَوَاذِلِ حَوْلَ قَلْبِی التَّائِہِ وَھَوَی الْاَحِبَّةِ مِنْہُ فِی سَوْدَائِہِ

یعنی محبوب سے محبت کرنے پر جو لوگ ملامت کرتے ہیں، اُن کی ملامت میرے دل کو دور سے چھو کر گزر جاتی ہے اور محبوب کی محبت دل کے اندر رہتی ہے اور اُس پر اِس ملامت کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ دل میں جو ایک سیاہ منجمد خون ہے، وہی دل کا جوہر ہے اور کسی چیز کی محبت یا نفرت کا نقش اسی میں ثبت ہوتا ہے اور اس تک کسی کی ملامت یا طعن کا کوئی اثر نہیں پہنچتا، اسی مفہوم کا ایک شعر جناب محسن بھوپالی کا بھی ہے:

چاہت میں کیا دنیا داری، عشق میں کیسی مجبوری
لوگوں کا کیا، سمجھانے دو، اُن کی اپنی مجبوری

اصل مسئلہ جس پر بحث کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ یہ جنگ جو ہمارے ملک کے اندر برپا ہے اور جس کا نشانہ امریکا یا اہلِ مغرب نہیں ہیں، بلکہ ہمارے اپنے دفاع اور سلامتی کے ادارے، دفاعی تنصیبات، قومی اَملاک، مسلح افواج کے افراد اور عام بے قصور لوگ جن میں بچے، بوڑھے، عورتیں اور جوان، مسلح افواج کے افراد اور سویلین سب شامل ہیں، سوال یہ ہے کہ اس جنگ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟، ریاست سے متحارب عناصر کا کیا حکم ہے؟۔ یہ سوال میں نے اس لیے اٹھایا کہ اس طرح کے سانحات کے بعد ہمارا میڈیا اشارات و کنایات میں اور بعض صورتوں میں صراحت کے ساتھ اس کا محرک مذہب کو قرار دیتے ہیں، اسی

طرح سیاست دان اور حکمران بھی لگے لپٹے لہجے میں اسی سوچ کا اظہار کرتے ہیں، یعنی ان دہشت گردوں کی ذہن سازی کے پیچھے بعض مدارس یا مذہبی قوتیں ہیں۔ تو بنیادی سوال یہ ہے کہ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ لوگ ریاست کے باغی ہیں؟، اگر اس کا جواب اثبات میں ہے، تو پھر ان کی سرکوبی کے بارے میں دو آراء نہیں ہونی چاہییں، بلکہ پوری قوم کا اجماع ہونا چاہیے کہ یہ ہمارے قومی، ملکی اور ملّی دشمن ہیں اور ان کے بارے میں کسی رُو رعایت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تمام مسالک کے سرکردہ علماء، جو اپنے اپنے مسالک میں مسلَّم ہیں اور اتھارٹی کا درجہ رکھتے ہیں، پارلیمانی جماعتوں کی طرح ان سب سے کہا جائے کہ ایک جگہ بیٹھ کر ریاست سے متحارب عناصر کے بارے میں تعیین کے ساتھ ایک حتمی اور دوٹوک فتویٰ جاری کریں۔ انفرادی واقعات پر تو کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ غیر انسانی اور غیر اسلامی فعل ہے اور حرام ہے، لیکن اس جنگ کی اصولی حیثیت کی وضاحت نہیں کی جاتی، بلکہ ایک طرح سے مسلّح افواج اور ان سے متحارب (Combatant) مسلّح گروپوں کو برابر کے فریق کی حیثیت دی جاتی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور اگر مومنوں کے دو گروہ باہم جنگ کریں تو ان میں صلح کراؤ، پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے، تو زیادتی کرنے والے گروہ سے جنگ کرو حتیٰ کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرلے، پس اگر وہ رجوع کرلے، تو ان میں عدل کے ساتھ صلح کراؤ اور انصاف سے کام لو، بے شک اللہ انصاف سے کام لینے والوں کو پسند فرماتا ہے''۔ (الحجرات:9)

اس آیت میں قرآن نے ''بَغی'' کا کلمہ ارشاد فرمایا ہے اور اسی سے ''باغی'' آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عنقریب فتنے ہوں گے، سنو جو شخص اس اُمّت کی جمعیت کو توڑنے کا ارادہ کرے، تو خواہ وہ کوئی بھی ہو، ان کو تلوار سے ماردو''۔ (صحیح مسلم:1852)

ہماری سیاسی اور مذہبی قیادت ان سانحات کا جائزہ ایک دوسرے سے جدا کرکے

یعنی Case to Case لیتی ہے اور اظہارِ افسوس اور ملامت و مذمت کر کے اس سے بری الذمہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ قیادت کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے لیے اس طرح کے سانحات کے دباؤ سے باہر آنے کے لیے کوئی آبرومندانہ صورت نکل آئے، جسے آج کل Face Saving کہا جاتا ہے۔ مسئلے کی جڑ کو کوئی بھی چھیڑنا نہیں چاہتا اور نہ ہی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض سیاست دانوں پر بھی انتہا پسند گروہوں کے ساتھ تعلق کا الزام لگایا جاتا ہے یا اس حوالے سے طعن کیا جاتا ہے۔ سو مسئلے کی جڑ یہی ہے کہ اس جنگ کی شرعی حیثیت طے کی جائے اور یہ کہ آیا ریاست سے برسرِ پیکار عناصر باغی اور واجب القتل ہیں؟، تاوقتیکہ وہ ریاست کے آگے سرنگوں ہو جائیں اور غیر مشروط اطاعت قبول کر لیں، تو پھر ان کے ساتھ مصالحت کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔

وزیرِ داخلہ چوہدری نثار علی خان ماضی میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ اُن لوگوں سے کن علماء کا تعلق ہے اور اُن کے ساتھ استادی شاگردی یا پیری مریدی کا تعلق کس کا ہے۔ اُس وقت تو اِن علماء نے کہا تھا کہ یہ ہمارے بچے ہیں اور ان حضرات نے بھی اس تعلق کو تسلیم کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہونے والے مسلح افواج کے افراد کو شہید کہنے میں بعض حضرات کو تردُّد ہے، ہم اس مسئلے کو طنز و تعریض یا سیاست بازی کی نظر کر دیتے ہیں اور اس کی سنگینی کو محسوس نہیں کرتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا میں یہ جنگ پاکستان کی نہیں تھی، امریکا نے اِسے جبراً پاکستان پر مسلّط کیا اور اب اِس سے نکلنا پاکستان کے لیے دشوار ہو رہا ہے۔ سو اب کوئی اس رائے سے اتفاق کرے یا اختلاف، بہر حال یہ پاکستان کی جنگ بن چکی ہے اور اس کا موجودہ چہرہ یہی ہے، تو لازم ہے کہ اس کی شرعی حیثیت (Legal Status) کو طے کیا جائے۔

مولانا عبدالعزیز مجموعی صورتِ حال کے تناظر میں ایک Non Issue ہے اور یہ مسئلے کی سنگینی کا رخ پھیر دینے اور عوام کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا عبدالعزیز کا تحریکِ طالبان پاکستان یا ان کے کسی ذیلی

گروپ سے کوئی باقاعدہ تعلق ہو یا ہمدردی کا رشتہ ہو۔ لیکن بہرصورت مولانا عبدالعزیز اپنے مکتبۂ فکر اور مسلک کے غیر متنازع اور مسلّم رہنما نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان پر طعن و تشنیع کے تیر برسانے پر ان کے مکتبۂ فکر نے بڑے پیمانے پر کبھی بھی غم و غصے کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا فائدہ تو یہ ہوا کہ جن تیروں کا رخ کسی اور جانب ہونا چاہیے تھا، مولانا عبدالعزیز نے اپنے آپ کو پیش کر کے انہیں نشانہ بننے سے بچالیا اور کچھ وقت گزرنے کے بعد ماضی کی طرح یہ جذبات بھی تحلیل ہو جائیں گے۔

تحریکِ طالبان افغانستان کی جِدّ و جُہد کو ایک اعتبار سے جائز قرار دیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے ملک کو قابض غیر ملکی افواج کی گرفت سے آزاد کرانا چاہتے ہیں، جب کہ تحریکِ طالبانِ پاکستان کے لیے یہ جواز موجود نہیں ہے۔ تحریکِ طالبانِ افغانستان اور تحریکِ طالبانِ پاکستان کے درمیان ربط و تعلق بھی ایک چیستان اور معمّا ہے۔ تحریکِ طالبانِ افغانستان پاکستان میں رونما ہونے والے بہت سے واقعات سے براءت کا اعلان کرتی ہے، لیکن بحیثیتِ مجموعی تحریکِ طالبانِ پاکستان سے ان کا اعلانِ براءت ریکارڈ پر نہیں ہے، یہی صورتِ حال القاعدہ کے حوالے سے درپیش ہے۔

تحریکِ طالبانِ افغانستان کے ہمدردوں سے جب کبھی تبادلۂ خیال کا موقع ملا، تو وہ کہتے ہیں کہ عورتوں اور بچوں کو مارنا، اسکولوں اور تعلیمی اداروں کو جلانا اور بلاتمیز پبلک مقامات پر دہشت گردی کی کارروائیاں کبھی بھی ان کا شِعار نہیں رہا، وہ تو صرف اپنے ہدف کو نشانہ بناتے ہیں۔ تو پھر فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب امیر ایک ہے، تو ان کو کنٹرول کرنے کی ذمّے داری کس پر عائد ہوتی ہے۔

29 دسمبر 2014ء

اسپیڈی ٹرائل کورٹس کے قیام میں مستور پیغام

ہماری پارلیمانی قیادت نے پہلی بار سنجیدگی کا مظاہرہ کیا اور گیارہ گھنٹے کے مسلسل اور طویل اجلاس کے بعد دہشت گردی کو کنٹرول کرنے اور دہشت گردوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے مکمل اتفاقِ رائے سے ایکشن پلان کے نام سے ایک بیس نکاتی لائحہ عمل مرتب کیا اور وزیر اعظم جناب محمد نواز شریف نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کے ذریعے اس کا اعلان کیا۔ ابتدا میں فوجی عدالتوں کی تشکیل کی تجویز دی گئی، لیکن اس پر بعض جماعتوں کے تحفظات تھے، لہٰذا اُن کی طمانیت کے لیے درمیانی راستہ نکالا گیا کہ انہیں فوجی عدالت کی بجائے اسپیڈی ٹرائل کورٹس کہا جائے گا اور آئین میں دو سال کی مدت کے لیے ایسی عدالتوں کے قیام کی گنجائش نکالی جائے گی۔ ان عدالتوں کا سربراہ فوجی افسر ہوگا، جس کی شناخت کا ظاہر کرنا ضروری نہیں ہوگا۔ ہماری سیاسی قیادت نے طویل بحث کے بعد بالآخر ایک متفقہ فیصلے تک پہنچنے کی اہلیت وصلاحیت کا جو مظاہرہ کیا، یہ ایک لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ اے کاش! کہ اس صلاحیت یا اجتماعی دانش کا مظاہرہ حالات کے جبر کے تحت نہیں بلکہ معمول کے حالات میں ہوا ہوتا، تاہم "دیر آید درست آید" کے مصداق یہ بھی بساغنیمت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہماری سیاسی قیادت کی اجتماعی دانش اور توقعات کے مطابق یہ جدّ و جہد نتیجہ خیز ثابت ہو، کیونکہ نتائج کا مدار عملی تنفیذ پر ہے۔

لیکن بصد ادب واحترام عرض ہے کہ ان "اسپیڈی ٹرائل کورٹس" کے قیام کے فیصلے میں ایک مستور پیغام یہ بھی پوشیدہ ہے کہ ہمارا نظامِ عدل عملی نتائج کے اعتبار سے بے فیض اور

بے ثمر ہے اور یہ عوام کو فوری انصاف فراہم کرنے میں بحیثیتِ مجموعی ناکام ہو چکا ہے، اِلاّ ماشاء اللہ۔ ہمارا ضابطۂ قوانین (Procedural Law)، جسے ضابطۂ فوجداری اور ضابطۂ دیوانی کہا جاتا ہے، حقیقی انصاف کی فراہمی میں مُمِد ومعاون بننے کی بجائے رکاوٹ بن رہا ہے، اس میں کہیں نہ کہیں ایسا جھول ہے کہ حق داروں، مظلومین اور متاثرین کی دادرسی اور تسکین کی بجائے باعثِ اذیت وآزار بن رہا ہے۔

قرآن وسنت کی واضح تعلیمات کا تقاضا تو یہ ہے کہ انصاف کی فراہمی شفاف ہو، اپنے اور غیر، زیردست اور بالادست کی تمیز سے ماورا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ''اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ یہ گواہی تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے ماں باپ اور قرابت داروں کے خلاف ہو، (فریقِ معاملہ) خواہ امیر ہو یا غریب، اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ ہے، پس تم خواہشِ (نفس) کی پیروی کر کے عدل سے روگردانی نہ کرو اور اگر تم نے گواہی میں ہیر پھیر کیا یا اِعراض کیا، تو اللہ تمہارے سب کاموں کی خبر رکھنے والا ہے''۔ (النساء:135)

(۲) ''اور اگر تم کوئی بات کہو تو انصاف کے ساتھ کہو، خواہ وہ (فریقِ معاملہ) تمہارا قرابت دار (ہی) ہو''۔ (الانعام:152)

(۳) ''بے شک اللہ تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچاؤ اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، بے شک اللہ تمہیں کیسی اچھی نصیحت فرماتا ہے، یقیناً اللہ خوب سننے والا دیکھنے والا ہے''۔ (النساء:59)

عدلِ حقیقی کے عناصرِ ترکیبی میں خشتِ اوّل خوفِ خدا اور فکرِ آخرت ہے، اس کے بعد عدالت ہے، قانون ہے، گواہ ہے اور آج کل ایک اہم ادارہ وکالت کا ہے۔ ہمارے نامی گرامی وکلاء کی فیسیں ناقابلِ تصور ہیں، کیونکہ وہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرنے میں ملکۂ تامّہ اور مہارتِ کاملہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے تعلیمِ امت کے

لیے فرمایا:

''تم میرے پاس مقدمات لے کر آتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص دوسرے کی بہ نسبت اپنے موقف کو مؤثر دلائل کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو (یعنی چرب زبانی اور طلاقتِ لسانی کا ماہر ہو) اور میں اس کے دلائل کی روشنی میں اس کے حق میں (کسی چیز کا) فیصلہ کر دوں (حالانکہ وہ درحقیقت اس کا حق نہیں بنتا)، سو جس کو میں اس کے بھائی کا حق دے دوں، تو وہ اسے نہ لے، کیونکہ میں اس کو آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں''۔ (صحیح مسلم:1713)

اس لیے کہ اُس سے بہتر کون جانتا ہے کہ چرب زبانی، طلاقتِ لسانی، زورِ بیان اور حجت بازی کے زور پر جو اس نے لیا ہے، وہ درحقیقت اس کا نہیں بلکہ اس کے فریقِ مخالف کا حق ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وعید کے طور پر بیان فرمایا کہ یہ اس کے لیے نارِ جہنم کے عذاب کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک قرض خواہ نے سختی کے ساتھ اپنے قرض کا تقاضا کیا، تو آپ کے اصحاب نے اس کو (مارنے یا سختی) کا ارادہ کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، کیوں کہ جس کا حق ہوتا ہے، اسے سختی کے ساتھ بات کرنے کی اجازت ہوتی ہے''۔ (بخاری:2401)

امام ثعلبی ''الکشف والبیان'' میں لکھتے ہیں: ایک انصاری شخص طعمہ بن اُبیرق تھا، جس نے اپنے پڑوسی قتادہ بن نعمان (اور ایک روایت میں ان کے چچا رفاعہ بن زید) کے گھر آٹے کی بوری اور زِرہ چوری کی۔ بوری کی پھٹن سے آٹا گرتا رہا اور اسی سے اس کا سراغ ایک یہودی زید بن سمین کے گھر تک پہنچا اور سامان مل گیا۔ یہودی نے کہا کہ یہ سامان طعمہ بن اُبیرق میرے گھر رکھ کر گیا ہے۔ طعمہ نے حلف اٹھایا کہ میں چوری میں ملوث نہیں ہوں اور اس کا خاندان اس کے دفاع کے لیے آ گیا کہ ہمارے صالح شخص کی رسوائی ہو رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خیال گزرا کہ شاید بلاوجہ اس پر چوری کا الزام لگایا جا رہا

ہے کہ اس دوران قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی، جس سے اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ چور طُعمہ بن اُبیرق ہی تھا اور یہ شخص منافق تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حقیقتِ حال سے مطلع فرمایا:

''بے شک ہم نے آپ کی طرف حق پر مبنی کتاب نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اُس (علمِ حق) کے مطابق فیصلہ کریں، جو اللہ نے آپ کو دکھایا ہے اور آپ خیانت کرنے والوں کے وکیل نہ بنیں''۔ (النساء: 105)

اس کی تفسیر میں علامہ قرطبی لکھتے ہیں: ''اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جس کا موقف باطل ہو، اس کی وکالت جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ باطل کی حمایت پر مبنی ہوگی جو شریعت کے مسلّمہ اصولوں کے خلاف ہے۔ پس کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ کسی کے موقف کی حقانیت کو جانے بغیر اس کی حمایت کرے۔۔۔۔ وہ مزید لکھتے ہیں: ''جب مسلمانوں پر کسی قوم کا نفاق واضح ہو جائے تو اس کا حمایتی اور مدافع (Defender) بننا جائز نہیں ہے''۔

(الجامع لاحکام القرآن، جلد: 5، ص: 377)

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر دعویٰ ناحق ہو اور باطل پر مبنی ہو۔ پس اگر کسی مدّعی کا دعویٰ حق پر مبنی ہے، تو اس کی وکالت کرنا، اس کی حمایت اور مدافعت کرنا بلاشبہ اچھی بات ہے، کیونکہ اس میں وکیل حق دار کو اُس کا حق دلانے میں معاون بن رہا ہے اور اسلام کی نظر میں یہ ایک اعلیٰ اخلاقی قدر ہے۔ لیکن اگر کسی پر یہ حقیقت آشکارا ہے کہ اس کے مدّعی کا موقف ناحق ہے اور باطل پر مبنی ہے، تو اس کے باوجود اس کی حمایت کرنا، اس کا دفاع کرنا اور حق کو رَد کرنے کے لیے اس کا وکیل بننا اور اس کے ناجائز موقف کو طلاقتِ لسانی، چرب زبانی اور اپنی قوتِ استدلال سے درست ثابت کرنا شریعت کی نظر میں یقیناً ناپسندیدہ امر ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ مکرم ﷺ کو سورۃ النساء، آیت: 105 میں یہی حکم فرمایا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کی روشنی میں حق پر مبنی فیصلے کیجیے اور خائنوں کی حمایت، دفاع اور وکالت نہ کیجیے۔

مقامِ غور ہے کہ آج کل ہمارے وکالت کے شعبے میں شریعت کی پاس داری کا یہ اہتمام ہے؟، کیا یہ امرِ واقعی نہیں ہے کہ بعض صورتوں میں جانتے بوجھتے اپنے موکل کے ناحق موقف کا دفاع کیا جاتا ہے اور اس کی وکالت کی جاتی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے خائن کی وکالت سے منع فرمایا ہے۔ الغرض ہمارے نظامِ عدل کی ساری پیچیدگیوں اور بے ثمر ہونے کا سبب یہی ہے۔

تنویرالابصار مع الدرالمختار میں وکالت کی تعریف میں لکھا ہے:

"کسی شخص کا اپنی سہولت کے لیے یا اپنے موقف کو بیان کرنے میں عجز کے سبب ایسے تصرف میں اپنا وکیل بنانا جو جائز اور معلوم ہو"۔ (ردالمحتار، جلد:8، ص:213)

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: "وکالت جس طرح رائج ہے کہ حق کو ناحق اور ناحق کو حق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جھوٹے حلف اٹھواتے ہیں، قطعی حرام ہے اور آج کل یہی وکالت رائج ہے۔ جو تحقیق کے بعد اپنے موکل کو حق جان کر اس کی وکالت کرے، جھوٹ بلوانے سے پرہیز کرے، اس کی وکالت اس زمانے میں بالکل نہیں چل سکتی۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد:19، ص:96)

30 دسمبر 2014ء

جنوری 2015ء

حالات کا جبر

پاکستان کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے منگل 6 جنوری کو یکے بعد دیگرے اکیسویں آئینی ترمیم کی منظوری مطلوبہ دوتہائی اکثریت سے دے دی، یہ ترمیم آرمی ایکٹ میں کی گئی اور اسے آئینی تحفظ دیا گیا۔ فوجی عدالتیں قائم کرنے کا اختیار دو سال کے لیے دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اقدام غیر معمولی حالات کے تحت اٹھایا گیا ہے اور اسے ہم حالات کے جبر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

مولانا فضل الرحمن نے کہا کہ ہم نے آرمی ایکٹ میں ترمیم کا گناہ قبول کر لیا تھا، لیکن ہمیں آئینی ترمیم کے مسودے سے بے خبر رکھا گیا، لہٰذا ان کی جماعت نے حکومت کا حلیف ہونے کے باوجود اکیسویں آئینی ترمیم کے حق میں ووٹ نہیں دیا، البتہ مخالفت بھی نہیں کی۔ سوشل ڈیموکریٹ کی حیثیت سے بے داغ شہرت رکھنے والے پارلیمنٹیرین جناب رضا ربانی نے اشکِ ندامت بہاتے ہوئے کہا کہ آج میں پہلی بار ضمیر کے خلاف ووٹ دے رہا ہوں، کیونکہ یہ ووٹ میرے پاس پارٹی قیادت کی امانت ہے اور ان کی ہدایت پر اسے استعمال کر رہا ہوں۔

ان سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اُن کا یہ عذر کچھ زیادہ متاثر کن (Appealing) نہیں ہے، کیوں کہ اِس امانت سے وہ استعفیٰ دے کر بھی عہدہ برا ہو سکتے تھے، جب کہ ضمیر (Conscience) بھی ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ قادرِ مطلق نے اسے سورۃ القیامہ:2 میں "نفسِ لوّامہ" (Self Blaming) سے تعبیر فرمایا ہے، یعنی اس کا

کام بدی اور برائی سے روکنا اور ٹوکنا ہے، گناہ کے ارتکاب پر ایک کسک اور ندامت کا احساس دلانا ہے، برائی کی طرف اٹھنے والے ہر قدم سے پہلے خبردار کرنا ہے، یہی اس کی زندگی کی علامت ہے، علامہ اقبال نے اسی کو ''احساسِ زیاں'' سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے نزدیک جس طرح فرد کا ضمیر ہوتا ہے، اسی طرح اُمت، مِلّت اور قوم کا بھی ضمیر ہوتا ہے اور ملّت کو ''کارواں'' سے تعبیر کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اسی طرح چوہدری اعتزاز احسن نے مبینہ طور پر خودکش بمبار کو روکنے کے نتیجے میں جاں بحق ہونے والے ہنگو کے نوعمر طالبِ علم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اعتزاز حسن ایک سال پہلے مر گیا تھا اور بیرسٹر چوہدری اعتزاز احسن آج مر گیا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک جذباتی کیفیت کا اظہار تھا، لیکن اس بات کا بھی اقرار تھا کہ حالات کے جبر یا نظریۂ ضرورت کے تحت وہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک نہ کہہ سکے۔ سینیٹر رضا ربانی اور سینیٹر اعتزاز احسن اپنے آپ کو آئین وقانون اور جمہوری اقدار کے اعتبار سے مثالیت پسند (Idealist) کے طور پر پیش کرتے تھے، لیکن اس موقع پر انہیں اپنی مثالیت پسندی (Idealism) کا خول اتار کر عملیت پسندی (Pragmatism) کی طرف آنا پڑا۔ ان کے پاس دو راستے تھے:

ایک یہ کہ اپنی مثالیت پسندی کی شہرت کو باقی رکھتے ہوئے وہ سینیٹ کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیتے اور دوسری یہ تھی کہ اپنے موقف پر سمجھوتا (Comprise) کر کے عملیت پسندی کا ثبوت دیتے۔ ان دونوں حضرات نے دوسری صورت کو اختیار کیا اور اس سے پہلے پاکستان پیپلز پارٹی جنرل پرویز مشرف کے ساتھ این آر او کا معاملہ کر کے ایسی ہی عملیت پسندی کا مظاہرہ کر چکی ہے، لہٰذا عملیت پسندی کے جرم کا یہ ارتکاب پہلی بار نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیاست مفاہمت اور مطابقت (Adjustability) پیدا

کرنے کی صلاحیت کا نام ہے، یہ بات الگ ہے کہ بہتر سودے بازی کی مہارت کس کے پاس زیادہ ہے۔

مولانا فضل الرحمن صاحب نے بھی بقولِ خود بادل نخواستہ مفاہمت ومطابقت کی خاطر اکیسویں آئینی ترمیم کے گناہ کو قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا، لیکن اس کے بعض مندرجات ومشمولات (Contents) پر انہیں اعتراض ہوا اور اس ترمیم کے حق میں ووٹ دینے سے احتراز کیا۔ میرے نزدیک اگر اکیسویں ترمیم گناہ ہے، تو ایل ایف او یعنی سترہویں آئینی ترمیم گناہِ کبیرہ ہے، جس کا ارتکاب ایم ایم اے نے کیا، مگر اس وقت ان کی مٹھی میں بہت کچھ تھا، جسے بچانا مقصود تھا، یعنی اس وقت کی صوبۂ سرحد کی حکومت، صوبۂ بلوچستان کی حکومت میں غالب حصہ اور مرکز میں قائدِ حزبِ اختلاف کے منصب کا تحفظ۔ چنانچہ انہوں نے اُس موقع پر مکمل عملیت پسندی کا ثبوت دیا اور اِس موقع پر نیم عملیت پسندی کا۔

مولانا کا اعتراض اس پر ہے کہ اکیسویں آئینی ترمیم کے متن میں ''مذہب اور مسلک کے نام پر دہشت گردی'' کو ہدف بنایا گیا ہے۔ اصولی طور پر یہ موقف غلط نہیں ہے، دہشت گردی کو مطلقاً ہدف بنانا چاہیے، خواہ مذہب کے نام پر ہو یا لسانیت وصوبائیت اور علاقائیت کے نام پر ہو۔ الغرض عنوان اور محرِک کوئی بھی ہو اُفقی (Horizontaly) اور عمودی (Vertical) ہر اعتبار سے یعنی مکمل گہرائی اور گیرائی کے ساتھ دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑا جائے۔ ہمارے ہاں جرائم کو جڑ سے اکھاڑا تو نہیں جاتا، لیکن اس کے لیے قانون سازی کا کریڈٹ کئی ناموں سے لیا جاتا ہے، یہ محض اخباری سرخیوں میں جگہ پانے اور کریڈٹ لینے کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً قتل صرف قتل ہے، قرآن نے ''جان کے بدلے میں جان'' کا تصور پیش کیا اور اس میں نفس کے ساتھ مسلم کی قید بھی نہیں لگائی۔ ہمارے ہاں قسمیں بیان کی جاتی ہیں: کاروکاری کے نام پر قتل، غیرت کے نام پر قتل، مذہب ومسلک اور زبان وعلاقے کے نام پر قتل، دولت وجائداد اور زمینوں کے تنازعات میں قتل وغیرہ وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دہشت گردوں نے اپنے انتہائی ظالمانہ، سفاکانہ، سنگ دِلانہ

اور درندگی پر مبنی دہشت گردی کے اقدامات کا جواز بعض صورتوں میں مذہب کے عنوان سے پیش کیا ہے، لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ "بات سچ ہے، مگر بات ہے رسوائی کی"۔ چوں کہ دہشت گردی کے بڑے واقعات میں اس طرح کی تنظیمیں سامنے آئیں اور انہوں نے برملا اِن جرائم کا اقرار واعتراف کیا اور کریڈٹ لیا، اس لیے اصل ہدف بھی وہی ہیں اور ہونا چاہیے۔ لیکن کیا اس کے لیے دہشت گردی کو کسی خاص عنوان کے ساتھ بریکٹ کرنا یا کسی خاص زاویے سے نمایاں نشان دہی (High Light) کرنا ضروری تھا، کیا اس کا کوئی درمیانی راستہ نہیں نکالا جاسکتا تھا، کیا اس کے لیے مناسب کوشش کی گئی، یہ سوال بہر حال جواب طلب ہے۔

دراصل ہمارے ہاں ایسے مواقع پر قانون سازی نہایت عُجلت میں کی جاتی ہے اور یہ بات عیاں ہے کہ عُجلت اور حکمت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ عُجلت کا ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ چیزیں منظرِ عام پر آنے سے میڈیا پر مخالفانہ بحث شروع ہوجاتی ہے اور سیاسی جماعتیں مخالفت میں آجاتی ہیں، لہٰذا حکمرانوں اور اسٹیبلشمنٹ کو یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ بڑی مشکل سے جو اِجماع یا اتفاقِ رائے (Consensus) پیدا کیا گیا ہے، کہیں وہ بیرونی دباؤ کے نتیجے میں ہاتھ سے نکل نہ جائے اور پارلیمانی سیاسی جماعتوں کو جو بڑی کاوش سے ایک موقف پر جمع کیا گیا ہے، بیرونی دباؤ کے نتیجے میں اُن کے قدم کہیں ڈگمگا نہ جائیں اور عزائم متزلزل نہ ہوجائیں۔ لہٰذا یہ ان کی مجبوری ہوتی ہے اور اندرونی و بیرونی دباؤ بیک وقت اثر انداز ہونے اور گوہرِ مقصود کے ہاتھ سے نکل جانے کا خدشہ بھی لاحق رہتا ہے۔ پس سچ یہ ہے کہ ہم ایک مشکل صورتِ حال سے دوچار ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ہماری پارلیمانی سیاسی قیادت کی اجتماعی دانش نتیجہ خیز ثابت ہو اور امن کی فاختہ جو ہم سے روٹھ کر بہت دور جاچکی ہے، دوبارہ ہمارے دام میں آجائے۔ خدانخواستہ اگر یہ اقدام بھی خاکم بدہن نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا، تو پھر خسارہ ہی خسارہ ہے۔

اب آئینی ترمیم کو بدلنا یا اس میں سے کسی جملے یا بعض الفاظ کو حذف (Delete)

کرنا یا بعض الفاظ کا اضافہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اب جو کچھ ہو سکتا ہے، وہ عمل درآمد کے حوالے سے یقین دہانیاں اور اعتماد سازی کے اقدامات ہیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ من حیث القوم ہمیں نہ ایک دوسرے پر اعتماد ہے اور نہ ہی ہم ایک دوسرے پر یقین کر پاتے ہیں، بس ہمارا سارا سرمایہ بدگمانیاں ہیں، بے اعتمادیاں ہیں، شکوک وشبہات ہیں اور قریب و دور کے اندیشے ہیں۔ وزیر داخلہ جناب چوہدری نثار علی خان اب یقین دہانیوں پہ لگے ہیں، لیکن ان کے رابطے صرف ایک مذہبی طبقے کے ساتھ ہیں، دوسروں کو وہ قابلِ توجہ اور درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے اور کبھی کبھی اس طرح کے جانبدارانہ اور لاتعلقی کے رویے کے نتائج بھی بھگتنا پڑتے ہیں، سو انہیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہمارے اقتدار کا جو کلچر یا شِعار ہے، اس کی رُو سے اہلِ اقتدار کی نظروں میں وہی قابلِ توجہ ہے جس کے پاس صلاحیتِ انتشار وفساد ہے یا کم از کم ایسے عناصر کے ساتھ کوئی رابطہ ہے، امن پسندی ان کے نزدیک پسندیدہ قدر نہیں ہے بلکہ کمزوری کی علامت ہے۔

9 جنوری 2015ء

دینی مدارس پر نظرِ کرم

1990ء کے عشرے سے دینی مدارس وقتاً فوقتاً اہلِ کرم کی توجہات اور عنایاتِ خصوصی کا مرکز رہے ہیں، انہیں پنجابی زبان کے الفاظ میں ''بندے دا پتر'' بنانے کی مساعیِ جمیلہ ہوتی رہیں۔ لیکن بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ ہم ''کندۂ ناتراش'' لوگوں کو مرکزی دھارے (Mainstream) میں لانے کی نیک خواہشات کا اظہار وقتاً فوقتاً ضرور ہوتا رہا۔ لیکن ہر بار مذاکرات کے کئی ادوار کے بعد ''دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا'' کا مرحلہ جب قریب آتا دکھائی دیتا ہے تو اچانک لڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ سوویت یونین کی تحلیل کے بعد امریکا وحدانی سپر پاور بن گیا اور اس نے ماضی کے فرعونوں کی طرح ''اَنَا وَلَاغَیْرِیْ'' (یعنی اب صرف میرا حکم چلے گا) کا ناقوس بجایا۔ پھر 9/11 کے بعد تو گویا دنیا ہی بدل گئی۔ تمام حقیقتیں، وفا و جفا اور بقا و فنا کے سارے پیمانے بدل گئے۔ چنانچہ اچانک امریکا پر آشکار ہوا کہ کائنات میں رونما ہونے والی ہر برائی اور ہر فساد کا منبع پاکستان کے دینی مدارس ہیں، حالانکہ 9/11 کے واقعے میں مبینہ طور پر جو لوگ شریک تھے، نہ وہ پاکستانی تھے، نہ پاکستان کے مدارس سے تعلیم یافتہ تھے، بلکہ امریکا کے جدید اداروں سے اعلیٰ تعلیم کے حامل تھے۔

اسی طرح یہ بھی فرض کرلیا گیا کہ دینی مدارس کے نصاب میں کہیں نہ کہیں کوئی خرابی ہے، لہٰذا اس کی اصلاح کے منصوبے بنائے جانے لگے، وہ نصابِ تعلیم جو ''درسِ نظامی'' کے نام سے موسوم ہے، آج سے تقریباً پونے تین سو سال قبل ملا نظام الدین سہالوی رحمۃ اللہ علیہ

نے، جن کا عہد 1677ء سے 1748ء تک ہے، اپنے عہد میں مختلف اسلامی و عربی علوم وفنون کی دستیاب کتب سے مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد سے اس میں حذف (Deletion) واضافہ (Addition) اور ردوبدل ہوتا رہا ہے، لیکن چونکہ اس کی اساس وہی ہے، اس لیے یہ نسبت قائم رہی۔ میں اپنے علماء سے کہتا رہتا ہوں کہ آپ اسے ''اسلامی علوم'' کا نام دیں، جیسے یونیورسٹیوں میں ''اسلامک لرننگ'' اور ''اسلامک اسٹڈیز'' کے شعبے قائم ہیں، لیکن جو نام زبان پر چڑھ جائے، وہ آسانی سے نہیں اترتا۔

یہ نصاب ایران عراق جنگ، جہادِ افغانستان، سوویت یونین کے خاتمے اور 9/11 کے واقعات سے پہلے کسی کی توجہات کا مرکز ومحور نہیں تھا، لیکن اب عالم یہ ہے کہ اس سے توجہ ہٹتی ہی نہیں۔ فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس نصاب میں کوئی خرابی ہوتی، تو اسے 1970ء کے عشرے کے اواخر سے بہت پہلے آشکارا ہوجانا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نصاب کی تشکیلِ اوّل کے بعد 1857ء کی جنگ آزادی لڑی گئی، ترکی میں خلافتِ عثمانیہ کے زوال پر تحریکِ احیائے خلافت چلی، تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے سیاسی معرکے برپا ہوئے، مگر یہ نصاب اُن ادوار میں زیرِ بحث نہیں آیا۔

یہ درست ہے کہ بعض مدارس جہادِ افغانستان کے لیے تحریکی مراکز بنے، مولانا سمیع الحق اس پر اب بھی علانیہ طور پر فخر کرتے ہیں، کیونکہ ہماری ریاست اور امریکا کی قیادت میں عالمی استعماری قوتیں، عالمِ اسلام وعالمِ عرب اس جہاد کی پشت پر تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ قومی دھارا تو کیا عالمی دھارے کا حصہ بنے، اس دور میں وہ محبوبِ عالم تھے، ہیرو تھے، منظورِ نظر تھے، وہ انٹرنیشنلائز ہوگئے اور ان کی ساری معلومات ہمارے ریاستی اداروں کے پاس یقیناً ہوں گی۔ مگر غضب یہ ہوا کہ جہاد کا یہ جِن، جسے ہماری ریاست اور عالمی امریکی استعمار اپنے ریموٹ کنٹرول (یعنی غیبی اشاروں) سے چلانا چاہتے تھے، شاید ریموٹ کنٹرول کہیں کھو گیا ہے اور چیلے گرو کی گرفت سے آزاد ہوگئے ہیں۔ سو اصل مسئلے کی جڑ پکڑنے اور ٹوٹے ہوئے رابطہ کو جوڑنے کی بجائے مدارس کی دہائی شروع کردی گئی۔ ہماری

حکومتیں تو Yes Minister اور His Master's Voice کا کردار ادا کرتی ہیں؛ لہٰذا عقل کو استعمال کرنے کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔ اب بھی یہی ہوا کہ چلے تھے دہشت گردی کے ناسور کو جڑ سے اکھیڑنے، مگر بیچ میں کہیں سے مدرسہ رجسٹریشن اور ریگولیشن کی گرہ آ گئی، لہٰذا اکیسویں آئینی ترمیم میں ''مذہب و مسلک کے نام پر دہشت گردی'' کو نشان زد یعنی Highlight کرنا ضروری قرار پایا۔

مدارس کو چھیڑنے اور مذہب و مسلک کو سُرنامہ بنانے کا فائدہ مولانا فضل الرحمن کو ہوا، وہ سیاستِ دوراں کے ماہر ہیں، انہوں نے بروقت اسے Exploit کیا اور اب خوف زدہ حکمران اُنہیں منانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک طرف وزیرِ اعلیٰ پنجاب شہباز شریف مولانا کو منانے میں مصروف ہیں اور دوسری جانب وزیرِ داخلہ چوہدری نثار علی خان، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کے تعاقب میں ہیں اور وفا کی یقین دہانیاں کرا رہے ہیں، اب یہی کہا جاسکتا ہے کہ:

ع: ''چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی''

دہشت گردی بجائے خود ایک عنوان ہے جو اپنے مفہوم میں واضح ہے، بہتر ہوتا کہ صرف اسے عنوان بنایا جاتا، خواہ یہ مذہب و مسلک کے نام پر ہو یا لسانیت، علاقیت، اور صوبائیت کے نام پر ہو یا کسی اور نام پر۔ کیا حکومت کے دعوے کے مطابق پی ٹی وی، پارلیمنٹ اور پرائم منسٹر سیکریٹریٹ پر چڑھائی مذہب کے نام پر ہوئی تھی کہ اراکین پارلیمنٹ کو آمد و رفت کے لیے عقبی دروازوں اور محفوظ راستوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسی لیے ''اتحادِ تنظیماتِ مدارس پاکستان'' کی قیادت نے وزیرِ داخلہ کے اِس بیان کی مذمت کی ہے کہ: ''90 فیصد مدارس صحیح ہیں، صرف دس فیصد مدارس دہشت گردی یا انتہا پسندی میں ملوث ہیں''۔

حضور والا! دس فیصد، پانچ فیصد اور دو فیصد کا ڈراما یا ''بعض مدارس'' کا عنوان چھوڑ دیجئے!۔ اگر آپ کے پاس ثقہ معلومات ہیں، تو اُن مدارس کی فہرست ثبوت و شواہد کے

ساتھ جاری کریں، اتحادِ تنظیماتِ مدارس پاکستان کی قیادت آپ کے ساتھ کھڑی ہوگی، کسی دہشت گرد کی مدافع (Defender) نہیں بنے گی، خواہ یہ دہشت گرد افراد ہوں یا اُن کی پشت پر ادارے ہوں۔

اپنے لیے تو آپ کا موقف یہ ہے کہ اگر قومی انتخابات میں دھاندلی منظم طور پر، یعنی پالیسی کے تحت اور اداروں کی سطح پر کی گئی ہے، تو مجوزہ جوڈیشل کمیشن کو بحیثیتِ مجموعی قومی انتخابات کو دھاندلی زدہ قرار دے کر کالعدم قرار دینے کا اختیار ہونا چاہیے۔ اور اگر کہیں دھاندلی مقامی امیدواروں اور افراد کی سطح پر ہوئی ہے، ریاستی اور حکومتی نظام اس میں ملوّث نہیں تھا، تو پھر اسے Case To Case دیکھنا ہوگا اور معمول کے عدالتی نظام کے ذریعے ان تمام مقدمات کے فیصلے ہوں گے، سو اپنے لیے ایک معیار اور دینی مدارس کے لیے دوسرا معیار، یہ شعارِ انصاف نہیں ہے۔ تمام مدارس میں ایک خوف کی فضا پیدا کرنے، جسے پنجابی زبان میں "تھرتھلی مچانا" کہا جاتا ہے، بلا سبب سات پشتوں کی معلومات پر پُر فارمے بھروانے کا کام بے نتیجہ اور بے فیض ثابت ہوگا اور اس کے منفی نتائج برآمد ہوں گے۔

انگریزی کا محاورہ ہے: "More Pious than the pope"، یعنی پوپ سے بھی زیادہ پارسا بننے کی کوشش کرنا، کل رات مجھے رحیم یار خان سے ایک صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ ڈی سی او صاحب نے تمام علماء کو جمع کر کے وارننگ دی ہے کہ اذان سے پہلے لاؤڈ اسپیکر پر صلوٰۃ وسلام پڑھنا اب ممنوع ہے، اس کے خلاف کارروائی ہوگی۔ لگتا ہے ہماری شاطر بیوروکریسی مسلم لیگ (ن) کی حکومت کے لیے نت نئے مسائل پیدا کرنے اور Non Issues کھڑے کرنے میں مصروف ہے، اس کا نتیجہ مزید انتشار کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوگا۔

نوٹ: میں نے یہ انگریزی کا محاورہ گزشتہ کالم میں لکھ دیا تھا، گزشتہ سال امریکا کے دورے کے موقع پر ایک صاحبِ علم اور علم دوست شخصیت جناب ڈاکٹر خالد اعوان صاحب نے اس پر اعتراض کیا کہ پوپ کا پارسائی (Piousness) سے کیا رشتہ؟ گزارش یہ ہے کہ

ہمارے ہاں علم معانی میں پڑھایا جاتا ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں کلی موافقت ضروری نہیں ہوتی، اُن کے اُن کا اپنا اختراع کیا ہوا یعنی خودتراشیدہ ہوا تصورِ پارسائی مراد ہوگا، جسے قرآن نے ابتداع یا بدعت سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کا اسلام کے پاکیزہ تصورِ پارسائی سے دور دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔

یہ ایسا ہی ہے کہ مذہبی جذباتیت سے آنکھیں بند کر کے بعض حضرات کو اچانک سلمان تاثیر یاد آ گئے۔ لبرل دانش وَروں سے انتہائی معذرت کے ساتھ گزارش ہے کہ کیا ہر شخص نہیں جانتا کہ ناموسِ رسالت ہر مسلمان کے لیے ایک انتہائی جذباتی مسئلہ ہے، اسے چھیڑ کر اصل ہدف سے صرفِ نظر کرنا انتہائی درجے کی بے بصیرتی اور بے تدبیری ہے۔ کیا حال ہی میں برسوں بعد پیرس میں توہینِ رسالت پر مشتمل کارٹون چھاپنے والے ادارے پر حملہ آور لوگ پاکستان یا پاکستانی مدارس سے تعلق رکھتے ہیں، اب تک تو ان کا تعلق الجزائر سے بتایا گیا ہے۔ اخبارات سے معلوم ہوا کہ کوپن ہیگن (ڈنمارک) کے اُس رسالے کے مدیر، جس نے کافی عرصہ پہلے توہینِ رسالت پر مبنی کارٹون شائع کیے تھے، نے اعلان کیا ہے کہ آئندہ وہ توہینِ رسالت کے کارٹون شائع نہیں کرے گا۔ مثالیت پسندی اور عقلیت پسندی (Rationality) کے تقاضوں کا ادراک ہمیں بھی ہے، لیکن زمینی حقائق سے بالکل آنکھیں بند کر لینا بھی معقولیت کی علامت نہیں ہے۔ ایک ہی وقت میں تمام مسائل کو خلط ملط نہ کیا جائے، مناسب ہوگا کہ یکسوئی کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف برپا جنگ کو انجام تک پہنچایا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ اس کے بطن سے مسائل کا ایک انبار جنم لے اور ملک کو دہشت گردی سے پاک کرنے کا یہ آخری معرکہ بھی ناکامی سے دوچار ہو جائے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ انواع واقسام کے مسائل چھیڑ کر قوم میں اختلافات کو ابھارنے اور تفریق پیدا کرنے سے مسلح افواج کو وہ غیر مشروط حمایت نہیں مل پائے گی جس کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔ لہٰذا کچھ لوگوں کو قومی تاریخ کے اس اہم موڑ پر ''جفائے وفا نما'' سے احتراز کرنا چاہیے۔

12 جنوری 2015ء

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

16 دسمبر کے سانحۂ پشاور کی متابعت (Follow Up) میں پارلیمانی جماعتوں کے اتفاقِ رائے سے "قومی ایکشن پلان" تشکیل پایا اور اس کے نتیجے میں اکیسویں آئینی ترمیم منظور ہوئی۔ بعدازاں میڈیا کی کمین گاہوں میں تشریف فرما ہمارے مہربانوں نے دینی مدارس کو زیرِ بحث بنایا۔ ہم تو کہتے ہیں کہ جہاں مسئلہ ہے، ثبوت وشواہد کے ساتھ اس پر ہاتھ ڈالیے، کارروائی کیجیے، لیکن یہ کام دشوار ہے، مگر "بے کار مباش، کچھ کیا کر" کے مصداق، جو لوگ آرام سے بیٹھے ہیں، کسی کے لیے بشمولِ ریاست کوئی مسئلہ نہیں پیدا کر رہے، ان کے بازو مروڑنے کی مشق کی جاتی ہے۔

مندرجہ ذیل سطور میں ہم ان کے تحفظات پر گفتگو کریں گے۔ ایک سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ مدرسے اور مسجدیں مسلک کے نام پر قائم ہیں۔ امریکا میں بھی عیسائیوں کے سینکڑوں فرقے ہیں اور ہر ایک کی عبادت گاہیں الگ ہیں۔ یہودی اپنے بِیْعَه اور کَنِیْسَه (Temple)، مسیحی اپنے صَوْمِعَه (Church)، مسلمان اپنی مساجد اور دیگر مذاہب کے ماننے والے اپنی عبادت گاہوں میں عبادات ادا کرتے ہیں۔

ترکی میں ریاستی کنٹرول میں مساجد میں فقہِ حنفی کے مطابق عبادات ادا کی جاتی ہیں، مگر فقہِ جعفری کے ماننے والوں کی مساجد ریاستی کنٹرول سے آزاد ہیں۔ ہم استنبول کے علاقے زَیْنَبِیَّه میں اہلِ تشیُّع کے ایک مرکز میں گئے، وہاں اربوں روپے کا پروجیکٹ زیرِ تعمیر تھا، اس میں تعلیمی ادارے، لائبریری، نشر واشاعت حتیٰ کہ پرائیویٹ ٹیلی ویژن چینل کا

منصوبہ بھی شامل ہے۔ ہم نے اہلِ تشیُّع سے پوچھا کہ عمومی طور پر ملک میں مساجد حکومتی تحویل میں ہیں، آپ کو اتنا بڑا پروجیکٹ پرائیویٹ سیکٹر میں بنانے کی اجازت کیسے ملی، انہوں نے بتایا کہ زَینَبِیَہ کے علاقے میں ہماری تقریباً 22 مساجد پرائیویٹ سیکٹر میں قائم ہیں۔ ہماری حکومت کے ساتھ ایک مفاہمت (Understanding) ہے کہ نہ ہم حکومت کے لیے مسئلہ پیدا کرتے ہیں اور نہ حکومت ہمیں بلاسبب چھیڑتی ہے۔

پس حکمرانی کی حکمت یہ ہونی چاہیے کہ جہاں کوئی مسئلہ ہے، جہاں درد یا ناسور ہے، اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے اگر حکومت میں ہمت ہے تو براہِ راست اس پر ہاتھ ڈالے۔ ہمارے ہاں اصل مسئلے کو جڑ سے اکھیڑنے کی بجائے اَطراف میں چھیڑ چھاڑ کو ترجیح دی جاتی ہے، جس سے اصل ناسور تو اپنی جگہ رہتا ہے، البتہ انتشار میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ ہمارے ہاں مذہبی شعبے میں اگر کوئی الجھن ہے، جو ریاست کے لیے مشکلات پیدا کررہی ہے، تو وہ یہ ہے کہ دلیل واستدلال کی بجائے طاقت کے بَل پر اپنی بات کو منوانا اور اسی سبب سے انتہا پسند مذہبی تنظیمیں وجود میں آئیں، ان کا نیٹ ورک مساجد ومدارس سے الگ ہے، یہ ممکن ہے کہ اُن کے زیرِ اثر مساجد یا مدارس بھی ہوں۔ سچ یہ ہے کہ اس کے عوامل داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی، حکومت کو چاہیے کہ ان برادر مسلم ممالک سے براہِ راست بات کرے اور اُن سے مطالبہ کرے کہ ہمارے ملک میں آپ اپنے زیرِ اثر مذہبی گروہ پیدا نہ کریں، یہ ایک جائز سفارتی مطالبہ ہوگا۔

ایران میں آج بھی قُم کا حوزۂ علمیہ ریاست کے کنٹرول میں نہیں ہے اور آزاد ماحول میں کام کررہا ہے، زاہدان میں ایک بہت بڑا حنفی مدرسہ قائم ہے، جس کا نظریاتی تعلق پاکستان کے دیوبندی مسلک کے مدارس کے ساتھ قائم ہے، انقلاب کے باوجود ایران کی مذہبی انقلابی حکومت نے اس سیٹ اَپ کو نہیں چھیڑا۔ عراق میں بحیثیتِ مجموعی مساجد ریاست کے کنٹرول میں ہیں، لیکن نجفِ اشرف کے فقہِ جعفریہ کے مراکز آزاد ماحول میں کام کررہے ہیں۔

ہمارے ہاں لوگ سعودی عرب سمیت اُن مسلم ممالک کی مثالیں دیتے ہیں جہاں سمندر کی بالائی سطح پر مسلکی امتیازات اور اِرتعاش نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاست نے ایک مسلک اختیار کر رکھا ہے اور نہ صرف یہ کہ اسی کو کام کرنے کی آزادی ہے بلکہ ان کے بجٹ کا ایک حصہ بیرونی دنیا میں اپنے مسلکی نظریات کے حاملین کی سرپرستی پر خرچ ہو رہا ہے۔ لیکن پاکستان میں مذہب ریاستی کنٹرول میں نہیں ہے اور ریاست کے لیے اسے چھیڑنا بھی آسان نہیں ہے۔ حکمت کا تقاضا ہے کہ ایک قابلِ قبول حکمتِ عملی وضع کی جائے کہ مساجد و مدارس اپنے اپنے مسلک کے مطابق اپنے اپنے دائرے میں کام کریں، مگر ریاست و حکومت کے لیے اور بحیثیتِ مجموعی معاشرے کے لیے مسائل پیدا نہ کریں۔

ایک تبصرہ یہ بھی سننے میں آیا کہ مذہب کے نام پر ایک معیشت وجود میں آ چکی ہے، گویا اب یہ مفادات کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ ریاست کے متوازی تو ہمارے ہاں کئی معیشتیں کام کر رہی ہیں۔ بہت سے ماہرینِ معیشت کا دعویٰ ہے کہ ریاستی معیشت کے حجم کے کم و بیش برابر ایک متوازی معیشت کام کر رہی ہے، یہ معیشت ہمارے قومی اقتصادی اشاریوں اور اعداد و شمار کا حصہ نہیں ہے۔ رئیل اسٹیٹ کی معیشت کالے دھن کا سب سے گہرا سمندر ہے جو کراچی سے متحدہ عرب امارات اور ملائیشیا تک پھیلا ہوا ہے اور بعض کا دائرہ اس سے بھی باہر دوسرے بِراعظموں پر محیط ہے۔ رئیل اسٹیٹ کا ایک نامی گرامی ٹائیکون حکمرانوں کے تنازعات پیدا کرنے یا طے کرنے میں متحرک نظر آتا ہے۔ پرائیویٹ تعلیمی ادارے ایک بہت بڑی یا سب سے بڑی منفعت بخش معیشت ہے، اس پر ریاست کا کوئی چیک نہیں ہے اور یہ استحصال کا ایک بہت بڑا جال ہے۔ اغوا برائے تاوان، بھتا خوری اور طرح طرح کے مافیا اس سے الگ ہیں۔ اس مادر پدر آزاد اور ریاستی کنٹرول سے ماورا معیشت کے ٹائیکون ہماری سیاست کے کھیل میں براہِ راست حصہ بھی لیتے ہیں اور سیاست پر سرمایہ کاری بھی کرتے ہیں۔ آزاد الیکٹرونک میڈیا کی صورت میں اکیسویں صدی میں ایک نیا شعبہ وجود میں آیا ہے، جہاں پیسے کی ریل پیل کی داستانیں ناقابلِ یقین و بیان ہیں، لیکن

ان کے قبضے میں اسٹوڈیو ہیں، سامنے مائیک ہے، ہاتھ میں کیمرا ہے اور قلم کی طاقت اس سے سوا ہے، اس لیے حکومت اس سے ہمیشہ جان کی امان چاہتی ہے اور اسے چھیڑنا حکومت کے لیے ناقابلِ تصور ہے، کیونکہ ان کی زبان کی کاٹ سے سیاست دانوں کے جگر لہولہو ہیں۔

ایک معیشت مغرب نواز NGOs کی ہے، جو 9/11 کے بعد خودرو جھاڑیوں کی طرح اُگ آئیں اور کیری لوگر بل میں اُن کا مُعتَد بہ حصہ بھی رکھا گیا ہے، گزشتہ ڈیڑھ عشرے سے اسلام آباد کے فائیو اسٹارز، فور اسٹارز اور تھری اسٹارز ہوٹلوں کی رونقیں انہی کے دم سے قائم ہیں، ان کے ذمے پاکستانیوں کو لبرل اور ماڈریٹ بنانے کا فریضہ ہے، یہ غیبی برکات کہاں سے آئیں اور کہاں صرف ہوئیں، یہ ریاست کے کنٹرول سے باہر ہیں۔ کرپشن کی معیشت کا ذکر تو زبانِ زدِ عام ہے۔ اور یہ ایک ہزار ارب سالانہ بتائی جاتی ہے۔

اس میں مدارس ومساجد ہی واحد شعبہ ہے، جہاں لوگ رضاکارانہ طور پر اپنے واجب اور نفلی صدقات وعطیات دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید رکھتے ہیں، اس شعبے میں نہ کوئی دھونس ہے، نہ دھمکی ہے، نہ جبر و جور ہے، نہ ہی منصب وعہدے کا ناروا استعمال ہے، بس حُسنِ ظن اور باہمی اعتماد کا ایک رشتہ ہے، جس پر یہ ساری عمارت استوار ہے۔

ایک دانشور نے ٹیلی ویژن پر کہا کہ دینی مدارس ومساجد کے مشاہرے کم ہیں، یہ درست ہے اور انہیں ریاست کی طرف سے مقررہ کم از کم معیار کے مطابق تو ہونا چاہیے، لیکن یہ وسائل کا مسئلہ بھی ہے، تاہم انتظامیہ کو بے حس نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن بعض پرائیویٹ اسکولوں کے مشاہرے تو مساجد اور دینی مدارس کے مقابلے میں بھی ہوش رُبا حد تک کم ہیں، تاہم کسی ایک کی غلطی یا غیر منصفانہ رویہ دوسرے کے لیے جواز نہیں بننا چاہیے۔ اسی طرح مدارس کو بھی اصلاح کے لیے ہمیشہ آمادہ رہنا چاہیے۔

ایک اعتراض یہ بھی آیا کہ مدارس کا نصاب فقہی اساس پر قائم ہے اور قرآن وسنت کی حیثیت ذیلی یا ثانوی رہ جاتی ہے، یہ بات کسی حد تک درست ہے، جب تک ہم اپنے خطے

میں بند تھے، تو زمینی حقیقت اور تقاضے یہی تھے۔ اب دنیا سمٹ چکی ہے، اَسفار اور انفارمیشن کے ذرائع ناقابلِ یقین حد تک ترقی کر رہے ہیں، تو ہمیں بھی اپنی اساس پر قائم رہتے ہوئے اپنی سوچ میں کھلا پن پیدا کرنا ہوگا۔ میں تو اپنے اساتذہ سے کہتا ہوں کہ آپ قرآن وسنت کی فہم کے لیے صرف ونحو، لغت، ادب، معانی وبلاغت اور دیگر معاون علوم پڑھاتے ہیں، ان کو شروع ہی سے قرآن پر منطبق کریں اور طلبہ وطالبات کو صیغوں (Tenses) کی تفہیم کے لیے بھی قرآن سے جوڑیں۔ یہ ہمارے بہت سے احباب کے علم میں نہیں ہے کہ اب ترجمۂ قرآن ہمارے ابتدائی نصاب کا حصہ ہے اور اسی طرح حدیث کی کتابیں ابتدائی درجات میں بھی شامل ہیں، تاہم قرآن وحدیث کو پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ تفصیلاً پڑھانا اس دور کی ضرورت ہے، اس سے خود فکر میں وسعت پیدا ہوگی۔

باہمی اعتماد کے ساتھ دینی مدارس کا مسئلہ حل کرنے کے لیے سیاسی عزم (Political Will) کی ضرورت ہے۔ ہمارا تقریباً دو عشروں پر محیط مذاکرات کا تجربہ یہ ہے کہ ہماری سیاسی قیادت میں اس کا فقدان ہے، جب بھی ہمارے مسائل کسی حتمی حل کے قریب پہنچے تو بیوروکریسی نے اسے سبوتاژ کردیا اور سیاسی حکمران لاتعلق سے ہو کر رہ گئے۔ ہماری بیوروکریسی کی ذہنی ساخت ہمیشہ یہ رہی کہ جس ادارے میں بیوروکریٹک کنٹرول نہ ہو، اسے قانونی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ سابق سیکریٹری مذہبی امور جناب وکیل احمد خان کے ہمراہ ''اتحادِ تنظیماتِ مدارسِ پاکستان'' کے قائدین نے حکومتِ برطانیہ کی دعوت پر ایک مطالعاتی دورہ کیا، وہاں ہمیں بتایا گیا کہ حکومت کا کام ریگولیٹر کا ہے، مقررہ معیارات کے مطابق پرائیویٹ سیکٹر میں بھی تعلیمی بورڈ قائم ہوسکتا ہے۔

13 جنوری 2015ء

دہشت

دہشت کو انگریزی زبان میں Terror اور عربی میں "اِرہاب" کہتے ہیں، یعنی جب کوئی فرد، معاشرہ یا قوم خوف کی کیفیت میں مبتلا ہو جائے، ہر وقت عدمِ تحفظ کا شکار رہے، اُس کا امن غارت جائے، سکون چھن جائے، تو اسے دہشت زدہ (Terrorize) کہا جاتا ہے اور جس نے یہ کیفیت پیدا کر دی ہو، وہ دہشت گرد (Terrorist) اور اِرہابی ہے۔ گویا دہشت، قتل اور موت کے ہم معنی نہیں ہے، موت دہشت میں مبتلا کرنے کی متعدد صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔ موت سے ہم کنار ہونے والا دہشت زدہ نہیں کہلاتا، وہ تو اس دنیا کے تمام غموں اور تفکرات سے آزاد ہو جاتا ہے، اُس جہان کی فکر یقیناً اسے دامن گیر ہوتی ہوگی۔ دہشت زدہ تو وہ ہوتے ہیں، جو زندہ رہ جاتے ہیں اور قتل وغارت، لوٹ مار، تخریب وفساد اور گھیراؤ جلاؤ کے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اپنے دل ودماغ پر طاری کر دیتے ہیں۔

الغرض دہشت کے نتیجے میں معاشرے میں سراسیمگی اور سنسنی (Sensation) پھیلتی ہے، خوف کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور پھر انسان کو اپنے سائے سے بھی خوف آنے لگتا ہے، اگر معاشرہ بحیثیتِ مجموعی اس کی کیفیت میں مبتلا ہو جائے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دہشت گرد اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور سماج اور نظام نے ذہنی طور پر شکست قبول کر لی۔ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آرمی پبلک اسکول پشاور کے سانحہ کے بعد دانستہ یا نادانستہ طور پر یہ فضا پیدا کر دی گئی ہے۔ میڈیا والے کیمرے لے کر چل پڑے اور

ایک ایک اسکول کی تصویر شعلہ بار تبصروں کے ساتھ نشر کرنا شروع کر دی کہ حکومت اسکولوں اور تعلیمی اداروں کو Safe & Secure یعنی محفوظ بنانے میں ناکام ہو گئی ہے۔ ہر شخص کو معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستان میں چند حساس اداروں کو تو اس طرح کی آئیڈیل سیکورٹی شاید دی جا سکے، تمام اداروں کے لیے یہ جامع انتظامات عملاً ممکن نہیں ہیں، نہ ہماری حکومتوں کے پاس اتنے وسائل ہیں کہ ہر تعلیمی ادارے کی چہار دیواری قلعہ نما بنا دے اور سیکورٹی چیک کا آئیڈیل نظام قائم کر دے، اس طرح کا خواب تو دیکھا جا سکتا ہے، کاغذ پر منصوبے بنائے جا سکتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں عملی دنیا میں ایسا ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور ہے۔ ہر جگہ ایک ایک دو دو سپاہی کھڑا کرنے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

میں سیکورٹی کا ماہر نہیں ہوں، اناڑی ہوں، مُبتدی بھی نہیں ہوں۔ لیکن میرے نزدیک اصل کام یہ ہے کہ سیاسی قیادت اور سلامتی کے ادارے خود اعتمادی کا مظہر بنیں اور قوم میں اعتماد پیدا کریں اور یہ احساس پیدا کریں کہ ہمیں ایک طویل جنگ لڑنی ہے، ہمارا مقابلہ کسی سامنے مورچہ زن دشمن سے نہیں ہے بلکہ عَدُوِّ مستور (Hidden Enemy) سے ہے، وہ اچانک کسی بھی کونے یا کمین گاہ سے برآمد ہو کر حملہ کر سکتا ہے۔ آئے روز ہم میڈیا کے ذریعے یہ سنتے رہتے ہیں کہ پولیس یا رینجرز کے سپاہی سیکورٹی گشت پر تھے کہ عقب یا اطراف سے کسی دہشت گرد نے اُنہیں نشانہ بنا دیا، آئے دن بم پلانٹ کرنے کے واقعات رپورٹ ہوتے رہتے ہیں۔

پس اس کے لیے ضروری ہے کہ عوام میں اعتماد پیدا کیا جائے تاکہ وہ سلامتی کے اداروں کی آنکھیں، کان اور دماغ بنیں اور گاؤں، قصبے، گلی محلے اور شہروں کی کمین گاہوں میں چھپے اجنبی اور مشکوک افراد کی نشاندہی کریں تو انہیں تحفظ ملے گا۔ سب لوگ مشکوک سرگرمیوں پر نظر رکھیں اور اگر کوئی پکڑا ہوا شخص اپنی صحیح شناخت بتا دے اور مطمئن کر دے، یا کوئی معتبر شخص اُس کی ذمے داری قبول کرے تو بلاوجہ اسے پریشان نہ کیا جائے، محض احمقانہ کارروائی ڈالنے کے بھی منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

حکمرانوں کی بوکھلاہٹیں اور بیوروکریسی کی شاطرانہ اور عیارانہ ذہنیت بھی حکومت اور عوام کے مختلف طبقات کے درمیان نفرتیں اور دوریاں پیدا کرتی ہے۔ مجھے وزیر اعلیٰ پنجاب کے زیرِ صدارت علمائے کرام کی میٹنگ کے بارے میں مضحکہ خیز خبریں ملیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہم ایک پُرعزم قوم نہیں ہیں۔ لاوڈ اسپیکر کے بارے میں یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ تقاریر، دروس، خطابات اور عام جلسوں میں غیر محتاط اور بلاضرورت بلکہ وحشیانہ استعمال نہیں ہونا چاہیے، لیکن وہاں یہ ہدایات دی جارہی تھیں کہ اذان میں صرف ایک اسپیکر کا استعمال ہو، اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام نہ پڑھا جائے، کیا ہم ذہنی طور پر اس حد تک دہشت زدہ اور مغلوب ہوگئے ہیں کہ اذان کے کلمات اور درود وسلام کے چند کلمات بھی ہمارے لیے خطرے، فساد اور دہشت کی علامت ہیں، فیاللعجب!۔

کیا پاکستان کا ہر شخص روزِ روشن کی طرح اس حقیقت کو نہیں جانتا اور نہیں مانتا کہ درود وسلام اس ملک کی غالب اکثریت اہلسنّت وجماعت کا مسلکی شِعار ہے اور درود وسلام پڑھنے والے اَمن پسند اور بے ضرر لوگ ہیں۔ کیا اسے مسلکی اور اعتقادی امور میں مداخلت سے تعبیر نہیں کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ مسلم لیگ (ن) کی حکومت کا ایجنڈا اذان اور درود وسلام بند کرانا ہے۔ ملک کو مصطفیٰ کمال اَتاترک کے شِعار کا تابع بنانا ہے۔ حضور والا! ذرا ہوش کے ناخن لیجیے!، کامیاب حکمرانی محض طاقت کے بل پر اور منصبی اختیارات کے خول میں بند ہوکر نہیں کی جاتی ہے، حکمت ودانش سے کی جاتی ہے۔

صد افسوس کہ ہم انتہا پسند لوگ ہیں، اچانک یوٹرن لیتے ہیں، ارتقا اور اعتدال ہمارے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔ ہم ایک ہی جست لگا کر شرق سے غرب اور شمال سے جنوب تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ہماری منزل ایک انتہا سے دوسری انتہا ہوتی ہے۔ کامیاب اور فلاح یافتہ قوموں کا مزاج توسُّط واعتدال، حکمت وتدبر اور دانش وبصیرت کا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حکمت ودانش کے اسوۂ حکمرانی کا مثالی نمونہ پیش فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنی شدید خواہش کے باوجود ایک انتہائی پسندیدہ کام کو چھوڑ دیا، جس کے لیے آپ کے پاس

وسائل بھی موجود تھے اور آپ کا ہر قول و فعل منشائے ربانی تھا، یعنی بیت اللہ کی موجودہ عمارت کو شہید کر کے اسے دوبارہ بنائے ابراہیمی پر تعمیر کرنا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

''اگر تمہاری قوم تازہ تازہ کفر کو ترک کر کے اسلام میں داخل نہ ہوئی ہوتی، تو میں بیت اللہ کو منہدم کر دیتا اور اسے دوبارہ بنائے ابراہیمی پر تعمیر کرتا اور پیچھے کی جانب بھی اس کا ایک دروازہ بناتا یا ایک روایت کے مطابق میں اس کے دو دروازے بناتا''۔

لیکن آپ نے اپنی اس انتہائی محبوب خواہش کو اس لیے پورا نہ کیا کہ کہیں بیت اللہ کی عمارت پر گینتی یا ہتھوڑا چلتے ہوئے دیکھ کر لوگوں کے ایمان متزلزل نہ ہو جائیں کہ کیا اللہ کے گھر کو بھی گرایا جا سکتا ہے؟۔

یہاں تک کہ زمانۂ قبلِ اسلام کی وہ اقدار جو اسلام کے متصادم نہیں تھیں یا اُن میں اسلام کے ساتھ مطابقت کی گنجائش تھی، آپ نے انہیں جاری رکھا۔ ان میں عاقلہ کا نظام، قتل کی دیت، قبائلی معاہدات اور حلیف و حریف کی تقسیم شامل ہے، آپ نے کسی دینی مقصد یا حکمت کے بغیر بلاوجہ ان چیزوں کو ختم کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ خیر کے کام میں اگر کسی کے ساتھ مشابہت پیدا ہو رہی ہے، تو خیر کو ترک کرنے کا حکم نہیں فرمایا بلکہ مشابہت سے گریز کی تدبیر فرمائی، اس کی مثال عاشورِ محرم کا روزہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ: آج بھی اگر کوئی مجھے ''حِلفُ الفُضول'' کا حوالہ دے کر مدد کے لیے پکارے گا، تو میں مظلوم کی مدد کے لیے پہنچ جاؤں گا''۔

لہٰذا میری گزارش ہے کہ دہشت گردوں کی تخریبی کارروائیوں کے مقابلے کے لیے سب سے پہلے امریکا کی ہوم لینڈ سیکورٹی کی طرز پر ایک مرکزی سراغ رسانی اور سیکورٹی کے ادارے کا قیام ہے۔ وزیر داخلہ نے نیکٹا (National Counter Terrorism Authority) کا ادارہ تو قائم کر دیا، لیکن وہ فعال نظر نہیں آیا۔ سو سب سے بڑی کامیابی دشمن کو اِقدام سے پہلے گرفت میں لینا اور جرم کے ارتکاب سے پہلے اُسے اُس کے انجام

تک پہنچانا ہے اور اگر خدانخواستہ اس میں کامیابی نہ ہو اور وہ کوئی اقدام کر بیٹھے، تو انتہائی ماہرانہ تکنیک اور واقعاتی شہادتوں (Forensic Evidence) سے مدد لے کر اس کے پورے نیٹ ورک تک رسائی حاصل کر کے اُسے جڑ سے اکھیڑنا ہے۔

دوسرا اہم کام ایسی سریع الحرکت فورس (Rapid Deployment Force) کا قیام ہے، جو بروقت محلِ وقوع تک پہنچ کر یا تو دہشت گردوں کے اقدامات کو ناکام بنا سکے یا اس کے ممکنہ نقصانات کو کم سے کم کر سکے۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ کوئی قلیل المدت جنگ نہیں ہے، یہ طویل المدت مہم ہے، کسی کو شک ہو تو امریکا سے پوچھ لے۔

16 جنوری 2015ء

امن کی فاختہ

آج کل میں امریکا کے دورے پر ہوں، کسی ایک مقام پر مستقل قیام نہیں ہے، دینی پروگراموں میں شرکت کے لیے مختلف ریاستوں میں جانا پڑتا ہے اور فاصلے بھی کافی زیادہ ہیں اور خود امریکا کے اندر بھی ٹائمنگ زون مختلف ہیں۔ جب بھی امریکا آنا ہوتا ہے، ٹینیسی (Tenessi) اسٹیٹ میں ایک رات ڈاکٹر شہرام ملک صاحب کے ہاں بھی قیام ہوتا ہے، ان کی بیگم بھی ڈاکٹر ہیں اور ماشاء اللہ بہت مہمان نواز ہیں۔ ان کے احباب دور دراز سے سفر کر کے آتے ہیں، ان میں سے اکثر میاں بیوی دونوں ڈاکٹر ہوتے ہیں اور باقی حضرات بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باوقار عہدوں پر فائز لوگ ہوتے ہیں۔ یہ ایک نہایت سنجیدہ اور باوقار علمی وفکری مجلس ہوتی ہے، جو خواتین وحضرات کے لیے یکساں دلچسپی کی حامل ہوتی ہے۔ وطن سے دوری کے سبب ان سب لوگوں کو ہم سے زیادہ پاکستان سے محبت ہے، اسی لیے انہیں ہر وقت اپنے وطنِ عزیز کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہمارا آزاد میڈیا ہر شعبے میں ہمیشہ پاکستان کا منفی رخ پیش کرتا ہے، یہ ان کی باہمی مسابقت کی مجبوری ہے، کیونکہ من حیث القوم ہم اپنے محاسن سے زیادہ اپنے عیوب سن کر محظوظ ہوتے ہیں۔ میری ایک عرصے سے دلی خواہش ہے کہ کوئی ایسا پاکستانی چینل بھی ہو، جو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاکستان کے روشن پہلو دکھائے اور نئی نسل میں امید کی کرن روشن کرے۔ آپ کہیں گے کہ پاکستان ٹیلی ویژن تو روزِ اوّل سے یہ خدمت بجا لا رہا ہے، مگر میری مراد حکومت کے قصیدے پڑھنا نہیں ہے بلکہ پاکستان پر نئی نسل کے یقین واعتماد میں اضافہ کرنا ہے اور

حبُّ الوطنی کے جذبات کو ابھارنا ہے۔

بہت سے پڑھے لکھے لوگ بیرونِ ملک رہتے ہوئے بھی پاکستانی اخبارات میں شائع شدہ اپنے پسندیدہ کالم انٹرنیٹ کے ذریعے باقاعدگی سے پڑھتے ہیں، ان میں ہمارے کرم فرما بھی شامل ہیں۔ ان اَسفار میں بالعموم نیوجرسی اسٹیٹ سے علامہ مقصود احمد قادری بھی میرے ساتھ شریکِ سفر ہوتے ہیں اور میرے ساتھ ان کے خطابات بھی ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا: ''امن کی فاختہ جو ہم سے روٹھ کر بہت دور جا چکی ہے، دوبارہ ہمارے دامِ تزویر میں آجائے (یعنی ہمیں امن نصیب ہو جائے)''۔ اس میں اردو ادب کی روایت سے استفادہ کرتے ہوئے میں نے ''فاختہ'' کو امن کی علامت کے طور پر استعمال کیا تھا۔

ورجینیا اسٹیٹ میں ہمارے کرم فرما ڈاکٹر خالد جاوید اعوان صاحب ہیں، وہ انتہائی شہرت یافتہ آئی اسپیشلسٹ ہیں اور اپنے شعبے میں ان کا بہت وسیع تحقیقی کام ہے، جو امریکا کے اعلیٰ شہرت یافتہ میڈیکل جرنلز میں شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی دور سے سفر کر کے ہمارے پروگرام میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نہایت وسیع المطالعہ اسلامی اسکالر بھی ہیں اور بین المذاہب تقابلی مطالعہ پر اُن کو کافی عبور حاصل ہے، بائبل پر بھی گہری نظر ہے۔ ان کے دولت خانے پر ہفتہ وار علمی مجلس منعقد ہوتی ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ پاکستانی احباب دور دراز سے سفر کر کے اس میں شریک ہوتے ہیں، تفاسیرِ قرآن اور دینی کتب کا کافی ذخیرہ نہ صرف ان کی لائبریری کی زینت ہے بلکہ ان کے زیرِ مطالعہ بھی رہتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ''فاختہ (Dove)'' کے علامتِ امن ہونے کی بابت ایک تفصیلی تحقیقی مقالہ لکھ کر مجھے پیش کیا، جو یقیناً میرے علم میں اضافے کا سبب بنا، مجھے اعتراف ہے کہ میں اس پس منظر سے پہلے متعارف نہیں تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ قارئینِ کرام کو بھی اس علمی فیضان میں شریک کروں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''یورپین لٹریچر، پریس اور ذرائعِ ابلاغ میں ''فاختہ'' کو امن کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس مغربی شِعار کو عالمی سطح پر پذیرائی ملتی چلی گئی، چنانچہ امن کی علامت کے طور پر ''فاختہ'' عالمی ثقافتوں اور سماجوں میں مقبول ہوتی چلی گئی''۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ''''فاختۂ امن'' کے پسِ منظر میں جو اصل کہانی ہے، وہ دلچسپ بھی ہے اور روح فرسا بھی۔ اقوامِ مغرب ہر نظریے اور عقیدے سے بڑھ کر محبت کی ڈفلی پر ناچتی ہیں، حالانکہ آپ اگر ان سے محبت کی تعریف پوچھیں تو ہر ایک کی تعبیر دوسرے سے مختلف ہوگی۔ چنانچہ ان کے نزدیک اس لفظی سَراب کے فرضی سمندر میں ہر برائی، ہر ظلم اور ہر فاسد عقیدہ سما سکتا ہے۔ مغربی انشا پردازوں کی نفسیات یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو کوئی بھی نام دینے کے لیے یونانی دیو مالائی (Greek Mythology) تصورات کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اسی ذہنی ساخت (Mindset) کے تحت ان کا ذہن امن کی علامت کے لیے دیو مالائی دیوی اَیفروڈائٹی (Aphrodite) کی طرف منتقل ہوا۔ آیئے جانیں کہ ایفروڈائٹی کیا ہے، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے: ''ایفر و ڈائٹی کا معروف نشان ''فاختہ (Dove)'' ہے، یہ جنسی آوارگی اور زنا بالجبر (Rape) کی بھی دیوی تھی، مذہبی داشتائیں (Prostitutes) بھی اس کی پرستش کرتی تھیں، (جلد:2،ص:110، اشاعت: 1970)''۔ ''مذہبی داشتہ'' کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُن کے دین میں تھا کہ جوان عورت شادی سے پہلے ایک رات کسی اجنبی مرد کے ساتھ مباشرت میں گزارے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ایفروڈائٹی دیوی کی رَس بھری داستان یوں بیان کرتا ہے: ''جب کارنس (Cornus) نے اپنے باپ یورانس کا عُضوِ تناسُل کاٹ کر اس کو سمندر میں پھینک دیا، تو اس کے گرد جمع شدہ جھاگ سے ایفروڈائٹی (Aphrodite) پیدا ہوئی''۔ (جلد:2،ص:111)

اہلِ مغرب نے اسی یونانی دیوتا یورانس (Uranus) سے عقیدت کے اظہار کے لیے ملکی نظام میں زمین سے چودہ گنا بڑے ساتویں سیارے کا نام Uranus رکھا ہے''۔

یہ زنا بالجبر، جنسی آوارگی، والد کے ساتھ ظلم اور مشرکانہ عقائد پر مشتمل اخلاق باختگی کے تصورات کا مجموعہ ہے''۔

ڈاکٹر صاحب نے فرانسیسی مستشرق اے۔ولیم اور سیرتِ ابنِ ہشام کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب فتح مکہ کے موقع پر رحمۃ للعلمین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ نے عثمان بن ابی طلحہ سے بیت اللہ کی کلید لی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے، تو آپ ﷺ نے فاختہ کی صورت کا ایک لکڑی کا بنا ہوا بت کعبے کی چھت سے لٹکا ہوا دیکھا۔سو آپ نے اسے توڑ کر باہر پھینک دیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکینِ عرب کے ہاں جو طرح طرح کے بت تھے، ان میں ایک بت ''فاختہ'' کی صورت کا بھی تھا، لہٰذا اس کا مشرکانہ عقائد سے بھی یقیناً تعلق ثابت ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس فکری کاوش کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ان اصطلاحات، استعارات، تلمیحات اور محاوروں کو استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے، جن کا ایک خاص پس منظر ہے اور اس کے ڈانڈے اخلاق باختگی، بدکاری اور الحاد و شرک سے ملتے ہیں اور ہمارے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اور کئی طریقے ہیں، لہٰذا یہ ہماری کوئی مجبوری بھی نہیں ہے۔سو میں اُن کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے عہد کرتا ہوں کہ آئندہ ''امن کی فاختہ'' کا استعارہ استعمال نہیں کروں گا۔

اسی طرح انہوں نے ''More Pious than the pope'' یعنی پوپ سے بھی زیادہ پارسا والے محاورے کو بھی قابلِ اعتراض قرار دیا ہے کہ اس سے پوپ کے پارسا ہونے کا تأثر ابھرتا ہے، اُن کی یہ بات بھی درست ہے، ہم اپنے مفہوم کو ''شاہ سے بھی زیادہ شاہ کے وفادار'' کے محاورے سے بھی ادا کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے میں ایک عرب عالم کا حوالہ دیا کہ وہ اپنے جمعے کے خطاب میں نہایت شدّ ومد سے ہر بات کو بدعت اور شرک قرار دے رہے تھے اور ''صلوٰۃ الجمعہ'' کے لیے Friday Prayer کے کلمات استعمال کر رہے تھے، حالانکہ

اہلِ مغرب نے دنوں اور مہینوں کے نام بھی یونانی دیومالائی پسِ منظر سے دیویوں اور دیوتاؤں کے نام پر رکھے ہیں۔ چنانچہ Friday کا نام فریہ(Freya) دیوی کے نام پر رکھا گیا ہے اور اس لحاظ سے Friday Prayer کے معنی ہوں گے: ''فریہ دیوی کی عبادت'' اس پر میں یہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ اگر انگریزی میں خطبہ دینے والے علمائے کرام ''صلوٰۃ الجمعہ'' کی اصطلاح استعمال کرنا شروع کردیں تو ہمارے انگلش اسپیکنگ مسلمانوں کی زبان پر بہت جلد یہ اصطلاح رائج ہوسکتی ہے، یہی صورتِ حال ہماری دوسری شرعی اصطلاحات کی ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے کو ان احادیثِ مبارکہ سے مزین کیا ہے، جن کی رو سے مذاہبِ باطلہ سے مشابہت اختیار کرنا حرام ہے۔ میں نے ان کے دینی جذبے کی تحسین کی اور اُن سے گزارش کی کہ ذرا ہاتھ نرم رکھیں، کیونکہ ان چیزوں میں مذاہبِ باطلہ کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا یقیناً حرام ہے، جو آج بھی ان مذاہب کے شِعار یعنی امتیازی علامت کے طور پر معروف ہیں، جیسے مسیحیوں کی صلیب اور ہندوؤں کے زُنار وغیرہ۔ لیکن جو چیزیں اب ان کے مذہبی شِعار کے طور پر معروف نہیں ہیں، جیسے ایام اور مہینوں کے نام وغیرہ اُن پر حرمت کا اطلاق نہیں ہوگا، مگر جس حد تک ان سے اجتناب ممکن ہو اور ابلاغ میں دشواری نہ ہو، ضرور کرنا چاہیے۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو پھر کبھی ہوگی، ان شاء اللہ۔

شعار، شعیرہ اور شعار کی جمع ہے۔ قرآن مجید میں مقدس مذہبی علامات وعبادات کو شعائر سے تعبیر فرمایا ہے، جیسے صفا، مروہ، مزدلفہ، حرم میں قربانی کے لیے نشان زد جانور، کعبۃ اللہ، زم زم وغیرہ، بعض مفسرین نے دین اسلام اور جملہ تعلیمات پر شعائر کا اطلاق کیا ہے۔

26 جنوری 2015ء

کاش کہ ہم حقیقت پسند بن سکیں

امریکا میں دورانِ سفر بعض اوقات کسی میزبان کے ڈرائنگ روم میں پاکستان کے ٹیلیویژن چینلز کی سرخیاں (Headline News) دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ آج سننے کو ملا کہ پنجاب گورنمنٹ نے لازم قرار دیا ہے کہ شہروں سے لے کر قصبوں اور دیہات تک ائمہ وخطباء اپنے خطبات کی تحریری نقول اور آڈیو کیسٹ یا وڈیو سی ڈیز ضلعی انتظامیہ کے پاس جمع کرائیں گے۔ اس سے بالواسطہ طور پر یہ بھی لازم قرار پایا کہ ہر مسجد، محفل درس اور مجلسِ وعظ وتذکیر میں ریکارڈنگ کا انتظام ہونا چاہیے۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کرلیں کہ یہ انتظام بھی کرلیا گیا، تو حکومت کو اس کے لیے ایک بہت بڑا اسیکریٹریٹ اور ریکارڈ روم قائم کرنا ہوگا، پھر ہر خطبے کے تفصیلی مطالعے اور ہر آڈیو کیسٹ اور سی۔ڈی از اوّل تا آخر سننے کے لیے بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ عملہ رکھنا ہوگا۔ ایک آدمی روزانہ کتنے خطبات کا مطالعہ کرسکے گا اور کتنی سی۔ڈی سن سکے گا، یہ ایک اہم سوال ہے، کیونکہ اس نے قابلِ اعتراض مواد کا ریکارڈ بھی مرتب کرنا ہوگا، پھر اُس کے قابلِ اعتراض قرار پانے یا نہ پانے پر علمی بحثیں بھی ہوں گی۔

ہماری انتظامی صلاحیت کا عالم یہ ہے کہ ہم قومی انتخابات کے ریکارڈ کو درست طریقے سے محفوظ رکھنے میں ناکام ہیں، حالانکہ اس کے بارے میں یہ امکان موجود رہتا ہے کہ انتخاب میں شکست کھانے والے امیدوار اسے عدالت اور ٹرابیونل میں چیلنج کرسکتے ہیں اور وکلاء بال کی کھال اتارنے میں مہارتِ تامّہ رکھتے ہیں، تو اسے تو ہر حال میں قواعد وضوابط

کے مطابق محفوظ رہنا چاہیے۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے اور آج کل اس کے شواہد بھی سامنے آرہے ہیں۔ ان شواہد کو بنیاد بنا کر تحریکِ انصاف یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ پورے انتخاب ہی کو کالعدم قرار دیا جائے، اس کے برعکس انتخابات میں کامیابی حاصل کر کے برسرِ اقتدار آنے والی جماعت مسلم لیگ (ن) کے لوگ کہہ رہے ہیں کہ اگر انتخابی عملے نے کسی جگہ بدانتظامی، نااہلی یا غفلت کا مظاہرہ کیا ہے، تو اس کی سزا انتخاب جیتنے والے امیدوار کو کیوں ملے کہ "کرے کوئی اور بھرے کوئی"۔

سو ہماری گزارش یہ ہے کہ قانون ایسا بنانا چاہیے جو محض کتاب کی زینت نہ بنے اور نہ ہی دستورِ پاکستان کے آرٹیکل 62 اور 63 کی طرح گونگا اور بہرا ہو کہ "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" کا مصداق قرار پائے۔ چنانچہ حال ہی میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے لارجر بنچ نے بھی اس کی تعبیر وتشریح (Interpretation) سے دامن کھینچ لیا۔ سو قانون واضح اور قابلِ عمل ہونا چاہیے۔ ہمارے نزدیک اس کی صورت یہ ہے کہ ایک مؤثر اور فعال شکایت سیل (Complaint Cell) ہو، جہاں لوگ کسی بھی خطیب اور مقرر کے بارے میں ثبوت وشواہد کے ساتھ شکایت درج کریں۔ شکایت کنندہ کی ذمہ داری ہو کہ وہ یہ ثبوت سی ڈی یا آڈیو کیسٹ کی صورت میں پیش کرے، ہو سکے تو دو گواہ بھی ساتھ پیش کرے، ہر ایک کو کسی بھی مذہبی مجلس میں ریکارڈنگ کی عام اجازت ہو اور مذہبی منافرت پر مبنی خطابات ثابت ہونے پر عدالت سزا دے، اسی طرح اس کلچر کا سدِّ باب ہوگا۔ سب جانتے ہیں کہ اس کلچر کے فروغ میں معاشی مفادات بھی شامل ہیں، اس کے لیے لازم ہے کہ اس طرح کی مجالس کی انتظامیہ کو بھی شریکِ جرم قرار دیا جائے۔ ہمارے ہاں مختلف المسالک پیشہ ور واعظوں اور خطباء کی ساری صنعت اسی پر قائم ہے، تاہم اگر کوئی حکومت اور انتظامیہ اپنی حکمت اور دانش مندی سے اس کلچر پر روک ٹوک عائد کرنے میں کامیاب ہو جائے تو بسا غنیمت ہے، اس کا فائدہ دین اور معاشرہ دونوں کو پہنچے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجے میں ہمارے واعظین اور خطباء عقیدے اور عمل کی اصلاح اور اصلاحِ معاشرہ کو اپنا موضوع

بنائیں، اخلاقی و معاشرتی مفاسد پر اپنی توجہ مرکوز کریں، لوگوں میں خوفِ خدا اور فکرِ آخرت پیدا کریں اور ہم بتدریج ایک بہتر اَخلاقی فضا اور اَخلاقی اَقدار کا حامل معاشرہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو جائیں اور ہمارے اندر سے کرپشن کا ناسور ختم ہو اور دولت و ثروت اور جاہ و منصب سببِ تکریم بننے کی بجائے، دیانت و امانت، صداقت و شجاعت، ایثار و قربانی اور علم و عمل کی اقدار کے حاملینِ عزت و تکریم کے حق دار قرار پائیں۔

ہمارا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم ایک معاشرتی خرابی کا علاج کرنے بیٹھتے ہیں، تو اصل نکتے اور مرکزیے پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے دائرہ کار کو اتنا پھیلا دیتے ہیں کہ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کریں اور کہاں جا کر ختم کریں، پہل کہاں سے کریں اور اختتام کہاں پر ہو، چنانچہ ہم ٹامک ٹوئیاں مارنے لگتے ہیں اور بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ ہماری بیوروکریسی مسائل کو سلجھانے کی بجائے اُلجھانے میں مہارت رکھتی ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ لگتا ہے کہ ہم نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے اور اب دامن کو بچانا اور بساط لپیٹنا مشکل ہو رہا ہے۔ چلے تھے ایک دشمنِ جان و ایمان کو ختم کرنے اور اس سعیِ لاحاصل کے نتیجے میں کئی اور دشمن پیدا کر دیے، کیونکہ ہمارے ہاں خیر کی قوتوں کا مجتمع ہونا تو امرِ دشوار ہوتا ہے، مگر شر کی قوتوں کا اجتماع نہایت آسان ہوتا ہے، اسی لیے ''امر بالمعروف'' سے ''نہی عن المنکر'' دشوار ہے۔ ''امر بالمعروف'' تو یہ ہے کہ:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو، ہم دعا کر چلے

یعنی جو سنے اس کا بھی بھلا اور جو نہ سنے اس کا بھی بھلا۔ الغرض امر بالمعروف بے ضرر کام ہے، اسی لیے ہماری تبلیغی اور دعوتی جماعتوں نے اس بے ضرر شعار کو اپنایا ہے، ہر ایک کہتا ہے: ''بھلے لوگ ہیں، کسی سے الجھتے نہیں ہیں''۔

جب کہ اس کے برعکس ''نہی عن المنکر'' بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے، منہ زور گھوڑے کو لگام دینا ہے، زورآور کے راستے کی رکاوٹ بننا ہے، اہلِ عشرت اور طرح طرح

کے مافیاز کو چیلنج کرنا ہے، پس خطرہ ہی خطرہ ہے۔ یہ شِعبِ ابی طالب کی محصوری ہے، یہ طائف کا بازار ہے، اس میں سفرِ ہجرت کی کٹھنائیاں ہیں۔ اسی راہ میں طرح طرح کے ڈراوے اور تخویفات (Threats) ہیں، یا پھر باطل سے مفاہمت کی صورت میں چمک دمک اور ترغیبات ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) "یہ (کفار) چاہتے ہیں کہ آپ (دین کے معاملے میں) ان کی بے جا رعایت کریں، تاکہ (جواباً) یہ بھی آپ سے نرمی برتیں، (قلم: 9)"۔

(۲) "تم ظالموں کی طرف میلان نہ رکھو (ورنہ) تمہیں دوزخ کی آگ چھوئے گی"۔

(ہود: 113)

کفار مکہ نے بھی تو آپ کو پیش کش کی تھی کہ تصادم کی اس راہ کو چھوڑیں، کوئی مفاہمت کا راستہ نکالیں۔ چلیے! کبھی ہم آپ کے معبود کی عبادت کرلیں گے اور کبھی آپ ہمارے بتوں کی پرستش کرلیا کیجیے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اے رسول!) کہہ دیجیے! اے کافرو! میں ان (باطل معبودوں) کی عبادت (ہرگز) نہیں کروں گا، جن کی عبادت تم کرتے ہو (اور نہ ہی تم اُس (معبود برحق) کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی میں کرتا ہوں اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی تم کرتے ہو اور نہ ہی تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی میں کرتا ہوں، تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین، (سورۃ الکافرون)"۔ الغرض علامہ اقبال کے مطابق:

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق وباطل نہ کر قبول

بیرونِ ملک مسلمانوں کی خواہش ہوتی ہے کہ پاکستان اسلامی اقدار کا حامل ایک آئیڈیل اسلامی ملک بنے، اسلام ہماری شناخت ہو، ہم اسلام سے اور اسلامی شِعار ہم سے پہچانے جائیں۔ چنانچہ جب یہاں کے مسلمانوں نے پاکستانی میڈیا کے ذریعے دیکھا کہ اہلِ پاکستان آرمی پبلک اسکول پشاور کے نوعمر شہداء کو موم بتیاں جلا کر خراجِ عقیدت پیش کر

رہے ہیں، تو انہیں حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ اسلام کا شِعار تو مرحومین کے لیے ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کا ہے، قرآن کی تلاوت اور درود واذکار وتسبیحات اور صدقاتِ جاریہ کے ذریعے ایصالِ ثواب ہے، نہ کہ موم بتیاں جلانا اور آگ روشن کرنا۔ قبر پر بھی آگ جلانا منع ہے، خواہ اگربتی وغیرہ کی صورت میں یا موم بتی کی صورت میں۔ لہٰذا اپنے روشن خیال اور ماڈریٹ طبقے سے معذرت کے ساتھ امریکا کے پاکستانی نژاد مسلمانوں کا شکوہ وشکایت اہلِ وطن تک پہنچانا میں نے مناسب سمجھا۔

اہانتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے یہاں کے ہر مسلمان کا دل دکھی ہے، لیکن صد افسوس کہ 57 مسلم ممالک کے بے حس اور بے حمیّت حکمران امتِ مسلمہ کے جذبات کی ترجمانی سے قاصر ہیں۔ اور اہلِ مغرب کی سازش ہے کہ وقتاً فوقتاً ان اذیت ناک واقعات کا اعادہ کرتے رہتے ہیں تاکہ حبِّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جذبے سے مغلوب ہوکر مسلمان اپنا ردِّعمل ظاہر کریں اور وہ مسلمانوں کو انتہا پسند، شدت پسند اور دہشت گرد ثابت کرسکیں، حالانکہ جو ڈیڑھ ارب مسلمانوں کو روحانی اور اعتقادی اذیت پہنچا رہے ہیں، وہ خود سب سے بڑے دہشت گرد ہیں۔

27 جنوری 2015ء

فروری2015ء

امریکا میں پاکستانی

امریکا جدید ماڈی اور سائنسی دنیا کی قیادت کا بلاشرکتِ غیرے دعوے دار ہے۔ اس کا اظہار صدرِ امریکا باراک حسین اوباما نے اپنے آخری ''اسٹیٹ آف دی یونین ایڈریس'' میں بھی کیا ہے اور اعلیٰ ٹیکنالوجی (High Tech.) پر اپنے قومی تفاخر کا اظہار کیا ہے۔ بوجوہ عالمی اقتصادیات اور سیاسیات اس کے کنٹرول میں ہیں، عالمی ادارہ اقوامِ متحدہ (UNO) بھی اس کے گھر کی لونڈی ہے۔ اسی لیے یہ بہت سے لوگوں کی خوابوں کی جنت بھی بنا ہوا ہے۔ مسلمانوں اور بطورِ خاص پاکستانیوں کا تضاد یہ ہے کہ امریکا سے نفرت بھی شدید ترین درجے میں رکھتے ہیں اور اپنی دنیا سنوارنے کے لیے وہاں جانا بھی چاہتے ہیں۔

امریکا میں پاکستانیوں کے کئی طبقات ہیں: ایک کاروباری طبقہ ہے، جو خوش حال ہے اور دنیا کی راحتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے، ان کے لیے پاکستان آنا جانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دوسرا طبقہ ڈاکٹر صاحبان، آئی ٹی اسپیشلسٹ اور دوسرے شعبوں کے ماہرین کا ہے، جو الحمدللہ باعزت زندگی گزار رہے ہیں اور دنیا کی ساری راحتیں ان کو حاصل ہیں، یہ اپنے وطن سے بھی کسی حد تک جڑے ہوئے ہیں۔ تیسرا طبقہ مڈل کلاس کا ہے، یہ بھی ماشاءاللہ کافی حد تک خوش حال ہے۔ ایک طبقہ ان پاکستانیوں کا ہے، جو کسی نہ کسی طرح امریکا پہنچ گئے ہیں، کوئی نہ کوئی روزگار بھی کر رہے ہیں، لیکن ان کی قانونی حیثیت (Legal Status) کوئی نہیں ہے، انہیں اپنے گھروں سے بچھڑے ہوئے سالہا سال ہو چکے ہیں، یہ نہ اِدھر کے ہیں نہ اُدھر کے۔

ان میں سے کئی ایسے بھی ہیں جو پاکستان سے جاتے ہوئے امیگریشن کے کاغذات میں ایجنٹوں یا وکلاء کے مشورے پر غلط اندراجات کر دیتے ہیں، مثلاً شادی شدہ ہیں، بچوں والے ہیں، لیکن اپنے آپ کو غیر شادی شدہ لکھوا دیتے ہیں۔ اب اگر ان کو امریکا میں قانونی حیثیت بھی مل جائے، تو وہ اپنے بیوی بچوں کو Sponsor کر کے وہاں نہیں بلا سکتے، چنانچہ یہ ایک طرح کی مستقل دوری پیدا ہو جاتی ہے اور زندگی بھر کا عذاب بن جاتی ہے۔

کئی ایسے لوگ بھی ملے جو شادی کے بعد جلد کسی نہ کسی طرح امریکا پہنچ گئے۔ انہوں نے امیگریشن کے کاغذات میں اپنے آپ کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا ہوا تھا، وہ امریکا میں قانونی حیثیت نہ ملنے کی وجہ سے معلق زندگی گزار رہے ہیں اور اِدھر پاکستان میں ان کی بیویاں اذیت سے دوچار ہیں، ایسی راحتیں اور ایسے ڈالرکس کام کے کہ جن کے سبب میاں بیوی، باپ اور اولاد کے درمیان مستقل دوری ہے، یہ لوگ زندگی کے ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکے ہیں کہ ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' والی کیفیت ہے۔ نہ ساری کشتیاں جلا کر واپسی کا فیصلہ کر پاتے ہیں اور نہ ہی وطن سے سارے رشتے توڑ پاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ پاکستانی اپنے حالات اور خواہشات کے تحت پاکستان سے نکل تو جاتے ہیں، لیکن پاکستان ان کے اندر سے نہیں نکل پاتا۔ وطن سے دور رہ کر وطن کی محبت اور دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو جاتی ہے۔ پاکستانیوں کی مساجد اور اسلامی مراکز ایک طرح سے کمیونٹی مرکز بھی بن جاتے ہیں، جہاں اختتامِ ہفتہ یا بعض دینی تقریبات کے مواقع پر یہ لوگ اپنے خاندانوں سمیت آتے ہیں اور آپس میں گھل مل جاتے ہیں، خواتین کو بھی آپس میں مل بیٹھنے کا موقع ملتا ہے۔ بعض جگہ بچوں کی ضروری دینی تعلیم کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ یہ لوگ پاکستانی میڈیا کے ذریعے پاکستان کی جو تصویر دیکھتے ہیں، اس پر کُڑھتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بعض صورتوں میں پاکستان کے اندر رہنے والوں سے زیادہ محبِ وطن پاکستانی اور اسی طرح اپنے مذہب کے ساتھ بھی جڑے رہتے ہیں۔ لیکن ان کو سب سے زیادہ اپنی اولاد کے دینی اور اخلاقی مستقبل کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔

صدرِ امریکا بارک حسین اوباما نے اپنی انتخابی مہم میں وعدہ کیا تھا کہ وہ امریکا میں مقیم غیر قانونی تارکینِ وطن کو ورک پرمٹ یا قانونی حیثیت دلوائیں گے، لیکن تاحال وہ اپنے وعدے کو نبھا نہیں سکے، کیونکہ کانگریس میں ریپبلکن پارٹی کی اکثریت ہے اور کسی بھی قانون سازی کے لیے اس کی تائید لازمی ہے۔ سیاہ فام صدر کو سفید فاموں کے غلبے پر مشتمل کانگریس کی اکثریت نے شاید دل سے کبھی قبول نہیں کیا۔ امریکی صدر کا یہ وعدہ امریکا میں مقیم تمام غیر قانونی تارکینِ وطن کے لیے تھا، اس میں غالب اکثریت میکسیکن یا اسپینش آبادی کی ہے۔ میکسیکو کی سرحد امریکی ریاست ٹیکساس سے ملی ہوئی ہے اور آبادی کی منتقلی کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ ریاستِ ٹیکساس، جو امریکا کی چند انتہائی مالدار اور بڑی ریاستوں میں سے ایک ہے، کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ میکسیکو کا حصہ تھی، جسے امریکا والوں نے قبضہ کر کے امریکا میں شامل کر لیا۔ ان لوگوں کے ساتھ امریکا کی مذہب اور تہذیب کے اعتبار سے بھی کوئی اجنبیت نہیں ہے، امریکا میں یہی اسپینش آبادی سستی لیبر فورس کے اکثر کام انجام دیتی ہے، جس میں تعمیری شعبہ بھی شامل ہے۔ غیر قانونی تارکینِ وطن ہونے کے اعتبار سے اکثر پاکستانیوں کا مستقبل ان سے جڑا ہوا ہے۔

بہت سے غیر قانونی تارکینِ وطن پاکستانی وہ ہیں، جنھوں نے محنت سے پاکستان پیسے بھیجے اور کچھ جائیدادیں بنائیں، لیکن ان کی زرخرید جائیدادوں پر مقامی مافیاز اور قبضہ گروپوں کا تسلُّط ہے، یہ لوگ طرح طرح کے مسائل و مصائب کا شکار ہیں۔ ایک صاحب حافظ عبدالقدیر قوم رحمانی، محلہ سکندر آباد، تھانہ لاری اڈا گجرات کے رہنے والے ہیں، یہ نیویارک میں ایک مسجد میں برسوں سے امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، لیکن ان کو وہاں قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ ان کی بیوی اپنی چھ بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ہمراہ گجرات میں رہ رہی ہے۔ ان کے اٹھارہ سالہ اکلوتے جواں سالہ فرزند عمر کو مبینہ طور پر ابتسام عرف رانجھا، فرحان ولد نوید احمد، ضرغام ولد نذیر احمد اور شرجیل ولد شیبانہ نے قتل کر دیا اور اس کی ایف آئی آر نمبر: 205، تھانہ لاری اڈا، ضلع گجرات زیر دفعہ 34-302/449

تعزیراتِ پاکستان درج ہوئی، قتل کا یہ واقعہ 21، جون 2014ء کو وقوع پذیر ہوا، اس کی ایف آئی آر اے ایس آئی ادریس افضل کی درج کردہ ہے۔ لیکن ان کے بقول ملزمان بااثر تھے اور چھوٹ گئے، ممکنہ طور پر یہ بچیوں کے معاملات ہوں گے۔ اب وہ خوف کے مارے اس محلے سے مکان چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔ ان کے ساتھ کئی حضرات میرے پاس آئے کہ ہو سکے تو ان کی کوئی مدد کریں۔ میرے پاس یہی ایک تدبیر تھی کہ اس کالم کے ذریعے آئی جی پنجاب، ڈی پی او گجرات، وزیر داخلہ پنجاب اور وزیر اعلیٰ پنجاب تک ان متاثرین کی فریاد پہنچاؤں، شاید ان کے درد کا کوئی درماں ہو جائے اور انہیں انصاف مل جائے۔

پاکستانیوں کا بنیادی طور پر امریکا میں کسی طبقے سے کوئی مذہبی تصادم نہیں ہے، کیونکہ امریکا اور اہلِ مغرب نے مذہب کو اپنی عملی زندگی سے خارج کر دیا ہے، اگرچہ وہاں مسیحیوں کے چرچ اور صومعہ ہیں، اسی طرح یہودیوں کے بیعہ اور کنیسہ (Synagogue) ہیں۔ ان میں مسیحیوں کے مقابلے میں یہودیوں میں مذہبیت زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کی پارلیمنٹ کا نام Knesset یعنی ان کی عبادت گاہ کے نام پر ہے، یہودیوں کے ہاں بھی ذبیحے کا التزام ہے اور اُسے Kosher کہتے ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی اہلِ مغرب نے یہ طے کر رکھا ہے کہ وہ اپنے خیر و شر کا فیصلہ اپنی اجتماعی دانش (Collective Wisdom) سے کریں گے اور اس کا پیمانہ ان کے قانون ساز ادارے یعنی پارلیمنٹ یا کانگریس ہیں۔ سو یہ ان کی تہذیب ہے اور مسلمانوں سے ان کا تہذیبی تصادم بہرحال موجود ہے، کیونکہ اسلام ہی واحد مذہب ہے جو ان کی تہذیب سے کسی طرح کی مطابقت یا مفاہمت کا روادار نہیں ہے اور مسلمان عملی لحاظ سے کتنے ہی گئے گزرے کیوں نہ ہوں، آسانی سے مغربی تہذیب کو اس کی تمام تر خصوصیات کے ساتھ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے، لہٰذا یہ کشمکش شاید جاری رہے گی۔

مغرب میں وقتاً فوقتاً اسلامی شعائر کی اہانت کے جو دیدہ و دانستہ واقعات ہوتے رہتے

ہیں، اُس سے وہاں کے مسلمانوں کو بھی شدید ذہنی اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہم پاکستان یا دیگر ممالک میں اس حوالے سے جو بڑی بڑی احتجاجی ریلی نکالتے ہیں، یہ دراصل اپنے جذبات کا پُرامن اظہار ہے، لیکن اس کے عالمی سطح پر کوئی مثبت اَثرات مرتّب نہیں ہو پا رہے، کیونکہ جب تک حقِ آزادیِ اظہار کی ازسرِنو تشریح نہ کی جائے اور اس کے لیے عالمی سطح پر قانون سازی کر کے تحدید و توازن کے کوئی معیارات وضع نہ ہو جائیں، اس کی روک تھام نہیں ہو پا رہی۔ اس کے لیے عالمی سطح پر مسلم اہلِ دانش کو کوئی حکمتِ عملی اور ایسی تدبیر اختیار کرنے پر غور کرنا ہوگا، جو نتیجہ خیز ثابت ہو۔

6فروری2015ء

مذاہبِ باطلہ کے ساتھ تشبُّہ

''امن کی فاختہ'' کے عنوان سے 26 جنوری 2015ء کو میرا کالم چھپا، اُس میں، مَیں نے لکھا ہے کہ مذاہبِ باطلہ کے ساتھ تَشَبُّہ کے موضوع پر قدرِ تفصیل کے ساتھ لکھوں گا۔ آج اس وعدے کی تکمیل کر رہا ہوں، سب سے پہلے چند احادیثِ مبارکہ ملاحظہ کیجیے:

(۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: ''بے شک ہم لوگ یہود سے کچھ ایسی باتیں سنتے ہیں، جو ہمیں اچھی لگتی ہیں، کیا آپ مناسب سمجھتے ہیں کہ ہم اُن میں سے کچھ لکھ لیا کریں؟۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے بطورِ زجر و انکار فرمایا: کیا تم لوگ دینِ اسلام کے بارے میں حیرت میں ہو جیسا کہ یہود و نصاریٰ اس کیفیت میں مبتلا ہو گئے تھے، حالانکہ میں تمہارے پاس ایک پاکیزہ روشن دین و ملّت لے کر آیا ہوں اور اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کے لیے (بھی) میری پیروی کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا''۔ (مسند احمد: 387/3)

(۲) رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''جس نے مذاہبِ غیر کے ساتھ تَشَبُّہ اختیار کیا وہ ہم میں سے نہیں، یہود و نصاریٰ سے مشابہت اختیار نہ کرو، کیونکہ یہود کا سلام انگلیوں سے اشارہ کرنا ہے اور نصاریٰ کا سلام ہتھیلیوں سے اشارہ کرنا ہے''۔ (سنن ترمذی: 2695)

(۳) حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''دین میں کسی بات کی بابت اہلِ کتاب سے نہ پوچھو، کیونکہ وہ تمہیں ہدایت ہرگز نہیں دیں گے، جب کہ وہ خود گمراہ ہو چکے ہیں، کیونکہ (دین کے بارے میں اُن سے مشابہت کر کے) یا تو تم باطل کی

تصدیق کرو گے یا حق کو جھٹلاؤ گے، کیونکہ اگر موسیٰ علیہ السلام (آج) تمہارے درمیان زندہ ہوتے، تو اُن پر بھی میری اتباع لازم ہوتی''۔ (مسند احمد:14631)

(۴) ''مشرکین کی مخالفت کرو''۔ (بخاری:5892)

(۵) ''مجوس کی مخالفت کرو''۔ (مسلم:260)

(۶) ''اور جس نے کسی ملتِ باطلہ کے ساتھ مشابہت اختیار کی تو اس کا شمار اُنہی میں سے ہوگا''۔ (سنن ابوداؤد:4028)

علامہ زین الدین ابن نُجیم حنفی لکھتے ہیں: ''یادرکھو! کہ ہر بات میں اہلِ کتاب کے ساتھ مشابہت مکروہ نہیں ہے، کیونکہ ہم بھی ان کی طرح کھاتے پیتے ہیں، صرف مذموم بات اور ایسی چیز میں تَشَبُّہ حرام ہے، جس میں ان کے مذہبی شعار یا امتیازی علامات سے مشابہت کا ارادہ کیا جائے''۔ (البحر الرائق، جلد:2، ص:18)

امام احمد رضا قادری ملا علی قاری کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''ہمیں کافروں اور منکرات وبدعات کے مرتکب لوگوں کے شِعار میں مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے، وہ بدعت جو مباح کا درجہ رکھتی ہو اس سے نہیں روکا گیا، خواہ وہ اہلسنّت کے افعال ہوں یا کفار اور اہلِ بدعت کے، لہٰذا حرمت کا مدار مذہبی شِعار ہونے پر ہے''۔

(منح الروض الازہر علی الفقہ الاکبر، ص:185)

نیز امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''تَشَبُّہ دو وجہ سے ہوتی ہے، التزامی ولزومی۔ التزامی یہ ہے کہ کوئی شخص کسی قوم کی خاص وضع کو اس نیت سے اختیار کرے کہ ان کی سی صورت بنائے اور ان کے ساتھ مشابہت اختیار کرے، حقیقی تَشَبُّہ اسی کا نام ہے۔ التزامی میں قصد کی تین صورتیں ہیں: اوّل: اس قوم کو پسندیدہ سمجھ کر ان سے مشابہت اختیار کرے، یہ بات اگر اہلِ بدعت کے ساتھ ہو تو بدعت اور معاذ اللہ! کفار کے ساتھ ہو تو کفر۔ دوم: کسی غرضِ مقبول (جیسے دشمن کی جاسوسی کرنا) کی ضرورت کے تحت اسے اختیار کرے، وہاں اس وضع کی شَناعت (خرابی) اور اس غرض کی ضرورت کا موازنہ ہوگا، اگر ضرورت غالب ہو تو

ضرورت کی حد تک تشبُّہ، کفر تو دور کی بات، ممنوع بھی نہیں ہوگا۔ سوم: نہ تو انہیں اچھا جانتا ہے، نہ کوئی شرعی ضرورت اس کی داعی ہے، بلکہ کسی دنیوی نفع کے لیے یا یونہی بطورِ ہزل واستہزاء (یعنی غیر سنجیدہ انداز میں یا مذاق کے طور پر) اس کا مرتکب ہوا، تو حرام وممنوع ہونے میں شک نہیں۔ اور اگر وہ وضع ان کفار کا مذہبی و دینی شِعار ہے، جیسے زُنار، قَشقہ، چُٹیا یا چلیپا اور گلے میں صلیب لٹکانا، تو علماء نے حکمِ کفر قرار دیا ہے۔ لزومی یہ کہ اس کا قصد تو مشابہت کا نہیں ہے، مگر وہ وضع غیر مسلم قوم کا شِعار ہے کہ خواہی نخواہی مشابہت پیدا ہوگی، اس سے بچنا بھی واجب ہے اسی وجہ سے علماء نے فسّاق کی وضع کے کپڑے پہننے سے منع فرمایا ہے''۔ (ماخوذ از فتاویٰ رضویہ، جلد:24، ص:532-530)

شِعار کا واحد شَعِیرَہ یا شِعَارَہ ہے، شِعَارَہ اور مَشْعَرَہ کے معنی ہیں: ''خاص نشانی''۔ اسی معنی میں خاص علامت کے حامل قربانی کے جانوروں کو اور صفا ومروہ کو بھی قرآن میں ''شعائرُ اللّٰہ'' کہا گیا ہے اور شعائرُ اللّٰہ کی تعظیم کو دلوں کا تقویٰ قرار دیا گیا ہے۔ اسی معنی میں بعض مقامات مثلاً کعبۃ اللّٰہ، میدانِ عرفات، مُزدلفہ، جمارِ ثلاثہ اور مقامِ ابراہیم ہمارے دینی شعائر ہیں، اسی طرح زمانے کے بعض مخصوص اوقات، جیسے رمضان، اَشْہرِ حُرُم، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، جمعہ، ایامِ تشریق وغیرہ ہمارے دینی شعائر ہیں۔ اور بعض افعال جیسے اذان، اقامت، نمازِ باجماعت، نمازِ جمعہ، نمازِ عیدین اور ختنہ وغیرہ بھی ہمارے دینی شعائر ہیں''۔ (تفسیر فتح العزیز، ص:369)

الغرض یہود ونصاریٰ، ہنود اور دیگر باطل ملّتوں کی وہ علامات جو اُن کا مذہبی شِعار ہیں اور جن پر نظر پڑتے ہی اُن کے مذہب کا تصور ذہن میں آتا ہے، ایسے اُمور میں اُن مذاہبِ باطلہ کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا حرام وممنوع ہے اور بعض صورتوں میں کفر بھی ہے۔ اسی طرح وہ افعال جو غیر مسلم قوم بطورِ مذہب انجام نہ دیتے ہوں بلکہ وہ ان کی طرزِ معاشرت ہو اور اسی قوم کے ساتھ خاص ہوں تو ان کو شِعارِ قومی کہا جاتا ہے اور ان سے بچنا بھی لازم ہے۔ اس کے علاوہ ایسے امور میں اہلِ باطل کے ساتھ مشابہت، جو ان کا مذہبی یا قومی شِعار

نہیں ہے، حرام وممنوع نہیں ہے۔

چنانچہ امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا کہ: ''ایک خاص انداز میں باندھی جانے والی دھوتی کو ایک صاحب ہندو کا شِعار قرار دے کر اس پر حُرمت کا فتویٰ لگا رہے ہیں''۔

آپ لکھتے ہیں: ''دھوتی باندھنے والے مسلمانوں کا یہ قصد تو ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ کافروں کی سی صورت بنائیں اور فی نفسہٖ دھوتی کی حالت کو دیکھا جائے تو اس کی اپنی ذات میں کوئی حرج بھی نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا لباس ہے کہ جس سے سترِ عورت کا مقصدِ شرعی پورا ہو رہا ہے، اصلِ سنّت ولباسِ پاک عرب یعنی تہبند سے صرف لٹکتا چھوڑنے اور پیچھے گھرس لینے (اُڑس لینے) کا فرق رکھتی ہے، اس میں کسی امرِ شرع کا خلاف نہیں، تو ممانعت کی دو یہ دو وجہیں تو قطعاً نہیں بنتیں، رہا خاص شِعارِ کفار ہونا، وہ بھی باطل ہوگا۔ بنگالہ وغیرہ پورب کے عام شہروں میں ہند کے تمام رہنے والوں مسلمانوں اور ہندوؤں کا یہی لباس ہے۔ اسی طرح سب اضلاعِ ہند کے دیہات میں مسلمان اور ہندو یہی وضع رکھتے ہیں، حتیٰ کہ شہروں میں بھی بعض اہلِ حرفت کام کے وقت یہی لباس پہنتے ہیں، ہاں یہاں کئی معزز شہریوں میں اس کا رواج نہیں ہے، مگر وہ صرف اس غرض سے کہ اپنی تہذیب کے خلاف سمجھتے ہیں، نہ یہ کہ باندھنے والے کو کفر یا حرام کا مرتکب سمجھتے ہیں، تو زیادہ سے زیادہ باوقار اور معاشرے میں ذی وجاہت لوگوں کو گھر سے باہر اس کے پہننے سے احتراز کرنا چاہیے''۔

(ماخوذ از فتاویٰ رضویہ، جلد: 24، ص: 35-534)

آج کل کوٹ، پینٹ اور ٹائی عام لباس کی صورت اختیار کر گئے ہیں، جسے مسلم اور غیر مسلم سب پہنتے ہیں اور کوئی بھی اسے عیسائیت یا یہودیت کا مذہبی اور قومی شِعار نہیں سمجھتا، پس کفار کے ساتھ مشابہتِ محض ممنوع نہیں ہے، البتہ اگر کسی لباس سے سترِ عورت کا شرعی مقصد پورا نہ ہوتا ہو، تو وہ اس اعتبار سے معیوب وممنوع سمجھا جائے گا۔

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''خلاصہ یہ ہے کہ کفار کے ساتھ تشبّہ ان اُمور میں ممنوع ہے، جو اُمور کفار کے عقائدِ فاسدہ اور اعمالِ باطلہ کے ساتھ مخصوص ہوں یا جو امور

کتاب وسنت کی تصریحات کے خلاف ہوں اور جو امور ہمارے اور کفار کے درمیان مشترک ہوں یا جنہیں اختیار کرنا نفع مند ہو، اُن میں اگر کفار کے ساتھ تشبُّہ واقع ہو جائے تو اُس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ احادیث میں اس قسم کے امور کو اختیار کرنے کی بکثرت مثالیں ہیں، جیسے شہر کے دفاع کے لیے خندق کھودنا کفارِ عجم کا طریقہ تھا، لیکن جب حضرت سلمان فارسی نے غزوۂ احزاب کے موقع پر مدینہ منورہ کے گرد خندق کھودنے کا مشورہ دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس مشورے کو قبول کرلیا''۔ (تبیان القرآن، جلد:9،ص:368)

اسی طرح انگریزی دنوں اور مہینوں کے نام، جن کے پیچھے کوئی یونانی دیو مالائی تصورات ہیں، اب انگریزی زبان میں ان دنوں اور مہینوں کا نام لینے والے عام آدمی کے ذہن میں وہ پسِ منظر قطعاً نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ نام اس زمانے میں کسی باطل مذہب کا مذہبی یا قومی شِعار ہیں، لہٰذا اُن پر بھی مشابہتِ صُوری یا ظاہری کے اعتبار سے حرمت کا فتویٰ لگانا درست نہیں ہے اور یہ دین میں بلاسبب عُسر (تنگی) پیدا کرنا ہے، جو شارع علیہ السلام کو پسند نہیں ہے اور اس سے کوئی مقصدِ شرعی باطل بھی نہیں ہوتا۔ کسی کی یاد منانے کے لیے موم بتی جلانا یہ مسلمانوں کا شِعار نہیں ہے اور اِسراف ہونے کی وجہ سے ناپسندیدہ امر بھی ہے۔

9فروری2015ء

پاکستان میں جنگلات کی تباہی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''کیا ہم نے زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو (اس کے لیے) میخیں نہیں بنایا''۔(النباء:7-6)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ مُدَوَّر (Rounded) اور ناہموار (Uneven) زمین کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بلند و بالا پہاڑ زمین میں کیلوں کی طرح گاڑھ دیے ہیں تاکہ زمین اپنی حرکت کے دوران اپنے محور پر قائم رہے اور اس سے تجاوز نہ کرے۔اسی طرح زمین کے کٹاؤ کو روکنے کے لیے قدرت نے جنگلات پیدا فرمائے، کیونکہ ان جنگلات کی برکت سے زمین کا درجۂ حرارت کنٹرول میں رہتا ہے اور یہی جنگلات سرسبزی و شادابی، درجۂ حرارت کے متوازن رہنے اور بارشوں کا سبب بنتے ہیں۔ پاکستان میں کشمیر سے لے کر ہزارہ ڈویژن سے ہوتے ہوئے گلگت بلتستان تک ہندوکش کا جو پہاڑی سلسلہ واقع ہے،اس کی زمینی ساخت اور بالعموم پتھر بھی کم زور ہیں۔یہی وجہ ہے کہ طوفانی بارشوں، زلزلوں اور قدرتی آفات کے نتیجے میں یہاں تباہی زیادہ آتی ہے۔ جنگلات زمین کے کٹاؤ اور بہاؤ (LandSlide) کو روکنے کا سبب بنتے ہیں، چنانچہ شاہراہِ قراقرم پر بارانی موسم میں اکثر زمین کا کٹاؤ جاری رہتا ہے،سڑکیں بند ہو جاتی ہیں اور ذرائع رسل و رسائل متاثر ہوتے ہیں۔

ماہرین بتاتے ہیں کہ دنیا میں ممالک کی سرزمین پر جنگلات کا جو تناسب درکار ہے، پاکستان میں جنگلات پر مشتمل رقبہ اُس سے بہت کم ہے اور تیزی سے اسے تباہ کیا جارہا

ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا جنگلاتی رقبہ کل رقبے کا صرف 5 فیصد ہے۔ لیکن یہ بھی محض تخمینہ ہے، شاید حقیقی جنگلاتی رقبہ اس سے بہت کم ہے۔ کیونکہ پاکستان میں ٹمبر مافیا نے جنگلات کو تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور اس میں ماضی کے با اثر حکمرانوں اور محکمۂ جنگلات کے افسرانِ اعلیٰ کا سب سے زیادہ کردار رہا ہے۔ خاص طور پر سابق صدر جنرل (ر) محمد ضیاء الحق کے دور میں اور اس کے بعد جنگلات کی بربادی کا سلسلہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ جاری رہا اور اس کے نتیجے میں وہاں ایک نیا متمول طبقہ وجود میں آیا اور پھر اس دولت کو سیاسی اقتدار کے حصول، ذاتی عیش وعشرت اور ریئل اسٹیٹ کے کاروبار میں سرمایہ کاری میں لگایا گیا۔ اس طرح کی مصنوعی سرمایہ کاری کے نتیجے میں اکثر رہائشی زمینوں کی قیمتوں کا گراف غیر فطری اور غیر معمولی رفتار سے بلند ہوتا رہتا ہے۔

اس موضوع کی طرف میرا ذہن اس لیے متوجہ ہوا کہ حال ہی میں صوبہ خیبر پختونخوا کی حکمران جماعت تحریک انصاف کے سربراہ جناب عمران خان نے مانسہرہ میں یہ بیان دیا کہ وہ جنگلات کا تحفظ کریں گے، ایک ارب درخت لگائیں گے اور ٹمبر مافیا اور محکمۂ جنگلات کی بیوروکریسی کے خلاف جہاد کریں گے، خواہ اس میں ان کی حکومت ہی کیوں نہ چلی جائے۔ خان صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ٹمبر مافیا ان کی جماعت سمیت سب جماعتوں میں موجود ہے، تو کسی بھی تبدیلی کا آغاز اپنے گھر سے کرنا چاہیے، اس سے اُن کے اخلاص پر لوگوں کو یقین ہوگا۔

آزاد کشمیر اور مانسہرہ سے ہوتے ہوئے گلگت بلتستان تک سرکاری جنگلات کا بیشتر حصہ پہلے ہی تباہ کیا جا چکا ہے۔ ہمیں سال دو سال میں جب کبھی مانسہرہ جانے کا موقع ملتا ہے، تو بتایا جاتا ہے کہ جہاں جہاں تھوڑے بہت درخت نظر آرہے ہیں، یہ لوگوں کی پرائیویٹ زمینوں پر ہیں، جنگلات کا سرکاری رقبہ بالعموم چٹیل ہے۔ خان صاحب ہیلی کاپٹر پر جب فضائی سروے کے لیے نکلیں، تو یہ بھی معلوم کر لیں جو تھوڑے بہت جنگلات نظر آرہے ہیں، وہ کس کی ملکیت ہیں؟۔

جنگلات کے کٹاؤ کی وجہ سے ان علاقوں کے موسم میں کافی تبدیلی آچکی ہے، اکثر سردیوں کا موسم خشک سالی میں گزر جاتا ہے، ماضی کی بہ نسبت برف باری بھی بہت کم ہوتی ہے اور اکثر اوقات سردیوں کے موسم کے اختتام پر ہوتی ہے، اسی طرح بارشوں کا اوسط بھی پاکستان کے ابتدائی عشروں کے مقابلے میں بہت کم ہے، پہاڑی چشمے کافی حد تک خشک ہوتے جارہے ہیں اور پہاڑی ندی نالوں میں موسمِ برسات کے علاوہ پانی یا تو بالکل نہیں ہوتا یا اس کی مقدار بہت کم ہوتی ہے اور یہی ندی نالے دریائے سندھ کے مختلف مَنابع (Sources) ہیں۔ ہم کالا باغ ڈیم کی بات تو کرتے رہتے ہیں، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ سیلابی موسم کے علاوہ تربیلا اور منگلا ڈیم کی جھیلیں بھی بعض اوقات پوری گنجائش کے مطابق بھر نہیں پاتیں۔

رسول اللہ ﷺ نے درخت اُگانے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''جو مسلمان کوئی پودا اگاتا ہے یا کھیت میں فصل کاشت کرتا ہے، تو (اس کی محنت کے نتیجے میں) اُس سے کوئی پرندہ یا انسان یا جانور کھاتا ہے اور یہ اس کے لیے صدقہ ہے''۔ (مسلم:2320)

آپ نے غور فرمایا کہ عام طور پر کسی عملِ خیر پر اجر کا مدار نیت پر ہوتا ہے، لیکن یہاں رسول اللہ ﷺ نے بندۂ مومن کو نیت کے بغیر بھی اجر کا حقدار قرار دیا اور اُس کے ہاتھ سے لگائے ہوئے درخت یا کھیت کھلیان سے اللہ کی جو بھی مخلوق فیض پائے، اُسے اُس کے لیے آپ ﷺ نے صدقہ قرار دیا۔ یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر درخت لگانا باعثِ اجر ہے، تو درختوں کو بچانا بھی اجر کا سبب قرار پائے گا۔ دنیا میں جنگلات کے رقبے کے اعتبار سے روس، برازیل، امریکا، کینیڈا اور بعض دوسرے ممالک سرِ فہرست ہیں اور تمام ترقی یافتہ ممالک میں جنگلات کی حفاظت کا غیر معمولی اہتمام کیا جاتا ہے۔ امریکا اور یورپ میں مکانات کی تعمیر میں بلڈنگ میٹریل میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی چیز لکڑی ہے، یہ وہاں کی موسمی ضرورت بھی ہے اور اب روایت بھی بن چکی ہے۔ مجھے نیویارک میں مکانوں کی تعمیرات کے شعبے میں کام کرنے والے بعض پاکستانی حضرات نے بتایا کہ وہاں

جنگلات اتنی زیادہ مقدار میں ہیں کہ تعمیر کے لیے جنگلی درختوں کو مفت کاٹنے کی اجازت ہے، صرف مشینی کٹاؤ، لکڑی کی تیاری، نقل وحمل اور دکان داروں کا تجارتی منافع لکڑی کی مجموعی قیمت قرار پاتا ہے اور ایک اوسط درجے کے مکان پر تقریباً تین ہزار ڈالر کی لکڑی خرچ ہوتی ہے، جو پاکستانی کرنسی میں تقریباً تین لاکھ روپے بنتے ہیں، حالانکہ وہاں مکانات کا پورا اسٹرکچر تقریباً لکڑی پر قائم ہوتا ہے اور فرش پر بھی ٹائلوں کے بجائے لکڑی ہی استعمال ہوتی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حالتِ جنگ کے لیے جو خصوصی احکام جاری کیے، ''ان میں عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرنا اور درختوں کو کاٹنے اور جلانے کی ممانعت شامل ہے''۔

(مصنف عبدالرزاق: 9437)

غزوۂ بنو نضیر کے موقع پر جو یہود کے درخت اور کھیت کاٹے گئے، وہ مخصوص حالات کا نتیجہ تھے، قرآن مجید کی سورۃ الحشر، آیت: 05 میں اس کی تائید فرمائی گئی ہے۔ آج بھی اگر کوئی دشمن جنگلات کو مورچے یا پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرے اور ان پر قابو پانے کا کوئی اور طریقہ نہ ہو، تو پھر انہیں کاٹا اور جلایا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یادرکھو! دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے، (سامانِ) زینت ہے اور آپس میں ایک دوسرے کے مقابل فخر کرنا ہے اور مال اور اولاد کی کثرت کو طلب کرنا ہے، (یہ) اُس بارش کی مثل ہے، جس کی پیداوار کسانوں کو اچھی لگتی ہے، پھر وہ خشک ہوجاتی ہے، تو (اے مخاطب!) تو اس کو زرد رنگ کی دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہوجاتی ہے اور آخرت میں (نافرمانوں کے لیے) سخت عذاب ہے اور (نیکو کاروں کے لیے) اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی صرف دھوکے کا سامان ہے''۔ (الحدید: 30)

اس آیت میں بھی زمین کی ہریالی اور شادابی کو سامانِ زیب وزینت اور زمین کا حُسن قرار دیا گیا ہے، اسی طرح جنگلات بھی پہاڑوں اور زمین کی زینت ہیں اور انہیں اجاڑنا

زمین کے حسن کو پامال کرنے کے مترادف ہے۔ضلع مانسہرہ میں بعض جنگلات، جن میں سری ڈھاکا شامل ہے، محکمۂ جنگلات کے ریکارڈ میں کنوارا جنگل (Virgin Forest) تھا، لیکن اب اس کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے، کنوار پن تو کیا بیوگی کے دور سے بھی گزر کر انجام تک پہنچ چکا ہے۔اب صورتِ حال یہ ہے کہ حکومتیں کمزور اور بے بس ہیں اور مختلف قسم کے مافیا موثر اور طاقت ور ہیں اور ان میں ٹمبر مافیا بھی شامل ہے، یعنی جنگلات میں صرف جنگل کے قانون کا راج ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"دنیا کی زندگی کی مثال اس پانی کی طرح ہے جس کو ہم نے آسمان سے نازل کیا، تو اس کی وجہ سے زمین کی وہ پیداوار خوب گھنی ہوگئی، جس کو انسان اور جانور سب کھاتے ہیں حتیٰ کے عین اس وقت جب کھیتیاں اپنی تر و تازگی اور شادابی کے ساتھ لہلہانے لگیں اور ان کے مالکوں نے یہ گمان کر لیا کہ وہ ان پر قادر ہیں، تو اچانک رات یا دن کو (کسی وقت) ہمارا عذاب آ گیا، پس ہم نے ان کھیتوں کو کٹا ہوا (ڈھیر) بنا دیا، جیسے کل یہاں کچھ تھا ہی نہیں، ہم غور و فکر کرنے والوں کے لیے اسی طرح وضاحت کے ساتھ اپنی نشانیاں بیان کرتے ہیں"۔(یونس:24)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام قرار دیا اور میں مدینہ کو حرام قرار دیتا ہوں، اس کی پتھریلی زمین اور حدود کے اندر سب حرام ہے، اس کی تر گھاس کو نہ کاٹا جائے، اس کے شکار کو نہ بھگایا جائے، اس میں کسی کی افتادہ چیز کو نہ اٹھایا جائے، سوائے اس کے کہ جو اس کی طرف اشارہ کرے اور اس کے درخت کو نہ کاٹا جائے سوائے اس کے کوئی اپنے اونٹ چرائے اور اس میں جنگ کے لیے ہتھیار نہ اٹھایا جائے"۔(مسند احمد:959)

10 فروری 2015ء

ہمارا اخلاقی زوال

نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم بحیثیتِ قوم ومعاشرہ اخلاقی زوال کا شکار ہیں۔ کسی بھی معاشرے یا قوم میں سیادت وقیادت کے منصب پر فائز ہونے والے رول ماڈل، نمونہ، اُسوہ اور قُدوہ (Ideal Model) ہوتے ہیں اور ان کی طرف سے قائم کی جانے والی اور پیش کی جانے والی اَخلاقی قَدروں کی معاشرے کے افراد تقلید کرتے ہیں۔ ہمارے دینی معیارات کے مطابق اہلِ مغرب بہت سی اَخلاقی وتہذیبی قَدروں کو ترک کر چکے ہیں اور وہاں اِسے معیوب نہیں سمجھا جاتا، لیکن مجموعی تہذیبی واَخلاقی تنزّل کے باوجود وہ اپنے حکمرانوں کو آئیڈیل دیکھنا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہاں سیاسی اور حکومتی مناصب پر فائز اعلیٰ عہدیداروں کی اگر ٹیکس چوری ثابت ہو جائے یا اپنی بیوی سے بے وفائی ثابت ہو جائے یا خفیہ معاشقے اور بدکرداری ثابت ہو جائے، تو پورا میڈیا ان کے درپے ہو جاتا ہے اور انہیں اقتدار سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے، عام لوگوں کے لیے جو باتیں قابلِ گرفت اور قابلِ نفرت سمجھی جاتی ہیں، اہلِ اقتدار اور بااثر طبقات کے لیے ان اقدار وقوانین کو توڑنا ان کا استحقاق اور وجہِ تفاخُر سمجھا جاتا ہے اور اِس پر انہیں کوئی ندامت یا شرمساری ہرگز نہیں ہوتی۔ حال ہی میں ہمارے نمایاں سیاسی رہنماؤں نے جس اَخلاقی پستی کا مظاہرہ کیا، وہ انتہائی قابلِ افسوس ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہیں خود اپنی باتوں سے برسرِ عام رجوع کرنا پڑا، بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ:

"چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"

اگرچہ اپنی غلطی کا احساس کرنا اور اس پر نادم ہونا اور متاثرہ فریق سے معافی مانگ لینا، یہ بہر صورت ایک قابلِ تحسین رویہ ہے۔

ہمارا میڈیا دو دھاری تلوار بنا ہوا ہے، سب کی خبر لیتا ہے، لیکن خود ہر احتساب، مؤاخذے اور اَخلاقی گرفت سے مادر پدر آزاد ہے اور سب لوگ اپنی عزت بچانے کے لیے اُن کے ساتھ تصادم سے گریز کرتے ہیں۔ حکومت، حکمران اور قانون بے بس ہے۔ میڈیا ایک طرف تو دوسروں کی برائیوں پر گرفت کرتا ہے اور پھر اُن برائیوں کی تشہیر کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی غیر معمولی دوڑ شروع ہوجاتی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اللہ کسی بری بات کی تشہیر کو پسند نہیں فرماتا، سوائے مظلوم کے (کہ اُسے انصاف طلبی کے لیے ظالم کے خلاف فریاد اور دادرسی کا حق ہے)''۔(النسا:148)

ازالۂ حیثیتِ عرفی یا کسی کی تحقیر، تذلیل اور رسوائی (Defamation) سے متعلق قوانین اور ان کے ضوابط بے مصرف اور بے نتیجہ ہیں، عدالتیں بھی اس معاملے میں غیر مؤثر نظر آتی ہیں۔ اکثر آپ پڑھتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں شخص کو اپنی تذلیل کرنے پر اتنے کروڑ یا اتنے ارب روپے ہرجانے یا برسرِ عام معافی مانگنے کا نوٹس دیا ہے، لیکن ہم نے کبھی بھی ان معاملات کو انجام تک پہنچتے ہوئے نہیں دیکھا اور منظر یہی ہوتا ہے کہ پھر: ''چراغوں میں روشنی نہ رہی''۔ یہ اُن لوگوں کے ساتھ نسبتاً زیادہ صورتوں میں ہوتا ہے جو قانون سازی اور قانون میں سُقم اور قانون کے بے اثر اور گونگا بہرا ہونے کی صورت میں قانون سازی کا اختیار رکھتے ہیں اور ان نقائص کو اگر وہ چاہیں تو پارلیمنٹ میں قانون سازی کے ذریعے دور کرسکتے ہیں، لیکن ان کا ایسا نہ کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔

ہم دینِ اسلام کے علَم بردار ہیں، جو اعلیٰ اَخلاقی اور تہذیبی اَقدار کا داعی، محافظ اور امین ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشاداتِ مبارکہ ہیں:

(۱)''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس کا رویہ اپنے اہل کے ساتھ اچھا ہو اور میرا برتاؤ

اپنے اہل کے ساتھ بہت اچھا ہے''۔(ابن ماجہ:1977)

(۲)''اہلِ ایمان میں سے اس کا ایمان مرتبۂ کمال پر ہے، جس کے اَخلاق سب سے اچھے ہوں''۔(ترمذی:2612)

(۳)''(قیامت کے دن) میزانِ عمل میں سب سے بھاری چیز اچھے اَخلاق ہوں گے''۔ (ترمذی:2003)

(۴)''رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نہ گالی دیتے تھے، نہ بے حیائی کے کام کرتے تھے، نہ کسی پر لعن طعن کرتے تھے، اگر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کسی کو عِتاب یا سرزنش بھی فرماتے تو صرف اتنا کہتے: اسے کیا ہوگیا ہے، اس کی پیشانی خاک آلود ہو''۔(بخاری:6031)

اس دور میں حجاز کے محاورے کے مطابق یہ عتاب اور سرزنش کے لیے بےضرر اور نرم سے الفاظ تھے۔

(۵)''تم میں سے مجھے سب سے محبوب اور قیامت کے دن میرے سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہوگا، جس کے اَخلاق سب سے اچھے ہوں''۔(الجامع فی الحدیث لابن وھب:429)

علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

''ادب ہر اُس قابلِ تعریف (اَخلاقی و تربیتی) ریاضت کو کہتے ہیں جس کے نتیجے میں انسان فضائلِ اَخلاق سے مُزَیَّن ہو''۔(تاج العروس، جلد:3،ص:36)

توشیح اور تہذیب میں ہے:

''ادب اُس قابلِ تعریف قول و فعل یا رویّے کو کہتے ہیں جو خوبیوں سے مُزَیَّن ہو، یا جس میں اپنے سے مرتبے میں بڑے کی تعظیم ہو اور چھوٹے کے لیے نرمی ہو''۔

ہم تو اُس رسولِ عظیم کے ماننے والے ہیں کہ جن کے اَخلاق کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں سورۃ القلم، آیت:4 میں عظیم فرمایا۔ ذرا سوچیے! کہ اِسی قرآنِ کریم میں ربِ کریم پوری متاعِ دنیا کو قلیل فرمارہا ہے، تو وہ جسے عظیم فرمائے تو اُس کی عظمت کا عالم کیا ہوگا؟۔

رئیس المفسرین امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ:

''علیٰ'' اِستعلاء اور کسی چیز پر مکمل کنٹرول کے لیے آتا ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اَخلاقِ حسنہ کسبی نہیں تھے بلکہ آپ کی نورانی جِبلّت، پاکیزہ سیرت اور فطرتِ سلیمہ کا تقاضا تھے۔ آپ کی سیرت کو اَخلاقِ حَسَنہ کے کسی پہلے سے طے شدہ معیار پر نہیں تولا جاتا تھا، بلکہ آپ کی سیرتِ طیبہ ہی اَخلاقِ حَسَنہ کے لیے معیار، میزان اور کسوٹی تھی، یعنی اَخلاقِ حَسَنہ اور فضائلِ محمودہ صرف وہی قرار پائیں گے، جو آپ کی سیرتِ طیبہ کا خاصّہ تھے اور جن کا صدور آپ کی ذاتِ مبارک سے ہوا۔ جِبلّت اور فطرت کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو خارج سے اَخذ نہ کیا جائے بلکہ اس کا داعیہ فطرت کے اندر موجود ہو، جیسے بھوک پر کھانے کی طلب، پیاس پر پانی کی طلب، مصیبت پر راحت کی طلب انسان کا داخلی، فطری اور طبعی تقاضا ہوتا ہے اور بچے کے پیدا ہوتے ہی کسی معلّم یا مربّی کی تربیت کے بغیر اس کی فطرت میں یہ داعیہ اور محرِّک موجود ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ رحمت کو اللہ تعالیٰ اِن کلمات میں بیان فرماتا ہے:

''یہ اللہ کی رحمت ہی کا ثمر ہے کہ آپ اُن (صحابۂ کرام) کے لیے نرم ہیں اور اگر (بہ فرضِ محال) آپ تُند مزاج اور سخت دل ہوتے، تو یہ (صحابہ کرام) آپ کے اردگرد سے تِتر بِتر ہو جاتے، سو اُن کی (لغزشوں) کو معاف فرمایئے، ان کے لیے (اللہ سے) استغفار کیجیے اور (تدبیرِ امت کے معاملات میں) اُن سے مشورہ کیجیے''۔ (آلِ عمران:159)

جگر مرادآبادی نے کہا تھا:

وہ ادائے دل بری ہو، کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے، وہی فاتحِ زمانہ

دل تو محبت، نرم دلی، اپنائیت اور حسنِ اخلاق سے فتح ہوتے ہیں، بدقسمتی سے ہمارے ہاں طاقت، رعب ودبدبہ، نمودِ قوت اور وحشت سے اس گوہرِ مقصود کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ان رویوں سے تنفُّر، توحُّش اور دلوں کی دوری تو پیدا ہوسکتی ہے، قربت اور محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن بقولِ حیدر علی آتش ہمارا حال کچھ یوں ہے:

لگے منہ بھی چڑانے، دیتے دیتے گالیاں صاحب!
زباں بگڑی تو بگڑی تھی، خبر لیجیے دہن بگڑا
بناوٹ کیفِ مے سے کھل گئی، اُس شوخ کی آتش
لگا کر منہ سے پیمانے کو، وہ پیماں شکن بگڑا

حال یہی ہے کہ ہمارا ذہن و اندازِ گفتار تیزی سے بگاڑ کی طرف جا رہا ہے اور اسے ہم اپنا کمال وافتخار سمجھتے ہیں۔ پھر یہ بھی تو سوچیے! غیر مشروط اطاعت تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لازم ہے، ان کے علاوہ خواہ کوئی حاکمِ وقت ہو، کسی گروہ یا جماعت کا قائد و رہنما ہو یا کسی بھی اعتبار سے بڑا ہو، ہر صورت میں اُس کے ہر حکم یا قول وفعل کی اتباع لازم نہیں ہے، اُس کے صحیح اور غلط کو قرآن وسنت کے میزان پر پرکھا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"کسی بھی مخلوق (یعنی بڑے سے بڑے صاحبِ منصب) کی اطاعت کسی ایسے امر میں لازم نہیں ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے"۔ (صحیح مسلم:1840)

ہمارے ہاں قیادت سے وفاداری کا معیار یہ ہے کہ رہنمائی پر فائز کسی بڑے کو اُس کی غلطی پر نہ روکا جائے نہ ٹوکا جائے، اُسے غلطی سے مبرّا سمجھا جائے، اُس کے ہر حکم کی تعمیل کو لازم قرار دیا جائے، تو ایسی صورتِ حال میں جماعتوں اور تنظیموں کے اندر مشاورت اور اصلاح کی توقع عبث ہے۔

13 فروری 2015ء

تحفظِ ناموسِ رسالت کے لیے حکمتِ عملی

17 فروری کو منصورہ لاہور میں تحفظِ ناموسِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے امیر جماعتِ اسلامی پاکستان جناب سراج الحق نے ایک کل جماعتی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے لیے دعوت نامے جاری کیے ہیں۔ یہ بلا شبہ ایک مستحسن اقدام ہے، لیکن لازم ہے کہ یہ مجلس محض جذباتی تقریروں پر مشتمل نہ ہو اور اس کا اختتام ''نشستند و گفتند و برخاستند'' اور ایک متفقہ اعلامیہ کے اجرا پر ہی نہ ہو بلکہ سب سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایک منظم و مربوط حکمتِ عملی ترتیب دیں اور اس کے Follow up اور اس پر عمل درآمد کا بھی کوئی انتظام ہو، یقیناً اس کے لیے مالی وسائل بھی درکار ہوں گے۔ عام مسلمان، خواہ عربی ہو یا عجمی، سیاہ فام ہو یا سفید فام، شرقی ہو یا غربی، کا تو ایمان یہ ہے کہ بقول مولانا ظفر علی خان:

نماز اچھی، حج اچھا، روزہ اچھا، زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں خواجۂ یثرب کی حُرمت پر
خدا شاہد مکمل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

مغربی دنیا میں وقفے وقفے سے توہینِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان واقعات سے اُمتِ مسلمہ کو روحانی اذیت پہنچتی ہے اور اُن کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے، بلکہ دیدہ و دانستہ طور پر اسلام اور مسلمانوں کے

خلاف اُن کے خُبثِ باطن اور نفرت کا اظہار ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے اس مسئلے میں اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہے۔ اور اب تو مسیحیوں کے سب سے بڑے فرقے کیتھولک کے روحانی پیشوا پوپ فرانسس (Francis) نے بھی کہا ہے:

''آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ دوسروں کی توہین کریں، آپ دوسروں کے عقائد کا مذاق نہیں اُڑا سکتے۔ پوپ فرانسس فلپائن کے دورے پر تھے، انہوں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے اپنے دورے کے منتظم البرٹو گاسبری کا بطورِ مثال ذکر کرتے ہوئے کہا: اگر وہ میری ماں کو لعنت کرے گا یعنی گالی دے گا، تو اُسے جواب میں مکّے (Punch) کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ''اظہارِ رائے کی آزادی'' کی بھی حدود ہوتی ہیں''۔

ان کی تفصیلی گفتگو انگلینڈ کے گارجین اخبار میں موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم دوسرے پر تعدّی (To Overreach) کرو گے اور دوسرے کی توہین کرو گے تو یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ردِّعمل اُس کا حق ہے۔ پس لازم ہے کہ پریس کی آزادی اور اظہارِ رائے کی آزادی کی حدود اور دائرۂ کار کو عالمی برادری ازسرِ نو متعیّن (Redefine) کرے، کیونکہ کسی ایک فرد یا افراد کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اپنے کسی قول یا فعل (Action) سے دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کو ایمانی، اعتقادی اور روحانی اذیت واَعذار میں مبتلا کر دیں۔ اگر ایک یا چند افراد کو جسمانی اذیت پہنچانا دہشت گردی ہے، تو کہا جا سکتا ہے کہ بیک وقت ڈیڑھ ارب انسانوں کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا دنیا کی سب سے بڑی دہشت گردی ہے اور اس کے لیے عالمی سطح پر قانون سازی اَز حد ضروری ہے۔

امریکا اور اہلِ مغرب اس مذموم حرکت کو پریس کی آزادی (Freedom of Press) اور اظہارِ رائے کی آزادی (Freedom of Expression) کے دل کش عنوانات کے تحت تحفظ دیتے ہیں۔ صدرِ امریکا نے ہماری اشک شوئی کے لیے یہ تو کہہ دیا کہ ہمیں اس پر افسوس ہے اور ہم اس کی مذمت کرتے ہیں، لیکن اسی لمحے اُنہوں نے فرانس کے واقعے کی بھی مذمت کی۔ اس معاملے پر پیش رفت یہ ہوئی کہ یورپ کے بیش تر اور خاص

طور پر سرکردہ یورپی ممالک کے حکمرانوں نے پیرس میں فرنٹ لائن میں شانہ بشانہ کھڑے ہوکر ایک بڑی ریلی میں شرکت کی اور یہ ایک طرح سے گستاخانِ رسالت کے ساتھ اظہارِ یک جہتی تھا۔اس کے برعکس امتِ مسلمہ کی صورتِ حال یہ ہے کہ عوام تو احتجاج کے لیے بے اختیار سڑکوں پر نکل آتے ہیں، ریلیاں نکالتے ہیں اور بعض اوقات ان میں ناخوش گوار واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں،لیکن مسلم حکمرانوں کی طرف سے اس حسّاس مسئلے پر کبھی بھی اجتماعی طور پر دینی وملّی حمیّت کا مظاہرہ نہیں کیا گیا اور امّتِ مسلمہ کے لیے اس بے حسّی کا رنج اغیار کی سنگ دلی سے بھی زیادہ ہے، بقولِ شاعر:

تکلیف تو کم و بیش پہنچتی ہے سبھی سے
اپنوں سے جو پہنچے، تو گزرتی ہے گراں اور

ہماری پارلیمنٹ نے بھی قراردادِ مذمّت تو پاس کردی اور معزّز ارکان نے مذمّت پر مبنی تقاریر بھی کیں، لیکن منظّم سفارتی پیش رفت کی منصوبہ بندی نظر نہیں آئی۔

عام مسلمانوں کے احتجاجی جلسوں، جلوسوں اور ریلیوں سے اُن کے جذبات کا اظہار تو یقیناً ہو جاتا ہے،لیکن تاحال اس کے مُثبت نتائج برآمد نہیں ہوئے۔انسانی تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ ہر دور میں جو سلطنتیں، تہذیبیں اور سماج مادّی لحاظ سے غالب رہے ہیں، اُنہوں نے اپنا یہ استحقاق سمجھا کہ انہی کی اَقدار کو غلبہ حاصل رہے گا اور مادّی اعتبار سے کمزور اور زیردست اقوام اور تہذیبوں پر اُن کے تَفوُّق اور بالادستی (Supremacy) کو تسلیم کرنا لازم ہے، ان کی دادوفریاد اور احتجاج کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور تو اور برطانیہ کی اسکاٹ لینڈ یارڈ پولیس نے تازہ احکام جاری کر کے احتجاج اور ریلیوں کے امکانات کو محدود کر دیا ہے، انہوں نے قرار دیا ہے کہ جلوس اور ریلی کے منتظمین کو سیکورٹی کے اخراجات ادا کرنے ہوں گے اور ٹریفک کی روانی میں خلل نہ پڑنے کی بھی ضمانت دینی ہوگی۔

لٰہذا اب لازم ہے کہ مسلمانوں کے اہلِ علم، اہلِ فکر ونظر، قانونِ بین الاقوام کے ماہرین، سابق ماہر سفارت کار اور اہلِ ثروت مل کر ایک حکمتِ عملی ترتیب دیں اور عالمی سطح

پر مختلف فورموں پر یہ مسئلہ اٹھائیں۔وہ اپنی مجالس مفکرین (Think Tanks)، عالمی شہرت کے حامل مذہبی سربراہان، ماہرین آئین وقانون، موجودہ اور سابق حکمرانوں، سفارت کاروں اور ذہن ساز طبقات (Opinion Makers) کے ساتھ مل کر مشترکہ حکمتِ عملی ترتیب دیں۔ماضی میں امریکا کی ویت نام پر مسلّط کردہ ظالمانہ جنگ کے خلاف عالمی رائے عامہ ہموار کرنے اور سفارتی دباؤ ڈالنے کے لیے لارڈ برٹرینڈ رسل نے عالمی ماہرینِ آئین وقانون کی غیر سرکاری عدالت لندن میں قائم کی، اس میں امریکا کا ٹرائل کیا اور امریکا کو جنگی جرائم کا مرتکب قرار دیا گیا،اس ساری تگ وتاز کا فوری قانونی نتیجہ تو برآمد ہونا نہیں تھا،لیکن اس سے اخلاقی دباؤ زبردست پڑا اور خود امریکا میں ویت نام کی جنگ کے خلاف زبردست تحریک چلی اور بالآخر امریکا کو اس جنگ کی بساط خائب وخاسر ہوکر لپیٹنی پڑی۔

اس امر پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا اسلامی کانفرنس کی تنظیم او آئی سی یعنی مسلم حکمرانوں کو بھی متحرک کیا جاسکتا ہے اور وہ سفارتی اور اقتصادی میدان میں کوئی موثر کردار ادا کر سکتے ہیں، اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو اس کی حکمتِ عملی اور طریقۂ کار (Mechanism) کیا ہونا چاہیے۔کیا یہ ممکن ہے کہ تمام مسلم حکمران لندن یا نیویارک میں شانہ بشانہ کھڑے ہوکر ایک ریلی کی قیادت کریں اور اس میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل کا خصوصی اجلاس طلب کرنے کے لیے ایک اجتماعی قرارداد جمع کریں۔ امریکا کے صدر باراک حسین اوباما نے مسلمانوں سے روابط کے لیے اپنا ایک خصوصی سفارتی نمائندہ (Special Envoy) مقرر کر رکھا ہے،اس کے ذریعے واشنگٹن میں مسلم سفارت کار صدرِ امریکا سے ایک خصوصی ملاقات کا اہتمام کریں۔

حال ہی میں اسرائیل کے حوالے سے صدرِ امریکا پر دباؤ ڈالنے کے لیے امریکی سینٹ کے چیرمین نے اسرائیلی وزیر اعظم بنجمن نتن یاہو کو امریکی کانگریس کے خصوصی اجلاس سے خطاب کی دعوت دی ہے اور انہوں نے یہ دعوت قبول کرلی ہے۔ اگرچہ

صدرِ امریکا نے کہا ہے کہ میں صرف اُس صورت میں بنجمن نتن یاہو کا استقبال کروں گا جبکہ وہ اُن کی دعوت پر واشنگٹن آئیں، لیکن اس سے امریکی حکمران طبقے کی نظر میں اسرائیل کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے سوچنے کا مقام ہے کہ چند ملین یہودی تو عالمی قوتوں کے لیے اپنے آپ کو ناگزیر بنا دیں اور انہیں نظر انداز کرنا امریکا اور اہلِ مغرب کے لیے ممکن نہ رہے، یعنی وہ اِسے Afford نہ کر سکیں۔ صدرِ امریکا کے لیے یہودیوں کو ناراض کر کے اقتدار میں رہنا عملاً ناممکن ہو جائے، ہولوکاسٹ کی حقیقت کو چیلنج کرنے والے کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑے، تو کیا ڈیڑھ ارب مسلمان اتنے بے توقیر ہیں کہ اُن کی کوئی اہمیت نہیں، وہ گردِ راہ ہیں، اُفتادۂ خاک ہیں کہ جو چاہے انہیں کچل دے، مسل دے اور روند ڈالے۔ کیا یہ اُمت جو ایک وقت میں دنیا کی واحد سپر پاور تھی، کوئی سوچ سکتا تھا کہ اتنی پستی بھی اُس کا مقدر بنے گی؟ علامہ اقبال نے اسلام کا مرثیہ اِن الفاظ میں منظوم کیا ہے:

میں جو سوختہ ساماں ہوں، تو یہ رُوزِ سیاہ
خود میرے گھر کے چراغاں نے دکھایا ہے مجھے
کافر میری تذلیل نہ کر سکتا تھا
یہ سوغات عطا کی ہے مسلماں نے مجھے

اور آخر میں بارگاہِ رسالت ﷺ میں یہی استغاثہ ہے:

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے!

16 فروری 2015ء

تیشۂ قلم

جناب وجاہت مسعود ایک مؤقر روزنامے میں ''تیشۂ نظر'' کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں، 14 فروری 2015ء کے کالم میں انہوں نے مجھ ناچیز پر ''تیشۂ قلم'' چلایا، وہ لکھتے ہیں:

''پشاور پبلک آرمی اسکول کے دو مہینے بعد مفتی منیب الرحمن فرماتے ہیں کہ مدرسوں کی اصلاح میں حکومت سے تعاون نہیں کریں گے۔ حکومت ان مدرسوں کی نشاندہی کرے جہاں سے دہشت گردی ہوتی ہے۔ صاحب! آپ بھی تو ان شعبوں کی نشان دہی کریں جہاں آپ کو اصلاح سے گریز ہے۔ معلوم تو ہو کہ آپ کو ریاست کی درون مدرسہ رسائی پر اعتراض ہے یا آپ مدرسوں میں موجود شدت پسندی کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔ کیا مدعا یہ ہے کہ معصوم بچوں کو تنگ نظری کا درس دینے سے نہ روکا جائے''۔

اس پر میں نے ان کی خدمت میں بذریعہ ای میل یہ مکتوب ارسال کیا:

''آپ کا یہ حق ہے کہ کسی کے نظریات سے اور موقف سے اختلاف کریں، لیکن مجھ جیسے کم علم کے نزدیک کسی پر بہتان باندھنا اور غلط بات منسوب کرنا کسی بھی درجے کی اخلاقیات میں روا نہیں ہے۔ آپ نے اپنے کالم میں لکھا ہے: ''پشاور آرمی پبلک اسکول کے دو مہینے بعد مفتی منیب الرحمٰن فرماتے ہیں کہ مدرسوں کی اصلاح میں حکومت سے تعاون نہیں کریں گے۔ حکومت اُن مدرسوں کی نشان دہی کرے، جہاں سے دہشت گردی ہوتی ہے''۔ میں نے کسی موقع پر بھی نہیں کہا کہ ہم مدرسوں کی اصلاح میں حکومت سے تعاون نہیں کریں گے۔ ہم ہمیشہ یہ کہتے رہے کہ حکومت جو اصلاح چاہتی ہے، اُس کے لیے

''اتحادِ تنظیماتِ مدارس دینیہ پاکستان'' کی قیادت کو اعتماد میں لے، جو چیز تعلیم کے مفاد میں ہوگی، اس میں ہم مکمل تعاون کریں گے۔

وزیر داخلہ جناب چوہدری نثار علی خان صاحب نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ 90% مدارس صحیح ہیں، صرف 10% مدارس میں انتہا پسندی یا دہشت گردی ہے۔ ہم نے یہ مطالبہ کیا کہ اس طرح کا مبہم بیان قانوناً، اخلاقاً اور شرعاً درست نہیں ہے۔ آپ اُن مدارس کی فہرست جاری کریں، ہم حکومت کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ آپ نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں نشاندہی کروں، تو گزارش یہ ہے کہ یہ میرا منصب نہیں ہے، نہ میرے پاس حکومتی وسائل ہیں اور نہ ہی ایجنسیوں کی معلومات تک میری رسائی ہے، یہ سب وسائل حکومت کے پاس ہیں، لہٰذا ذمہ داری بھی اُسی کی ہے۔

ہاں! میں یہ آپ کو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تنظیم المدارس اہلسنّت پاکستان سے ملحق کسی مدرسے میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں اور نہ ہی کبھی کوئی الزام لگا ہے۔ ہمارے ادارے کھلی کتاب کی طرح ہیں اور آپ جب چاہیں آپ کو ان اداروں کا معائنہ کرایا جاسکتا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ کالم نگاروں کی ضرورت یا مجبوری ہوتی ہے کہ اظہارِ خیال کے لیے کوئی موضوع ملے، میں خود بھی کالم لکھتا ہوں، لیکن نہایت ادب کے ساتھ صرف اتنی گزارش ہے کہ غلط بات منسوب نہ کیجیے اور یہ میرا جائز حق ہے۔

جب مبہم انداز میں یہ تو کہا جاتا ہے کہ صحافیوں میں کالی بھیڑیں ہیں، بلیک میلر ہیں، لفافہ چلتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو مجھ عاجز کی طرح اس وقت آپ کا مطالبہ بھی یہ ہوتا ہے کہ چند کھوٹے سکوں کی خاطر سب کو بدنام نہ کیجیے، جن کی طرف اشارہ ہے، اُن کا نام بتائیے، حضور والا!

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں تھی

میں آپ کی طرح ادیب شہیر اور ماہر قلم کار نہیں ہوں، اگر میرے لب ولہجہ میں کوئی

بات آپ کی طبع نازک پر ناگوار گزرے، تو پیشگی معذرت قبول فرمایئے''۔

ہم سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ہم اپنی صفوں میں سماج دشمن عناصر کی نشان دہی کریں، تو حضور والا! اِس سنتِ مبارکہ کا آغاز آپ اپنے شعبے سے فرما دیجیے اور غلط عناصر کی نشان دہی کر دیجیے، شاید آپ کی جرأت و جسارت کو دیکھ کر اوروں کو بھی حوصلہ ہو جائے۔ کاش کہ اخبار میں چھپا ہوا ہر لفظ مصدّقہ ہوتا اور تحقیق کے بعد شائع کیا جاتا، لیکن کیا ایسا ہوتا ہے؟، اسی لیے علمِ معانی میں خبر کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ:

''خبر وہ ہے، جو صدق اور کذب دونوں کا احتمال رکھتی ہے، تاوقتیکہ تحقیق سے اس کا صدق یا کذب متعین نہ ہو جائے''۔

میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ اب ہمارے معاشرے میں بزعمِ خویش خطا سے مبرّا یا تو اسٹوڈیوز میں بیٹھے ہوئے اینکر پرسن ہیں یا بعض فاضل کالم نگار، جنہوں نے ازخود (Suo Moto) یہ حق حاصل کر لیا ہے کہ جس کی چاہیں پگڑی اچھالیں یا جو بات چاہیں کسی کی طرف منسوب کر لیں یا کوئی بھی مفروضہ قائم کر کے ''تیشۂ قلم'' ہاتھ میں لیں اور اسے نشانِ عبرت بنا دیں یا زبان کا ''نشتر'' چلائیں اور اس کے پرخچے اڑا دیں۔ کس کی مجال جو آپ سے حساب طلب کرے، کیونکہ حالات نے آپ کو خود ہی مدّعی، خود ہی گواہ اور خود ہی منصف بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے:

''اے اہلِ ایمان! جب تمہارے پاس کوئی شخص کوئی (غیر مصدّقہ) خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لاعلمی میں کسی پر چڑھ دوڑو اور پھر تمہیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑے''۔ (الحجرات:06)

اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''کسی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو (بلا تحقیق ہر ایک سے) بیان کرتا پھرے''۔ (صحیح مسلم:05)

جناب وجاہت مسعود کے بارے میں مجھے ان کے ادارے کے ایک صاحب نے بتایا کہ وہ ملک کی ایک نامور درس گاہ ''لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز'' میں پروفیسر بھی

ہیں، اس منصب کے حاملین سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے شعبے میں رُجحان ساز (Trend Setter) کا کردار ادا کریں گے اور اچھی روایات قائم کریں گے تاکہ ہم جیسے طالبِ علم بھی اُن سے رہنمائی حاصل کریں۔ ہمیں میڈیا کی مجبوریوں کا بھی علم ہے، مسابقت کا دور ہے، خبروں کے حصول میں مقابلہ ہے، خبر نہ ملے تو گھڑ لی جاتی ہے۔ اسی لیے میں آج کل ٹیلی فون پر کوئی Comments دینے سے حتی الامکان اجتناب کرتا ہوں، کیونکہ ہم کہتے کچھ ہیں اور اگلے دن اخبار میں اس کے برعکس نظر آتا ہے۔

ایکسپریس ٹرائیبون کی جس خبر کو جناب وجاہت رسول نے اپنے تبصرے کی بنیاد بنایا، میں اُس وقت بازار میں تھا، شور میں آواز سمجھ نہیں آرہی تھی اور رپورٹر نے خود مجھے کہا کہ آواز واضح نہیں ہے میں پھر بات کروں گا، لیکن پھر انہوں نے اپنی خواہش کو خبر بنا کر چھاپ دیا۔ کیونکہ اب خبر وہی رہ گئی ہے، جس سے آگ لگے یا بدگمانی پیدا ہو اور پھر متعلقہ شخص کس کس کے آگے اپنی صفائی بیان کرتا پھرے گا۔ اسی لیے میں اخبارات اور ٹی وی کے رپورٹر سے کہتا ہوں کہ اپنا سوال لکھ دیں، میں تحریری جواب آپ کو دے دوں گا اور خدارا! اُس میں تحریف نہ کرنا۔

خبر نگاری کا عالم تو یہ ہے کہ ایک رپورٹر خاتون لاہور سے مجھے فون کرتی ہیں کہ: بکرے نے دودھ دیا ہے، اِس پر آپ کیا کہیں گے؟۔

میں نے عرض کی: ''میں کچھ نہیں کہوں گا''۔

رپورٹر نے کہا: ''مفتی صاحب! اس پر شریعہ کیا کہتی ہے، آپ کا Opinion چاہیے؟''۔

میں نے کہا: ''آپ دنیا کو بتادیں کہ اس پر شریعہ کو کوئی پریشانی نہیں ہے، آپ کے لیے بہتر ہوگا کہ کسی طبیبِ حیوانات (Veterinary Doctor) سے رجوع کرلیں''۔

محترمہ پھر فرماتی ہیں: ''مفتی صاحب! For God Sake میری جاب کا مسئلہ ہے،

کچھ نہ کچھ کمنٹس ضرور دیں"۔

سو یہ ہے اب رپورٹنگ کا معیار۔ اسی لیے جب راہ چلتے اخبارات بالخصوص یا ٹیلیویژن چینلز کے رپورٹر کسی لایعنی سے مسئلے پر رائے طلب کرتے ہیں، تو میں اُن سے تفنّنِ طبع کے طور پر کہتا ہوں کہ مجھے آپ سے ازحد ہمدردی ہے اور مجھے آپ کی پریشانی (Concern) کا احساس ہے کہ ہر دس منٹ بعد آپ کی سبزی باسی ہوجاتی ہے اور آپ کو کھٹکا لگا رہتا ہے کہ گاہک کسی اور دکان پر چلا جائے گا۔ یہ سب ہمارے دوست ہیں، ہم سے محبت کا برتاؤ کرتے ہیں اور احترام کرتے ہیں، لیکن یہ میں ان کی مجبوریوں کی ایک داستان بیان کر رہا ہوں۔

پس میری آخر میں پھر گزارش ہے کہ کسی شخص کے موقف پر رائے زنی سے پہلے، اُس کے صِدق وکِذب کا تعین فرمالیں، اُس کے بعد یہ آپ کا حق ہے کہ دلائل سے اُس کا رَد کریں، اس سے اتفاق کریں یا اختلاف کریں۔ جن حضرات کا یہ سوءِ ظن ہے کہ مدارس کے طلبہ ہر جگہ جبر اور خوف کے ماحول میں رہتے ہیں، انہیں اندھیرے میں رکھا جاتا ہے، ہوسکتا ہے کہیں ایسا ہوتا ہو، لیکن ہر جگہ بلکہ اکثر جگہ ایسا نہیں ہوتا۔

تمام پاکستانیوں کی طرح ہر طالبِ علم کے پاس دو نہیں تو ایک موبائل فون ضرور ہوتا ہے اور میرا طالبِ علم اُس کے استعمال کے طریقے مجھ سے بہتر جانتا ہے اور اس کی خوب مہارت رکھتا ہے۔ میں تو ٹیلی فون کال سن لیتا ہوں یا کسی کو کال کرلیتا ہوں یا زیادہ سے زیادہ Text Message کرلیتا ہوں جسے ہمارے ہاں SMS کہا جاتا ہے، سو بہتر یہ ہے کہ ہم اللہ کے اس حکم پر عمل کریں کہ:

"اے اہلِ ایمان! بہت سے گمانوں سے بچو! بے شک بعض گمان (یعنی ظنِ سُوء) گناہ کا (باعث) ہوتے ہیں، (الحجرات:12)"۔ اور یہ کہ "مومنوں کے بارے میں حسنِ ظن رکھو"۔

17 فروری 2015ء

الفاظ و معانی کا رشتہ

ہمیں زمانۂ طالب علمی میں پڑھایا گیا تھا کہ معنی، مفہوم اور مدلول (Concept) پہلے ذہن میں آتا ہے، پھر اُس کے اظہار اور ابلاغ (Communication) کے لیے الفاظ، اشارات اور تاثرات (Impressions) کا سہارا لیا جاتا ہے، اسی لیے الفاظ و اشارات کو دالّ (Indicator) اور معنی کو مدلول (Meaning, Concept) کہا جاتا ہے۔ پس الفاظ اور تمام ذرائع اظہار پر معنی اور مفہوم مقدم ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مثلاً ٹیلی فون، ٹیلی وژن، کمپیوٹر، ریل اور ہوائی و بحری جہاز کے الفاظ یا اسماء پہلے وضع کر لیے گئے، پھر یہ تمام اشیاء وجود میں آ گئیں اور بعد میں ان کے معانی و مفاہیم اور تصورات (Ideas) وجود میں آئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اور اس (اللہ) نے آدم کو تمام چیزوں کے اسماء سکھا دیے، پھر ان اشیاء کو ملائکہ پر پیش کیا اور فرمایا: مجھے ان چیزوں کے اسماء بتاؤ"۔ (البقرہ:31)

مفسرینِ کرام نے فرمایا کہ آیت میں اسماء سے "مُسَمّیات" (Named Objects) مراد ہیں اور یہ نہیں کہ اسماء پیش کر کے فرمایا ہو کہ مجھے ان (اسماء) کے اسماء بتاؤ، بلکہ وہ چیزیں پیش کر کے اُن کے اسماء کی بابت سوال فرمایا۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) "ن اور قسم ہے قلم کی اور اس کی جو (فرشتے) لکھتے ہیں"۔ (القلم:1)

(۲) "طور کی قسم اور کھلے ورق پر لکھی ہوئی کتاب کی قسم"۔ (الطور:1-3)

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے قلم، مَسطور (Written) اور وہ کاغذ جس پر کتاب لکھی گئی ہے، کی قسم فرمائی ہے اور بعض مفسرینِ کرام نے ''ن'' سے دوات بھی مراد لی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام ملفوظ و منطوق (Spoken Word)، مسطور (Written) اور کاغذ (یا جس پر لکھا جارہا ہے) اور قلم جو ذریعۂ تحریر ہے، سب کی قسم فرمائی ہے تاکہ ان سب چیزوں کی حُرمت (Sanctity,Sacredness) سب پر واضح ہوجائے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو کتاب یعنی مکتوب (Scripture) سے بھی تعبیر فرمایا ہے تاکہ لکھے ہوئے حرف کی حُرمت بھی ثابت ہوجائے۔

لفظ کی توقیر اور حُرمت اس کے اندر معنیٰ و مفہوم یا مدلول (جس پر وہ لفظ دلالت کر رہا ہے) کی حُرمت کے اعتبار سے ہے۔ایک وقت تھا کہ تحریر اور کلام میں ایجاز و اختصار (Abbreviation) کو کمال سمجھا جاتا تھا، یعنی الفاظ کم ہوں اور معانی زیادہ یا آسان لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ: ''(معانی کے) دریا کو (کم سے کم الفاظ کے) کوزے میں بند کردیا جائے''۔رسول اللہ ﷺ نے تمام انبیائے کرام علیہم السلام پر اپنے چھ امتیازی فضائل بیان کرتے ہوئے اُن کا آغاز ان کلماتِ مبارکہ سے فرمایا: ''اُوتِیتُ جوامِعَ الکَلِم'' (مجھے ''جَوامِعُ الکَلِم'' یعنی معانی کے سمندر کو چند الفاظ میں سمونے کا معجزہ اور مَلَکہ عطا کیا گیا ہے)۔

علمِ معانی کی اصطلاح میں جہاں الفاظ زیادہ ہوں اور معانی محدود، اسے ''اِطناب'' کہتے ہیں، اسے انگریزی میں ہم ''To discuss at length to discourse'' سے تعبیر کرسکتے ہیں۔مغلیہ ہند کے زوال اور برٹش انڈیا کے عروج کے دور میں مفتیانِ شعر و ادب کی غالب رائے کے مطابق مرزا اسد اللہ خان غالب برصغیر کے بہت بڑے یا سب سے بڑے شاعر تھے، یہ دعویٰ صحیح ہے یا غلط اللہ بہتر جانتا ہے، کیونکہ ہم اس شعبے میں مہارت نہیں رکھتے، ہمیں تو علامہ اقبال پسند ہیں، لیکن ایسے لوگوں کو ہمارے لبرل اور روشن خیال دانشور جذباتی اور جنونی قرار دیتے ہیں۔چنانچہ مرزا غالب لفظ کی معنویت و جامعیت

اور گہرائی و گیرائی کو یوں بیان کرتے ہیں:

قطرے میں جلوہ دکھائی نہ دے اور جزء میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

امام احمد رضا قادری نے شانِ رسالت میں لکھا ہے:

آنکھ والے تیرے جوبَن کا تماشا دیکھیں
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر، کیا دیکھے

یعنی جو صاحبِ نظر ہیں، جن کی چشمِ بصیرت وَا ہے، اسی کو عظمتِ مصطفیٰ اور شانِ مصطفیٰ ﷺ نظر آسکتی ہے۔ اس کے برعکس جو بصیرت، فکرِ صائب اور عقلِ سلیم سے محروم ہو، وہ شانِ مصطفیٰ کیا جانے۔ جو مُحب اور غلام بن کر ذاتِ پاک مصطفیٰ ﷺ کو چشمِ تصور میں لائے گا، تو اسے آپ کی ذات میں محاسن ہی نظر آئیں گے، مگر جو ناقد اور عیب جو بن کر دیکھے گا، تو اسے عیب نظر آئیں گے۔

بعض شارحینِ غالب کا قول ہے کہ اس میں فلسفۂ وحدت الوجود بیان کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود جب غالب کے حاسدین ومخالفین نے اُن کے کلام کو مُہمَل اور بے معنی (Meaningless) قرار دیا تو انہیں کہنا پڑا:

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہے میرے اشعار میں معنی، نہ سہی

پھر غالب نے اپنے حاسدین کی نامرادی کو ان الفاظ میں بیان کیا:

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پر تماشا نہ ہوا

علامہ اقبال نے کہا:

یقیں محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں، یہ مردوں کی شمشیریں

حقیقت ایک ہے، ہر شے کی، نوری ہو کہ ناری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے، اگر ذرے کا دل چیریں

''طلوعِ اسلام'' کے عنوان سے یہ الہامی شاہکار اور لاجواب نظم علامہ اقبال نے انجمن حیاتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی اور سب کو رُلا دیا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس آخری مصرعے: ''لہو خورشید کا ٹپکے، اگر ذرے کا دل چیریں'' کہتے وقت علامہ اقبال کے ذہن میں اس کے حاضر اور مستقبل کے اعتبار سے کون سے معانی تھے، لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس میں ذرّے کی تجزّی (Splitting to be divided) کے بعد جو آخری ذرہ رہ جاتا ہے، وہ آج کل نیوکلیئر سائنس میں ایٹم کہلاتا ہے۔ اور اس آخری ذرے یا غیر معمولی قوت کے مرکز یہ کو الیکٹرون اور پروٹون سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس سے Atom Bomb بنا ہے، اسی کی طرف اشارہ ہے۔ تو ذرّے کا دل چیرنے (Fusion) سے، جو معلوم دنیا میں حرارت کا سب سے بڑا ماخذ (Source) ہے، جب خورشید کا لہو یا کشید کیا ہوا جوہر ٹپکے گا، تو تباہی کا کوئی تصور کر سکتا ہے۔

یہ چند سطور میں نے اس لیے لکھیں کہ جب سے ہمارے ہاں آزاد میڈیا آیا ہے، الفاظ بے توقیر ہو گئے ہیں، الفاظ کی فضول خرچی بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اس میں معنی کی تلاش کارِ عبث ہے۔ ٹیلی ویژن چینلز پر بعض مباحثوں کو مکالمہ کہنے کی بجائے مُنازعہ (Quarrelling) اور مُحاربہ (Battling) کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ دو تین روز قبل ایک سیاسی رہنما سے ایک اینکر پرسن کا الجھاؤ دیکھا، دونوں کے شور و غوغا میں لفظ تو کوئی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، بس لگ رہا تھا کہ اچانک حضرتِ اینکر پرسن اٹھ کر اپنے مہمان کی گردن دبوچ لیں گے یا خدانخواستہ اس کے برعکس صورتِ حال بھی رونما ہو سکتی ہے۔

اسی طرح بعض اوقات کوئی بزرگ تجزیہ کار کسی مکالمے میں بلا لیے جاتے ہیں، وہ کسی دوسرے اسٹیشن کے اسٹوڈیوز یا DSNG کے ذریعے مباحثہ میں شریک ہوتے ہیں، ادھر مین اسٹوڈیوز میں جنگ جاری ہوتی ہے اور وہ بے چارے ہونّق بنے اور سانس روکے

ہوئے اینکر پرسن کی نگاہِ التفات کے منتظر بیٹھے ہوتے ہیں اور کبھی جب صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے تو انہیں کہنا پڑتا ہے کہ حضورِ والا: ''اک نظرِ التفات ادھر بھی''۔ مسابقت اور قبولِ عام کا گراف (Rating) معیار بن جائے، جس کے بارے میں خود میڈیا والے بھی زیرلب کہتے ہیں کہ یہ ایک راز (Mystery) ہے اور کوئی قطعی اور یقینی چیز نہیں ہے، لیکن شاید اس کا متبادل بھی نہیں ہے، اس لیے اسے قبول کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سب کسی نصب العین اور منزلِ مقصود کے تعین کے بغیر بگٹٹ دوڑے چلے جارہے ہیں، ایسے میں صرف ذہنی اور فکری انتشار، عملی بے حسی اور معاشرے میں بے یقینی میں اضافہ ہورہا ہے۔ اگرچہ اب میڈیا والوں کا اپنے بارے میں حسنِ ظن یہ ہے کہ انہیں کسی غیبی قوت سے مصلحِ اعظم بننے کا فریضہ تفویض ہوگیا ہے اور اب انہوں نے ہی ہر ایک کا حساب لینا ہے اور ملک وملّت اور قوم و وطن کی سَمتِ قبلہ کو درست کرنا ہے، وہ خدائی فوجدار ہیں، سب ان کے سامنے جواب دِہ ہیں، مگر وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہیں، بقولِ غالب:

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے، گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

الغرض جو جتنے زور سے چلا کر بول سکتا ہو، وہی اپنے عہد کا دانائے روزگار، نابغۂ عصر اور عبقریِ دہر (Genius) ہے۔

23 فروری 2015ء

ریاست اور حکومت

معروف اسکالر علامہ جاوید احمد غامدی نے ''اسلام اور ریاست : ایک جوابی بیانیہ'' کے عنوان پر ایک مؤقر روزنامے میں ایک کالم لکھا ہے۔ میں ان دنوں بیرونِ ملک تھا، معلوم ہوا کہ ایک سے زائد اصحابِ علم نے اُس پر اپنے تحفظات و ملاحظات پیش کیے اور اپنے دلائل سے اُن کے موقف کو رد کیا۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ علامہ غامدی صاحب نے کون سے بیانیے (Narrative) کا جوابی بیانیہ پیش فرمایا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پاکستان کے دستوری میثاق میں اسلام اور قرآن وسنت کے ساتھ جو تمسّک اور اِعتصام (Conviction and Commitment) کا عزم (Resolve) ظاہر کیا گیا ہے، اُسے انہوں نے ریاستِ پاکستان کا بیانیہ قرار دے کر اپنا جوابی بیانیہ پیش کیا ہو۔

اس کے بعد انہوں نے 21 فروری کو ''ریاست اور حکومت'' کے نام سے ایک اور کالم لکھا اور شاید اپنے سابق کالم پر مختلف زاویوں سے وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ تمام تر احترام کے باوجود گزارش ہے کہ یہ کافی حد تک مغالطہ آرائی اور تعبیر کی غلط تشریح (Misinterpretation) پر مبنی ہے، اسے عربی میں: ''تعبیرٌ بما لا یَرضیٰ به القائلُ'' کہا جاتا ہے، یعنی کسی کے قول کی ایسی تعبیر کرنا جو قائل کی فکر کے خلاف ہو۔ اس کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

علامہ صاحب لکھتے ہیں:

''ایک جزیرہ نمائے عرب کی ریاست جس کی حدود خود خالقِ کائنات نے متعین کر کے

اس کو اپنے لیے خاص کرلیا ہے۔ چنانچہ اُسی کے حکم اُس کی دعوت اور عبادت کا عالمی مرکز اُس میں قائم کیا گیا اور ساتویں صدی عیسوی میں آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اعلان کردیا گیا کہ 'لَا یَجْتَمِعُ فِیْهَا دِیْنَا'، ''اب قیامت تک کوئی غیر مسلم اِس کا شہری نہیں بن سکتا''۔

یہ موقف ہم نے آج تک کسی صاحبِ علم کی نہ تحریر میں پڑھا اور نہ تقریر میں سنا کہ خالق ارض وسماء نے پورے روئے زمین میں سے ایک ''خطۂ حجاز'' کو اپنے لیے متعین کرلیا ہو اور باقی کو اپنی عملداری سے آزاد کردیا ہو۔ قرآن تو جابجا فرماتا ہے:

(۱) ''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ ہی کی ملکیت ہے''۔ (البقرہ:284)

(۲) ''حکم تو بس اللہ ہی کا چلے گا، وہ حق بیان فرماتا ہے اور وہ (حق و باطل کے درمیان) بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے''۔ (الانعام:57)

(۳) ''سنو! حکم صرف اُسی کا چلے گا اور وہ سب سے جلد حساب لینے والا ہے''۔

(الانعام:62)

اسی موضوع کو سورۂ یوسف میں ایک سے زائد بار بیان کیا گیا۔ اگر علامہ غامدی صاحب کے بقول اللہ تعالیٰ نے اپنی تشریعی عملداری کے لیے سرزمینِ حجاز پر ہی قناعت فرما لی ہے، تو باقی سے محاسبہ کس بات کا ہوگا؟۔

ہماری رائے میں علامہ صاحب قائدِ اعظم کی تقاریر اور بیانات کی بھی اپنے زاویۂ نظر سے تشریح فرمارہے ہیں۔ قائدِ اعظم کا بیانیہ اس کا ساتھ نہیں دیتا، انہوں نے قائدِ اعظم کی تقریر کے یہ اقتباسات نقل کیے ہیں:

''اب آپ آزاد ہیں، اس مملکت پاکستان میں آپ آزاد ہیں، آپ مندروں میں جائیں، اپنی مساجد میں جائیں یا کسی اور عبادت گاہ میں۔ آپ کا کسی مذہب، ذات پات یا عقیدے سے تعلق ہو، کاروبارِ ریاست کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم اس بنیادی اصول کے ساتھ ابتدا کررہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور ایک مملکت کے یکساں شہری ہیں۔

انگلستان کے باشندوں کو وقت کے ساتھ ساتھ آنے والے حقائق کا احساس کرنا پڑا اور اُن ذمے داریوں اور اُس بارِگراں سے سبک دوش ہونا پڑا جو اُن کی حکومت نے اُن پر ڈال دیا تھا اور وہ آگ کے اُس مرحلے سے بتدریج گزر گئے۔ آپ بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب وہاں رومن کیتھولک ہیں نہ پروٹسٹنٹ۔ اب جو چیز موجود ہے، وہ یہ کہ ہر فرد ایک شہری ہے اور سب برطانیہ عظمیٰ کے یکساں شہری ہیں۔ سب کے سب ایک ہی مملکت کے شہری ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں اِس بات کو ایک نصب العین کے طور پر اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو ہندو رہے گا، نہ مسلمان مسلمان۔ مذہبی اعتبار سے نہیں، کیوں کہ یہ ذاتی عقائد کا معاملہ ہے، بلکہ سیاسی اعتبار سے اور ایک مملکت کے شہری کی حیثیت سے''۔ (قائدِ اعظم: تقاریر و بیانات: 3594)

علامہ غامدی صاحب نے تقاریر و بیانات کا عنوان اس لیے قائم کیا ہے کہ متفرقات کو انہوں نے ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور اس سے وہ نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں کہ ریاست سیکولر ہے، لامذہب ہے اور وہ دین میں فریق نہیں ہے۔ ہماری رائے میں قائدِ اعظم کے افکار کی یہ تعبیر درست نہیں ہے، قائدِ اعظم کے افکارِ عالیہ کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان یعنی اسلامی ریاست میں کسی غیر مسلم کو ترکِ مذہب پر مجبور نہیں کیا جائے گا، نہ ہی اُسے جبراً اسلام میں داخل کیا جائے گا، اُسے اپنے مذہب کے مطابق اپنی عبادت گاہ میں عبادت کی آزادی ہوگی، شہری حقوق کے اعتبار سے اس کو جان و مال اور آبرو کے تحفظ میں مساوی حقوق حاصل ہوں گے، اُسے مسلمانوں کی طرح معاش، کاروبار اور تجارت کی آزادی ہوگی، جو قوانینِ عامہ (Common Laws) مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں، وہ اُن پر بھی عائد ہوں گے اور ان کے بھی حقوق و فرائض ہوں گے، اسی کو برابر کے شہری یا شہری حقوق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہماری دعا اور تمنا ہے کہ پاکستان میں نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی مکمل عافیت، سلامتی اور امان میں رہیں، یہی ہمارے دستور کا بھی تقاضا ہے۔ اِکا دُکا جو ناخوشگوار واقعات

وقتاً فوقتاً ہوجاتے ہیں، اِن پر ہمیں شدید افسوس ہے، یہ ہمارے نظام کی کمزوری ہے، اس طرح کے ناخوشگوار واقعات مسلمانوں کے ساتھ بھی ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا ہندوستان میں بابری مسجد کو نہیں گرایا گیا، مسلمانوں کے خلاف انسانیت کش فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوتے رہے ہیں، برطانیہ میں مسلمانوں اور مساجد پر حملے نہیں ہوتے، کیا امریکا میں مساجد کو آگ لگانے کے واقعات نہیں ہوتے، مسلمانوں سے نفرت کے شواہد نہیں ملتے؟ لیکن اِن واقعات کی بنا پر کوئی نہیں کہتا کہ امریکا یا برطانیہ سیکولر ملک نہیں رہے، وہاں اب مذہبی اَشرافیہ کا غلبہ ہوگیا ہے اور اب وہاں جمہوریت نہیں بلکہ Theocracy ہے، ہر جگہ ایسے واقعات کو نظام کی کمزوری یا ناکامی سے تعبیر کیا جاتا ہے، ریاست اور اس کی نظریاتی اَساس کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاتا۔ لیکن ہمارے ہاں اس طرح کے ناخوش گوار واقعات کو نظام کی ناکامی قرار دینے کے بجائے فوراً ریاست اور اس کے نظریۂ اسلام کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے، یہی اصل تضاد ہے۔

علامہ غامدی صاحب ایک طرف تو ریاست کو لامذہب قرار دیتے ہیں، مگر پھر لکھتے ہیں:

''اب دوسری ہی باقی ہے، جس کا لازمی نتیجہ اکثریت کی حکومت ہے۔ یہ اکثریت اگر مسلمانوں کی ہے اور اس کی بنیاد پر انہیں کسی ریاست میں اقتدار حاصل ہوجاتا ہے تو اُن کا جمہوری اور انسانی حق ہے کہ اُن کے دین نے اگر کوئی حکم اجتماعی زندگی سے متعلق دیا ہے تو وہ خود بھی اُس پر عمل پیرا ہوں اور اُس کے ماننے والوں کے تمام معاملات کا فیصلہ بھی اُسی شریعت کے مطابق کریں جو اُن کے پروردگار نے اپنے آخری پیغمبر کی وساطت سے نازل فرمائی ہے۔ قائدِ اعظم جب پاکستان کے حوالے سے اسلام، اسلامی تہذیب اور اسلامی شریعت کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کی مراد بھی یہی ہوتی ہے''۔

ہم یہی کہتے ہیں کہ پاکستان میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے، اس لیے انہوں نے قرآن وسنت کی ہدایات کے مطابق اپنے دستوری میثاق میں اپنے آپ کو اسلامی احکام کے نفاذ کا ذمے دار قرار دیا ہے۔ قرآن وسنت میں بہت سے ایسے اجتماعی احکام ہیں، جو

اپنی تنفیذ (Implementation) کے لیے نظمِ اجتماعی اور قوتِ نافذہ، جسے ہمارے ہاں اسٹیبلشمنٹ، مُقتدِرہ یا ایگزیکٹو کہا جاتا ہے، کے متقاضی ہیں۔ یہاں ہم جگہ کی قلت کے سبب ان احکام کی تفصیلات بیان نہیں کررہے ہے، لیکن ہر مسلمان ان سے بخوبی واقف ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں ریاست اور مَملکت کی تعریف یہ کی گئی ہے:

''قوم یا خطۂ ارضی (یعنی جو طے شدہ سرحدات کے اندر واقع ہو) یا ایک منظم سماج ہو اور ایک حکومت کے تحت ہو''۔

قرآنِ مجید نے اِسے سورۂ یوسف: 21، سورۂ کہف: 84، سورۂ اعراف: 10 اور سورۂ حج: 41 اور دیگر مقامات پر ''تَمَکُّن فِی الْاَرْض'' یعنی کسی معینہ خطۂ زمین میں تحکّم اور اقتدار سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی حاصل شدہ خطۂ زمین کے بغیر ریاست متصور نہیں ہوسکتی۔ ریاست تو اپنی جگہ ایک وجودِ قانونی (Legal Entity) کا نام ہے، یہ قانونی وجود جامد اور ساکت ہوتا ہے اور یہ اُس ہیئتِ مقتدرہ (Establishment) کے ذریعے بولتا ہے، جو اس پر حاکم ہے اور اس کے تحفظ اور مفادات کی ضامن ہے۔ اور اگر وہ ہیئتِ مقتدرہ مسلمانوں کی کل اکثریت یا غالب اکثریت پر مشتمل ہے، تو وہ مسلمانوں کی ریاست ہے۔ مسلمان اس بات کے مکلف ہیں کہ وہ اسلام اور قرآن وسنت کے ترجمان بنیں، وہ اللہ کی طرف سے ان کے نفاذ کے لیے مسئول (جواب دہ) اور امین ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی تین آیات میں فرمایا: ''اور جو اللہ کے نازل کردہ احکام پر فیصلے نہ کریں، وہ فاسق ہیں، ظالم ہیں اور کافر ہیں''۔

یہاں صرف اَحکامِ قرآنی پر عمل کرنے کا مطالبہ نہیں ہے کہ کہا جائے ہر شخص انفرادی حیثیت میں اللہ کو جواب دہ ہے، بلکہ یہاں تحکیم اور فیصلہ کرنے کا مطالبہ ہے اور یہ فریضہ صرف نظمِ اجتماعی ہی انجام دے سکتا ہے اور ہمارے نزدیک ریاست کے اسلامی ہونے کے معنی یہی ہیں۔

علامہ غامدی صاحب نے اپنی فکر سے ہمارے اختلاف کو ''تجاہلِ عارفانہ'' یا ''سخن

ناشناسی'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اپنے کالم کے اختتام پر وہ ہم جیسے کم فہم لوگوں پر پھبتی کستے ہیں: ''سخن شناس نہ ای، دلبرا خطا ایں جاست''۔ ان کی اس عنایت کا شکریہ، ان کی فکر اور سخن شناسی انہی کو مبارک ہو۔

28 فروری 2015ء

مارچ2015ء

مویشی منڈی

امیر جماعتِ اسلامی جناب سراج الحق صوبۂ خیبر پختونخوا کی اسمبلی سے سینٹ کے امیدوار ہیں۔ انہوں نے اپنے انتخابی کالج کے ووٹروں کو بھیڑ بکریوں سے تشبیہ دیتے ہوئے سینٹ کے انتخاب کو ''مویشی منڈی'' سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ سینٹ کے انتخاب تک انتظار کرتے، پھر اپنا غصہ نکالتے، مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور انسان بہت جلد باز ہے''۔ (الاسراء:11)

اس پر صوبۂ خیبر پختونخوا کی اسمبلی میں احتجاج کیا گیا اور بعض ارکانِ اسمبلی نے اسے اپنی توہین پر محمول کرتے ہوئے شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔ حالانکہ ہارس ٹریڈنگ کی اصطلاح ایک عرصے سے استعمال ہو رہی ہے، مگر اس پر تو کسی کی جبیں پر شکن نہیں آئی۔ شاید اس لیے کہ ''اسپ تازی'' کا بہر حال ایک نام ہے اور اسی لیے گھڑ سوار کو شہسوار کہا جاتا ہے، یہ نام کسی نے ہاتھی یا اونٹ پر سوار ہونے والے کو بھی نہیں دیا، حالانکہ یہ قامت و جسامت اور طاقت میں گھوڑے سے بڑھ کر ہیں اور ان پر سواری بھی کی جاتی ہے، مگر گھوڑے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ویسے تو قرآن مجید نے بتایا کہ انسان جب اپنے مقام سے گر جاتا ہے تو وہ چوپایہ تو در کنار، چوپایوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''بلاشبہ ہم نے جہنّم کے لیے بہت سے ایسے جن اور انسان پیدا کیے، جن کے دل ہیں مگر وہ ان سے (حق کو) سمجھتے نہیں، اُن کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، اُن کے کان ہیں جن سے وہ (حق کی آواز) کو سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی:

بڑھ کر گمراہ''۔ (الاعراف: 179)

جناب عمران خان کا دعویٰ تھا کہ باقی ساری سیاسی جماعتیں غیر جمہوری ہیں اور خاندانی اثاثہ ہیں، جبکہ ان کی جماعت جمہوری ہے، یونین کونسل، صوبے اور وفاق کی سطح تک باقاعدہ انتخابات ہوئے ہیں اور لگتا تھا کہ ان کا اپنی جماعت پر کنٹرول بہت مضبوط ہے۔ لیکن سینٹ کے انتخابات کے موقع پر ان کا اضطراب قابلِ دید ہے۔ اب اُن کا مطالبہ ہے کہ خفیہ بیلٹ کی بجائے ہاتھ کھڑے کرا کے فیصلہ کیا جائے تا کہ ہارس ٹریڈنگ اور ضمیر فروشی کا خاتمہ ہو۔ اس سے یہ بھی پتا چلا کہ ہمارے سیاست دان آئین وقانون سے کتنے نابلد ہیں کہ سیکریٹری الیکشن کمیشن کے بقول انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ سینٹ کا انتخابی شیڈول جاری ہونے کے بعد انتخابی قواعد میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ مزید یہ کہ سینٹ کا انتخاب متناسب نمائندگی کی بنیاد پر ہوتا ہے اور ایک سے زائد ترجیحی ووٹ ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سینٹ کے ووٹوں کی کاؤنٹنگ بھی کافی ٹیکنیکل ہوتی ہے۔ ماضی میں ایسا بھی ہوا کہ ایک امیدوار کو پہلے ترجیحی ووٹ تین ملے اور اس کے مقابل دوسرے امیدوار کو پہلا ترجیحی ووٹ ایک ہی ملا، لیکن دوسرے اور تیسرے ترجیحی ووٹوں کی زیادہ تعداد کی بنا پر مجموعی پوائنٹس میں پہلے ترجیحی تین ووٹوں والا ہار گیا اور ایک والا جیت گیا، لہٰذا Show of Hands سے اس پیچیدہ عمل کا مکمل ہونا کافی مشکل ہے۔

مسلم لیگ (ن) اور تحریکِ انصاف کی قیادت کا چونکہ اپنے ارکانِ اسمبلی کے ساتھ برتاؤ شاہانہ انداز کا ہے، ارکان کی حیثیت سیاسی مزارعین اور ہاریوں کی سی ہے، اس لیے پارٹی قیادت کا اپنے ارکان پر اعتماد متزلزل ہے اور جناب عمران خان کو مصلحت کا شکار ہونا پڑا اور اپنے اصولی موقف سے تنزل اختیار کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض تبصرہ نگار کہیں صراحت کے ساتھ اور کہیں اشارات و کنایات میں طنز و تعریض کر رہے ہیں اور جیسا کہ سننے میں آرہا ہے کہ ضمیر کے جو دام لگ رہے ہیں، وہ ناقابلِ تصور ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں کالے دھن کی کتنی بہتات ہے کہ جہاں چاہو اور جس کرنسی میں چاہو اپنے

دام وصول کرلو۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان کے سابق سیکریٹری جناب کنور دلشاد نے اس مسئلے کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے کہ شوآف ہینڈز کی صورت میں ضمیر کے فیصلے کی بجائے امیر کا فیصلہ نافذ ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پارٹی لیڈر براہِ راست خریدار سے یکمشت قیمت وصول کرلے اور ارکانِ اسمبلی کا سودا بھی ہوجائے، مگر ان کے ہاتھ کچھ نہ آئے۔ یہ صورتِ حال پہلی صورت سے بھی زیادہ استحصال پر مبنی ہوگی کہ بکے کوئی اور قیمت کسی اور کو ملے۔ اِس وقت جناب آصف علی زرداری اور مولانا فضل الرحمن دور بیٹھ کر تماشا دیکھ رہے ہیں اور متاثرین کے زخموں پر ہلکا ہلکا نمک بھی چھڑک رہے ہیں، کیونکہ ان کی حمایت کے بغیر مجوزہ 22ویں ترمیم کا پارلیمنٹ سے پاس ہونا عملاً مشکل نظر آرہا ہے، کیونکہ مسلم لیگ (ق) کا وزن بھی ممکنہ طور پر ان کے پلڑے میں ہی پڑے گا۔

یہ چند مظاہر ''مشتے نمونہ از خروارے'' ہیں۔ اصل المیہ بحیثیتِ مجموعی ہمارا اخلاقی زوال ہے کیونکہ جب کسی قوم، ملک وملت اور سماج میں زوال آتا ہے، تو وہ ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہوتا ہے۔ مستثنیات تو ہر جگہ ہوتے ہیں، لیکن معاشرے کی مجموعی تصویر اور قومی کردار کی عکاسی اکثریت سے ہوتی ہے اور یہ انتہائی بھیانک ہے۔ کیونکہ جب ہماری قومی وعلاقائی سیاسی جماعتیں اپنی ساخت میں ہی جمہوری نہیں ہیں، تو وہ ملک میں حقیقی جمہوریت کہاں سے لاسکتی ہیں۔ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ جناب شہباز شریف کسی حد تک فعالیت کا مظاہرہ کرتے ہیں، لیکن یہ بھی آمرانہ طرزِ حکومت کی ایک صورت ہے کہ انہیں اپنے یا اپنے فرزند یا معدودے چند افراد کے سوا کسی پر اعتبار نہیں ہے، اس کو نظام کی فعالیت اور شفافیت سے تعبیر کرنا زیادتی ہوگی۔ جہاں مشاورت نہ ہو وہاں تمام تر اخلاصِ نیت اور راستیٔ عمل کے باوجود سب کچھ بہتر نہیں ہوسکتا۔ دونوں برادران پر تسلسل کے ساتھ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کا تمام تر انحصار اپنی برادری، لاہور یا سنٹرل پنجاب پر ہے، جنوبی پنجاب کو نظر انداز کیا جارہا ہے، ان کے حجم اور استحقاق کے مطابق عہدوں اور وسائل کی تقسیم نہیں ہورہی۔

حالانکہ اٹھارہویں ترمیم میں صوبوں کو وسائل کی تقسیم میں آبادی کے تناسب کے ساتھ ساتھ کسی حد تک پسماندگی کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، تو کیا صوبے کے اندر اس کا اعتبار نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح بالعموم صوبہ خیبر پختونخوا کا وزیر اعلیٰ پشاور، مردان یا بنوں سے ہوتا ہے، اسی لیے صوبے کا اسی فیصد ترقیاتی بجٹ اسی علاقے پر صرف ہوتا ہے، کسی حد تک شاید مولانا فضل الرحمٰن اور سراج الحق صاحب اپنے لیے کوئی حصہ نکال لیتے ہوں۔ ایم ایم اے کی حکومت سے لے کر موجودہ حکومت تک کے تمام سالوں کے سالانہ ترقیاتی بجٹ کا ریکارڈ دیکھ لیجیے، حقائق آپ کے سامنے آجائیں گے۔ ڈی آئی خان اور ہزارہ ڈویژن کا حصہ شاید آٹے میں نمک کے برابر ہو، کیونکہ یہاں کے ارکانِ صوبائی اسمبلی ذاتی مفادات پر قناعت کر کے اپنے علاقائی مفادات کو قربان کر دیتے ہیں۔ پختونخوا سیکریٹریٹ میں بالعموم تمام محکموں کے سیکریٹریز اور سینئر بیوروکریٹس بھی سینٹرل پختونخوا کے اضلاع سے تعلق رکھتے ہیں، الّا ماشاء اللہ۔ سو ہمارا وطنِ عزیز کسی عادلانہ نظام اور مُسلّمہ جمہوری روایات کے مطابق نہیں چل رہا بلکہ ہر جگہ قیادت کا یا ایک طبقے یا مخصوص اضلاع کا تسلّط ہے۔

سو یہ کہنا کافی حد تک بجا ہے کہ پاکستان میں تعلیم اور صحت کی طرح سیاست بھی ایک منفعت بخش صنعت ہے، پیسا لگاؤ اور پیسا بناؤ ہماری سیاست کا ماٹو ہے، آج کل سراج الحق صاحب بھی اسی کا رونا رو رہے ہیں۔ ارتکازِ اختیارات کا یہی کلچر ہے کہ وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں یعنی فاٹا کو جمہوری حقوق نہیں دیے جا رہے، انہیں وہ آئینی و قانونی حقوق حاصل نہیں ہیں جو پاکستان میں دیگر تمام صوبوں کے شہریوں کو حاصل ہیں۔ حالانکہ ریفرنڈم کرا کے وہاں کے باشندوں کی اکثریت کی خواہش کے مطابق اسے الگ صوبہ بھی بنایا جا سکتا ہے اور صوبہ خیبر پختونخوا میں بھی ضم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ پاکستان کی پوری تاریخ میں آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ فاٹا کے منتخب ارکانِ اسمبلی یا سینیٹرز وفاقی حکومت کے خلاف گئے ہوں یا اپوزیشن کا حصہ بنے ہوں، کیونکہ ان کے مسائل و وسائل صدر اور گورنر خیبر پختونخوا کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں یا یوں کہیے کہ وہ وفاق کے محتاج رہتے ہیں۔ لہٰذا وہ وفاق کے

خلاف کھڑے ہو کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اے این پی 2013ء کا انتخاب بے انتہا کرپشن کی وجہ سے ہاری ہے، ورنہ انہوں نے تو سنٹرل خیبر پختونخوا میں پیسا پانی کی طرح بہایا ہے۔ سابق وزیر اعلیٰ جناب امیر حیدر ہوتی نے تو مردان میں ہر مسجد کو اور غالباً مدارس کو بھی دل کھول کر پیسے بانٹے ہیں، جس طرح دو ماہی وزیر اعظم جناب راجا پرویز اشرف نے اپنے حلقۂ انتخاب کے پیروں کو بھی نوازا، لیکن کرپشن کی وجہ سے مار کھا گئے۔

الغرض سارے مسائل کی بنیاد ہمارا مجموعی زوال اور اخلاقی کمزوریاں ہیں۔ نمائندوں کی اکثریت اگر کرپٹ ہے، تو حضور والا! یہ جمہوریت کا دیا ہوا تحفہ ہے، کیا ہم بحیثیتِ ووٹر کرپٹ نہیں ہیں، کیا ہمارا ووٹر پردے کے پیچھے ووٹ کی پرچی پر مہر لگاتے وقت اپنے آپ کو اللہ کی عدالت میں جوابدہ سمجھتے ہوئے امیدوار کی دیانت وامانت کو معیار بناتا ہے، ہرگز نہیں۔ اُس وقت چند مستثنیات کے سوا ہمارے رائے دہندگان کی غالب اکثریت کی ترجیحات کچھ اور ہوتی ہیں۔

پس کسی ہمہ گیر داخلی اور فکری انقلاب کے بغیر ہم کسی بڑی اور جوہری تبدیلی کی توقع نہیں کر سکتے، یہ حقیقت پسندی نہیں ہے۔ ببول کا درخت لگا کر انگور کی تمنا عبث ہے۔

2 مارچ 2015ء

انسانی شخصیت کی تشکیل

خیر وشر کی کشمکش اَزل سے جاری ہے، علامہ اقبال نے کہا:

ستیزہ کار رہا ہے اَزل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے، شرارِ بولہبی

علامہ اقبال نے چراغِ مصطفوی کو خیر کے لیے اور شرارِ بولہبی کو شر کے لیے بطورِ استعارہ استعمال کیا۔ انسانیت کے جدِ اعلیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو ابتداءِ آفرینش ہی سے ابلیس سے واسطہ پڑا اور وہ حضرت آدم وحوا کے جنت سے نکالے جانے کا ظاہری سبب بنا اور آدمیت وابلیسیت کی یہ کشمکش تا قیامت جاری رہے گی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو ضرور درجۂ کمال پر پہنچائے گا، خواہ کافروں کو ناگوار ہو''۔(التوبہ:32)

دنیا میں انسانوں کے بنائے ہوئے نظام میں، انسانی شخصیت کی جو تشکیل ہوتی ہے، وہ قانونی ضوابط میں کس کر بنائی جاتی ہے، انہیں ایک قانونی نظام کا پابند اور ذمے دار شہری بنایا جاتا ہے۔ قانون کی پابندی کرتے کرتے ایک وقت آتا ہے کہ وہ قانون اس کے مزاج اور عادت کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس پر چیک رکھنے کے لیے مختلف طرح کی نگرانی کے انتظامات کیے جاتے ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے افراد ہر وقت چوکس رہتے ہیں اور نظر رکھتے ہیں اور آج کل جدید سائنسی ترقی کی وجہ سے CCTV کیمرے نصب کیے جاتے ہیں اور زیادہ تر ترقی یافتہ ممالک بہت سی چیزوں کو

سیٹلائٹ میں نصب کیمروں کے ذریعے سے بھی چیک کرتے ہیں اور پھر انھی آلات کی مدد سے قانون شکن عناصر کو تلاش کر کے قانون کی گرفت میں لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ تمام ذرائع بھی انسان کی سو فیصد اصلاح میں ناکام رہتے ہیں، اسی لیے دنیا میں عدالتیں ہیں، جزا و سزا کا نظام ہے، مجرموں کے لیے جیلیں ہیں۔

لیکن اسلام ایک ایسے انسان کی تشکیل چاہتا ہے کہ جہاں قانون کی کوئی ظاہری یا خفیہ آنکھ اسے نہ دیکھ رہی ہو، وہاں بھی وہ اپنے آپ کو اللہ عالم الغیب والشہادۃ کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"بے شک اللہ اپنے بندوں (کے حال) کو خوب دیکھنے والا ہے"۔ (المؤمن:44)

وہ نہ صرف ظاہر کو جانتا ہے بلکہ باطن کو بھی جانتا ہے اور کسی عمل، خواہ بظاہر کتنا ہی پرکشش کیوں نہ ہو، کے پیچھے کارفرمانیت کو بھی جانتا ہے اور آخرت کے اجر کا مدار اسی نیت پر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وہ نگاہوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور اُن (رازوں) کو بھی جو تم اپنے سینوں میں چھپاتے ہو"۔ (المؤمن:19)

اسی لیے ارشاد ہوا:

"اور انہیں فقط اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے، اس کی عبادت کریں"۔ (البینۃ:05)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اعمال پر (اُخروی جزا) کا مدار نیتوں پر ہے، سو جس کی ہجرت (خالصاً) اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہو، تو وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہی قرار پائے گی اور جس کی ہجرت کسی دنیوی مقصد کے حصول کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کے لیے ہو، تو وہ انہی مقاصد کے لیے قرار پائے گی"۔ (بخاری:01)

ایسی ہجرت کا آخرت میں کوئی اجر نہیں ہوگا اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

"بے شک اللہ تمہارے جسموں اور (ظاہری) صورتوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمہارے

دلوں کو دیکھتا ہے''۔(بخاری:33)

راوی کہتے ہیں کہ یہ کہتے ہوئے حضور ﷺ نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: تقوے کا مرکز یہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کے بارے میں آخرت میں پوچھا جائے گا''۔(اسراء:36)

یعنی اللہ تعالیٰ نے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی جو صلاحیتیں انسان کو عطا فرمائی ہیں، ان کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی کہ اُس نے ان صلاحیتوں کو اُس کی اطاعت میں استعمال کیا یا نافرمانی میں۔ الغرض اسلام ایک اخلاقی شخصیت کی تشکیل چاہتا ہے کہ جب اللہ کی زمین پر کوئی بھی نظر اسے نہ دیکھ رہی ہو، تب بھی وہ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جوابدہ سمجھے اور اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی طرف قدم نہ بڑھائے اور جو شخص اللہ کے خوف سے معصیت کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو روک لے، اُسے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی سایۂ رحمت میں پناہ عطا فرمائے گا، جبکہ اس کے سایۂ رحمت کے سوا کوئی اور جائے امان نہیں ہوگی، ان میں سے ایک وہ شخص ہے کہ جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اپنی خطاؤں پر نادم ہو کر اُس کی آنکھوں سے آنسوں جاری ہو گئے اور ایک وہ شخص ہے کہ جسے کسی منصب و جمال والی عورت نے دعوتِ گناہ دی (اور جب نفسانی شہوت کی تکمیل میں کوئی حِسّی رکاوٹ نہ رہی)، اس نے (یہ کہہ کر قدم روک لیے کہ) میں اللہ سے ڈرتا ہوں''۔(سنن نسائی:5395)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اے بنی آدم! کہیں شیطان تم کو فتنے میں مبتلا نہ کردے جس طرح وہ تمہارے ماں باپ کے جنت سے اخراج اور ان کے لباس اتروانے کا سبب بنا تھا (تاکہ وہ انہیں اُن کی شرمگاہیں دکھائے)، بے شک وہ (شیطان) اور اُس کے کارندے تمہیں (ایسی جگہ سے) دیکھتے ہیں، جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ پاتے''۔(الاعراف:27)

اُس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی آزمائش کے لیے جنات اور شیاطین میں ایسی قوتِ ادراک پیدا کی ہے، جس کے سبب وہ انسانوں کو دیکھ لیتے ہیں اور عام انسانوں

میں ایسی قوت نہیں ہے کہ وہ جنات اور شیاطین کو دیکھ سکیں، کیونکہ جنات اور شیاطین کے جسم لطیف ہیں، اس لیے ان کی شعاعِ بصر بہت قوی ہے، وہ لطیف (Thin) اور کثیف (Thick) دونوں اجسام کو دیکھ لیتی ہے، جبکہ عام انسان اپنے اجسام کے کثیف ہونے کی وجہ سے لطیف اجسام کو نہیں دیکھ سکتے، البتہ انبیاء علیہم السلام بطورِ معجزہ اور اولیاءِ کرام بطورِ کرامت جنات اور شیاطین کو دیکھ لیتے ہیں۔ حضرتِ سلیمان علیہ السلام کی بابت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور بعض جنات کو ان کے تابع کر دیا تھا، جو ان کے سامنے ان کے رب کے حکم سے کام کرتے تھے اور انہیں بتا دیا کہ اُن میں سے جو ہمارے حکم کی نافرمانی کرے گا، ہم اسے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب پہنچائیں گے، وہ اُن کے حسبِ منشا اُن کے لیے اونچے قلعے، مجسمے اور حوض کی مانند بڑے بڑے ٹب اور (چولھوں پر) گڑی ہوئی بڑی بڑی دیگیں بناتے تھے''۔ (سبا:14-13)، آج کل کی جو عالمی قوتیں ہیں، انہوں نے مادّی اسباب سے اپنے لیے مخفی آنکھیں بنالی ہیں۔

حدیثِ پاک میں ہے:''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ام المؤمنین صَفِیّہ بنت حُیَیّ مسجد میں ملاقات کے لیے آئیں، جب وہ لوٹیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان کے ساتھ چل پڑے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے دو انصاری شخص گزرے، آپ نے ان دونوں کو بلایا اور کہا: یہ صَفِیّہ (یعنی میری زوجہ) ہیں، ان دونوں نے کہا: سبحان اللہ، آپ نے فرمایا: شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے''۔(بخاری:7171)

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معصوم ہیں، مگر اس کے باوجود آپ نے ممکنہ بدگمانی کے ازالے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا۔ ایک روایت میں ہے:''ایسے مواقع سے بچو، جہاں لوگوں کی بدگمانی اور تہمت کا امکان ہو''۔ الخرائطی نے مرفوعاً روایت کیا ہے: ''جو اپنے بارے میں بدگمانیوں کے مواقع پیدا کرے گا، وہ (انجامِ کار) لوگوں کی تہمت کا ہدف بنے گا، پھر اسے بدگمانی کرنے والوں کو ملامت نہیں کرنا چاہیے''۔

(کشف الخفاء ومزیل الالباس، جز: اوّل، ص:44)

ایک اور حدیثِ پاک میں ہے:

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جن عورتوں کے شوہر موجود نہ ہوں، ان کے پاس نہ جاؤ، کیونکہ شیطان تمہاری رگوں میں خون کی طرح سرایت کرتا ہے''۔(ترمذی:1172)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور جس چیز کا تمھیں علم نہ ہو، اس کی ٹوہ میں نہ لگو، بے شک کان، آنکھ اور دل ان سب کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا''۔(بنی اسرائیل:36)

الغرض کامل مومن وہی ہے جو اپنے آپ کو اُس اللہ کے حضور جواب دہ سمجھے، جس سے ظاہر و باطن کا کوئی ذرہ پوشیدہ نہیں ہے۔ انسانی اعمال پر تو اس کی نظر ہے ہی، ان اعمال کے پیچھے جو نیت کارفرما ہے اور جو اس کے باطنی اور قلبی محرکات ہیں، وہ اُن سے خوب آگاہ ہے۔ چنانچہ ایک بار ایک بادشاہ اپنی ریاست میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے ایک باغ میں گیا تو اسے باغ کے مالی کی بیوی کے حسن و جمال نے فریفتہ کر دیا۔ اس نے اس کے شوہر کو دور دراز بھیجا اور اس کی بیوی کو اپنے حرم میں بلایا اور اُس کو حکم دیا کہ سارے دروازے، کھڑکیاں، روشن دان بند کر دو۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ بادشاہ نے اُس سے پوچھا کہ سب روزن بند کر دیے، اس نے کہا کہ سوائے ایک کے سب بند کر دیے۔ بادشاہ نے کہا: ''اسے بھی بند کر دو''۔ اس نے کہا: ''وہ میرے بس میں نہیں ہے''۔ بادشاہ نے کہا: ''بتاؤ میں بند کر دیتا ہوں''۔ اُس نے کہا: ''آپ بھی نہیں کر سکتے''، کیونکہ یہ وہ روزن ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان ہے۔ اس سے بادشاہ کی دل کی آنکھ جو شہوت کے غلبے سے بند ہو چکی تھی، کھل گئی، اس نے فوراً توبہ کی اور گناہ میں مبتلا ہونے سے بچ گیا۔

6 مارچ 2015ء

رسیدہ بود بلائے، ولے بخیر گزشت

کالم کا عنوان فارسی زبان کا ایک مقولہ ہے، جس کا معنی ہے: ''ایک بلائے ناگہانی نازل ہو چکی تھی، لیکن اللہ کے کرم سے خیر سے گزر گئی''۔ یہ بلا سینٹ کے انتخابات میں ہارس ٹریڈنگ کی تھی، کافی حد تک یہ بلا ٹل گئی، اگرچہ مکمل طور پر نہیں، کیونکہ اندرونِ خانہ سیاسی اُمور سے آگہی رکھنے والوں کا دعویٰ ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے۔ سب سے زیادہ دباؤ جناب عمران خان پر تھا، چنانچہ وہ خود میدان میں اترے اور صوبائی اسمبلی کی تحلیل کی دھمکی دے دی۔ اس کے بعد وزیر اعلیٰ خیبر پختونخوا جناب پرویز خٹک متحرک ہوئے اور عزتِ سادات بچ گئی۔ البتہ مسلم لیگ (ن) کی قیادت کو اپنے شاہانہ مزاج اور شانِ بے اعتنائی پر بلوچستان میں جھٹکا لگا اور اب پنجاب میں بھی کھٹکا لگا ہوا ہے کہ منحرفین کون تھے۔ تاہم یہ درست ہے کہ سیم وزر کی چمک کو بڑے پیمانے پر ہاتھ دکھانے کا موقع نہ مل سکا۔

جناب عمران خان نے اپنی اس کامیابی پر بے انتہا فرحت وانبساط کا اظہار کیا، انہوں نے اور جناب سراج الحق نے قرار دیا کہ اراکینِ اسمبلی نے اپنے ''ضمیر'' کے مطابق ووٹ دیا ہے۔ اس پر مجھے وہ لمحہ یاد آ گیا جب 2002ء میں جناب میر ظفر اللہ خان جمالی ایک ووٹ کی اکثریت سے وزارتِ عظمیٰ کا انتخاب جیت گئے، تو ارکانِ اسمبلی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ارکان نے اپنے ''ضمیر'' کے مطابق ووٹ دیا ہے۔ اس پر مولانا فضل الرحمٰن نے پھبتی کسی اور کہا کہ جی ہاں! میجر جنرل احتشام ضمیر کی ہدایت کے مطابق ووٹ دیے ہیں، کیونکہ ان انتخابات کو ''نتیجہ خیز'' بنانے کی ذمے داری انہی کی تھی۔ ان کی

ذمے داری یہ تھی کہ قابلِ انتخاب (Electables) پرندوں کو چن چن کر ق لیگ کے ڈربے میں بند کریں، آخر میں جب مطلوبہ تعداد میں بیس کی کمی رہ گئی، تو اس وقت کے صدر جنرل پرویز مشرف نے پیپلز پارٹی کی لاٹ سے بیس ارکانِ اسمبلی تھوک میں خرید لیے۔ اس لیے اس موقع پر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ضمیر نہیں بلکہ حکمِ امیر کے مطابق ووٹ دیے ہیں۔

سو خفیہ رائے شماری اور ضمیر کی آواز بھی ایک مُعَمّا اور چیستان ہے۔ ارکانِ اسمبلی کو اگر ضمیر کے مطابق ووٹ دینے کی آزادی ہوتی تو جناب عمران خان کو یہ مطالبہ نہ کرنا پڑتا کہ Show of Hands یعنی دست نمائی کے ذریعے ووٹنگ کرائی جائے لیکن چونکہ ارکان کے ضمیر کے فیصلے پر اعتماد مشکل تھا اور پھر اس کے لیے انہیں لاٹھی (Stick) اور جناب پرویز خٹک کو گاجر (Carrot) کا انتظام کرنا پڑا۔ سو اگر ہماری جمہوری اخلاقیات میں اپنی جماعت کے سربراہ کے حکم یا اشارۂ ابرو پر ہی ووٹ دینا ضمیر کی آواز ہے، امانت و دیانت کا مظہر ہے اور ہماری سیاسی اخلاقیات کا معیار بھی یہی ہے، تو پھر زیادہ آسان بات یہ ہے کہ خفیہ رائے دہی یا دست نمائی کی بجائے ہر سیاسی پارٹی کو ارکان کے تناسب سے سینٹ کی نشستیں الاٹ کردی جائیں، کیونکہ عملاً سینٹ کے امیدوار چننے میں ارکان کا کوئی عمل دخل یا اختیار نہیں ہے، یہ سو فیصد پارٹی سربراہ کی صوابدید یا حُسنِ انتخاب پر منحصر ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے فرض کرلیں کہ ارکانِ اسمبلی دیانت و امانت کے اعلیٰ معیار پر فائز ہیں، سیم وزر کی چمک دمک سے بے نیاز ہوچکے ہیں، انہیں ہر آن اپنی عاقبت کی فکر رہتی ہے، اُن کے ضمیر کو کوئی دولت کے انبار سے بھی خریدنے کا تصور نہیں کرسکتا، وہ اپنے آپ کو صرف اللہ تعالیٰ اور عوام کے سامنے جوابدہ سمجھ کر اہل امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہماری سیاسی اخلاقیات میں ضمیر کی آواز پر فیصلہ کرنے والے کو مطعون کیا جاتا ہے، اسے لوٹا کریسی اور ہارس ٹریڈنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس پر بِک جانے یا منحرف ہوجانے کی پھبتی کسی جاتی ہے، تو پھر ارکان کی رائے تو بے اعتبار ہے، پارٹی سربراہ ہی سب کچھ ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے سیاسی نظام میں سینٹ کی چنداں اہمیت نہیں ہے۔ ایک

تجویز یہ آئی کہ پورا صوبہ ایک حلقۂ انتخاب قرار پائے اور ہر پارٹی خواتین کی طرح اپنے سینٹ کے امیدواروں کی ترجیحی فہرست الیکشن کمیشن کے پاس پیشگی جمع کرادے، تب بھی فیصلہ تو صرف اور صرف پارٹی سربراہ ہی کا چلے گا۔ امریکا میں سینٹ کا انتخاب براہِ راست ہوتا ہے اور بہت سے اُمور میں سینٹ ایک طاقت ور ادارہ ہے۔

دراصل حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کی سیاست اسلام کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ کیونکہ آپ حزبِ اقتدار میں ہیں تو آپ کو صحیح اور غلط کی تمیز کے بغیر حکومت کا ساتھ دینا ہے، ورنہ اختلاف کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کرنا ہے۔ اصولی طور پر پوری اسمبلی یا پارلیمنٹ کو "حزبِ احتساب" کا کردار ادا کرنا چاہیے کہ اگر حاکمِ وقت کے اقدامات، حکمتِ عملی اور فیصلے درست سَمت میں ہیں تو سب پر ان کی حمایت لازم ہے اور اگر وہ غلط سَمت میں جا رہا ہے، تو سب پر اس کے غلط فیصلوں کی مخالفت کرنا اور اسے راستی پر لانا لازم ہے۔ رسول اللہ ﷺ تو "معصوم عنِ الخطاء" تھے، آپ پر تو وحیِ ربانی نازل ہوتی تھی، اس لیے ہر صورت میں آپ کی اطاعت لازم تھی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اپنے باہمی تنازعات میں آپ کو حاکم نہ مان لیں، پھر آپ کے فیصلے پر اپنے دلوں میں (بھی) کوئی گھٹن محسوس نہ کریں اور (آپ کے کیے ہوئے ہر فیصلے کو) خوش دلی سے تسلیم کریں"۔

(النساء:85)

لیکن آپ کے بعد کوئی معصوم نہیں ہے، اب ہر حاکم کے ہر فیصلے کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، اُسے چیلنج کیا جاسکتا ہے۔ ہر صحیح فیصلے کی حمایت کی جائے گی اور حاکم غلطی پر ہے تو اسے راستی پر لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو صاحبانِ امر ہیں ان کی اطاعت کرو، پس اگر کسی معاملے (کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے) میں تم میں اختلاف ہو جائے تو (آخری فیصلے کے لیے) اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو،

اگر اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی (رَوِش) بہتر ہے اور اس کا انجام سب سے اچھا ہے"۔(النساء:59)

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اندازِ حکمرانی اس کی عمدہ مثال ہے، ایک بار آپ نے اپنے خطبہ میں متنبہ کیا کہ لوگوں نے مہر زیادہ مقرر کرنے شروع کر دیے ہیں، اس پر ایک خاتون کھڑی ہوئی اور کہا: امیر المومنین اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

"اور اگر تم ان میں سے ایک کو (یعنی اپنی بیوی کو مہر میں) ڈھیروں مال دے چکے ہو، تو اس مال میں سے کچھ بھی واپس نہ لو"۔(النساء:20)

یعنی قرآن میں تو "قِنطار" کا کلمہ آیا ہے اور آپ مہر کی رقم کی تحدید کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر حضرت عمر فاروق نے کہا: "عورت نے درست کہا اور عمر سے غلطی ہوگئی"، چنانچہ انہوں نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا"۔(سنن کبریٰ للبیہقی، جلد7، ص:233)

اسی طرح ان کے عہدِ خلافت میں ایک شخص طواف کے دوران کچلا گیا اور اس کی موت واقع ہوگئی اُس کا معاملہ امیر المومنین کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے کہا کہ یہ پتا چلانا مشکل ہے کہ کس کے پاؤں تلے کچلنے سے اس کی موت واقع ہوئی، اس لیے اس کی دیت کسی پر بھی عائد نہیں کی جاسکتی، اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "امیر المومنین! مومن کا خون رائیگاں نہیں جاتا، اس کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے"۔ حضرت عمر فاروق نے اپنے فیصلے سے رجوع کیا اور کہا: "اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا"۔

ایک موقع پر حضرت عمر نے خطبے کے دوران کہا کہ اگر میں غلط روش اختیار کروں تو تم کیا کرو گے۔ اس پر ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا: "میری یہ تلوار آپ کو سیدھا کر دے گی"۔

اس پر حضرت عمر نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ جب تک انہیں روکنے اور ٹوکنے والے موجود ہیں، امت کے معاملات درست سمت پر چلتے رہیں گے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسلامی امارت وخلافت کے لیے زریں اصول اپنے اولین خطبۂ خلافت میں ارشاد فرمایا:

"جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے جادۂ مستقیم پر چلتا رہوں، تم پر

میری اطاعت لازم ہے اور اگر (بفرضِ محال) میں اس سے انحراف کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں ہے"۔

10 مارچ 2015ء

انجیر

میں Qtv پر ہر سوموار کو کسی تفسیر پر گفتگو کرتا ہوں، اس ہفتے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی "تفسیر عزیزی" پر گفتگو کا موقع ملا۔ مطالعے کے دوران سورۃ التین کی تفسیر میں شاہ صاحب نے انجیر کی جو صفات اور خاصیات بیان کی ہیں وہ نہایت دلچسپ اور مفید معلوم ہوئیں، اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے قارئین کو اس میں شریک کروں۔ اللہ تعالیٰ نے جن اشیاء یا مقامات کی قرآنِ مجید میں قسم فرمائی ہے، ان میں کوئی نہ کوئی ظاہر یا مستور حکمت ضرور موجود ہے۔ انجیر کو انگریزی میں Fig اور بعض علاقائی زبانوں مثلاً ہندکو میں پھگوڑی کہتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے لکھا کہ انجیر میں کچھ ظاہری خصوصیات ہیں اور کچھ باطنی۔ ظاہری خصوصیات بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ یہ پھل لطیف ہے، زُود ہضم اور ہاضم (Digestant) ہے، معدے اور آنتوں کو نرم رکھتا ہے، سڑے ہوئے یا بدبودار مادّے کو بدن کے اندر سے پسینے کی راہ سے نکال دیتا ہے۔ اس کی خاصیت گرم ہے، لیکن اس کے باوجود بخار کے لیے مفید ہے، بلغم کو پتلا کرتا ہے۔ یہ پھل گردے اور مثانے کو پتھریلے ذرات سے پاک کرتا ہے، بدن کو موٹا کرتا ہے اور مسام کو کھول دیتا ہے۔ انجیر جگر اور تلی کے سُدّوں یعنی گٹھلی بننے والے بافتوں (Tissues) کو تحلیل کرتا ہے اور یہ تلی کے ورم کے لیے بھی مفید ہے۔

انجیر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ سارے کا سارا پھل، غذا اور دوا ہے۔ اس

میں کوئی فاضل اور فالتو جُز مثلاً گٹھلی، بیج اور پھینکا جانے والا چھلکا نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اس اعتبار سے جنت کے پھلوں کے مشابہ ہے، کیونکہ جنت کے پھلوں میں بھی کوئی فاضل جُز نہیں ہوگا۔ یہ قرآن کی مانند مغز ہی مغز ہے۔ حدیثِ پاک میں ہے:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انجیر کا ایک طباق ہدیہ کیا گیا، آپ نے اس میں سے انجیر کھائیں اور اپنے اصحاب سے فرمایا: کھاؤ۔ پھر آپ نے فرمایا:

اگر میں یہ کہوں کہ یہ پھل جنت سے نازل ہوا ہے تو کہہ سکتا ہوں، کیونکہ جنت کے پھل بغیر گٹھلی کے ہیں، اس کو کھاؤ کیونکہ یہ بواسیر (Piles) کو کاٹتا ہے اور گٹھیا کے درد کے لیے بھی مفید ہے''۔ (الکشف والبیان، جلد: 10، ص: 238)

حضرت امام علی موسیٰ رضا رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انجیر کھانے سے منہ کی بدبو دور ہوتی ہے، یہ سر کے بالوں کو بڑھاتا ہے اور فالج سے محفوظ رکھتا ہے۔ انجیر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ایک درمیانے لقمے کے برابر ہوتا ہے، لہٰذا اسے کھانے میں کوئی مشقت نہیں ہوتی اور یہ خوش ذائقہ بھی ہے۔

انجیر کے اندر پروٹین، معدنی اجزاء، گلوکوز، کیلشیم اور فاسفورس پائے جاتے ہیں۔ یہ قبض کے لیے بھی مفید ہے۔ حدیثِ مبارک میں ہے کہ انجیر مرض قولنج میں بھی مفید ہوتا ہے۔ یہ پھل رنگت کو سرخ وسفید بنانے کی خاصیت بھی رکھتا ہے۔ اسے زیادہ دیر تک تر وتازہ نہیں رکھا جاسکتا، البتہ اسے خشک کر کے محفوظ کیا جاسکتا ہے، خشک کرنے کے عمل کے دوران جراثیم سے حفاظت کے لیے اسے گندھک کی دھونی دی جاتی ہے اور ملائم رکھنے کے لیے اسے نمک کے پانی میں ڈبویا جاتا ہے۔ اس کے تازہ کچے پھل اور پتوں سے دودھ کی طرح قطرے ٹپکتے ہیں، ان میں جلن ہوتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ برص کے داغ کو دور کرنے کے لیے مفید ہیں۔ انجیر کو عرب ممالک میں پسند کیا جاتا ہے۔ پاکستان کے بعض علاقوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر سنٹرل ایشیا کا پھل ہے، کہا جاتا ہے کہ سنٹرل ایشیا سے منگول، مغل اور مسلمان اَطِبّاء اسے برصغیر میں لائے، کیونکہ مسلمانوں کی

آمد سے پہلے اس خطے میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے انجیر کے باطنی خواص بھی بیان کیے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: یہ پھل اہلِ کمال سے مشابہت رکھتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن ایک ہے، لہٰذا یہ سراسر خیر ہی خیر ہے اور یہ سارے کا سارا فیض رساں ہے کہ نہ گٹھلی، نہ فالتو چھلکا اور نہ ہی اس میں بیج ہوتا ہے کہ اسے پھینکا جائے، جب کہ دیگر پھلوں میں کہیں گٹھلی ہے (جیسے آم) یا چھلکا ہے اور اندر مغز، جیسے بادام، مونگ پھلی، اخروٹ، کاجو وغیرہ۔ اور کہیں چھلکا پھینکا جاتا ہے جیسے مالٹا، سنگترہ وغیرہ اور چیکو میں بیج ہوتا ہے۔

انہوں نے مزید لکھا کہ یہ پھل ایثار کی صفت کا بھی حامل ہے۔ دیگر پھل دار درختوں پر پہلے شگوفے کھلتے ہیں، یعنی وہ اپنے آپ کو حسن و جمال سے آراستہ کرتے ہیں، جب کہ انجیر میں کسی شگوفے یا کلی کے بغیر براہِ راست پھل نکل آتا ہے۔ شاہ صاحب دیگر پھل دار درختوں کو خود غرض اور دنیا دار لوگوں کے مشابہ قرار دیتے ہیں، جو ''اوّل خویش بعد درویش'' کے فارمولے کا مظہر ہوتے ہیں۔

اس بات کو امام فخر الدین رازی نے تفسیرِ کبیر میں لکھا ہے کہ:

''دیگر درختوں کا شعار اس حدیث کا مصداق ہے'' پہلے اپنی ضرورت پوری کرو اور پھر ان کی جو تمہاری کفالت میں ہیں'' اور انجیر اس صفتِ مصطفوی کا مظہر ہے جو سورۃ الحشر 09: میں بیان کی گئی ہے: ''اور وہ خود ضرورت مند ہونے کے باوجود (ایثار سے کام لیتے ہیں اور) دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں''۔ (تفسیرِ کبیر، جلد: 32، ص: 11-210)

مزید یہ کہ انجیر سال میں ایک سے زائد بار پھل دیتا ہے۔ شاہ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ جب عالمِ انسانیت کے جدِّ اعلیٰ حضرت آدم علیہ السلام کی خطائے اجتہادی کے نتیجے میں اُن کا جنتی لباس اتار لیا گیا اور ان کا بدن بے لباس ہو گیا، تو قرآن مجید میں ہے:

''پھر ان دونوں کے دلوں میں شیطان نے وسوسہ ڈالا تا کہ (انجامِ کار) اُن دونوں کی شرم گاہیں جو اُن پر مستور تھیں، اُن کو ظاہر کر دے، شیطان نے کہا: تمہارے رب نے تم کو

اس درخت سے اس لیے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ اور اس نے ان دونوں کو قسم کھا کر کہا: بے شک میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔ پھر فریب سے اس نے ان دونوں کو اپنی طرف مائل کرلیا، پس جب ان دونوں نے اُس درخت کو چکھا تو ان کی شرم گاہیں اُن کے لیے ظاہر ہو گئیں اور وہ اپنے اوپر جنت کے پتے لپیٹنے لگے۔ اور ان کے رب نے ان کو پکار کر فرمایا: کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے نہیں روکا تھا اور تم دونوں سے یہ نہیں کہا تھا کہ بے شک شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، (تب) ان دونوں نے عرض کی: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے"۔

(الاعراف:23-20)

شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں:

حضرت آدم وحوا علیہما السلام اپنے بدن کو ڈھانپنے کے لیے جس درخت کے پاس جاتے وہ آپ کی پہنچ سے اونچا ہو جاتا، پس جب وہ انجیر کے درخت کے پاس گئے تو انجیر کا درخت اونچا نہ ہوا اور حضرت آدم وحوا علیہما السلام نے اس کے پتوں سے اپنے بدن کو ڈھانپا۔

شاہ عبدالعزیز مُحدّث دہلوی نے لکھا:

بعض کاشت کار لوگوں کا کہنا ہے کہ کامل درخت وہ ہے جس میں مندرجہ ذیل دس چیزیں پائی جائیں: جڑ، ڈالیاں، پتے، پھول، گٹھلی، گوند، چھال، چھلکا اور شیرہ، جیسے کھجور کا درخت کہ یہ دس چیزیں اس میں موجود ہیں۔ پس جس درخت میں ان میں سے کوئی چیز کم ہو تو وہ ناقص ہے اور انجیر میں گٹھلی نہیں ہے، لہٰذا یہ ناقص ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نقص نہیں بلکہ کمال ہے، کیونکہ گٹھلی کھانے کی چیز نہیں ہے، پھینک دینے کی چیز ہے، پس گٹھلی کا ہونا کمال نہیں بلکہ نہ ہونا کمال ہے۔

آخر میں شاہ صاحب لکھتے ہیں: خلاصۂ کلام یہ کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انجیر کی قسم فرما کر اس کی اہمیت اور فضیلت کی جانب اپنے بندوں کو متوجہ فرمایا۔ امام قرطبی نے لکھا ہے:

''کسی شخص کو خواب میں انجیر نظر آئے تو اس کی روزی کشادہ ہوگی اور انجیر کھائے تو اسے اولاد کی نعمت نصیب ہوگی''۔(احکام القرآن، جلد:20،ص:111)

امام قرطبی نے انجیر کا وصف بیان کرتے ہوئے عربی اشعار بھی نقل کیے ہیں، جن میں سے ایک کا ترجمہ یہ ہے:

''میرے نزدیک انجیر ہر پھل کی خوبیوں کا حامل ہے، اس کی شاخ پھل سے لدی ہوتو جھک جاتی ہے، اس کا منہ زخم کی مانند ہوتا ہے، جس سے شہد بہتا ہے، گویا کہ یہ اللہ کی خشیت سے جھک جاتا ہے''۔

14 مارچ 2015ء

منارۂ نور

اُستاذی واستاذ العلماء علامہ مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کی ایک منفرد، ممتاز اور جامعِ کمالات شخصیت تھے۔ آپ اَسلاف کے ایثار، اخلاص، استقامت وعزیمت، وَرَع وتقویٰ کا کامل مظہر، ان کی علمی وراثت کے امین، معاصرین میں اپنی ہمہ جہت شخصیت کی وجہ سے ممتاز اور اپنے اَخلاف کے لیے اُسوہ وقُدوہ اور منارۂ نور ہیں۔

ہر علم اور ہر فن پر آپ کو کامل عبور اور مَلکۂ تامّہ حاصل تھا۔ آپ علومِ اسلامیہ وعلومِ عربیہ کے بے مثال معلّم تھے، تدریس اور فیض رسانی کا ملکہ قدرت نے آپ کو ودیعت فرمایا تھا، آپ علومِ دینیہ میں جامع معقول ومنقول تھے۔ اسی لیے تمام علمی تحقیقات، نِکات اور مشکل مقامات آپ کو اَزبر تھے اور آپ علومِ عربیہ واسلامیہ کی تدریس کے شہسوار تھے۔ ایسا نابغۂ روزگار، بیہقیِ دوراں، وحید العصر اور فرید الملّت شخص اب شاید ہی نظر آئے جس نے علمی مسابقت کے میدان میں ہر جانب اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑے ہوں اور دور دور تک کوئی ان کی گردِ راہ کو بھی پانے والا نظر نہ آئے جو بیک وقت قرآن، حدیث، فقہ اور جملہ علومِ عربیہ، معقول ومنقول میں مہارت تامّہ رکھتا ہو۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی حیاتِ مبارکہ میں جن علمی رفعتوں اور مناصبِ جلیلہ تک پہنچے ان میں سے کچھ بھی موروثی نہ تھا، ایسا نہیں کہ آپ کو سجی سجائی مسند مل گئی ہو اور زیبِ سجادہ بن گئے ہوں، دولت وثروت کے انبار اور اہلِ عقیدت وارادت کا جمِ غفیر آپ کو ورثے میں مل گیا ہو، بلکہ آپ اُن لوگوں میں سے تھے جو اپنی دنیا آپ تعمیر کرتے ہیں،

اپنے لیے امکانات (Opportunities) خود پیدا کرتے ہیں، یعنی وہ عہدِ جدید کی اصطلاح میں Self Made انسان تھے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو مناصب کے متمنی وطلبگار ہوتے ہیں، بلکہ آپ ان نادر روزگار ہستیوں میں سے تھے جن سے مناصب کو عزت ملتی ہے، آپ جس علمی مجلس میں رونق افروز ہوتے، اُس پر چھا جاتے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے تلامذہ کے روحانی باپ، مربّی اور محسن تھے، اکثر پیار سے اپنے شاگرد کو بھائی جان کہہ کر مخاطب کرتے۔ اعلیٰ مشینیں بنانا، فن پارے تخلیق کرنا، بلند وبالا عمارات اور یادگاریں تعمیر کرنا اور تیشۂ فرہاد سے جوئے شیر کشید کرنا آسان ہے، باکمال انسان بنانا ایک مشکل ترین فن ہے۔ انسانی شخصیت کی تراش خراش کر کے اسے ایک پیکرِ کمال میں ڈھالنا، اس کی شخصیت کی داخلی تہوں میں مستور فطرت کے ودیعت کردہ نقوشِ جلال وجمال کو نکھار کر باہر لانا، اسے پیکرِ علم وعمل بنانا، ایک لاشئ کو وجود کامل بنا دینا، ابنِ آدم کو انسان بنا دینا، الغرض انسانیت سازی اور شخصیت سازی یہ سب سے مشکل ترین فن ہے دراصل یہی اعجازِ نبوت، فیضانِ نبوت اور وراثتِ نبوت ہے، مفتی صاحب کو قدرت نے یہ ملکہ ودیعت فرمایا تھا۔

یہی تربیتِ نبوت تھی جس نے گڈریوں، گنواروں، وحشی انسانوں اور صحراؤں اور ریگستانوں کے مکینوں کو رہتی دنیا تک کے لیے علم، تہذیب، اَخلاق، عدالت، صداقت، شجاعت، دیانت، فیاضی، زُہد وتقویٰ، ایثار واخلاص، آدابِ جہان بانی وحکمرانی کا امام بنا دیا۔ حضرت مفتی صاحب اسی وراثتِ نبوت کے امین تھے، وہ زرنگاہ، زر پرست وزرخرید نہیں تھے بلکہ انسانیت کے ہیرے تراشنے والے جوہری تھے۔ وہ جوہرِ انسانیت کے عقیقوں اور ہیروں کے شناور تھے، انہیں ریت کے ٹیلوں میں سے ڈھونڈ ھ نکالتے تھے اور ان کی تراش خراش کر کے قابلِ رشک بنا دیتے۔

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا　　　سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اندازِ تربیت ایسا حکیمانہ تھا کہ آپ ایک جانب اپنے تلامذہ کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور ان کو بلند ہمتی کا درس دیتے تھے۔ جن طبقات سے انہیں علمی و اعتقادی میدان میں مقابلہ درپیش تھا، ان کی افرادی قوت، اداروں کی ظاہری وجاہت، اسبابِ ظاہری کی فراوانی اور اہلِ اقتدار سے قربت کے مادّی مظاہر کو اپنے تلامذہ کی ہمت اور عزیمت و استقلال کو قائم رکھنے کے لیے قرآن کی آیاتِ مبارکہ کے مصداق بے توقیر و بے مایہ قرار دیتے تھے۔

لیکن اس کے ساتھ وہ انہیں ان کی علمی نارسائی، عملی کوتاہی اور بشری کمزوریوں کا بھی احساس دلاتے رہتے تھے تاکہ وہ فریبِ نفس اور عُجبِ نفس کے مہلک مرض میں مبتلا نہ ہو جائیں، مخالفین کو لاشئ سمجھ کر تساہل و تغافل کا شکار نہ ہوں اور جُہدِ مسلسل کو ترک نہ کریں۔ الغرض وہ بہت بڑے ماہرِ نفسیات اور نبّاضِ فطرت بھی تھے۔ مفتی صاحب بلاشبہ عصبیتِ جاہلیہ کے داعی و مبلغ نہیں تھے جس کی تعریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ:

''اَلْعَصَبِيَّةُ اَنْ تُعِينَ قَوْمَكَ عَلَى الظُّلْمِ''

''یعنی عصبیت یہ ہے کہ تم حق و باطل اور صواب و خطا کی تمیز کیے بغیر ظلم پر اپنی قوم کے حامی و ناصر بن جاؤ''۔ (سنن ابوداؤد:5078)

عصبیتِ جاہلیہ سے مراد کٹ حُجّت، اَڑیل اور ضِدّی بن کر جانتے بوجھتے حق کا انکار کرنا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ ''تصلُّب فی الدین'' کی علامت تھے اور یہی جذبۂ صادقہ اپنے تلامذہ کے قلوب و اذہان میں راسخ کرتے تھے تاکہ بڑی سے بڑی ترغیب یا ترہیب، ہوائے نفس اور خوف سے ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئے اور وہ اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل کا فریضہ ادا کرتے رہیں۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کے ان لوگوں میں سے تھے، جو معیارِ حق تھے، حق گو تھے، حق پر ڈٹ جانے والے اور حق پر مر مٹنے والے تھے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اَخلاف، اولادِ امجاد اور تلامذہ کے علاوہ ان کی دو عظیم یادگاریں ہیں:

(۱) جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور و شیخوپورہ کمپلیکس۔

(۲) تنظیم المدارس (اہلسنّت) پاکستان۔

ان دونوں اداروں کی تشکیل و تعمیر پر انہوں نے اپنے شباب اور عمرِ عزیز کا ایک ایک لمحہ صَرف کر دیا۔ آپ بعد فجر تا عشاء ادارے ہی میں رہتے، اس لیے ان کی خَلوت و جَلوت سب کے سامنے تھی۔ میں نے سیرتِ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں پڑھا کہ جب انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین بنانے کا ارادہ فرمایا تو ان کے بارے میں اکابر صحابۂ کرام کی آراء جاننا چاہیں۔ چنانچہ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ان کی بابت دریافت کیا، تو انہوں نے کہا: ''عمر کا باطن اُن کے ظاہر سے اچھا ہے''۔

میں بھی الحمدللہ شرحِ صدر کے ساتھ کہتا ہوں کہ ''حضرت مفتی صاحب کا باطن ان کے ظاہر سے بھی زیادہ درخشاں و تابندہ تھا''۔ اور سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو چہرہ بھی نورانی عطا کیا تھا۔ آپ فائل ورک اور دفتری ضابطوں کے عادی نہ تھے، لیکن جب انہوں نے تنظیم المدارس اہلسنّت پاکستان کی ذمہ داری سنبھالی تو نئے معیارات قائم کیے۔

الحمدللہ! اب جامعہ نظامیہ رضویہ اپنی ظاہری و باطنی شان و شوکت، عظیم الشان عمارت اور علمی وجاہت کے اعتبار سے اس مقام پر ہے کہ اسے ایک یونیورسٹی کا چارٹر حکومت کی جانب سے عطا کیا جائے۔ جامعہ نظامیہ رضویہ پاکستان میں اہلسنّت کا سب سے بڑا ادارہ ہے اور اس کے نیٹ ورک میں تقریباً پانچ ہزار طلبہ و طالبات زیرِ تعلیم ہیں۔

امامِ احمد رضا خان قادری قُدِّس سرُّہ العزیز کا نام لینے والے، اُعراس منانے والے، ان کے مسلک پر تصلُّب کا دم بھرنے والے تو بہت ملیں گے، لیکن رضوی مشن کی جو عظیم خدمت آپ نے انجام دی ہے، اس میں آپ کا کوئی ثانی اور مقابل نہیں ہے۔ آپ نے ''فتاویٰ رضویہ'' کو تخریج و تحقیق اور جدید اسلوب کے مطابق 33 مجلّدات میں مدوّن کر کے عصرِ حاضر سے ہم آہنگ کر دیا اور رہتی دنیا تک اب یہ شاہکار لائبریریوں کی زینت بنا رہے گا اور موافق و مخالف اہلِ علم اس سے صَرفِ نظر نہ کر پائیں گے۔ آپ نے

''الدولة المكية بالمادة الغيبية'' اور ''انباء الحی'' کو جدید عربی اسلوب پر مدوّن کر کے امامِ اہلسنّت کو بین الاقوامی اور بین الاسلامی علمی شخصیت کی حیثیت سے منوایا۔ اب ''دیدۂ کور'' کے سوا عرب وعجم کے کسی بڑے سے بڑے صاحبِ علم و تحقیق کے لیے اعلیٰ حضرت کی علمی وجاہت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔

حضرت قبلہ مفتی صاحب کی حیاتِ مبارکہ ہی میں ان کا علمی ودعوتی صدقۂ جاریہ جامعہ نظامیہ رضویہ کی چہار دیواری سے نکل کر بین الاقوامی سطح پر پھیل چکا تھا۔ ان کے تلامذہ نے جا بجا ادارے قائم کیے، مساجد بنائیں، پہلے سے قائم اداروں کو جِلا بخشی، دعوت وارشاد، تدریس، تصنیف وتالیف، خطابت اور جدید پرنٹ والیکٹرونک میڈیا کو ابلاغِ دین کے لیے مہارت کے ساتھ استعمال کیا، یہ تا قیامت ان کے لیے صدقۂ جاریہ رہے گا۔

حضرت مفتی صاحب کی زندگی اخلاص وایثار، سعیِ پیہم، جُہدِ مسلسل اور عزمِ صمیم سے عبارت تھی، وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک مصروفِ عمل رہے، ان کی حیاتِ مبارکہ کو اگر ہم الفاظ میں سمیٹ کر کوئی عنوان دینا چاہیں تو وہ فقط یہی ہے ''کام، کام اور صرف کام''۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس راز کو سمجھنے اور اس پر کاربند رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ان کے صاحبزادگان علامہ محمد عبدالمصطفیٰ ہزاروی، مولانا عبدالمجتبیٰ، مولانا غلام مرتضیٰ اور محمد سعید احمد ہیں اور یہ ان کے دینی وعلمی مشن کو نہ صرف کامیابی کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں، بلکہ ان کے ادارے روز بروز ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں اور اس سے یقیناً مفتی صاحب کی روح کو تسکین مل رہی ہوگی۔

نوٹ: 16 مارچ بروز پیر ایوانِ اقبال لاہور میں مفتی صاحب کی شخصیت کے بارے میں آگہی کے لیے ''مفتیٔ اعظم سیمینار'' منعقد ہو رہا ہے، اُس کی مناسبت سے یہ سطور لکھی گئی ہیں۔

16 مارچ 2015ء

نکاح نامہ

ہماری مغرب نواز ''این جی اوز'' کا ایک ترجیحی اور نسبتاً آسانی سے حاصل ہونے والا ایجنڈا مربوط خاندانی نظام کے مستحکم شیرازے کو، جو ہمارا افتخار ہے، بکھیر دینا ہے۔ مخلوط اجتماعات اور جنسی تعلیم کا فروغ اس مہم میں کامیابی کے لیے زینے کا کام دیتا ہے اور امریکا کی رینڈ کارپوریشن اس مہم کے لیے فراخ دلی سے مالی وسائل فراہم کرتی ہے۔ یہ بیگمات اور ان کا عملہ اپنے مشن کے لیے اتنا پرعزم (Committed) ہوتے ہیں کہ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر ایسی ہی مستحکم وابستگی (Commitment) انہیں دین کے لیے نصیب ہوجائے، تو سیدھے جنت میں جائیں۔ اگر محبت کے نام پر شادی رچانے والا کوئی مفرور جوڑا ہاتھ آجائے، تو ان کا بانڈ نکل آتا ہے۔ بھاگم بھاگ پہلے سول عدالت سے ضمانت قبل از گرفتاری لیتے ہیں، پھر لڑکی کو کسی دارالامان کے حوالے کرنے کا عدالتی پروانہ حاصل کرتے ہیں اور اس کے بعد سیدھا پریس کلب جاکر اُس جوڑے کے ہمراہ پریس کانفرنس کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس سے ہمارے میڈیا کو بھی رونقِ محفل کے لیے کچھ مواد ہاتھ آجاتا ہے۔

اس ضمن میں ان بیگمات کا ایک من پسند موضوع نکاح نامہ بھی ہوتا ہے، آئے دن اسٹوڈیوز میں بیٹھ کر نکاح خواں یا رجسٹرار نکاح کو کوستی رہتی ہیں کہ نکاح نامے کے سارے کالم کیوں نہیں پُر کیے جاتے، صرف کراس لگادیا جاتا ہے، اُن پر پابندی لگائی جائے کہ نکاح نامے کے کالم نمبر 18 میں درج کردیں کہ بیوی کو خود کو طلاق دینے کا اختیار حاصل

ہے، یعنی طلاق کا حق اسے تفویض کر دیا گیا ہے، ان کا بس چلے تو ٹکٹکی باندھ کر ان نکاح خوانوں کو سرِ عام کوڑے لگوائیں۔ میڈیا پر یہ واویلا اکثر مچایا جاتا ہے۔ جب سے ہمارے ہاں انڈین ڈراموں، فلموں اور ٹیلی ویژن مکالموں میں ازدواجی معاملات کو بحث کا موضوع بنانے کا کلچر عام ہوا ہے، ہمارے معاشرے میں طلاق کی شرح میں کافی اضافہ ہوگیا ہے۔ اسی طرح جب سے ''قانونِ تحفظِ حقوقِ نسواں'' کی آڑ میں ''زنا بالرضا'' کو تحفظ ملا ہے، غیرت کے نام پر قتل کے واقعات میں اضافہ ہوگیا ہے۔

اصولی طور پر کسی نکاح خواں یا رجسٹرار کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ نکاح نامے کے کالموں میں اپنی طرف سے کچھ لکھ دے۔ وہ صرف اسی صورت میں کوئی اندراج کر سکتا ہے، جب فریقین کسی شرط یا شرائط پر متفق ہو جائیں، نکاح خواں یا کسی ایک فریق (دولہا یا دلہن) کی جانب سے یک طرفہ طور پر کوئی شرط نہیں لکھوائی جا سکتی۔ ہمارے ہاں اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے امیدواروں کے لیے درخواست فارم بھرنے کی بابت جو ہدایات درج ہوتی ہیں، اُن میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ خالی کالم میں Not Applicable لکھیں اور کراس لگانے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ سو اگر نکاح کے موقع پر زوجین میں کچھ شرائط پر اتفاق ہو جاتا ہے، تو نکاح نامے میں ان کو درج کرانا فریقین کی ذمہ داری ہے۔ اگر نکاح خواں یا رجسٹرار کالم کو خالی چھوڑ دے اور کراس نہ لگائے تو خدانخواستہ کوئی فریق یک طرفہ طور پر کوئی شرط درج کر کے ایک نئے تنازع کو جنم دے سکتا ہے، کیونکہ نکاح نامے کی ایک کاپی دولہا کے لیے اور ایک دلہن کے لیے ہوتی ہے۔

شریعت کی رُو سے نکاح کے صحیح طور پر منعقد ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ فریقین ایک ہی مجلس میں دو گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول کریں۔ ایجاب و قبول نکاح کے رُکن ہیں، دو گواہوں کا موجود ہونا صحتِ نکاح کے لیے شرط ہے اور خطبۂ مسنونہ پڑھنا سنّت ہے اور اس خطبے کی حکمت بھی نکاح کا اعلانِ عام ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے اور کوئی انہیں اکٹھے دیکھ کر بدگمانی نہ کرے۔ صحتِ نکاح کے لیے ایک مرتبہ ایجاب و قبول کافی ہے،

ہمارے ہاں بعض علاقوں میں تین مرتبہ ایجاب وقبول کرایا جاتا ہے، ایسا کرنا نہ ضروری ہے اور نہ اس میں کوئی حرج ہے۔ اسی طرح پنجاب کے بعض علاقوں میں دولہا کو چھ کلمے پڑھائے جاتے ہیں، ایسا کرنا صحتِ نکاح کے لیے لازم نہیں ہے اور اگر معنی ومفہوم سمجھ کر پڑھا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ برکت کا باعث ہے۔ اگر مجلسِ نکاح میں سب لوگ دلہن کے مَحرم ہوں تو زوجین براہِ راست بھی ایجاب وقبول کر سکتے ہیں، ورنہ دلہن کی طرف سے ایجاب وقبول کے لیے ہمارے معاشرے میں وکیل مقرر کیا جاسکتا ہے۔ جب دلہن کسی شخص کو اپنا وکیلِ مُجاز (Authorised Attorney) بنالے تو اس کے ایجاب یا قبول سے نکاح منعقد ہوتا ہے۔ نکاح نامہ پُر کرنا یا نکاح کی دستاویز مُرتب کرنا یہ شریعت کا مطالبہ نہیں ہے، بلکہ قانونی ضرورت ہے اور مفید بھی ہے کہ آئندہ کے معاملات کے لیے نکاح کا ثبوت زوجین کے پاس ہوتا ہے اور خدانخواستہ کوئی تنازع ہو جائے، تو اس کو طے کرنے میں بھی کام آتا ہے۔

سورۂ بقرہ آیت 282، جو قرآن مجید کی طویل ترین آیات میں سے ایک ہے، میں قرض کے لین دین کی دستاویز مرتب کرنے کا استحبابی حکم فرمایا گیا ہے، ارشاد ہوا:

''اے ایمان والو! جب تم کسی مقررہ مدت کے لیے آپس میں قرض کا لین دین کرو، تو اسے لکھ دیا کرو''۔

پھر اگر دستاویز یا وثیقہ لکھنے والا ایک ہی آدمی ہو تو اسے ہدایت فرمائی گئی:

''اور تمہارے درمیان کسی کاتب (وثیقہ نویس) کو عدل کے ساتھ دستاویز لکھنی چاہیے اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے لکھنا سکھایا ہو، اُسے لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے''۔

یہ حکم اس لیے فرمایا کہ اپنے دینی بھائی کے حقوق کے تحفظ میں مددگار بننا مسلمان کا شِعار ہونا چاہیے، حدیث پاک میں فرمایا:

''جو اپنے مسلمان بھائی کی نصرت ومدد کرتا ہے، اللہ تعالیٰ (جزا وانعام کے طور پر) اس کی مدد فرماتا ہے''۔ (صحیح مسلم: 2074)

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ہدایت فرمائی:

''جس پر کسی کا قرض ہے، دستاویز لکھوانا اس کی ذمے داری ہے، وہ اللہ سے ڈرتا رہے جو اس کا رب ہے اور (حق) میں کوئی کمی نہ کرے''۔

اسی طرح اس آیت میں کاروباری معاملات میں گواہ مقرر کرنے کا بھی استحبابی حکم فرمایا گیا ہے۔ اور اس سے اگلی آیت میں فرمایا:

''پھر اگر تم کو ایک دوسرے پر اعتبار ہو، تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے، اُسے چاہیے کہ وہ اس کی امانت ادا کرے اور (بارِ امانت سے عہدہ برا ہونے میں) اللہ سے ڈرتا رہے، جو اس کا رب ہے اور شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو شخص گواہی کو چھپائے گا (یعنی گواہی نہیں دے گا یا اس میں خیانت کرے گا) تو اس کا دل گناہ گار ہے''۔

قرآن مجید میں دوسرے مقام پر ہے:

''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے، جس نے اُس شہادت کو چھپایا جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے ہے''۔ (البقرہ:140)

لہٰذا نکاح نامہ پُر کرنا اور اس کی رجسٹریشن کرانا یہ ہمارے ملک کا قانون ہے اور ہم پر اِس کی پاس داری لازم ہے۔ قانون کی پاس داری اس لیے بھی لازم ہے کہ قانون شکنی کی صورت میں انسان قانون کی گرفت میں آتا ہے اور اس کی عزت پامال ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''مومن کے شایانِ شان نہیں ہے کہ اپنے آپ کو ذلت سے دوچار کرے، صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! وہ اپنے آپ کو ذلت سے کیونکر دوچار کرے گا؟۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی صورت یہ ہے کہ اپنے آپ کو ایسی آزمائش سے دوچار کرے، جس سے سرخرو ہوکر نکلنے کی اس میں طاقت نہ ہو''۔ (سنن ترمذی:2254)

سو قانون شکنی بھی مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اب آتے ہیں ''تفویضِ طلاق'' (To Delegat The Powers of Talaq) کی طرف، سو مسئلہ یہ ہے کہ

باقاعدہ نکاح منعقد ہونے سے پہلے تو خود دولہا کے پاس طلاق کا حق نہیں ہے، تو وہ دلہن کو یہ حق کیسے تفویض کر سکتا ہے، کیونکہ نکاح کے انعقاد سے پہلے وہ عورت اس کے لیے نامحرم اور اجنبی ہے۔ اسی طرح کسی نکاح خواں یا رجسٹرار کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اَزخود یعنی Suo Moto یہ حق حاصل کر لے۔ لہٰذا اگر نکاح سے پہلے نکاح نامے میں بیوی کے لیے خود کو طلاق دینے کا حق درج بھی کر دیا جائے، تو وہ شرعاً مؤثر اور معتبر نہیں ہے۔ پس اس کا درست شرعی طریقہ یہ ہے کہ نکاح منعقد ہونے کے بعد دولہا دلہن کو طلاق دینے کا حق تفویض کرے، اس لیے کہ اب اسے یہ حق حاصل ہو چکا ہے، اور اب وہ یہ حق اپنی بیوی کو تفویض کر سکتا ہے اور اس کے لیے درست الفاظ یہ ہیں: ''میری بیوی جب کبھی چاہے، اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے''، اس کے لیے ہماری فقہ کی کتابوں میں ''مَتٰی شِئۡتِ، مَتٰی مَاشِئۡتِ، اِذَا شِئۡتِ، اِذَا مَاشِئۡتِ'' کے کلمات آئے ہیں اور ان کا معنی ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے کہے: ''تو جب بھی چاہے یا جب کبھی چاہے اپنے آپ کو طلاق دینے کا حق رکھتی ہے''۔ ان کلمات سے تفویض طلاق کا یہ حق اُسی مجلس یا کسی خاص وقت تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اُسے ہمیشہ یہ حق حاصل رہتا ہے۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی نے بھی اس پر تفصیلی بحث کی ہے کہ فقہ حنبلی اور فقہ مالکی میں یہ توکیل طلاق ہے، یعنی شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینے کے لیے اُسے اپنا وکیل بناتا ہے اور ایک بار یہ اختیار دینے کے بعد واپس نہیں لے سکتا''۔ (فقہ الاسلامی وادلتہ، جلد 9، ص: 6935-6941)

چند احادیثِ مبارکہ پیشِ خدمت ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

(۱) ''عورتوں سے اُن کے حسن کے سبب نکاح نہ کرو، ممکن ہے اُن کا حسن اُنہیں پستی میں گرادے اور نہ ہی اُن کے مال کے سبب اُن سے نکاح کرو، ممکن ہے کہ ان کا مال انہیں سرکش بنادے، بلکہ اُن کی دین داری کے سبب اُن سے نکاح کرو''۔

(سنن ابن ماجہ: 1859)

(۲) ''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل یعنی بیوی بچوں کے لیے اچھا ہو اور میں تم میں اپنے اہل کے لیے سب سے بہترین ہوں''۔(سُنن ابن ماجہ:1977)

(۳)''دنیا متاعِ زیست ہے اور اس دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے''۔(مسلم:3628)

(۴)''عورت کے ساتھ نکاح چار خوبیوں کی وجہ سے کیا جاتا ہے، اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب (Status) کی وجہ سے، اس کے حُسن کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے، پس تمہارے ہاتھ خاک آلود ہوں تم دین دار عورت کے ساتھ نکاح میں کامیابی حاصل کرو''۔(بخاری:5090)

21مارچ2015ء

سانحۂ لاہور کی تنبیہات

15 مارچ بروز اتوار یوحنا آباد لاہور میں ایک بڑا سانحہ پیش آیا، یوحنا آباد لاہور میں مسیحیوں کی بڑی بستی ہے، اس بستی میں اتوار کے دن عین اُس وقت جب کہ مسیحی اپنے دو چرچوں میں عبادت میں مصروف تھے، مبینہ طور پر خودکش حملے کیے گئے، کئی افراد ہلاک ہوگئے اور درجنوں زخمی ہوگئے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق ''الاحرار'' تنظیم نے اِس کی ذمّے داری قبول کی۔ پھر اس کے ردِّ عمل میں دو مسلمانوں کو تشدد کر کے مارا گیا اور ان کی لاشوں کو نذرِ آتش کردیا گیا۔ پھر میٹرو بس کی تنصیبات پر حملہ کر کے شدید نقصان پہنچایا گیا۔

اس سانحے میں ہمارے لیے بڑی تنبیہات (Warnings) ہیں اور سامانِ عبرت ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ایسے تمام جرائم انتہائی حد تک افسوسناک، اذیت ناک اور قابلِ مذمت ہیں، یہ سنگ دلی اور درندگی کی انتہا ہے اور شریعت کی رو سے حرامِ قطعی ہے۔ قرآن نے اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جنگ اور فساد فی الارض قرار دیا ہے اور یہ ایسا جرم ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس کی سب سے زیادہ سزا مقرر کی ہے، کیونکہ اس جرم کی شدت (Intensity) سب سے زیادہ ہے۔ یہ اسلام دشمنی، پاکستان دشمنی اور انسانیت دشمنی کی انتہا ہے۔ پہلے مسیحیوں پر ظلم ہوا اور پھر جواباً دو مسلمانوں کو اذیتیں دے کر مارا گیا اور ان کی لاشوں کو نذرِ آتش کردیا گیا اور قومی اَملاک کو نقصان پہنچایا گیا۔ اس طرح مظلومیت اور ظلم دونوں جمع ہوگئے۔ ابھی ہم اس صدمے سے بحال بھی نہیں ہوئے تھے کہ کراچی میں جمعۃ المبارک کے دن ایک مسجد پر بم بلاسٹ ہوا اور رینجرز کی گاڑی پر مبینہ

طور پر خودکش حملہ ہوا اور کئی افراد لقمۂ اجل بنے اور درجنوں زخمی ہوئے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ''ضربِ عضب'' کی کامیابیوں کے باوجود اب بھی پہل کرنے اور اپنی ترجیح کے مطابق ہدف مقرر کرنے اور اسے روبہ عمل لانے کی صلاحیت ریاست سے متصادم دہشت گردوں کے پاس موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کارروائیوں کا مقصد سیکورٹی کے اداروں کی توجہ کو اپنے ہدف سے ہٹانا، قوم کو عدمِ تحفظ کے احساس اور بے یقینی میں مبتلا کرنا، خوف زدہ کرنا اور ملک کو عدمِ استحکام سے دوچار کرنا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ شمالی وزیرستان میں بے پناہ زک اٹھانے کے باوجود وہ شہروں میں اپنے ہدف کو حاصل کرنے میں تاحال کامیاب ہیں۔

مزید یہ کہ ہمارے میڈیا کا کردار بھی منفی ہے، ان مناظر کو براہِ راست نشر کرنے کی جب تک قانوناً ممانعت نہیں ہوتی، ہجوم (Mob) اکٹھا بھی ہوتا رہے گا، بے قابو بھی ہوگا اور فسادی عناصر اس میں نفوذ کر کے تخریبی کارروائیاں بھی کریں گے۔ اس کے نتیجے میں معاشرے میں ایک نیا رجحان جنم لے گا، مردم آزاری اور اذیت رسانی کو لوگ Enjoy کریں گے، اس کا دوسرا منفی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ کسی سانحے کی واقعاتی شہادت (Forensic Evidence) ضائع ہو جاتی ہے اور موقع پر شواہد جمع کرنے کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔

ہمارا میڈیا دوسرا نقصان یہ پہنچا رہا ہے کہ غیر مسلموں یا ان کی عبادت گاہوں پر حملہ ہوتا ہے، تو پوری دنیا کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ پاکستان میں غیر مسلموں کا جینا دوبھر کر دیا گیا ہے، ان کی نسل کشی ہو رہی ہے اور ان کے انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ واقعات کی یہ تعبیر درست مان لی جاتی، اگر صرف غیر مسلموں کو نشانہ بنایا جارہا ہوتا اور مسلمان بے خوف وخطر رہتے، وہ سلامتی اور امان میں شاداں وفرحاں ہوتے۔ لیکن کیا مسلمانوں کی مساجد ومزارات پر حملے نہیں ہوئے، علمائے کرام کے قتل کے واقعات نہیں ہوئے، مارکیٹوں اور بازاروں میں بم بلاسٹ نہیں ہوئے، بلا امتیاز بوڑھے، جوان، بچے اور عورتیں لقمۂ اجل نہیں بنائے

گئے، مسلح افواج، دفاعی تنصیبات اور سیکورٹی کے دیگر اداروں پر حملے نہیں ہوئے؟۔لہٰذا میری مؤدبانہ گزارش ہے کہ ہر سفاکانہ حملے کو پاکستان پر حملہ تصور کیا جائے اور ہر نقصان کو قومی نقصان قرار دیا جائے۔لوگوں کو اندازہ نہیں کہ جب غیر مسلموں پر حملے کو ملک کی مجموعی صورتِ حال سے الگ تھلگ کر کے پیش کیا جاتا ہے، تو پاکستان کا امیج دنیا میں کتنا مجروح ہوتا ہے۔

اسلام غیر مسلموں شہریوں کو مکمل تحفظ دیتا ہے۔نجران کے نصاریٰ جب جزیہ قبول کر کے صلح پر آمادہ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو تحفظ کی ضمانت دی اور اس وقت جو دستاویز مرتب ہوئی، اُس کا ترجمہ یہ ہے:

''اہلِ نجران اور ان کے قرب وجوار میں رہنے والوں کے دین، جانوں، اراضی، اموال، غائب وحاضر اُن کے خاندان، ان کے تابع لوگوں، خواہ کم ہوں یا زیادہ اور ان کی ان عبادت گاہوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ضمان (Gaurantee) ہے۔ یہ کہ ان کے حقوق اور ان کے دین میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی، نہ ہی ان کے پادریوں اور راہبوں کو تبدیل کیا جائے گا، زمانۂ جاہلیت کا کوئی قصاص یا دیت ان سے وصول نہیں کی جائے گی، انہیں جلاوطن نہیں کیا جائے گا، ان سے عُشر نہیں وصول کیا جائے گا اور ان کی زمین کو لشکر نہیں روندیں گے، ان کے باہمی معاملات میں انصاف کیا جائے گا، وہ سود نہیں کھائیں گے، البتہ ماضی کے معاملات معاف ہوں گے اور اُن کے کسی شخص کو کسی دوسرے کی زیادتی کے بدلے میں نہیں پکڑا جائے گا۔ اس دستاویز پر اللہ اور اس کے نبی محمد ﷺ کی ہمیشہ کے لیے ضمان ہے، جب تک کہ وہ خود اِس عہد کو نہ توڑیں۔ آپ ﷺ نے اِس پر ابوسفیان، غیلان بن عمرو، مالک بن عوف، اَقرع بن حابس اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم کو گواہ بنایا''۔ (سُبُلُ الھدیٰ والرّشاد، جلد:6،ص:420)

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فتح بیت المقدس کے موقع پر القدس کے مسیحیوں کے لیے تحفظ کی باقاعدہ تحریری دستاویز لکھی، جو یہ ہے:

"یہ وہ امان ہے، جو القدس الشریف (Jerusalem) کے رہنے والوں کو اللہ کے بندے امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ نے عطا کی۔ آپ نے یہ امان اُن کو اُن کی جانوں، اموال، کلیساؤں (Churches)، صلیبوں (Cross)، ہر بیمار اور تندرست اور اُن کے تمام اہلِ مذہب کو عطا کی۔ امیر المؤمنین نے ان سے عہد کیا کہ اُن کی عبادت گاہوں میں کوئی سکونت نہیں اختیار کرے گا، انہیں ڈھایا نہیں جائے گا، ان کی حدود میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح ان کے مالوں اور صلیبوں میں بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور دین کے معاملے میں ان پر جبر نہیں کیا جایا گا، اُن میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ اور القدس الشریف میں اُن کے ساتھ یہودی رہائش اختیار نہیں کر سکیں گے اور وہ ٹیکس ادا کریں گے۔ انہیں روم کی طرف جلاوطن نہیں کیا جائے گا، ہاں جو اپنی مرضی سے روم جانا چاہیں، تو انہیں ان کے اموال اور صلیبوں سمیت حفاظت کے ساتھ ان کی منزل تک پہنچایا جائے گا۔ اور جو اپنی مرضی سے وہیں قیام کرنا چاہیں، تو انہیں مکمل تحفظ عطا کیا جائے گا"۔

آخر میں لکھا: "اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مسلمانوں کے خلفاء اور جملہ مسلمانوں پر اس عہد کی پاس داری لازم ہے"۔ پھر آپ نے اس عہد پر اکابر صحابۂ کرام خالد بن ولید، عمرو بن عاص، عبدالرحمٰن بن عوف اور معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہم کو گواہ بنایا"۔ (الفاروق: ص:292 بحوالہ طبری)

حدیثِ پاک میں ہے:

"یاد رکھو! جو شخص مسلمان ریاست کے پابندِ آئین وقانون یعنی "مُعاہِد" غیر مسلم کو قتل کرے، جسے اللہ اور اس کے رسول نے تحفظ کی ضمانت دی ہے، تو وہ اللہ کے عہد کی بے حرمتی کرتا ہے، ایسا شخص جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا"۔ (ترمذی:1403)

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ذمّی کے بدلے میں ایک مسلمان کو قصاص میں قتل کر دیا اور فرمایا: میں سب لوگوں کے مقابلے میں اس بات کا زیادہ حقدار ہوں کہ اپنے عہد کو پورا کروں"۔ (سُنَنِ دارقطنی:3233)

سانحۂ لاہور کی ایک اور وارننگ یہ ہے کہ ہمارے سلامتی کے اداروں کے پاس جذباتی ہجوم کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، اسی صلاحیت کے فُقدان کے باعث دو انسانی جانیں اذیت رسانی کے بعد نذرِ آتش کی گئیں اور اَملاک کو نقصان پہنچایا گیا۔ لاہور پولیس کے سربراہ نے اس کا یہ عُذر پیش کیا کہ اگر ہم ایکشن لیتے تو اور زیادہ نقصان ہوتا۔ پس اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ایسے حالات میں ترقی یافتہ اَقوام کی پولیس یا سیکورٹی کے ادارے کیا حکمتِ عملی اختیار کرتے ہیں، جب دنیا میں ہر مسئلے کا حل تلاش کیا جاتا ہے، تو ہمارے اداروں کے پاس بھی اس کی واضح حکمتِ عملی ہونی چاہیے۔ ہماری ناکامی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ میڈیا یک طرفہ طور پر سیکورٹی اداروں کے پیچھے لگ جاتا ہے اور ایک ہی فوٹیج کو بار بار پیش کر کے اشتعال پیدا کیا جاتا ہے اور پولیس کوئی اقدام کرنے کی بجائے دفاع میں چلی جاتی ہے، جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں پوری ریاستی قوت سلامتی کے اداروں کی پشت پر کھڑی ہوتی ہے۔

23 مارچ 2015ء

دوبار یا دس بار سزائے موت

بعض اوقات آپ ٹیلی ویژن پر سنتے ہیں یا اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ عدالت نے کسی دہشت گرد یا قاتل کو دوبار یا دس بار سزائے موت دی۔ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون ہیں، انسانوں کی اجماعی یا اکثریتی دانش کا شاہ کار ہیں۔ یہ محض علامتی چیز ہے، ورنہ درحقیقت دنیا میں سزائے موت صرف ایک ہی بار دی جاسکتی ہے اور ایک ہی بار دی جاتی ہے، ایک سے زائد بار سزائے موت دینا ممکن ہی نہیں ہے۔ سزائے موت میں تداخُل (Merger) بھی نہیں ہوسکتا۔ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ قاتل اور مجرم دندناتے پھرتے ہیں، اکثر صورتوں میں وہ قانون کی گرفت میں آتے ہی نہیں ہیں، قانون کو جُل دے جاتے ہیں اور اگر آبھی جائیں تو بچ نکلنے کے ہزار حیلے ہیں۔ قانون بے بس ہوجاتا ہے، دولت اور اثر ورسوخ غالب آجاتا ہے، کبھی انصاف قابلِ فروخت جنس بن جاتا ہے، کہیں دہشت، دھونس اور بربریت کا راج ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں مجرم قانون اور قانون نافذ کرنے والے اداروں سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوتے ہیں، الغرض عیاری و مکّاری اور حیلہ گری ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر اس نظامِ کائنات کو اسی دنیا تک محدود سمجھا جائے، تو ماننا پڑے گا کہ معاذ اللہ! قدرت نے انصاف نہیں دیا اور انصاف نہیں کیا، تو پھر کیا مظلوم کے لیے چارہ گری اور داد رسی کا کوئی دروازہ کھلا نہیں رہا، کوئی راستہ نہیں بچا، ایسا نہیں ہوسکتا، قدرت ہرگز ظالم نہیں ہوسکتی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) ”(قیامت کے دن) اللہ فرمائے گا: میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، میں تم کو پہلے ہی (عذاب) کی وعید سنا چکا ہوں، میرے سامنے میرے فرمان میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی اور میں (اپنے) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں“۔ (قٓ:29-28)

(۲) ”یہ تمہارے اُن اعمال کی (سزا) ہے، جو تم نے پہلے اپنے ہاتھوں سے کیے تھے اور بے شک اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے“۔ (آلِ عمران:182)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ”مظلوم کی فریاد سے ڈرو، کیونکہ اُس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے“۔ (بخاری:2448)

پس ثابت ہوا کہ دنیا میں حقیقی عدل ممکن ہی نہیں ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک دہشت گرد نے خودکش حملہ کرکے یا بم بلاسٹ کرکے سو انسانوں کی جان لے لی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سب بے قصور ہوں، بچوں کا بے قصور ہونا تو ہر قسم کے شک وشبہے سے بالاتر ہے۔ اور بعض اوقات کوئی انتہائی نیک اور پارسا آدمی نشانہ بن جاتا ہے، آئے دن علماء، پروفیسر اور ڈاکٹر قتل کیے جاتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں تو قاتل اور دہشت گرد قانون کی گرفت میں آتے ہی نہیں ہیں اور بالفرض آ بھی جائیں اور سزائے موت بھی دے دی جائے، تو کیا ایک مجرم اور ایک بے قصور پارسا انسان کی جان برابر ہوسکتی ہے، یا ایک جان سو جانوں کا بدل ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(۱) ”کیا اندھا اور بینا برابر ہیں یا اندھیرے اور روشنی برابر ہیں“۔ (الرعد:16)

(۲) ”کیا مومن کسی کافر کی مثل ہوسکتا ہے، (ہرگز نہیں) وہ برابر نہیں ہیں“۔ (السجدہ:18)

(۳) ”کیا عالم اور جاہل برابر ہیں“۔ (الزمر:9)

(۴) ”کہہ دیجیے! ناپاک اور پاک برابر نہیں ہیں، خواہ تمہیں ناپاک کی کثرت (کتنی ہی) بھلی لگے“۔ (المائدہ:100)

(۵) ”جنتی اور جہنمی برابر نہیں ہوسکتے“۔ (الحشر:20)

(٦) ”بھلا جو شخص منہ کے بَل اوندھا چلے، وہ زیادہ ہدایت یافتہ ہے یا وہ جو صراطِ مستقیم پر سیدھا چلا جا رہا ہے“۔(الملک:22)

الغرض اس طرح کی آیات بے شمار ہیں۔

پس حقیقی عدل صرف آخرت ہی میں ممکن ہے کہ ظالم، جابر، دہشت گرد اور قاتل ہر آن جیے گا اور ہر آن مرے گا۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(١) ”بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا، ہم عنقریب انہیں آگ میں جھونک دیں گے، جب اُن کی کھالیں جل کر پک جائیں گی، ہم ان کی کھالوں کو دوسری کھالوں سے بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کو (مسلسل) چکھتے رہیں“۔(النسآء:56)

(٢) ”بے شک دوزخ (مجرموں کی) گھات میں ہے، (وہ) سرکشوں کا (آخری) ٹھکانا ہے، جس میں وہ مدتوں رہیں گے، اس میں کھولتے ہوئے پانی اور (جہنمیوں کے زخموں کی) پیپ کے سوا نہ وہ ٹھنڈک پائیں گے، نہ کوئی مشروب، یہ اُن (کے جرائم کا) پورا پورا بدلہ ہے“۔(النبا:25-21)

(٣) ”تھور کا درخت، گنہگاروں کا کھانا ہے، جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹوں میں جوش مارے گا، جیسے کھولتا ہوا پانی جوش مارتا ہے، (اللہ فرمائے گا!) اس کو پکڑو اور اس کو گھسیٹتے ہوئے جہنم کے وسط میں لے جاؤ، پھر اس کے سر کے اوپر کھولتے ہوئے پانی کا عذاب ڈالو (اور اسے کہو کہ) چکھ، تو دنیا میں اپنے تئیں بہت معزز و مکرم بنتا تھا“۔(الدخان:49-43)

جنت کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

(٤) ”یہ اچھی مہمانی ہے یا تھور کا درخت، بے شک ہم نے اس کو ظالموں کے لیے عذاب بنایا ہے، یہ ایسا درخت ہے جو دوزخ کی جڑ سے نکلتا ہے، اُس کے شگوفے شیطانوں کے سروں کی طرح ہیں، وہ ضرور اس درخت سے کھائیں گے، سو اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر بے شک ان کے لیے پیپ ملا ہوا گرم پانی ہوگا“۔(الصّٰفّٰت:67-61)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

(۱) ''ایک (بے قصور) مسلمان کے قتلِ (ناحق) کے مقابلے پوری کائنات کی بساط کو لپیٹ دینا اللہ تعالیٰ کے نزدیک معمولی بات ہے''۔ (ترمذی:1395)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قتلِ ناحق کتنا سنگین جرم ہے۔

(۲) ''اگر آسمانوں اور زمینوں کے سب رہنے والے ایک مومن کے قتلِ (ناحق) میں شریک ہوں، تو اللہ سب کو اوندھے منہ جہنم میں ڈالے گا''۔ (ترمذی:1398)

پس ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ جب سچا اور کھرا انصاف ہوگا، کوئی ظالم اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل کی گرفت سے بچ نہیں پائے گا اور کوئی مظلوم انصاف سے محروم نہیں رہے گا۔ لہٰذا ظالموں کو وعید ہے کہ اس یومِ حساب سے ڈریں اور ظلم سے باز آجائیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''جس دن سب لوگ ظاہر ہوں گے، ان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہوگی، (اعلان ہوگا) آج کس کی بادشاہت ہے، صرف اللہ کی، جو واحد سب پر غالب ہے، آج ہر شخص کو اس کی کمائی کا صلہ دیا جائے گا، آج کوئی ظلم نہیں ہوگا، بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے اور (اے رسول!) آپ اُن کو بہت قریب آنے والے دن سے ڈرایئے، جب وفورِ دہشت سے دل منہ کو آجائیں گے، لوگ غم کے گھونٹ بھرے ہوں گے، (اُس دن) ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا نہ ایسا سفارشی، جس کی سفارش قبول کی جائے، وہ اللہ نگاہوں کی خیانت اور دل کے چھپے رازوں کو خوب جانتا ہے اور اللہ ہی حق کے ساتھ فیصلہ فرماتا ہے''۔ (المؤمن:16 تا 20)

جب ہم قرآن وسنّت کی روشنی میں آخرت کے حقیقی نظامِ عدل کی بات کرتے ہیں، تو ہمارے لبرل اور روشن خیال دانشور طنز کرتے ہیں کہ مفلس ونادار اور ظلم سے دبے اور پسے ہوئے طبقات کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے آمادۂ عمل کرنے کی بجائے، انہیں مستقبل کے سہانے خواب دکھائے جاتے ہیں، یہ بے عملی اور کم ہمتی کا راستہ دکھانے کے مترادف ہے اور یہ کہ غریبوں کو طفل تسلیاں دے کر دینی طبقات اور علماء سرمایہ داروں اور استحصالی

عناصر کے ایجنٹ کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ہماری گزارش ہے کہ حضورِ والا! ایسا ہرگز نہیں ہے، جزا و سزا، جنت و جہنم اور عقیدۂ آخرت پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن ہم اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو آمادہ کرتے ہیں کہ ظلم کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیں، ظالم کی شوکت توڑ دیں، مظلوم اور اپنے حقوق سے محروم طبقات اپنے حق کے حصول کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس ساری تگ و تاز کو قرآن و حدیث میں ''تَغییرِ منکَرات'' سے تعبیر فرمایا ہے اور قرآن نے یہ بھی تو کہا ہے:

''بے شک اللہ اُس وقت تک کسی قوم کی حالت تبدیل نہیں فرماتا، جب تک وہ خود اپنی حالت کو بدلنے پر آمادہ نہ ہو''۔ (الرعد:11)

اور ظلم و استحصال کو رفع و دفع کرنا بجائے خود بہت بڑی سعادت اور نیکی ہے، اس کا ثمرہ دنیا میں فراوانی عدل کی صورت میں اور آخرت میں جزا و انعام کی صورت میں ضرورت ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ خود اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اُسے ظالموں کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہے''۔ (بخاری:2442)

اور رسول اللہ ﷺ نے ظالم کو ظلم سے روکنے کو بھی اُس کی نصرت سے تعبیر فرمایا ہے، ارشاد ہوا:

''اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! مظلوم کی مدد کی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ اسے ظلم سے بچایا جائے، مگر ہم ظالم کی کیسے مدد کریں؟۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم ظلم کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ کو روک دو''۔ (بخاری:2444)، کیونکہ یہی اس کی حقیقی مدد ہے کہ اس طرح تم اسے جہنم کی دائمی سزا سے بچالو گے۔

28 مارچ 2015ء

اَخلاقی اَقدار کا فقدان

28 مارچ 2015ء کو ایوانِ صدر اسلام آباد میں ''اَخلاقی اَقدار کا فقدان اور کرپشن۔ تدارک اور علاج'' کے عنوان پر صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان جناب ممنون حسین نے پاکستان کے سرکردہ اٹھائیس علماء کے ساتھ ایک نشست منعقد کی۔ اپنی تمہیدی گفتگو میں انہوں نے پاکستان کو درپیش مسائل کا ایک تجزیہ اپنے انداز میں پیش کیا، جس میں کرپشن کے ناسور کو قومی معاشی خود کفالت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا اور بتایا کہ حکومت کو اپنی تمام تر مساعی اور اخلاص کے باوجود اِس مقصد کو حاصل کرنے میں دشواری پیش آرہی ہے اور سرِ دست ہمارے پاس سابق قومی قرضوں سے عہدہ برا ہونے کی تدبیر مزید قرضے لینا ہی رہ گئی ہے۔ ان کے بقول ایک تخمینے کے مطابق سالانہ ایک ہزار ارب کی کرپشن ہورہی ہے، جو ہماری معاشی خود کفالت کے لیے ایک ناسور ہے۔ انہوں نے اپنے بیرونی دوروں کے تجربات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ہر ملک اپنے تعلیمی نصاب میں اپنی قوم کے بچوں کو اپنی قومی اور ملّی تاریخ سے آگہی دیتا ہے، جس سے اُن کے اندر حبُّ الوطنی، قومی وقار اور اعتماد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جبکہ ہمارے بچوں کو تعلیمی نصاب کے ذریعے اپنی تاریخ سے کوئی آگہی عطا نہیں کی جاتی۔ یہ تاریخ کا شعور ہی ہے جو نئی نسل کو اپنے ماضی سے جوڑے رکھتا ہے اور ایک پہچان عطا کرتا ہے اور اُسی کے نتیجے میں آئندہ کے قومی اور ملّی نصب العین کا تعین کیا جاتا ہے۔

صدرِ پاکستان کے ساتھ نشست کا موضوع کرپشن کا ناسور اور اَخلاقی اَقدار کا فقدان

تھا۔ ہمارے ہاں مسائل اور ملّی امراض کا ادراک تو ہر ایک کو ہے، صرف اندازِ بیان اپنا اپنا ہوتا ہے، لیکن اس کا قابلِ قبول اور قابلِ عمل حل کسی کو سجھائی نہیں دیتا اور زیادہ بہتر تعبیر یہ ہے کہ ہمارا "نظمِ اجتماعی" اصلاحِ احوال کے لیے پہلا قدم اٹھانے یا پستی سے بلندی کی طرف یوٹرن لینے کے لیے بھی آمادہ نظر نہیں آتا۔ لہٰذا یہ ساری کانفرنسیں، سیمینارز یا مجالسِ فکر محض ذہنی مشق (Intellectual Excercise) بن کر رہ جاتی ہیں۔ ایک اور المیہ یہ ہے کہ جنہیں ملّی درد ہے اور قومی مسائل و مصائب کا ادراک ہے، ان کے پاس کوئی تبدیلی لانے کا اختیار نہیں ہے اور جن کے پاس اختیار ہے، انہیں ان جھمیلوں میں پڑنے کی فرصت ہی نہیں ہے، پس ہمارا قومی تناظر اس شعر کی حقیقی تصویر و تعبیر ہے کہ:

درد مِنّت کشِ دوا نہ ہوا
یہ بھی اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

مسیحیت کا تصور تو یہ ہے کہ انسان موروثی طور پر یعنی حضرت آدم و حوّا علیہما السلام سے پاپ (Sin) لے کر پیدا ہوتا ہے اور جب چرچ میں اُس کا بپتسما (Baptise) کیا جاتا ہے، تو وہ مسیحی بن جاتا ہے اور پاک ہو جاتا ہے۔ مسیحی عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صلیب پر چڑھ کر سب کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے، عربی میں بپتسما کو "اصطباغ" کہتے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے مطابق یہ مسیحیت کی ایک مقدس رسم ہے، جس میں مقدس باپ، مقدس بیٹا اور روح القدس کے نام پر بچے کو پانی میں ڈبویا جاتا ہے یا اس کے سر پر پانی ڈالا جاتا ہے۔ ہندو مذہب میں "آواگون" یا "انتقالِ ارواح" کا تصور ہے کہ انسان کا موجودہ "جنم" اُس کے پچھلے "جنم" کے کرتوتوں کی صورتِ جزا ہے یا سزا ہے، اسے "تناسخِ ارواح" یا (Transmigrationism) کہتے ہیں۔

اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر کوئی پاپ یا گناہ لے کر پیدا نہیں ہوا۔ ہر انسان اللہ تعالیٰ کی فطرتِ سلیم پر پیدا ہوتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "سو آپ تمام باطل

نظریات سے لاتعلق ہو کر اپنے آپ کو دینِ حق پر قائم رکھیں، (اے لوگو!) اللہ کی فطرتِ (سلیم) وہی ہے، جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے، یہی صحیح دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''۔ (الروم:30)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''ہر بچہ دینِ فطرت (ملّتِ اسلام) پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں، جیسے جانور کا بچہ بالعموم صحیح سالم پیدا ہوتا ہے، کیا تم اُس میں کوئی کن کٹا یا مقطوع الاعضاء پاتے ہو، پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم چاہو سورۂ روم، آیت:30 پڑھو''۔ (مسلم:3658)

اس حدیث کا مدّعا یہ ہے کہ تخلیق کے حوالے سے عام قانونِ قدرت یہی ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت سے بعض استثنائی صورتیں بھی ہوتی ہیں۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ماں باپ اگر فطرتِ سلیم کے حامل ہیں تو بچے کی تربیت بھی اُسی نہج پر کرتے ہیں اور اگر اُن میں کوئی بگاڑ پیدا ہو چکا ہے تو پھر بچے کے اَخلاق واَطوار میں بگاڑ پیدا ہونا بعید اَز امکان نہیں ہے، کیونکہ والدین ہی بچے کی پہلی تربیت گاہ ہوتی ہیں۔ ہم اَبَوَین (Parents) کو بطورِ استعارہ وسیع تر معنی میں بھی لے سکتے ہیں، یعنی ماحول خیر سے معمور ہو یا شر سے آلودہ بہرصورت بچے کی نشوونما، ذہنی ساخت وپرداخت اور مزاج پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں جس طرح آج طبعی اور حسی اعتبار سے ماحول کی آلودگی (Environmental Pollution) کا رونا رویا جاتا ہے، اگر ہم غور سے جائزہ لیں تو اَخلاقی اور دینی ماحول (Moral & Ethical Environment) کی آلودگی اور خبیث اثرات اس سے بھی زائد ہیں، جس سے نشوونما پاتے ہوئے ناپختہ ذہن کے بچے کو بچانا کارِ دشوار ہے۔ اِس اَخلاقی ماحول میں گھر کا ماحول، گردوپیش کا ماحول، اسکول اور درس گاہ کا ماحول سب شامل ہیں اور پھر موبائل کے اندر مستور آفتیں، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن، اخبارات اور چاروں طرف پھیلے ہوئے نیم عریاں اشتہارات کی آلودگی، اسے دوآتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیتی ہیں۔ انڈین ٹیلی ویژن چینلز کی غیر قانونی نمائش، جو کیبل کے

ذریعے گھر گھر پہنچ چکی ہے، کی پیدا کردہ اَخلاقی تباہی اس سے سوا ہے۔اب ہمارے ہاں ریاست، حکومت اور معاشرے کی طرف سے اِن اثراتِ بد سے نئی نسل کے بچاؤ کا کوئی اہتمام نہیں ہے۔ایک وقت تھا کہ کہا جاتا تھا مدرسہ اور محراب و منبر کی گرفت بڑی مضبوط ہے اور اس کا دائرۂ اثر سب سے زیادہ ہے، مگر اب جدید میڈیا کے پھیلاؤ اور دائرۂ اثر کے مقابلے میں یہ سمندر کے مقابلے میں قطرہ اور آفتاب کے مقابلے میں ذرہ معلوم ہوتے ہیں۔

منظم، مہذب اور متمدن معاشروں میں ریاست وحکومت ضابطہ بندی یعنی Regulator کا رول ادا کرتی ہے، مگر ہمارے ہاں آزاد الیکٹرونک میڈیا کی گرفت اتنی مضبوط اور پھیلاؤ اس قدر ہمہ گیر ہو چکا ہے کہ حکومتیں کمزور اور بے بس نظر آتی ہیں، میڈیا کی یلغار کے آگے تھر تھر کانپتی نظر آتی ہیں، سو اِن سے کسی اصلاحِ احوال کی توقع رکھنا پنجابی زبان کے الفاظ میں ''سنڈے کو چونے'' یعنی ''بھینسے سے دودھ نکالنے'' کے مترادف ہے، یعنی عملاً ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔

ایسے پسِ منظر اور تناظر میں ہمارے معاشرے میں غیر سرکاری سطح پر تعمیرِ اخلاق کی فضا پیدا کرنے اور تخریبِ اخلاق کے کانٹوں کو چننے کے لیے ایک اجتماعی تجدیدی تحریک کی ضرورت ہے۔اہلِ علم، اہلِ کردار اور اہلِ دانش کی دینی و ملّی ذمے داری ہے کہ وہ اس میں اپنا حصہ ڈالیں اور اہلِ ثروت کی ذمے داری ہے کہ وہ اتنے مالی وسائل فراہم کریں کہ اَخلاق باختگی کے ماحول سے بچا کر بچوں کو مثبت اور تعمیری مسابقت اور علمی و تفریحی سرگرمیوں کی طرف راغب کیا جائے، اُنہیں اُن کے ضمیر اور ذہنی ساخت میں اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سلیم کا جو خمیر رکھا ہے اور جو جوہرِ مستور (Talent) ودیعت فرمایا ہے، اُسے ابھارنے اور نکھارنے کے مواقع پیدا کیے جائیں، ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے، تحریر و تقریر اور کھیلوں کے مقابلے منعقد کیے جائیں اور بڑے بڑے انعامات رکھے جائیں۔میڈیا، کرکٹرز، رقاصوں اور مغنیات (Singers) کے مقابلے میں انہیں دینی، ملّی اور قومی ہیروز کے طور پر پیش کرے تو امید کی جاسکتی ہے کہ اگر ہم خیرِ غالب نہیں تو

خیرِ کثیر کا ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''قیامت کے دن تم میں سے اُس شخص کا مقام مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہوگا اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہوگا، جس کے اَخلاق سب سے اچھے ہوں اور قیامت کے دن اُس شخص کا مقام مجھ سے سب سے زیادہ دور ہوگا اور وہ مجھے سب سے زیادہ ناپسند ہوگا، جو متکبر ہے، بلاضرورت باتونی ہے اور منہ پھاڑ کر اور باچھیں کھلا کر طویل گفتگو کرتا ہے''۔(صحیح مسلم:2018)

یعنی اس کا اندازِ کلام متکبرانہ اور فواحش و منکرات پر مشتمل ہوتا ہے اور اُس میں تکلُّف اور رِیا کا غلبہ ہوتا ہے۔

31 مارچ 2015ء

اپریل2015ء

پاکستان کی مبہم خارجہ پالیسی

پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ موجودہ حکومت کو اقتدار میں آئے دو سال ہونے کو ہیں لیکن اب تک کوئی مستقل وزیرِ خارجہ مقرر نہیں ہوسکا، غیر منتخب مشیروں سے کام چلایا جارہا ہے۔ پارلیمنٹ سے حکومت گریزاں رہتی ہے، اس لیے پارلیمنٹ میں اہم پالیسی اُمور پر بھرپور بحث ومباحثہ نہیں ہوتا۔ وزراء اپنے آپ کو پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتے، اس لیے اکثر فورم ناتمام رہتا ہے۔ صرف دھرنوں کے دوران کہ جب حکومت اور خود پارلیمنٹ کے وجود کو خطرہ درپیش تھا، وزیر اعظم بھی ایک سے زائد بار پارلیمنٹ میں نظر آئے اور اس پر چوہدری اعتزاز احسن نے ناخلف ونافرمان بیٹے کے ماں کو یاد کرنے پر ماں کی طرف سے تھانیدار کا شکریہ ادا کرنے کی پھبتی کسی اور اس استعارے میں تھانیدار اہلِ دھرنا تھے۔

عام طور پر خارجہ پالیسی اور بین الممالک تعلقات میں بعض حساس معاملات پس پردہ زیرِ بحث آتے ہیں، بلاضرورت منظرِ عام پر نہیں لائے جاتے، لیکن ہمارے حکمران ماشاءاللہ اس حکمت وبصیرت سے بالعموم عاری ہوتے ہیں، کسی مسئلے کا فوری کریڈٹ لینے کے لیے اُسے طشت اَز بام کردیتے ہیں اور پھر جب منفی ردِّ عمل سامنے آتا ہے تو چوکڑی بھول جاتے ہیں۔ سعودی عرب/یمن کے معاملے میں بھی یہی ہوا کہ شاہ سلیمان بن عبدالعزیز کا وزیر اعظم نواز شریف کو فون آیا اور اسے میڈیا میں نشر کردیا گیا، اگلے روز وزیر اعظم سیکریٹریٹ میں ایک اجلاس دکھایا گیا جس میں وزیر اعظم کے علاوہ چیف آف آرمی اسٹاف، چیف آف ایر اسٹاف، وزیر داخلہ اور خارجہ امور کے ذمے دار دکھائے گئے،

جس سے یہ واضح پیغام دیا گیا کہ سعودی بادشاہ کی جانب سے فوجی امداد کی درخواست دی گئی تھی اور اس کی عملی صورت گری کے لیے یہ اجلاس منعقد ہوا۔ یہ تاثر بھی دیا گیا کہ ایک اعلیٰ سطحی وفد فوری طور پر سعودی عرب کا دورہ کرے گا۔ اس کے بعد سیاسی جماعتوں اور میڈیا کی طرف سے منفی ردِ عمل آنا شروع ہوا اور حکومت آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔

یہ تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ اپنی معاشی مجبوریوں اور پٹرول کی ضروریات کے سبب پاکستان ہمیشہ کسی نہ کسی طور پر سعودی عرب کے زیرِ اثر رہتا ہے اور موجودہ حکمرانوں کی عقیدت و وفا کا رشتہ اس سے بھی سوا ہے اور اس کی وجہ سب کو معلوم ہے۔ کچھ عرصہ قبل سعودی عرب پاکستان کو ڈیڑھ ارب ڈالر نقد امداد بھی دے چکا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک کھلا راز ہے کہ کسی نہ کسی درجے کا فوجی تعاون بھی، خواہ مسلح افواج کے ٹروپس کی شکل میں ہو یا فوجی ٹریننگ کی صورت میں، سعودی عرب کو بالعموم حاصل رہتا ہے۔ ہمارے بعض ریٹائرڈ اور حاضر سروس فوجی جوان اور افسران بھی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ معمول کی صورتِ حال ہوتی ہے، اس لیے اسے ایک مسلّمہ حقیقت یا روایت کا درجہ حاصل ہے اور یہ کبھی زیرِ بحث نہیں آتی۔

لیکن موجودہ صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔ سعودی عرب نے اپنے قومی مفادات کے تحت یمن میں باقاعدہ فوجی مداخلت شروع کر رکھی ہے اور تا حال یہ فضائی حملوں (Air Attack) تک محدود ہے، لیکن سب جانتے ہیں کہ جنگ شروع کرنا تو اپنے اختیار میں ہوتا ہے، مگر اس کا اختتام بعض اوقات اپنے اختیار میں نہیں رہتا۔ خاص طور پر کسی ملک میں داخلی بغاوت یا گوریلا جنگ کی صورت میں سلسلہ طوالت ہی اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ سعودی عرب کی سرحد یمن کے ساتھ ملحق ہے اور اسے یقیناً خدشہ ہوگا کہ خدانخواستہ یہ آگ اس کے گھر تک بھی پہنچ سکتی ہے، خواہ اس کی صورت کوئی بھی ہو۔ لہٰذا سعودی عرب یمن کی خانہ جنگی میں اپنے علاقائی اور قومی مفاد (Stake) کے حوالے سے متفکر ہے۔ سعودی عرب کا ایک تضاد یہ ہے کہ بعض ممالک میں وہ ریاست کے خلاف باغیوں یا حریت

پسندوں کی مادّی واخلاقی مدد بھی کرتا ہے، لیکن اب یہی ''جہادی'' یا آمادۂ بغاوت طبقات بٹ چکے ہیں، ان کے اپنے اپنے گروپ اور اپنا اپنا ایجنڈا ہے۔ اور ایک گروپ دولتِ اسلامیہ عراق وشام یعنی داعش (ISIS) تو خلافتِ اسلامیہ کا مدعی ہے اور وہ تمام مسلم حکمرانوں کا مخالف ہے۔ القاعدہ کا ایجنڈا الگ ہے اور النصرہ شام میں سعودی عرب کے زیرِ اثر مصروفِ پیکار ہے۔ آج کل سعودی علماء، حرمین طیبین کے ائمہ اور سرکاری دارالافتاء کے سربراہ داعش اور القاعدہ کو خارجی تکفیری اور گمراہ ٹولہ قرار دے رہے ہیں۔ لیکن جب تک انہی نظریات کے حامل گروپ صرف پاکستان اور افغانستان میں مصروف پیکار تھے، تو سعودی عرب سے یہ فتوے جاری نہیں ہوئے تھے، بلکہ کسی حد تک سرکاری یا غیر سرکاری طور پر ان کے لیے پسندیدگی کا گوشہ موجود تھا۔

پاکستان کی سیاسی جماعتیں بھی تضاد کا شکار ہیں، اوّلاً تو انہوں نے حکومت کی پالیسی اور یمن کی جنگ میں بلاواسطہ یا بالواسطہ حصہ لینے کی شدت سے مخالفت شروع کر دی، مگر اب ذومعنی بیانات دیے جا رہے ہیں۔ جنگ میں ملوّث ہونے کی مخالفت کا تاثر بھی دیا جاتا ہے اور سعودی عرب سے محبت اور قریبی دوستی کا دعویٰ بھی کیا جاتا ہے، یعنی پیٹ کھاتا ہے اور آنکھیں شرماتی ہیں، طے نہیں کر پا رہے کہ دل کا فیصلہ قبول کریں یا شکم پروری کو ترجیح دیں، علامہ اقبال نے فرمایا:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا، ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

سو زیادہ احتیاط پر مبنی مشورہ یہ ہے کہ ملک کے پارلیمانی سیاسی قائدین بند کمرے میں (In Camera) اجلاس منعقد کریں اور اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد شخصی تعلقات اور ذاتی پسند و ناپسند سے بالاتر ہو کر دینی، ملّی اور ملکی وقومی مفاد میں فیصلے کریں۔

سعودی عرب کے دفاع یا داخلی سلامتی کے لیے پاکستان کا دفاعی تعاون تو شاید کسی نہ

کسی درجے میں سب یا اکثر سیاسی جماعتوں کو قابلِ قبول ہوگا۔ مگر سعودی عرب کی خاطر یمن کی خانہ جنگی میں براہِ راست شامل ہونا پاکستان کے لیے منفی نتائج کا حامل ہوسکتا ہے اور اس سے قریبی پڑوسی ایران کے ساتھ بھی تعلقات کا متاثر ہونا ناگزیر ہے، کیونکہ ایران اپنے آپ کو مشرقِ وسطیٰ کا بڑا Stakeholder سمجھتا ہے اور وہ وہاں کے تنازعات میں بالواسطہ طور پر ملوّث بھی ہے اور تیل وگیس کے وافر ذخائر کی وجہ سے وہ اس کا متحمل بھی ہوسکتا ہے، یعنی Afford کرسکتا ہے۔ جبکہ ہماری معاشی حالت کمزور ہے اور ابھی ہم معاشی خود کفالت کی منزل میں داخل نہیں ہوئے۔ حال ہی میں ایران کی قومی سلامتی کے ایک سابق مشیر نے عظیم تر ایران کی بات کی ہے، جس میں مشرقِ وسطیٰ کا بڑا حصہ شامل ہے۔

اس لیے بہتر یہ ہے کہ پاکستان کو چاہیے کہ مسئلے کا حصہ بننے اور الجھاؤ پیدا کرنے کی بجائے اُس کے حل کا حصہ بنے اور اس سلسلے میں ایران سے روابط قائم کرکے کوئی درمیان صورت نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ بعض اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ اس موقع پر ''تحفظِ حرمین طیبین'' کے نام سے تنظیمیں وجود میں آرہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ حضرات وہاں جاکر جہاد کریں گے، کیا حرمین طیبین پر کہیں سے حملے کی دھمکی ملی ہے؟۔ الغرض ہمیں حرکت وعمل کا ہر وقت کوئی تازہ عنوان چاہیے۔ پرائیویٹ جہاد کے دروازے تو اب ہر وقت اور ہر جگہ کھلے ہیں، اب تو اخبارات میں امریکی طالبان، برطانوی طالبان، فرانسیسی طالبان اور مختلف الاقوام طالبان کے نام بھی پڑھنے کو ملتے ہیں اور حرمین طیبین کے نام میں تو بڑی جاذبیت اور جذباتیت کا سامان موجود ہے۔ سعودی عرب کو ایک ریکروٹنگ آفس کھول دینا چاہیے، مگر ایسا نہ ہو کہ وہاں جاکر Back Fire ہوجائے، کیونکہ اس جن کو ہر وقت کوئی کام چاہیے۔ سعودی عرب کی حکومت اور وہاں کے علماء سے نہایت احترام کے ساتھ گزارش ہے کہ حضورِ والا!:

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

آپ اگر پوری اُمتِ مسلمہ کے لیے عقیدت واحترام کا مرکز بننا چاہتے ہیں تو ایک خاص مسلک اور مکتبۂ فکر کی پروموشن کو ترک کر دیجیے۔ حرمین طیبین میں آپ نے ہر ملک سے جو ایک خاص مسلکی ومذہبی نظریے کے حامل مراقبین (CID) کی فوج ظفر موج بھرتی کر رکھی ہے، اُن کے حصار سے نکلیے۔ یہی لوگ ہیں جو آپ اور اُمّت کے دیگر مذہبی طبقات میں دوریاں بلکہ منافرت پیدا کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ کم از کم عالمی سطح پر ''اہل السنۃ والجماعۃ'' ہی کو کسی برانڈ کے بغیر قبول کر لیجیے تاکہ آپ کے لیے ہر ایک کے دل میں احترام کے جذبات موجزن ہوں۔

چند سال پہلے ملک عبداللہ نے سعودی عرب میں ایک بین المسالک (Intra Faith) مکالمہ منعقد کیا، اس میں پاکستان، بھارت، بنگلا دیش اور ایران تک سے اہلِ حدیث، دیوبندی، جماعتِ اسلامی اور اہلِ تشیُّع کے علماء کو شرکت کی دعوت دی، لیکن اس پورے خطے میں اہل السنۃ والجماعۃ کو مکمل طور پر نظر انداز کیا۔ سعودی سفارت خانے اور قونصلیٹ کے اربابِ اقتدار کو اس جانب بھی توجہ دینی چاہیے۔

6 اپریل 2015ء

کرکٹ: پاکستان کے قومی مزاج کا عکاس

ہمارا قومی مزاج جذباتیت، عدمِ توازن، خواہشات اور مفروضات کا غیر معقول امتزاج ہے۔ ہم حقیقت پسندی سے کوسوں دور خوابوں کی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔ ہماری محبتیں اور نفرتیں بلبلوں کی طرح ابھرتی اور بیٹھتی رہتی ہیں۔ کرکٹ ہمارے قومی مزاج کا صحیح عکاس اور آئینہ دار ہے۔ ایک وقت تھا کہ ہم ہاکی کے بے تاج بادشاہ تھے، اولمپک، ورلڈ کپ اور ایشین کپ کی چمپین شپ کا تاج ہمارے سر پر سجا ہوا تھا، چمپینز ٹرافی پر ہمارا اجارہ تھا، بلکہ چمپینز ٹرافی کے محرک ہی ہم تھے۔ ہر کھلاڑی سپر سٹار تھا اور ان کی جگہ لینے والے (Challenger) بھی قطار میں موجود تھے۔ اُس وقت کے انٹرنیشنل ہاکی فیڈریشن کے صدر رینی فرینک نے کہا تھا کہ:

''دنیا کی کسی ٹیم میں ایک ہاکی آرٹسٹ ہے، کسی میں دو، کسی میں تین اور کسی میں چار پانچ آرٹسٹ ہیں، لیکن پاکستانی ٹیم میں گیارہ کے گیارہ کھلاڑی آرٹسٹ ہیں''۔

مگر پھر بوجوہ کامیابی ہم سے روٹھ گئی اور ایک ایک کر کے سارے اعزازات ہم سے چھن گئے۔ آج ہاکی کے شعبے میں ہماری صورتِ حال یہ ہے کہ:

ع ''ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے''

یہی صورتِ حال اسکواش کی تھی، برسہا برس تک جہانگیر خان اور جان شیر خان اسکواش کے آسمان پر آفتاب بن کر چھائے رہے، پھر یہ شمع ایسی گُل ہوئی کہ آج تک روشن نہ ہو سکی۔ مگر ہم نے ہاکی اور اسکواش اسٹارز کو وہ مقام کبھی نہیں دیا، جو کرکٹ اسٹارز کو دیتے رہے

ہیں۔ دراصل سارا مسئلہ ٹیلی ویژن اسکرین کی جادوگری اور کشش کا ہے۔

کرکٹ چونکہ ہمارے آقاؤں کا کھیل رہا ہے، اس نے برطانیہ میں جنم لیا اور پھر جہاں جہاں ان کی نوآبادیات (Colonies) یا مفتوحہ ممالک تھے، وہاں رائج رہا، جیسے پاکستان، بھارت، بنگلادیش، سری لنکا، جنوبی افریقا، زمبابوے، ویسٹ انڈیز، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا وغیرہ۔ آئرلینڈ اور کینیڈا بھی اس میں کبھی کبھار شامل ہوتے رہے ہیں اور تازہ ترین انٹری افغانستان کی ہے۔ متحدہ عرب امارات کی ٹیم حال ہی میں وجود میں آئی، لیکن یہ وہاں کے عرب شہریوں پر مشتمل نہیں ہے بلکہ پاک و ہند ہی کے نوجوان ہیں، جن کے خاندان وہاں روزگار کے سلسلے میں مقیم ہیں۔

کرکٹ میں ہم نے بحیثیتِ ٹیم کبھی کبھی جوہر دکھائے، کبھی نہ کبھی تمام کرکٹ کھیلنے والے ممالک کی ٹیموں کو ہرایا، کئی کھلاڑیوں نے کچھ انفرادی ریکارڈ بنائے، کبھی کبھار ایشیا کپ اور ایک بار 1992ء میں عمران خان صاحب کی قیادت میں ون ڈے ورلڈ کپ بھی جیتا۔ لیکن ہماری کارکردگی (Performance) کبھی بھی غیر معمولی (Outstanding) نہیں رہی کہ ایک ہی لائن میں ہر حریف کو روندتے چلے گئے ہوں، ایسی کارکردگی ماضی میں ویسٹ انڈیز، برطانیہ اور آسٹریلیا کی ٹیمیں دکھاتی رہی ہیں۔ اس بار ورلڈ کپ میں نیوزی لینڈ کی ٹیم فائنل تک ناقابلِ شکست رہی۔ انڈیا اور سری لنکا کی ٹیمیں بحیثیتِ مجموعی ہم سے قدرِ بہتر رہی ہیں۔ 1992ء کے ورلڈ کپ میں ہمارا آغاز انتہائی مایوس کن اور قابلِ رحم تھا، لیکن اہم مراحل میں قدرت کی مدد شاملِ حال رہی، کافی کریڈٹ عمران خان صاحب کی قیادت کو بھی جاتا ہے اور اللہ کے فضل سے ہم بھی ایک بار ''کرکٹ ورلڈ کپ'' کے چمپئن بن گئے۔ اسے عربی محاورے میں ''رَمیۃٌ مِنْ غَیرِ رامٍ'' یعنی ''اتفاقاً کسی اناڑی کے تکے کا غیر متوقع طور پر نشانے پر لگ جانا'' کہا جاتا ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے تو دہشت گردی کے الزام کی وجہ سے پاکستان پر سرخ دائرہ لگادیا گیا، اس میں انڈیا کا کردار سب سے زیادہ ہے۔ چند برسوں سے ہم متحدہ عرب امارات یعنی دوسرے ممالک کی سرزمین پر

کرکٹ کی ہوم سیریز کھیل رہے ہیں اور یہ شاید کرکٹ کی تاریخ کی انوکھی مثال ہے۔

مندرجہ بالا سطور تو تمہید کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ کرکٹ کے حوالے سے ہم ہمیشہ تضادات کا شکار رہتے ہیں۔ کھلاڑیوں کے سلیکشن پر ہمیشہ ماہرین اور اناڑیوں کا اختلافِ رائے سامنے آتا ہے۔ کوئی تسلسل کے ساتھ کارکردگی نہیں دکھا پاتا، لیکن اگر اسے سلیکشن میں نظر انداز کر دیا جائے، تو میڈیا ماضیِ بعید کی پرفارمنس کا حوالہ دے کر آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔ لہٰذا کرکٹ بورڈ اور سلیکشن کمیٹی کی دیانت یا اقربا پروری اور ذاتی پسند و ناپسند سے قطعِ نظر انہیں بہت سے فیصلے دباؤ میں کرنے پڑتے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ الیکٹرونک میڈیا ٹورنامنٹ کے آغاز سے پہلے ہی قوم کو ایک خُمار میں مبتلا کرتا ہے، بلند بانگ دعوے کیے جاتے ہیں، نہایت بلند و بالا توقعات قائم کی جاتی ہیں۔ لگتا ہے چند دنوں کی بات ہے ہمارے شہباز اور شاہین فاتحِ عالم بن کر لوٹیں گے۔ قوم کو سچ نہیں بتایا جاتا، نہ ہی قومی ٹیم کی امکانی صلاحیت اور استعداد (Potential) کو پیشِ نظر رکھ کر بحث کی جاتی ہے۔ بس ہمیشہ کسی انہونی، جادوئی اور کرشماتی کارکردگی کی آس قوم کو دلائی جاتی ہے۔ یہ الیکٹرونک میڈیا کے سماں باندھنے کی پیشہ وارانہ مہارت اور کثیر الاقوام صنعتی و تجارتی کارپوریشنوں کی تشہیری مہم جوئی کی مشترکہ مہم (Joint Venture) ہوتی ہے۔ بس پیسے کا کھیل ہے، پیسا پیسے کو کھینچتا ہے، لیکن زیادہ پیسا کم کو کھینچ لیتا ہے۔ پیسے میں یہ کمال ہے کہ لوگوں کو جس کے سحر میں چاہے، مبتلا کر دے۔

اگر ٹیم کی کارکردگی بہتر نہ ہو، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، تو پھر خود تراشیدہ ہیروں اور سپر سٹارز کو عرش سے فرش پر پٹخ دینے میں ایک لمحے کی دیر نہیں لگتی۔ آنِ واحد میں ہیرو زیرو ہو جاتے ہیں اور پھر ان کے خوب چیتھڑے اڑائے جاتے ہیں۔ اس موقع پر ''محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے'' کا فارمولا روبہ عمل لایا جاتا ہے۔ سو ایک انتہا سے دوسری انتہا کا سفر پل بھر میں طے ہو جاتا ہے۔ آنکھیں طوطے کی طرح پھیر دی جاتی ہیں، کیونکہ اصل مقصد کسی کی عقیدت یا محبت و نفرت نہیں بلکہ کاروباری مفاد ہوتا ہے اور کھلاڑی ہوں یا

ماہرین کٹھ پتلی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

یہ کہنا بجا ہوگا کہ کرکٹ کا خمار اور کرکٹر سے انتہائی محبت اور انتہائی نفرت ہمارے قومی مزاج کے آئینہ دار ہیں۔ ہم حقیقت پسند نہیں ہیں، خواہشات پر مبنی بڑی بڑی توقعات باندھتے ہیں اور جب ہماری خواہشات اور خوابوں کا تراشا ہوا آئینہ کرچی کرچی ہوتا ہے، تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اگر حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھا جائے تو ہماری ٹیم کسی بھی مرحلے میں ورلڈ چمپین نظر نہیں آ رہی تھی۔ کوارٹر فائنل تک پہنچ پائی، یہی اس کی پرفارمنس اور کارکردگی کی معراج تھی۔ آسٹریلیا یا نیوزی لینڈ کی طرح ہماری ٹیم کسی بھی مرحلے میں تسلسل کے ساتھ غیر معمولی کارکردگی کی حامل نظر نہیں آئی، ہماری ٹیم کے اکاؤنٹ میں صرف ایک سنچری ہے، جبکہ یہ سنچریز اور ڈبل سنچریز کا ٹورنامنٹ تھا، ٹیموں کے مجموعی رنز ماضی کے تمام ورلڈ کپ ٹورنامنٹس سے زیادہ تھے۔ اگر انصاف پسندی سے جائزہ لیا جائے تو اس ٹورنامنٹ میں کوئی بڑا اپ سیٹ نہیں ہوا، فائنل میں وہی دو ٹیمیں پہنچیں، جن کی کارکردگی میں تسلسل تھا اور جو وکٹری اسٹینڈ پر کھڑی ہونے کی میرٹ پر حق دار نظر آتی تھیں۔ بس آخر میں کسی ایک کو تو نمبر دو پر رہنا تھا، سو وہ ہوا۔

مزید یہ کہ کسی بھی میچ کا فیصلہ اکیڈمک بنیادوں پر اور کاغذی زائچوں پر نہیں ہوتا، بلکہ میچ والے دن آن دی گراؤنڈ ٹیم کی پرفارمنس پر ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ بلند و بالا توقعات قائم کر کے اور مصنوعی سماں باندھ کر کھلاڑیوں کو دباؤ میں لایا جاتا ہے اور وہ خود اعتمادی کھو بیٹھتے ہیں۔ ہماری ٹیم نے کسی ایک میچ میں بھی حتیٰ کہ چھوٹی ٹیموں کے خلاف بھی غیر معمولی اسکور نہیں کیا، تو پھر واویلا کس بات کا۔ کرکٹ بورڈ کے مسند نشیں اچھے ہوں یا برے، کسی کو پسند ہوں یا ناپسند، دیانت دار ہوں یا خائن، اہل ہوں یا نا اہل، میدان میں کارکردگی دکھانا کھلاڑیوں ہی کا کام ہوتا ہے، باقی سب باتیں وزنِ شعر کے لیے ہوتی ہیں۔ کرکٹ اور کرکٹ بورڈ میں پیسا بہت ہے اور کوئی بھی شعبۂ حیات ہو، اسے دیانت و امانت کے اوسط قومی معیار پر ہی پرکھنا چاہیے، اگر کہیں مستثنیات ہوں اور غیر معمولی دیانت و امانت کے

حائل اِکّا دُکّا افراد مل جائیں، تو اسے نظام کی پیداوار نہیں، بلکہ قدرت کا غیر معمولی عطیہ سمجھنا چاہیے۔ ویسے کرکٹ میں وقت کا ضیاع بہت ہے اور یہ عیاشی متموّل اور خوش حال اقوام ہی کو زیب دیتی ہے اور انہی کے لیے سازگار ہے، ہمیں سستے اور کم وقت والے مشاغل ڈھونڈنے چاہئیں۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم ٹی۔ وی اسکرین کے سامنے جمے ٹکٹکی باندھ کر ورلڈ کپ کے میچ دیکھتے رہے ہیں، ہم مزدور لوگ اس عیاشی کے متحمل نہیں ہوسکتے، نہ ہی ایسی کشش دل میں محسوس ہوتی ہے، پس ٹیلی ویژن اسکرین کے ٹکر، خبرنامے کی جھلکیوں اور اخبارات کی سرخیوں سے جو معلومات ملتی ہیں، وہی چند دانے پوری دیگ کا حال بتانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔

7اپریل 2015ء

صاحبِ سکینہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اگر تم نے رسول کی مدد نہیں کی تو اللہ اُن کی مدد کر چکا ہے، جب کافروں نے ان کو جلاوطن کر دیا تھا، دراں حالیکہ وہ دو میں سے دوسرے تھے، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے صاحب سے فرما رہے تھے: غم نہ کرو، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے، سو اللہ نے ان پر اپنی سکینہ (قلبی قرار واطمینان) نازل فرمادی اور ایسے لشکروں سے ان کی مدد فرمائی جن کو تم نے نہیں دیکھا اور (اللہ نے) کافروں کی بات کو نیچا کر دیا اور اللہ کا دین ہی (درحقیقت) بلند وبالا ہے اور اللہ بہت غلبے والا، بڑی حکمت والا ہے'' (توبہ:40)

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفرِ ہجرت اور غارِ ثور کا منظر بیان فرمایا ہے۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر سات مرتبہ آیا ہے۔ ''ثَانِیَ''، دوسرا، کیونکہ اوّل تو یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔

(۲) ''اِثْنَیْنِ''، دو، اس کلمے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق دونوں کا ایک ساتھ ذکر ہے۔

(۳) ''ھُمَا''، دونوں اور دوسرے یقیناً صدیق اکبر ہیں۔

(۴) ''صَاحِبِ''، ساتھی اور غارِ ثور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ ایک ہی ساتھی ابوبکر صدیق تھے۔

(۵) ''لَاتَحْزَنْ''، تم غم نہ کرو، اس کا مصداق بھی صرف اور صرف صدیقِ اکبر ہیں۔

(۶) ''مَعَنَا''، ہمارے ساتھ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ یقیناً صرف ابوبکر صدیق تھے۔

(۷) ''فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ''، اللہ نے اُس پر سکینہ اور طمانیت نازل فرمائی۔

ایک آیت میں سات بار مدح کے انداز میں ذکر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کی دلیل ہے۔ اِس آیتِ مبارکہ کی روشنی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت قطعی ہے اور مُفسّرین نے لکھا ہے کہ آپ کی صحابیت کا انکار کفر ہے، کیونکہ غارِ ثور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اُن کے علاوہ اور کوئی تھا ہی نہیں کہ اس کے مصداق پر کسی اختلاف یا تاویل یا ترجیح کی گنجائش ہوتی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نہ صرف غارِ ثور میں آپ کے ساتھ ''ثانی'' تھے، بلکہ آپ اسلام قبول کرنے کے بعد تبلیغِ اسلام میں بھی ثانی ہیں اور آپ ہی کی تبلیغ سے سابقینِ اوّلین میں سے حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسی طرح آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں آپ کے حکم پر امامت فرمائی اور اس منصب پر بھی ثانی قرار پائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ بلافصل ہونے میں بھی آپ کے ثانی بنے۔ اسی طرح روضۂ انور میں بھی آپ ثانی ہیں اور حشر اور دخولِ جنت میں بھی آپ کے ثانی ہوں گے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت مُرّہ بن کعب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جاملتا ہے۔

سفرِ ہجرت کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ مکہ کی امانتیں لوٹانے کے لیے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہجرت کی شب اپنے بستر پر لٹایا۔ اور سفرِ ہجرت کی تیاری اور دیگر مراحل کے لیے نہ صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا محرمِ راز بنایا بلکہ آپ کی اہلیہ محترمہ، آپ کی صاحبزادی، آپ کے صاحبزادے، آپ کے غلام سب اس راز کے امین تھے۔ تاج دارِ نبوت کے لیے سواری، زادِ راہ اور دیگر ضروریات کا اہتمام آپ اور آپ کے اہلِ خانہ نے کیا۔ جب آپ غارِ ثور کی طرف گئے تو آپ کے غلام نشاناتِ قدم پر بکریاں لے جاتے تاکہ کفارِ مکہ نشاناتِ قدم پر تعاقب کرتے ہوئے آپ کا سراغ نہ لگا سکیں۔ آپ کے غلام اور آپ کے صاحبزادے بکریوں کا دودھ لے کر آتے اور رات کو کفارِ مکہ کی چالوں

اور اقدامات کے بارے معلومات فراہم کرتے۔ الغرض اگر ایک طرف تاج دارِ کائنات ﷺ نے کفارِ مکہ کی امانتیں لوٹانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امین بنایا تو دوسری جانب ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی حفاظت کے لیے نہ صرف ذاتِ ابوبکر صدیق بلکہ آپ کے پورے خانوادے کو امین اور مُحرمِ راز بنایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نگاہِ نبوت میں اگر کوئی شخصیت اور خانوادہ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد تھا، تو وہ حضرت ابوبکر صدیق کی شخصیت اور آپ کا خانوادہ تھا، یہ ایسا اعزاز ہے کہ جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے، کم ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق کی رسول اللہ ﷺ سے فطری مناسبت کا عالَم یہ تھا کہ جب آپ غارِ حرا سے پہلی وحیِ ربانی لے کر اپنے گھر آئے اور بشری تقاضے کے تحت آپ پر نبوت کی بھاری ذمّے داری کے احساس سے گھبراہٹ طاری تھی تو آپ کی رفیقۂ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

''اللہ کبھی بھی آپ کو رسوائی سے دوچار نہیں فرمائے گا، کیونکہ آپ صلۂ رحمی کرتے ہیں، ناداروں کے کام آتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی راہ میں مصیبت میں مبتلا لوگوں کی مدد کرتے ہیں''۔

اسی طرح جب حضرت ابوبکر صدیق اہلِ مکہ کے مظالم سے تنگ آکر ہجرت کے ارادے سے نکلے تو راستے میں مکے کے ایک رئیس ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی، اُس نے کہا:

''(اے ابوبکر!) آپ جیسے بلند کردار کے حامل شخص کو نہ تو اپنا وطن چھوڑ کر جانا چاہیے اور نہ ہی ایسے شخص کو جلاوطن کرنا چاہیے، کیونکہ آپ صلۂ رحمی کرتے ہیں، ناداروں کے کام آتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی خاطر مصیبت میں مبتلا لوگوں کی مدد کرتے ہیں''۔

آپ اِن الفاظ پر غور فرمائیں تو پتا چلے گا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کردار اور آپ کے اَخلاقِ عالیہ سید المرسلین ﷺ کے اَخلاق کا عکسِ کامل تھے اور آپ صفاتِ مصطفیٰ ﷺ کے مظہرِ کامل تھے۔ اسی طرح آپ کا مزاج اور آپ کی فکر

مزاجِ مصطفیٰ ﷺ میں ڈھلی ہوئی تھی، چنانچہ جب صلحِ حدیبیہ کی شرائط کو بظاہر مسلمانوں کے خلاف دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوالات کیے:

''یارسول اللہ! کیا آپ نبیِ برحق نہیں؟، آپ نے فرمایا: ''کیوں نہیں''، انہوں نے عرض کی: کیا ہم حق پر اور کفارِ مکہ باطل پر نہیں؟، آپ نے فرمایا: ''کیوں نہیں''، انہوں نے کہا: پھر ہم دب کر کیوں صلح کریں؟، آپ نے فرمایا: ''میں اللہ کا رسول ہوں اور کسی حال میں اُس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مدد فرمائے گا''۔ انہوں نے کہا: کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ: ہم بیت اللہ کا طواف کریں گے؟، آپ نے فرمایا: ''میری خبر سچی ہے اور ہم یقیناً کسی نہ کسی سال بیت اللہ کا طواف کریں گے''۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اضطراب پھر بھی دور نہ ہوا اور آپ اسی کیفیت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان کے ساتھ بھی یہ مکالمہ کیا اور لفظ بہ لفظ یہی سوالات دہرائے اور انہوں نے ہر سوال کا لفظ بہ لفظ وہی جواب دیا، جو رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فطرت نبوت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، اُن کی سوچ اور رسالت مآب ﷺ کی سوچ میں بال برابر بھی فرق نہیں تھا۔ عالَمِ بشریت میں اتنی صائبِ فکر اور پاکیزہ ذہن کا حامل ہونا آپ کی عظیم سعادت اور رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے کہ آپ کی تربیت میں کیسے کیسے، انسانیت کے شاہکار اور جوہرِ کامل تیار ہوتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ امتیاز بھی ہے کہ آپ کی چار پشتوں کو صحابیت کا شرف حاصل ہوا ہے، یعنی آپ کے والدین، آپ خود، آپ کی ساری اولاد اور اولاد کی اولاد، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کی چار پشتوں کو تسلسل کے ساتھ نبوت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ آپ کے امتیازات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنا سارا مال اللہ کی بارگاہ اور اُس کے رسول ﷺ کے قدموں میں دین کی سربلندی کے لیے نچھاور کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں مال صدقہ کرنے کا حکم دیا، (اس موقع پر)

میرے پاس کثیر مال موجود تھا، تو میں نے دل میں کہا:

''اگر میں کبھی ابوبکر پر سبقت لے جا سکتا ہوں تو وہ آج ہی کا دن ہے۔ حضرت عمر کہتے ہیں: میں (گھر) آیا اور آدھا مال لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پوچھا: گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟، میں نے کہا: بقیہ نصف مال گھر والوں کے لیے چھوڑا ہے۔ اتنے میں حضرت ابوبکر اپنا سارا مال لے کر حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟، حضرت ابوبکر نے عرض کیا: گھر والوں کے لیے اللہ اور اُس کے رسول کا نام باقی چھوڑا ہے۔ حضرت عمر بیان کرتے ہیں کہ میں نے دل میں کہا: میں کبھی بھی حضرت ابوبکر سے سبقت نہیں لے سکتا''۔

(ترمذی:3675)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''ہم نے ابوبکر کے سوا ہر ایک کے احسان کا بدلہ دنیا میں چکا دیا ہے، مگر ابوبکر کے ہم (یعنی اسلام) پر اتنے احسانات ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود قیامت میں انہیں جزا عطا فرمائے گا اور مجھے کبھی بھی کسی کے مال نے اتنا نفع نہیں دیا، جتنا ابوبکر کے مال نے دیا''۔(ترمذی:3661)

11 اپریل 2015ء

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہماری خودمختار اور دانش سے معمور پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں چند دن یمن کے مسئلے پر بحث اور تقریری مقابلہ جاری رہا اور بالآخر اُن کی اجتماعی دانش کے بطن سے ایک مُتفقہ قرارداد منظور ہوئی، اُس پر غالب کے الفاظ میں یہی تبصرہ کیا جاسکتا ہے:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے، خدا کرے کوئی

ہمارے ارکانِ پارلیمنٹ جب آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر تقریر فرماتے، تو یمن کے مسئلے میں فریق نہ بننے اور مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرنے کے موضوع پر پُرجوش خطاب فرماتے۔ پھر جب اچانک نظریں نیچے کرتے تو انہیں حرمین شریفین کی تقدیس اور سعودی عرب کی دوستی اچانک یاد آجاتی اور اس کا اعادہ کرتے۔ کئی دن پر محیط ساری بحث اسی تضاد کی آئینہ دار ہے۔ اُس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے حکمران طبقے میں سے اکثر کے کاروباری معاملات اور مالی مفادات سعودی عرب اور امارات سے جڑے ہوئے ہیں، تو وہ اِن سے صَرفِ نظر کیسے کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ملین پاکستانی اس خطے میں روزگار کے سلسلے میں مقیم ہیں اور بعض کے کاروبار کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ ہمارا سرمایہ دار طبقہ بھی اپنے سرمائے کو پاکستان سے زیادہ دبئی میں محفوظ اور نفع بخش سمجھتا ہے، اسی لیے جناب عمران خان کا دعویٰ ہے کہ گزشتہ دو سالوں میں چار ارب تیس کروڑ ڈالر پاکستان سے دبئی منتقل ہوچکے ہیں۔ ایسے میں اس کھلے سیشن کی کیا ضرورت تھی، زیادہ بہتر ہوتا کہ مختلف

سیاسی جماعتوں کے پارلیمانی رہنماؤں کو بند کمرے میں بریفنگ دی جاتی اور حکمتِ عملی طے کی جاتی یا کم ازکم پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس In Camera ہوتا۔ یہ کیا ہوا کہ ایک ہاتھ سے پھول اور دوسرے ہاتھ سے کنکر پھینکا جائے۔

سوال یہ ہے کہ ایک طرف آپ اپنی حکومت کو یمن کے مسئلے میں غیر جانب دار رہنے اور مصالحت کار کا رول ادا کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں اور دوسری جانب ہر مشکل وقت میں سعودی عرب کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں، حرمینِ طیبین اور سعودی عرب کے دفاع کو اپنی قومی اور ملّی ذمّے داری قرار دے رہے ہیں، ان دونوں باتوں میں واضح تضاد ہے۔ سعودی عرب میں کوئی داخلی خلفشار نہیں ہے، نہ ہی تا حال سعودی عرب پر کسی بیرونی ملک نے حملہ کیا ہے، سارا تنازع یمن میں چل رہا ہے، جہاں داخلی بغاوت اور قتل وغارت کا بازار گرم ہے۔ سعودی عرب یہ سمجھتا ہے کہ حُوثی باغیوں کو ایران کی حمایت حاصل ہے اور یمن کے داخلی خلفشار میں ایران ملوّث ہے، یہ ساری بغاوت اور مسلّح قتل وغارت یمن میں اقتدار پر قبضے کے لیے ہے اور سعودی عرب نہیں چاہتا کہ ایک عرب ملک میں ایران کی حامی حکومت قائم ہو۔

اسی بنا پر سعودی عرب نے یمن میں بمباری اور فضائی حملے شروع کر رکھے ہیں اور اسی مہم کے لیے اُسے پاکستان کی فوجی مدد درکار ہے، جس میں ہمارے وزیرِ دفاع کے بیان کے مطابق دفاعی ساز وسامان (میزائل وطیارے وغیرہ) بھی مطلوب ہے اور پاکستان کی مسلّح افواج کی محض اَخلاقی نہیں، عملی مدد بھی درکار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سعودی عرب نے اپنا مدعا کھل کر بیان کیا ہے اور اس میں کوئی ابہام نہیں رکھا، سارے کا سارا ابہام ہماری حکومت اور ہماری مجموعی پارلیمانی قیادت کے ذہنوں میں ہے کہ وہ ہر حال میں سعودی عرب کے ساتھ کھڑا بھی رہنا چاہتے ہیں اور ایران کے حوالے سے اپنی پوزیشن غیر جانب دار بھی دکھانا چاہتے ہیں۔ اسی کو فیس سیونگ کہتے ہیں یا زیادہ واضح الفاظ میں اسے ''منافقت'' سے تعبیر کر سکتے ہیں، یعنی ہم قومی اعتبار سے اتنے کمزور ہیں کہ کوئی واضح

موقف اختیار نہیں کر پا رہے، ایسے حالات میں بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم تنازع میں ہر فریق کا اعتماد کھو بیٹھتے ہیں اور مشکوک و ناقابلِ اعتبار قرار پاتے ہیں۔ اس حوالے سے ایران کی پالیسیوں اور اقدامات میں کوئی ابہام نہیں ہوتا۔

سعودی عرب میں فوج ہمیشہ پسِ منظر میں رہی اور منظر پر نظر نہیں آئی، لیکن جب معرکۂ کارزار گرم ہوجائے، تو خواستہ ونخواستہ فوج کو منظر پہ آنا پڑتا ہے۔ چنانچہ آج (بروز ہفتہ) صبح ٹیلی ویژن پر سعودی عرب کی مسلّح افواج کے سربراہ کا بیان اور اپنے فوجی افسران سے خطاب دکھایا جارہا تھا کہ ہم پاکستان کی مسلّح افواج کو اپنے ساتھ کھڑا دیکھنا چاہتے ہیں۔ دراصل ہمیں ہر مشکل میں سعودی عرب پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور وہاں سے مدد مل بھی جاتی ہے، لہٰذا ''پیٹ کھائے اور آنکھ شرمائے'' والا معاملہ ہے، کیونکہ اپنی نااہلی کی وجہ سے ہم اپنے ملک کو خود کفیل نہیں بنا پائے اور دوسروں پر انحصار کا سلسلہ تاحال ختم نہیں ہوا۔

تاحال سعودی عرب پر کسی بیرونی طاقت نے حملہ نہیں کیا اور نہ ہی مستقبلِ قریب میں اس کے امکانات ہیں۔ ہماری نظر میں جو بہت بڑا خطرہ ہمیں اور پوری اُمتِ مسلمہ بطورِ خاص مشرقِ وسطیٰ کو درپیش ہے، وہ ایران کی مشرقِ وسطیٰ میں نفوذ اور تسلّط کی خواہش ہے اور اتفاق سے اس کے لیے حالات بھی سازگار ہیں۔ اسی لیے وہ امریکا اور یورپ کے ساتھ ایٹمی معاہدہ کر کے عالمی پابندیوں سے جلد از جلد نکلنا چاہتا ہے تاکہ مشرقِ وسطیٰ میں اپنا بھرپور کردار ادا کرسکے اور اپنے آپ کو برتر (Dictating) پوزیشن میں لے آئے، غالباً ایرانیوں کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں ماضی کی سلطنتِ فارس (Persian Empire) کا تصور موجود ہے، جیسے ترک لاکھ سیکولر بنیں، لیکن ان کے ذہنوں سے سلطنتِ عثمانیہ کا عہدِ شباب کیسے محو ہوسکتا ہے، اس لیے انہوں نے عثمانیوں کی جانب سے فتحِ قسطنطنیہ کے تخیُّلاتی منظر کو مجسّم صورت میں دکھانے کے لیے ایک عظیم الشان فلمی منظر نامہ (Panorama) بنایا ہے، جو انسان کو مسحور کردیتا ہے، اس کو دیکھ کر ترک نوجوانوں میں اپنی عظمتِ رفتہ کو پانے کے لیے ایک برقی رو دوڑ جاتی ہوگی۔ ایسا ہی ایک منظر نامہ (Panorama) عراق کے

سابق صدر صدام حسین نے عراق میں بنوایا ہے۔

عراق میں شیعہ حکومت قائم ہے، شام کی نُصیری حکومت کو بچانے میں تا حال ایران کامیاب رہا ہے۔ لبنان میں اس کا اثر و نفوذ بہت زیادہ ہے۔ سعودی عرب اور کویت کے تیل والے علاقوں میں غالب شیعہ آبادی موجود ہے اور وہ بھی اب اپنے مذہبی شِعار یعنی ماتمی مجالس اور جلوس نکالنے لگے ہیں۔ سو مسئلہ بڑا گھمبیر ہے، اتنا سطحی نہیں ہے، جتنا ہماری پارلیمانی قیادت یا حکومت نے سمجھ رکھا ہے اور نہ ہی جلد یا بہ آسانی ختم ہونے والا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں تمام تر تعصّبات سے بالاتر اور خالص قومی مفاد اور ترجیحات کو طے کرنے والی مجالسِ فکر (Think Tank) موجود نہیں ہیں، جو طویل المدت حکمتِ عملی اور قومی پالیسی کے خطوط متعین کریں اور قومی قیادت انہیں رُو بہ عمل لائے۔ حکمرانوں کی ترجیحِ اوّل اپنے اقتدار کے دورانیے (Tenure) کی تکمیل ہوتی ہے، ایسے میں پاکستان کی طویل المدت قومی ترجیحات ثانوی حیثیت اختیار کرتی جاتی ہیں۔

اس کے برعکس دولت کی فراوانی کی وجہ سے بحیثیتِ مجموعی سعودی کاہل ہیں، سہل پسند ہیں اور عشرت کے دلدادہ ہیں، انہیں دوسروں کے جذبات اور احساسات کی کوئی خاص پروا نہیں ہوتی، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ سب کو ان کی ضرورت ہے، انہیں کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ ائیرپورٹ پر امیگریشن کے موقع پر اُن کے استغناء اور شانِ بے نیازی کا مشاہدہ ملک میں داخل ہونے والا ہر غیر ملکی مسافر بخوبی کرتا ہے۔ سو اخلاقیات اور انسانی اَقدار کے حوالے سے سعودی حکومت کو اپنے سرکاری اہلکاروں کی تربیت کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔

سعودی عرب اور امارات کے نقطۂ نظر سے اُن کے لیے تشویش اور پریشانی کا ایک اور زاویہ یہ ہے کہ انہیں مشرقِ وسطیٰ میں ایرانی نفوذ اور تسلّط کا حقیقی یا موہوم خطرہ درپیش ہے۔ سعودی عرب کا مسئلہ یہ ہے کہ اُن کی فوج میں یمنی کافی تعداد میں ہیں اور یمن کے ساتھ تنازع طول پکڑنے کی صورت میں یمنی جوانوں کے ذہنوں میں منفی جذبات پیدا ہوسکتے ہیں، یہ بشری تقاضا ہے۔ سعودی عرب اگر چاہے تو پاکستان سے تازہ دم جوانوں یا

ریٹائرڈ فوجیوں کو بھرتی کرسکتا ہے، لیکن سعودیہ کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ چند سالوں کے کنٹریکٹ پر تو ملازم رکھ لیتا ہے، لیکن مستقل بنیادوں پر نہیں رکھتا۔ گزشتہ دو سالوں میں سعودیہ سے پاکستانیوں سمیت کافی غیر ملکی کارکنوں کو نکالا جاچکا ہے اور وہاں مزدوروں کی قلّت بھی موجود ہے، لیکن اہلیت، استعدادِ کار اور قابلیت سے قطعِ نظر ہر ادارے میں سعودیوں کو جبری ملازمت دینے کا جو قانون ہے، اُس کی وجہ سے بھی اداروں کی استعدادِ کار میں فرق واقع ہوتا ہے۔

13 اپریل 2015ء

قرض کی پیتے تھے مے

غالب نے کہا ہے:

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یہ بات کسی کو اچھی لگے یا بری، بہرحال ہمارے قومی منظرنامے کی حقیقی تصویر ہے۔ یمن کے حالیہ بحران نے اسے بالکل واضح کر کے رکھ دیا ہے اور اب اس پر کوئی پردہ نہیں ڈالا جا سکتا، سوائے اس کے کہ دانستہ اندھے بن جائیں یا خدانخواستہ بصیرت یعنی حقائق کے صحیح ادراک کی صلاحیت سے محروم ہو جائیں۔ سعودی عرب کے ساتھ جو حرمین طیبین کی نسبت وابستہ ہے، اس سے عقیدت ہمارے ایمان کا تقاضا ہے اور یہ لازوال اور اَبدی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے ہم حرمین طیبین کی حُرمت اور اِس مقدّس نسبت کو ایک طرف بھی رکھ لیں، تو ہماری صورتِ حال میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں آسکتی۔

ہم قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک 68 سال گزرنے کے باوجود قیادت کی نااہلی، مفاد پرستی اور خود غرضی کی وجہ سے ایک Depended یعنی دوسروں پر مستقل انحصار کرنے والی قوم بن چکے ہیں۔ ہمارا بال بال داخلی اور خارجی قرضوں میں جکڑا ہوا ہے اور خود کفالت کی منزل ابھی ہم سے کوسوں دور ہے۔ مگر متحدہ عرب امارات کے نائب وزیر خارجہ ڈاکٹر انور محمد قرقاش (اس کا عربی تلفظ گرگاش ہے) نے تو کسی رُو رعایت کے بغیر ہمارے حکمرانوں کو آئینہ دکھا دیا اور یہ بیان دیا کہ "یمن کے بحران کے حوالے سے پاکستان کی

پارلیمنٹ کی قرارداد خطرناک نتائج و مُضمرات (Subsequences) کی حامل ہے‘‘۔
پھر سعودی عرب کی پارلیمنٹ نے بھی پاکستانی پارلیمنٹ کی قرارداد کو مایوس کن قرار دیا ہے۔

سعودی عرب کے ہاتھ سے عراق اور شام نکل چکے ہیں۔ شام میں بشّار الاسد کی حکومت کو گرانے میں امریکا اور اہلِ مغرب نے وعدۂ فردا تو کیا، لیکن وقت آنے پر عملی تعاون سے انکار کر دیا، حالانکہ اس وعدے کی قیمت سعودی عرب نے مصر میں الاخوان المسلمون کی منتخب حکومت کو ناجائز طور پر معزول کرنے میں اعانت کی صورت میں ادا کی۔ اس کا سعودی حکمرانوں کو بہت صدمہ ہوا اور ملک عبداللہ یہ صدمہ لے کر گئے۔ اس وقت سعودی عرب کی سرپرستی میں ''خلیج تعاون کونسل'' کے رکن ممالک شامل ہیں اور سعودی عرب ایک طرح سے ان کی دفاعی اور خارجہ پالیسی کو کنٹرول کر رہا ہے۔ پاکستان اور مصر، سعودی عرب اور کسی حد تک ''خلیج تعاون کونسل'' ممالک کے وظیفہ خواروں میں شامل ہیں۔ اسی لیے سعودی عرب اور اس کے اتحادیوں کی بجا طور پر یہ توقع ہے اور اب اسے دھمکی بھی کہہ سکتے ہیں کہ دفاعی میدان میں ہمارا غیر مشروط تعاون کرو اور سامانِ حرب اور فوجی دستوں کی فراہمی سمیت تمام مطلوبہ دفاعی ضروریات پوری کرو۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستانیوں کے دسیوں ارب ڈالر کے اثاثہ جات اور تجارتی مفادات خلیج تعاون کونسل کے ممالک سے وابستہ ہیں، ذرا سے جھٹکے سے سرمائے کی یہ فلک بوس عمارت زمین بوس ہو سکتی ہے۔ اس میں ہمارے آج کے حکمرانوں، بیشتر سیاست دانوں، عام تاجروں اور صنعت کاروں کا سرمایہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کے تیس لاکھ سے زائد افراد کا روزگار بھی اس خطے سے وابستہ ہے اور اسے ہم تیس لاکھ خاندانوں کے ذریعۂ معاش سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ہمارے بیرونی زرِ مبادلہ کے توازن کو بہتر بنانے کے لیے یہ بہت بڑا ذریعہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مزدور اور ملازم پیشہ پاکستانی بیرونِ ملک سے زرِ مبادلہ کما کر پاکستان بھیجتے ہیں اور بعض حکمران، کرپٹ بیوروکریٹ، بااثر لوگ اور تُجّار و صنعت کار اسی سرمائے کو غیر قانونی ذرائع سے باہر بھیج

دیتے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگا کہ متحدہ عرب امارات کے نائب وزیر خارجہ ڈاکٹر انور محمد گرگاش کا بیان پڑھ کر ہمارے سرمایہ داروں اور حکمرانوں کی نیندیں حرام ہو چکی ہوں گی۔ یہ عجب بات ہے کہ پاکستان میں سرمائے کو غیر محفوظ سمجھ کر متحدہ عرب امارات بھیجا جاتا ہے، لیکن اس ایک بیان نے یہ ثابت کر دیا کہ وہاں بھی سرمائے کا یہ محل کتنا غیر محفوظ اور کتنی کمزور بنیادوں پر قائم ہے۔

مشکل وقت میں بہرحال سعودی عرب پاکستان کو مالی سہارا دیتا رہا ہے، خواہ یہ زرِ مبادلہ کی شکل میں ہو، یا طویل المدت قرض پر پٹرول کی فراہمی کی صورت میں ہو۔ پاکستان کے امریکا کے علاوہ کسی اور خطے سے ایسے مفادات وابستہ نہیں ہیں اور امریکا جس طرح غلامی کراتا ہے، کم از کم خلیج تعاون کونسل کے ممالک نے ماضی میں پاکستان کو اتنی قومی تذلیل سے دوچار نہیں کیا۔ لیکن ایک بیان نے یہ بتا دیا کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے بلکہ ہو چکا، کیونکہ آخرِ کار ہر ایک کو اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔ سو غالب نے قرض کی مے پینے اور اس کے نشے میں مدہوش رہنے والوں کی فاقہ مستی کے رنگ لانے کی جو وعید بہت پہلے سنا دی تھی، اب اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ لیکن ہم چونکہ آنکھیں، کان اور دل و دماغ کے دریچے بند رکھنے کے عادی ہیں، اس لیے جب تک خطرہ سر پہ نہ آ جائے، ہم اُس کا اِدراک نہیں کر پاتے۔ سو ہماری پارلیمان میں ہماری خود ساختہ دانشور (Pseudo Intellectual) اور مدہوش قیادت کی تقاریر اسی کیفیت میں تھیں، انہیں ہوش نہیں تھا کہ ہم گردن تک قرض میں ڈوبے ہوئے ہیں اور مزید قرض لے کر اپنا نظام چلا رہے ہیں اور کوئی بھی ہمیں اچانک جھٹکا دے کر بے حال کر سکتا ہے۔

بہتر ہوتا کہ ہماری پارلیمانی قیادت بند کمرے میں اس صورتِ حال پر غور کرتی اور سعودی عرب کے ساتھ کوئی بہتر سودے بازی کرتی، پاکستان کے لیے کوئی باوقار اور دیرپا مفادات کی بات کرتی، پاکستانی مزدوروں، ہنرمندوں اور مختلف پیشہ وارانہ صلاحیتوں کے حامل لوگوں کے لیے روزگار کے بڑے مواقع پیدا کرنے کی بات کی جاتی تا کہ کم از کم

زرِ مبادلہ کا توازن ہمارے حق میں ہونے کے امکانات پیدا ہوتے، اسی طرح پاکستانی تاجروں اور صنعت کاروں کے لیے بہتر مواقع اور امکانات پیدا کیے جاتے۔ پاکستان پر واجب الادا بین الاقوامی قرضوں کی ادائیگی کی کوئی صورت پیدا کی جاتی۔ لیکن ہماری مجموعی قیادت کی بے بصیرتی کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا اور اب سو جوتے اور سو پیاز کھا کر ہمارے ذہنوں کے دریچے یقیناً کھل جائیں گے۔ اس موقع پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ

ع: ''چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی''

اور اہلِ نظر نے پہلے ہی کہا ہے: ''ہر کہ دانا کُند، کُند ناداں لیکن بعد از خرابیِ بسیار''۔ اور کسی پنجابی صاحبِ نظر صوفی کا قول ہے: ''عقل نہ ہووے تے موجاں ای موجاں، عقل ہووے تے سوچاں ای سوچاں''۔

جہاں تک جناب عمران خان کی بے نیازی کا تعلق ہے، اُن کے لیے بھی اِس قرارداد کے آفٹر شاکس (مابعد جھٹکے) کا مقابلہ کرنا دشوار ہوگا، کیونکہ اُن کی سیاست کے مالی معاونین اور شوکت خانم اسپتال کے لیے فنڈ ریزنگ کا ایک بڑا ذریعہ ''خلیج تعاون کونسل'' کے ممالک میں مقیم پاکستانی تُجّار و صنعت کار ہیں۔

قرآنِ مجید کے الفاظ میں ہمارا حال سوت کات کر اُسے ریزہ ریزہ کرنے والی بڑھیا جیسا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ، جس نے اپنا سوت مضبوطی سے کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا''۔ (النحل:92)

یہاں تک یہ سطور اتوار کی صبح لکھی جا چکی تھیں کہ اتوار کی شام تک کے واقعات نے اِن حقائق کی توثیق کر دی۔ جماعت اسلامی کے امیر جناب سراج الحق تا حال قرارداد کی حمایت پر قائم ہیں، لیکن مولانا فضل الرحمن نے یوٹرن لے لیا ہے۔ اُن کے ابتدائی ردِ عمل اور اتوار کی شام قرارداد پر تبصرے کو اگر میڈیا لائیو دکھا دے، تو فرق واضح ہو جائے گا۔ ہمارے نزدیک یمن کے تنازع میں غیر جانب دار رہنے کے الفاظ کا قرارداد میں اضافہ بے معنی

ہے، کیونکہ جب یہ عہد کر لیا گیا کہ سعودی عرب کا دفاع ہماری ذمّے داری ہے، تو غیر جانبداری کے کیا معنی؟۔ اتوار کی شام کو وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان کا رَدِّ عمل سامنے آیا کہ متحدہ عرب امارات کے وزیر خارجہ کا بیان توہین آمیز ہے اور پاکستان کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ اس بیان سے حُبُّ الوطنی سے سرشار لوگوں کی کچھ ڈھارس بندھی ہے۔ پاکستان کا ایک المیہ یہ ہے کہ ایسے نازک وقت میں مستقل وزیرِ خارجہ سے محروم ہے، حالانکہ ایسے مواقع پر بہت سی یقین دہانیاں اور وضاحتیں پسِ پردہ کر لی جاتی ہیں اور سرِ عام تماشا نہیں لگتا، لیکن ہماری قسمت میں وقار و افتخار کہاں؟۔

اس موقع پر ایک نمبر گیم بھی چل رہی ہے، بہت سی مذہبی جماعتیں ''تحفظِ حرمینِ طیبین'' کے نام سے ریلیاں نکال رہی ہیں، سیمینار اور کانفرنسیں منعقد کی جارہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ساری تگ ودَو کا مقصد سعودی حکومت سے قربت کی تمنا اور اس کا اعتماد حاصل کرنے کی آرزو ہے، میں نے دانستہ مفاد کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

میرے نزدیک سعودی عرب سے قربت رکھنے والی جماعتوں کو چاہیے کہ وہ انہیں خارجہ اُمور کی نزاکتوں کی بابت آگہی بھی دیں اور اپنے وطن کے جمہوری نظام کی مجبوریوں اور موجودہ حکمرانوں پر سیاسی دباؤ کے حقائق سے بھی آگاہ کریں اور یہ بتائیں کہ اُن کی خواہش بہر حال پوری ہو جائے گی، لیکن پاکستانی حکمرانوں کو بے توقیر کرنا خود اُن کے مفاد میں نہیں ہے، آخر حبُّ الوطنی کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔

نوٹ: حالات لمحہ بہ لمحہ بدل رہے ہیں، ان سطور کا تکملہ پیر کی صبح تحریر کیا گیا ہے۔

14 اپریل 2015ء

تذکیرِ ایام اللہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''بے شک ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر (اس ہدایت کے ساتھ) بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف لاؤ اور اُن کو اللہ کے دنوں کی یاد دلاؤ، بے شک بہت صبر کرنے والے، بہت شکر کرنے والے ہر شخص کے لیے اس میں (ہدایت کی) نشانیاں ہیں''۔ (ابراہیم:05)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی جانے والی نشانیاں یہ ہیں: ''عصا، یدِ بیضا، ٹڈیوں کا لشکر، جوؤں کا تسلُّط، ماکولات و مشروبات کی خون سے آلودگی، مینڈکوں کی یلغار، سمندر کا پاٹ دینا، پتھروں سے چشموں کا جاری ہونا، (میثاق لینے کے لیے) ان کے اوپر طور کا اٹھا لینا اور منّ و سلویٰ کا نزول وغیرہ''۔

مفسرینِ کرام نے ''ایّام اللہ کی متعدد تفاسیر بیان کی ہیں: وہ ایام جن میں اللہ تعالیٰ نے کسی قوم پر خصوصی انعام فرمایا ہو، یا کسی مشکل سے نجات عطا فرمائی ہو۔ اس معنی کی تائید ان آیاتِ مبارکہ سے بھی ہوتی ہے: ''جب حواریوں نے کہا: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے خوانِ (نعمت) نازل کرسکتا ہے؟، (عیسیٰ نے) کہا: اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو، انہوں نے کہا: ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس خوان سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوجائیں اور ہمیں یقین ہوجائے کہ ہم سے سچ کہا تھا اور ہم اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوجائیں۔ عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی: اے ہمارے رب! ہم پر آسمان سے کھانے کا (تیار) خوان نازل فرما، تاکہ (وہ دن) ہمارے اگلوں اور پچھلوں

کے لیے عید ہو جائے اور تیری طرف سے (قدرت کی) نشانی بن جائے اور ہمیں رزق عطا فرما اور تو سب سے بہتر رزق عطا فرمانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں اس خوان کو تم پر نازل کیے دیتا ہوں، پھر تم میں سے جو (قدرت کی) یہ نشانی آنے کے بعد کفر کرے گا، تو میں ضرور اس کو ایسا عذاب دوں گا، جو تمام جہان والوں میں سے کسی کو بھی نہ دوں گا"۔

(المائدہ:112-115)

اِن آیاتِ مبارکہ میں نزولِ نعمت کے دن کو عید سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ نعمت کا اطلاق عطا پر بھی ہوتا ہے اور مصائب وبلیّات کے رَد پر بھی ہوتا ہے۔ اس کی تائید اس حدیثِ مبارک سے ہوتی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ یہود عاشورا کا روزہ رکھتے ہیں، آپ ﷺ نے اُن سے فرمایا: تم اس دن کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟، انہوں نے کہا: یہ بڑا دن ہے، اللہ نے اس دن موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات عطا فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو سمندر میں غرق فرمادیا، تو موسیٰ علیہ السلام نے اِس دن نعمتِ باری تعالیٰ کے شکرانے کے طور پر روزہ رکھا، لہٰذا ہم بھی اِس دن روزہ رکھتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہماری موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نظریاتی قُربت اِن سے زیادہ ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور صحابہ کو روزہ رکھنے کا حکم دیا"۔ (بخاری:2004)

(رسول اللہ ﷺ سوموار کا روزہ رکھا کرتے تھے) آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ آپ ہر پیر کو روزہ کیوں رکھتے ہیں؟، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اِس دن میری وِلادت ہوئی اور اِسی دن میری بعثت ہوئی یا مجھ پر پہلی بار وحیِ ربانی نازل ہوئی"۔

(صحیح مسلم:197)

یعنی آپ ﷺ اپنی نعمتِ ولادت اور عطائے نبوت کے شکرانے کے طور پر ہر پیر کو روزہ رکھتے تھے۔

اِن آیات واحادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ جس دن کسی نعمتِ باری تعالیٰ کا نزول

ہوا ہو یا کسی گمراہ قوم پر عذاب آیا ہو، وہ ''ایام اللہ'' کہلاتے ہیں۔ مختلف مذاہب و اقوام کے لوگ اِن ایام کو اپنے اپنے انداز سے مناتے ہیں اور اِسی کو ''تذکیرِ ایام اللہ'' کہا جاتا ہے۔ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شِعار سے معلوم ہوا کہ اللہ کی نعمت کے دن کو منانا مستحسن ہے اور اس کے منانے کا اَحسن طریقہ ذکر و فکر اور عبادتِ الٰہی میں مصروف رہنا ہے، جیسے عاشورا اور پیر کا روزہ رکھنا وغیرہ۔

آج کل دن منانے کے کئی اور طریقے بھی رائج ہوئے ہیں، مثلاً جلوس نکالنا اور مجالس منعقد کرنا وغیرہ۔ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجالس اور جلوس اور محرم الحرام کی مجالس اور ماتمی جلوس اسی قبیل سے ہیں۔ ایک طبقہ اِن جلوسوں کا مخالف تھا اور انہیں بدعت قرار دیتا تھا، مگر اب انہوں نے بھی عظمتِ صحابہ اور مدحتِ صحابہ کے جلوس نکالنا شروع کر دیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا مُحرِک بھی مذہب ہی ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض کام اپنی آدرش اور اپنی تحریک سے کیے جاتے ہیں اور بعض دوسروں سے مسابقت اور مقابلے کے سبب کیے جاتے ہیں۔ عظمتِ صحابہ کے جلوس اسی قبیل سے ہیں۔ اب ہمارے ملک میں ایامِ خلفائے راشدین اور دیگر بزرگانِ دین کے ایام پر قومی تعطیل کے مطالبات بھی کیے جاتے ہیں۔ حکومت کے لیے مذہبی جلوسوں کی حفاظت بھی ایک مسئلہ ہے۔ ہمارے بعض حضرات نے حال ہی میں دینی جذبے کے تحت جلوسِ غوثیہ کا بھی آغاز کیا ہے۔

میں نے ایک اعتدال پسند اور محقق شیعہ عالم سے پوچھا کہ آپ کے مسلک میں محرم الحرام کے ماتمی جلوس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟۔ انہوں نے کہا: اگر مُنکرات اور بدعات سے پاک ہو، خلافِ شرع اُمور کا ارتکاب نہ کیا جائے، جلوس کے دوران نمازوں کا باقاعدہ التزام کیا جائے، مرد و زن کا بے حجاب اختلاط نہ ہو، تو زیادہ سے زیادہ اسے مستحب قرار دیا جا سکتا ہے، مگر ہمارے ہاں مذہبی جذباتی فضا ایسی ہوتی ہے کہ بعض اوقات سچ اور صحیح بات کرنا بھی خطرہ مول لینے کے مترادف ہے۔ سچ اور حق بات یہی ہے کہ اہلسنّت و جماعت کے نزدیک بھی میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلوس کی شرعی حیثیت یہی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن

اب یہ سلسلہ دراز ہوتا جارہا ہے اور تعطیلات کے مطالبے کو حکومت قبول کرے یا نہ کرے، جس علاقے میں جلوس نکلتا ہے، وہاں کاروبارِ زندگی معطل ہوجاتا ہے، ایمرجنسی کی صورت میں بھی اُن مقامات پر آنا جانا دشوار بلکہ عملاً ناممکن ہوجاتا ہے۔ یہ تو میں نے مذہبی جلوسوں کی بات کی ہے، سیاسی جلوسوں کی وبا اس سے بھی زیادہ ہے اور اس کا کوئی موسم بھی متعین نہیں ہے، جب کسی کے دل میں جوش آجائے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

کیا اب مناسب وقت نہیں ہے کہ اِس شِعار پر غور کیا جائے اور جلوسوں کو شرعی حدود وقیود کے مطابق میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور محرم الحرام تک محدود رکھا جائے اور باقی مقاصد کے لیے جلسوں پر اکتفا کیا جائے۔ حال ہی میں عالمی مالیاتی اداروں نے جنوبی ایشیا کے ممالک کی سالانہ ترقی کا ایک اِشاریہ شائع کیا ہے، جسے معاشی زبان میں جی ڈی پی کی شرح ترقی کہا جاتا ہے، اُس کی رو سے پاکستان کی سالانہ شرحِ ترقی اپنے خطے کے تمام ممالک یعنی ہندوستان، بنگلا دیش، سری لنکا، نیپال، برما اور بھوٹان سے بھی پیچھے ہے، یہ ہمارے لیے شرم کا مقام ہے۔ حکومت نے تو اپنی طَمانیت کے لیے بتادیا ہے کہ پیپلز پارٹی کے دور اور ماضی کے سالوں سے یہ شرح دگنی ہے، مگر فی نفسہٖ اقوامِ عالَم کے مقابلے میں کم ہے اور پوری قوم کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

ہمارے ہاں ایک اور المیہ یہ ہے کہ کوئی بھی طبقہ، جب چاہے اپنے مطالبات کے لیے سڑکوں پہ آجاتا ہے اور نظامِ زندگی کو مفلوج کردیتا ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ حکمران اُس وقت تک کسی بات یا کسی کے مطالبے کو سنجیدگی سے لینے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے جب تک کہ نظام کو مفلوج نہ کردیا جائے۔ دوسری جانب میڈیا کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ وفاقی یا صوبائی وسائل کے اندر رہتے ہوئے ان مطالبات کو مِن وعَن پورا کرنا حکومت کے لیے عملاً ممکن بھی ہے یا نہیں۔ کیا ترقیاتی عمل کو جامد کرکے صرف اِن مطالبات ہی کو پورا کیا جائے یا توازن کے ساتھ دونوں شعبوں کے تقاضوں کو پورا کیا جائے، یہ مقامِ غور ہے، حکومت کوئی بھی ہو، ملک ہم سب کا ہے۔ ہمارے میڈیا کی ترجیحات کا عالم یہ ہے کہ

کوئی شخص اپنے جائز یا ناجائز مطالبات کو پورا کرنے کے لیے بجلی کے پول پر چڑھ جائے تو سارا میڈیا اُس کی لائیو کوریج میں لگ جاتا ہے اور پوری قوم کو اُسی کے تصوّر میں محو کر دیتا ہے۔ کیا وقت نہیں آ گیا کہ لائیو کوریج کے لیے کوئی معیار اور ترجیحات متعین کی جائیں۔

اِن تمام گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں تعطیلات اور جلوسوں کے لیے اتفاقِ رائے سے کوئی فارمولا وضع کرنا چاہیے اور بزرگانِ دین اور اکابرینِ اُمّت کی یاد منانے، انہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے اور ان کے تذکرے کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی ایسے شِعار وضع کریں کہ معیشت کا پہیہ بھی رواں دواں رہے اور یہ تقاضے بھی پورے ہوتے رہیں۔

17 اپریل 2015ء

حضرت اُویس قَرَنی رضی اللہ عنہ

حضرت اُویس بن عامر مُرادی قَرَنی رضی اللہ عنہ یمن کے رہنے والے ہیں، ان کے قبیلے کا نام ''مُراد'' ہے اور ذیلی شاخ ''قَرَن'' ہے۔ حضرت اُسَیر بن جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس اہلِ یمن کی امداد آئی، آپ نے اُن سے پوچھا، کیا تم میں اُویس بن عامر ہیں؟، (نشاندہی پر) آپ اُن کے پاس آئے اور پوچھا: کیا آپ اُویس بن عامر ہیں؟، انہوں نے کہا: جی ہاں! انہوں نے پوچھا: آپ کا تعلق قبیلۂ مراد اور اس کی (ذیلی شاخ) قَرَن سے ہے؟، انہوں نے کہا: ہاں! آپ نے پوچھا: کیا آپ کو بَرَص کی بیماری تھی، پھر آپ اُس سے شفایاب ہو گئے اور صرف ایک درہم کے برابر نشان باقی رہ گیا؟، انہوں نے کہا: ہاں! آپ نے پوچھا: کیا آپ کی والدہ ہیں؟، انہوں نے کہا: ہاں! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا: تمہارے پاس اہلِ یمن کی امداد کے ہمراہ اُویس بن عامر مُرادی قَرَنی آئیں گے، اُن کو برص کی بیماری تھی، تو اللہ نے انہیں شفا عطا فرمائی، بس صرف ایک درہم کے برابر نشان باقی رہ گیا، اُن کی والدہ ہیں، جن کے ساتھ اُن کا سلوک بہت اچھا ہے، (وہ مستجاب الدعوات ہیں) اگر وہ (کسی بات کے بارے میں) اللہ کی قسم کھا کر (یہ کہہ دیں کہ یوں ہے) تو اللہ تعالیٰ انہیں قسم میں سرخرو فرما دے گا (یعنی اُن کی قسم سچی ثابت ہو گی)، اگر تم اُن سے اپنے لیے دعائے مغفرت کرا سکو تو ضرور کرانا، (حضرت عمر نے ان سے کہا:) میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت کریں، تو حضرت اُویس نے (ان کی فرمائش پر) اُن کے لیے دعائے

مغفرت کی''۔(صحیح مسلم:2542)

ایک روایت میں صراحت کے ساتھ ہے کہ حضرت اُویس قَرنی رضی اللہ عنہ نے اپنے بدن پر سے برص کے داغوں کے ازالے کے لیے اللہ سے دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے اِس مرض سے انہیں شفا عطا فرمائی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ وہ ''خیر التابعین'' ہیں (یعنی تابعین میں سب سے افضل ہیں)۔

بعض علماء نے حضرت سعید بن مُسیّب کو اور بعض نے حضرت حسن بصری کو افضل التابعین قرار دیا ہے، ان میں تقابل مقصود نہیں ہے، سب دین میں اعلیٰ مرتبے کے حامل ہیں۔ دراصل مختلف شخصیات کو، اپنی اپنی جگہ صاحبِ فضیلت ہونے کے ساتھ ساتھ، بعض شعبوں میں اختصاص کا درجہ حاصل ہوتا ہے، جیسے حضرت سعید بن مُسیّب علومِ شرعیہ یعنی تفسیر وحدیث وفقہ میں اعلیٰ مرتبے کے حامل تھے، حضرت اُویس قَرنی پر حُبِّ الٰہی اور حُبِّ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا غلبہ تھا اور وہ مستجاب الدعوات تھے۔ مشہور محدِّث امام یحییٰ بن شرف نووی نے کہا: حضرت اُویس قرنی کی بابت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی بشارت آپ کا معجزہ ہے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اویسِ قرنی کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثتِ مبارَکہ کا علم ہو چکا تھا اور وہ آپ پر ایمان بھی لے آئے تھے، لیکن ماں کی خدمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر صحابیت کا شرف حاصل نہ کر سکے۔ اس کی توجیہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ شاید اُن کے علاوہ اُن کی والدۂ ماجدہ کی خدمت کے لیے کوئی اور موجود نہ تھا اور وہ اُن کی خدمت کی محتاج تھیں۔ حدیث میں یہ صراحت نہیں ہے کہ بعد میں جب وہ گئے تو اُن کی والدۂ ماجدہ انتقال فرما چکی تھیں یا نہیں؟۔ اگر وہ حیات تھیں تو ممکن ہے کہ حضرت اُویس کو اُن کی خدمت کے لیے کسی کو مقرر کرنے کے اسباب دستیاب ہو چکے ہوں یا پھر وہ حجِ فرض ادا کرنے کے لیے آئے ہوں۔ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ حجِ فرض کی ادائیگی کے لیے ماں باپ کی اجازت لے کر جانا افضل اور مستحب ہے لیکن عدمِ اجازت

کی بناپرفریضۂ حج کوترک نہیں کر سکتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضرت اُویس قرنی کے بارے میں اس بشارت، کہ اگر وہ کسی بات کی قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ انہیں سرخرو فرمادے گا، کی تائید میں یہ حدیث بھی موجود ہے:

''بہت سے پراگندہ حال بندے ایسے ہیں کہ لوگ انہیں اپنے دروازے سے دھتکار دیں، (لیکن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اُن کی مقبولیت کا عالَم یہ ہے کہ) اگر وہ کسی بات کے بارے میں اللہ کی قسم کھالیں، تو اللہ تعالیٰ انہیں سرخرو فرماتا ہے''۔ (صحیح مسلم:2622)

روایت میں ہے: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت اُویس قرنی سے کہا کہ میں کوفے کے حاکم کے نام آپ کے لیے ایک خط لکھ دیتا ہوں، انہوں نے کہا: (اس کی ضرورت نہیں) مجھے گمنام اور کمزور لوگوں میں رہنا پسند ہے۔ اگلے سال جب حضرت عمر نے ایک یمنی حاجی سے ان کا حال دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ میں انہیں ایسے حال میں چھوڑ کر آیا ہوں، اُن کا مکان بوسیدہ تھا، ساز وسامان بہت کم تھا اور رہن سہن تنگی کا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ گمنام رہنا پسند کرتے تھے اور جذب کی کیفیت میں رہتے تھے۔

حضرت اویس قرنی کے بارے میں بعض روایات میں ہے: ''جب انہوں نے غزوۂ اُحد میں حضور کے دو دندانِ مبارک کے ٹوٹنے کا سنا تو فرطِ عشق میں اپنے سارے دانت توڑ دیے کہ نجانے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کون سے دندانِ مبارک ٹوٹے ہیں، ایک جگہ تو یہ بھی پڑھنے کو ملا کہ ان کے ٹوٹے ہوئے دانت پھر صحیح سالم نکل آئے، انہوں نے پھر توڑے اور ایسا سات بار ہوا، پھر چونکہ وہ ٹھوس غذا چبا نہیں سکتے تھے، اس لیے اُن کی خاطر قدرت نے کیلے کا پودا پیدا فرمایا''۔

یہ روایت کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے اور نہ ہی یہ عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ معیار ہے، جو شریعت کو مطلوب ہے۔ اگر محبتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معیار یہی ہوتا تو صحابۂ کرام جو محبتِ رسول میں اپنی جانیں نچھاور کر رہے تھے، ضرور مشابہتِ رسول کی خاطر اپنے دانتوں کو توڑ دیتے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پس وہی قرینۂ عشقِ رسول مقبول اور پسندیدہ ہے،

جو شریعت کے اصولوں کے مطابق ہو اور شریعت کی رو سے اپنی جان یا کسی عضو کو تلف کرنا جائز نہیں ہے۔ ہمارے ہاں شعرائے کرام ان مضامین پر پُر درد اشعار تخلیق کرتے ہیں اور خوش گلو نعت خواں حضرات درد بھرے انداز میں انہیں پڑھتے ہیں اور عوام ان پر نوٹ نچھاور کرتے ہیں، اس سے وہ عوام کی عقیدت ومحبت کو ابھار کر نذرانے تو وصول کر لیتے ہیں، لیکن یہ تینوں طبقات اتنے دانا ضرور ہوتے ہیں کہ عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرشار ہوکر اپنے دانتوں کو نہیں توڑتے۔

حضرت علامہ محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی نے ''تذکرۂ اُویس قرنی'' کے ضمن میں یمن کی بابت بھی احادیث ذکر کی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے اللہ! ہمارے شام اور ہمارے یمن میں برکتیں عطا فرما، صحابہ نے عرض کی کہ نجد کے بارے میں بھی دعا فرما لیجیے، آپ نے پھر فرمایا: اے اللہ! ہمارے شام اور ہمارے یمن میں برکتیں عطا فرما، صحابہ نے دوبارہ اور ایک روایت کی رو سے سہ بارہ نجد کے بارے میں متوجہ فرمایا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہاں زلزلے آئیں گے، فتنے برپا ہوں گے اور قرنِ شیطان (یعنی شیطان کا حامی ومددگار گروہ) نمودار ہوگا''۔ (بخاری:7094)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ یمن کے بارے میں یہ بھی فرمایا: ''تمہارے پاس اہلِ یمن آئیں گے، وہ بڑے نرم دل ہیں، ایمان یمانی ہے اور حکمت یمانیہ ہے''۔ (بخاری:4388)

نرم دلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی خصلتِ مبارکہ بھی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ''سو یہ رحمتِ باری تعالیٰ ہی کا فیضان ہے کہ (اے رسول!) آپ مسلمانوں کے لیے نرم دل ہیں اور اگر آپ تُند خو اور سخت دل ہوتے، تو وہ ضرور آپ کے گرد وپیش سے منتشر ہو جاتے''۔ (آل عمران:159)

(۲) ''اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے، جس کے مضامین ایک جیسے ہیں، اِس کلام (کی جلالت سے) اُن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کی جلد اور ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے نرم ہو جاتے ہیں''۔ (الزمر:23)

اس کے برعکس یہود کے بارے میں فرمایا: ''پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے، سو وہ پتھروں کی طرح بلکہ اُن سے بھی زیادہ سخت ہیں اور بے شک بعض پتھر پھٹ جاتے ہیں تو اُن سے پانی نکل آتا ہے اور بے شک بعض پتھر اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں''۔(البقرہ:74)

قرآن کے اس ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ سنگ دل انسان کے دل سے ایمان اور ہدایت کے سوتے نہیں پھوٹتے اور وہ قبولِ حق سے محروم رہتے ہیں۔

آج وہی اہلِ یمن، جن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے برکت کی دعائیں فرمائی تھیں اور ان کی نرم دلی کی تعریف فرمائی تھی، خاک وخون میں لتھڑے ہوئے ہیں اور خانہ جنگی کا شکار ہیں۔ زمین سے بھی اُن پر گولے برس رہے ہیں اور فضا سے بھی اُن پر بمباری ہو رہی ہے، دعا کریں اِس حالتِ زار سے اللہ تعالیٰ انہیں جلد نجات عطا فرمائے۔

21 اپریل 2015ء

یمن کے قضیے کا تازہ ترین رُخ

ہمارے وطنِ عزیز میں کچھ عرصے سے ''تحفظِ حرمین طیبین'' کے عنوان پر سیمیناروں، کانفرنسوں اور ریلیوں کا سلسلہ جاری وساری ہے اور ماشاء اللہ مختلف تنظیموں اور جماعتوں میں مسابقت کی فضا قائم ہے۔ ہمارے کچھ دوستوں نے اپنے تَفَرُّد اور امتیاز کو قائم رکھنے کے لیے لاہور میں ''تحفظِ گنبدِ خضریٰ'' کے نام سے بھی ریلی نکالی۔ کئی جمعوں کے خطبات اس کارِ خیر کے لیے وقف کرنے کے اعلانات اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ پاکستانی پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد کو ناکافی سمجھا جارہا ہے، حالانکہ قرارداد میں واضح طور پر پارلیمنٹ نے سعودی عرب کے دفاع کے لیے اپنی تمام تر خدمات غیر مشروط طور پر پیش کی ہیں اور سعودیہ کے دفاع کو اپنا دفاع قرار دیا ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ حلقوں کی بے چینی اور اضطراب کا ازالہ نہیں ہو پارہا، حالانکہ الحمدللہ! تاحال حرمین طیبین اور سعودی عرب کو دور دور تک کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے۔

دروغ برگردنِ راوی کراچی کے ایک اخبار نے رپورٹ کیا کہ اتوار 19 اپریل 2015ء کو کراچی کے سعودی قونصل خانے میں منتخب علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کا ایک خصوصی اجتماع منعقد ہوا اور اُس سے سعودی حکومت کے مشیرِ اعلیٰ برائے مذہبی امور جناب ڈاکٹر عبدالعزیز العمار نے خطاب کیا اور نہایت مدلّل اور متوازن انداز میں سعودی پالیسی کی وضاحت کی۔ لیکن تقریر کے بعد ہڑبونگ مچ گئی اور علمائے کرام ومفتیانِ عظام اپنی اپنی درخواستیں، فائلیں اور حاجات لے کر لائن میں کھڑے ہوگئے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز العمار

خطاب کے بعد جانا چاہتے تھے، لیکن بندگانِ ہوس نے انہیں گھیر لیا اور عالمِ پریشانی میں انہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیسے جان چھڑائیں۔ اس سے واضح ہوا کہ حرمین طیبین اور سعودی عرب کے لیے جو جاں نثاری کی ایک نہ ختم ہونے والی مہم جاری تھی، اس کے اصل محرکات کیا ہیں۔ حالانکہ یہ اجتماع سعودی عرب کی غیر مشروط حمایت کے لیے منعقد کیا گیا تھا، اس سے یقیناً پاکستان اور علمائے پاکستان کی بے توقیری ہوئی، کاش کہ ایسا نہ ہوا ہوتا اور اپنی اغراض اور یہ حضرات خواہشات پیش کرنے کا کوئی اور باوقار اور باسلیقہ طریقہ اختیار کرتے تو اچھا ہوتا۔

لیکن آج سعودی عرب نے ایک اور ستم ڈھا دیا اور اِن خدائی خدمت گاروں کی امیدوں پہ پانی پھیر دیا۔ سعودی عرب کی مسلّح افواج کے ترجمان بریگیڈئر جنرل احمد العُصیری نے کہا ہے کہ یمن کی جلاوطن حکومت کے صدر جناب منصور ہادی کی درخواست پر ''آپریشن صحرائی طوفان (Desert Storm)'' ختم کر دیا گیا ہے۔ سعودی فوجی ترجمان نے کہا ہے کہ یمن میں حوثی باغیوں کے خلاف جاری فضائی آپریشن ختم کر دیا گیا ہے، انہوں نے کہا کہ آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم کے مقاصد حاصل کر لیے گئے ہیں اور حوثی باغی اب سعودی عوام کے لیے مزید خطرہ نہیں رہے۔ اگرچہ انہوں نے ان مقاصد کی وضاحت نہیں کی جو آپریشن صحرائی طوفان شروع کرتے وقت سعودی عرب کے پیشِ نظر تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ سعودی فوج یمن میں حوثی قبائل کے مخالف گروہوں کی مدد کرنے پر غور کرے گی اور Operation Restoring Hope یعنی بحالیِ امید کے نام سے ایک نیا آپریشن شروع کیا جائے گا۔ بیان مین کہا گیا ہے کہ نئے آپریشن کا مقصد یمن کی سلامتی کو یقینی بنانا اور بحران کا سیاسی حل نکالنا ہے۔ اگر یہ آپریشن کچھ عرصہ مزید یا لمبے عرصے تک چلتا رہتا، تو ہمارے دوستوں کا موج میلہ اور گلشن کا کاروبار بھی چلتا رہتا۔ میڈیا پر بھی رونقیں جاری وساری رہتیں اور سعودی شاہی خاندان سے کچھ احباب کے تعلقات بھی استوار ہوتے۔ سفارت خانوں اور قونصل خانوں کی پسندیدہ فہرست میں اضافہ ہوتا رہتا، لیکن لگتا

ہے کہ سعودی مسلّح افواج کے ترجمان نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا، اب حرمینِ طیبین کو خطرات لاحق ہونے کی دُہائی کیسے دی جائے گی اور اس کا جواز کس طرح پیش کیا جائے گا، ساتھ ہی اپنی حکومت اور پارلیمنٹ کی نالائقی اور عاقبت نااندیشی پر لعن طعن اور ملامت کا سلسلہ کیسے جاری رکھا جائے گا، یہ ایک بڑا سوال ہے۔

عالمی ادارۂ صحت کے مطابق اس آپریشن میں اب تک 940 افراد ہلاک اور 3487 زخمی ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ میڈیا رپورٹ کے مطابق ایران پہلے ہی جنگ بندی کا مطالبہ کرتا رہا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ جذباتی فضا سے نکل کر اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیا جائے اور اس کا کوئی پرامن اور دیرپا حل تلاش کیا جائے۔ ہماری رائے میں پارلیمنٹ کی قرارداد میں اجتماعی دانش کی بہتر عکاسی کی گئی تھی، کیونکہ تمام تنازعات میں جنگ سے گریز اوّلین ترجیح ہوتی ہے اور جنگ آخری آپشن قرار پاتی ہے، کیونکہ جنگ کے بعد بھی دیرپا امن کے قیام کے لیے ڈائیلاگ ٹیبل پر بیٹھنا ہوتا ہے۔ سو اگر کسی بڑی جنگ کے شعلے بھڑکائے بغیر امن حاصل ہوسکے تو یہ اجتماعی دانش کی بہت بڑی فتح ہوتی ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ یمن کی جلاوطن حکومت کے سربراہ سعودی عرب میں ہیں اور اُن کا اپنے ملک میں اقتدار قائم نہیں ہے، ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ جو باغی گروہ یمن میں برسرِپیکار ہے، اُس کے مقابل جو عسکری قوت یمن میں موجود ہے، وہ کس کے کنٹرول میں ہے۔

ہمیں صورتِ حال کو اس نظر سے بھی دیکھنا چاہیے کہ آج روئے زمین پر جہاں کہیں بھی ظلم ہے، فساد ہے، تخریب ودہشت گردی ہے، قتل وغارت ہے، آگ اور خون کا الاؤ شعلہ زن ہے، وہ سب مسلمانوں کی سرزمین ہے، سب کچھ مسلم ممالک میں ہورہا ہے، گردنیں صرف مسلمانوں کی کٹ رہی ہیں، جانیں اور اَملاک صرف مسلمانوں کی تباہ ہورہی ہیں، عالَمِ کفر مکمل طور پر سکون اور امان میں ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ یہ سب ظلم وعدوان اور قتل وغارت مسلمانوں کے اپنے ہاتھوں برپا ہے۔ سو ہمیں اُمّت اور ملّت کے درد اور اَلم کا بھی ادراک ہونا چاہیے، آخر دونوں طرف نقصان ہمارا ہی ہے، کسی اور کا نہیں ہے۔

ہماری نظر میں وقت کا تقاضا یہ ہے کہ غیر سرکاری سطح پر اُمّتِ مسلمہ کے اہلِ فکر ونظر کی ایک ''مجلسِ فکر'' (Think Tank) تشکیل دی جائے، جو مکمل طور پر غیر جانب دار ہو اور وہ اُمّتِ مسلمہ کی باہمی آویزش کے اس گھمبیر مسئلے کا حل تلاش کرے، اُمّت کی وحدت اور ملّت کی سلامتی کے لیے کوئی لائحۂ عمل تجویز کرے اور مسلم حکمرانوں کو خوابِ غفلت سے جگا کر ان کی ذمے داریوں سے آگاہ کرے۔

اس موقع پر ہم یہ کہنا مناسب سمجھتے ہیں کہ جن تنظیموں، جماعتوں اور افراد کو سعودی عرب کی قُربت حاصل ہے، وہ اپنے اثر ورسوخ کو پاکستان کے حق میں استعمال کریں، پاکستانیوں کے لیے بڑے پیمانے پر روزگار اور کاروبار کے مواقع پیدا کریں اور سعودی عرب میں تارکین وطن کے لیے جو کفیل کا ادارہ ہے، اُسے مسلّمہ انسانی حقوق کے معیار پر لانے کے لیے وہاں کے حکمرانوں کو آمادہ کریں۔ اس وقت سعودی عرب، کویت اور متحدہ عرب امارات میں ہندوستان کے کاروباری مفادات (Stakes) اور اثر ورسوخ پاکستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے، کیا حرمینِ طیبین کی تقدیس اور اُخوّتِ اسلامی کے جذبے کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ کم ازکم پاکستان سے ہائی پروفیشنلز، ہنرمند کارکنوں اور عام مزدوروں کو ترجیحی مواقع دیے جائیں۔ اس سے پاکستان کی معیشت اور زرِ مبادلہ کے توازن کو سہارا ملے گا اور پاکستان خود کفالت کی منزل میں داخل ہو کر اُمّتِ مسلمہ اور مسلم ممالک کی بہتر طور پر خدمت کر سکے گا۔ اسی طرح اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ جن پاکستانیوں کا سعودی عرب اور خلیج تعاون کونسل کے ممالک میں وسیع کاروبار ہے، ان کے سرمائے، اثاثوں اور حقِ ملکیت کا تحفظ کیا جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سعودی عرب میں مقامی باشندوں کو سرکاری ملازمتوں میں جو مراعات اور حقوق حاصل ہیں، اگر اُسی معیار پر پاکستان سے سعودی عرب کی مسلّح افواج کے لیے جوان اور افسران بھرتی کیے جائیں، تو دفاع کے بارے میں سعودی عرب کی مشکلات کا مستقل حل نکل آئے گا۔

حوثی رہنما حسین البخیتی کا بیان بی بی سی پر نشر ہوا کہ اُن کے نزدیک بھی حرمینِ طیبین کا

وہی تقدس واحترام ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حرمین طیبین پر حملہ تو ہر مسلمان کے لیے ناقابلِ تصور ہے، ہم نے تو سعودی عرب کی طرف ایک گولی بھی نہیں چلائی، نہ کوئی حملہ کیا ہے، ہم پر یکطرفہ فضائی حملے ہورہے ہیں، جبکہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ حوثیوں نے حرمینِ طیبین پر حملے کرنے کے ناپاک عزائم کا اظہار کیا ہے، جس سے پوری اُمّتِ مسلمہ میں اشتعال اور ردِّعمل کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ یہ بھی مسلّم کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز سمجھا جاتا ہے، مگر مذہبی مُقدّسات کو کسی قطعی ثبوت کے بغیر ان مقاصد کے لیے استعمال کرنا بہرحال درست نہیں ہے، لہٰذا اس دعوے کی صداقت کو پرکھنا بھی ضروری ہے۔

25اپریل2015ء

مئی2015ء

خواجہ معین الدین حسن چشتی اجمیری نور اللہ مرقدہم

خواجہ معین الدین حسن چشتی سجزی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ برصغیر ہند میں تصوف کے سلسلۂ چشتیہ کے بانی ہیں۔ سلسلۂ چشتیہ حضرت ابواسحاق شامی کی طرف منسوب ہے اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کے توسط سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک جا پہنچتا ہے، کہا جاتا ہے کہ ہرات کے قریب چشت نامی ایک گاؤں ہے اور چشتی اسی کی طرف منسوب ہے، عام طور پر اُنہیں سَنجری کہا جاتا ہے، لیکن اُن کے وطنِ مالوف سجستان کی طرف نسبت کے حوالے سے صحیح لفظ سَجز ہے۔ خواجہ معین الدین حسن سجزی کا سلسلۂ بیعت وخلافت خواجہ عثمانی ہَروَنی سے ہے، ہَروَن ایک قصبے کا نام ہے۔ خواجہ اجمیری نے حضرت سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر مراقبہ کیا اور یہ شعر انہی کی طرف منسوب ہے:

گنج بخش فیضِ عالَم مَظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را رہنما

خواجہ معین الدین، سلطان محمد غوری سے پہلے اجمیر پہنچے۔ خواجہ معین الدین چشتی نے پرتھوی راج کے زمانے میں اپنی خانقاہ بنائی۔ لفظِ خانقاہ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ ''خوانگاہ'' کا مُعرَّب ہے اور اس کے معنی ہیں: ''کھانے کی جگہ''، یعنی جہاں فقرا اور مسافروں کے لیے لنگر کا انتظام ہو اور بعض نے اسے ''خان اور قاہ'' سے مُرکب مانا ہے، اس کے معنی ہیں: ''عبادت اور دعا کی جگہ''۔ دراصل ''خانقاہ'' سے مراد وہ جگہ جہاں دنیا کی الائشوں سے کٹ کر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ذکر وفکر میں مشغول رکھا جائے، اسی کو قرآن

مجید میں ''مُتَبَتِّل''، یعنی اپنی توجہ خالص اللہ تعالیٰ کی طرف مبذول کیے رکھنے سے تعبیر کیا گیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہیں اور سب سے لاتعلق ہو کر اُسی سے تعلق جوڑے رکھیں''۔ (المزمل:08)

صوفیائے کرام سب سے پہلے توبہ کے ذریعے سالک کے قلب کو پاک کرتے ہیں اور پھر اس پر اللہ تعالیٰ کی جلالت اور محبت کا نقش ثبت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نیا اور پائیدار رنگ چڑھانے کے لیے سب سے پہلے لوحِ قلب کو پاک کرنا ضروری ہے تاکہ دنیا اور علائقِ دنیا (Relevances) یعنی ماسوی اللہ ہر چیز کی محبت سے دل پاک ہو جائے اور اللہ جلّ شانہٗ کے سوا کسی اور کے لیے غلبۂ محبت کا شائبہ نہ رہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے''۔ (الاحزاب:04)

یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی کے دل میں شیطان کا بھی بسیرا ہو اور وہ محبتِ الٰہی کا بھی مرکز بنا رہے۔ توبہ کے بعد انسان ایک نئی روحانی زندگی میں داخل ہوتا ہے، ماضی کی معصیتوں سے آلودہ زندگی سے رشتہ توڑتا ہے، چنانچہ مشائخِ چشت نے توبہ کی تین قسمیں بتائی ہیں:

(۱) ''توبۂ ماضی'' کہ انسان ماضی کی معصیتوں سے سچے دل سے توبہ کرے اور اُن کی تلافی کے لیے شریعت نے جو طریقہ بتایا ہے، اس پر کاربند ہو، یعنی وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد جو اس نے پامال کیے ہیں، اُن پر دل سے نادم ہو اور شریعت کے اَحکام کے مطابق اُن کی تلافی کرے، ورنہ صرف زبانی توبہ کوئی معنی نہیں رکھتی۔

(۲) ''توبۂ حال'' کہ اس کا حال اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سانچے میں ڈھل جائے۔

(۳) ''توبۂ مستقبل'' کہ آئندہ کے لیے اللہ کی حقیقی بندگی کے پیمان پر قائم و دائم رہنے کا عہد کرے۔

خواجہ معین الدین حسن اجمیری کے مکمل حالات ثقہ اور مستند ذرائع سے دستیاب نہیں

ہیں، کچھ اُن کے اقوال ہیں اور زیادہ تر اُن کی کرامات ہیں جو واعظین پُراثر انداز میں بیان کرتے ہیں اور عامۃ المسلمین انہیں سن کر روحانی سرور حاصل کرتے ہیں۔ بزرگانِ دین کے تذکرے کا بنیادی مقصد تو اُن کی سیرت وکردار اور شِعار پر عمل کرنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی عزیمت واستقامت کی زندگی کو سامنے رکھا جائے۔ خواجہ صاحب جب ہندوستان میں وارد ہوئے تو وہاں کے سماج میں ذات پات کا نظام تھا، کچھ لوگ "اَچھوت" کہلاتے تھے، یعنی انہیں اتنا حقیر اور قابلِ نفرت سمجھا جاتا تھا کہ ان سے خدمت تو لی جاتی تھی، مگر اُن سے بدن کا مَس (Touch) ہونا بھی گوارا نہ تھا۔ ہندو سماج چار ذاتوں میں منقسم تھا، جن میں برہمن سب سے اعلیٰ اور شُودر سب سے حقیر ذات تھی، انگریزوں نے ان کے لیے Scheduled Cost کی اصطلاح وضع کی تھی، یعنی اُن کے نام ایک الگ فہرست میں درج تھے، آج کل ہندوستان میں انہیں دَلت کہا جاتا ہے۔ قرآن نے اِن زیردست طبقات کو "مُسْتَضْعَفِیْن" (Oppressed) سے تعبیر فرمایا ہے۔

صوفیائے کرام کا شِعار یہ رہا ہے کہ انہوں نے اِن زیریں طبقات کو انسانیت کا وقار اور احترام عطا کیا، انہیں اپنے ساتھ بٹھایا، انہیں محبت اور اعتماد عطا کیا، جس کی وجہ سے وہ اِن کے گرویدہ ہوئے۔ خواجہ معین الدین حسن اجمیری اور تمام صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں لنگر کا نظام اسی وجہ سے چلا کہ یہ خانقاہیں غریب اور نادار طبقات کے لیے دارالکفالت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ انہوں نے ایسے انسانوں کو، جو اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے پتھر کے بتوں کے آگے سجدہ ریز تھے یا انہوں نے اپنے دل ودماغ میں خیالی معبود بسا رکھے تھے، اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی کی معراج عطا کی۔ انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ انبیائے کرام پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں انہی کمزور طبقات کے لوگ ہوتے تھے، چنانچہ قیصر کے دربار میں ابوسفیان سے جو مکالمہ ہوا، اُس میں قیصر نے ابوسفیان سے پوچھا کہ اس نئے مدعیِ نبوت پر ایمان لانے والے زیادہ تر کون لوگ ہیں؟، تو ابوسفیان نے جواب دیا کہ کمزور طبقات کے لوگ ہیں۔

اور یہ فطری بات ہے کہ باطل مذہب کے نام پر جن طبقات نے اجارہ داری قائم کر رکھی ہوتی ہے، وہ اپنی مراعات سے دستبردار ہونے کے لیے آسانی سے آمادہ نہیں ہوتے اور ہمیشہ حق کی مزاحمت کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر مکے کے سرداروں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: چلیے! ہم آپ کی بات سن لیتے ہیں، لیکن آپ کے اردگرد جو زیردست طبقے کے لوگ ہیں، جب ہم آئیں تو انہیں اپنے پاس سے اٹھا دیا کریں، کیونکہ اِن کا ہمارے برابر بیٹھنا ہمارے وقار کے مُنافی ہے، یعنی انہوں نے دین کی بات سننے کے لیے بھی خصوصی مرتبے (Special Status) کا مطالبہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ لوگ کسی بہانے اللہ کے پیغامِ ہدایت کو سن لیں، سو آپ کے دل میں خیال آیا کہ اِن کی یہ حُجت بھی پوری کر دی جائے، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''اور آپ اپنے آپ کو اُن لوگوں کے ساتھ وابستہ رکھیں جو صبح شام اپنے رب کی رضا چاہتے ہوئے اسے پکارتے ہیں اور آپ اپنی نگاہِ التفات کو اُن سے نہ ہٹائیں''۔ (الکہف: 28)

سو خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا اندازِ دعوت و تبلیغ اِسی شعارِ نبوت کے مطابق تھا۔ آپ نے ہندو سماج میں انسان کی بے توقیری کے باطل مذہبی نظریے کو دعوتِ اسلام کے پھیلانے کے لیے اپنی طاقت میں تبدیل کر دیا اور اسی باعث وہ مرجعِ خلائق بن گئے۔ اور تاریخِ انسانیت شاہد ہے کہ جب انسانوں کے کمزور طبقات کو ایمان اور عقیدے کی روحانی قوت ملتی ہے، تو اُن کی کمزوری طاقت میں بدل جاتی ہے اور وہ ناقابلِ شکست ہو جاتے ہیں۔ اور بالائی طبقہ (Upper Class) جو مادّی طاقت اور ظاہری اسباب کے زعم میں رہتا ہے، وہ وقت آنے پر ایمان اور عقیدے کی کمزوری کی وجہ سے ریت کی دیوار ثابت ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام کی خانقاہوں اور مسجدِ نبوی میں صُفّہ کے مکتب میں تعلیم و تربیت اور تزکیۂ نفس قدرِ مشترک ہے۔ اور اس کی معراج یہ ہے کہ دنیا اپنی تمام تر چکا چوند اور آب و تاب کے باوجود صاحبِ ایمان کی نظر میں بے توقیر قرار پائے۔

حدیثِ پاک میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے حارثہ! تو نے کیسے صبح

کی؟، انہوں نے عرض کی: میں نے اس حال میں صبح کی کہ میرا ایمان یقینِ کامل کے درجے میں تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تو تمہارے اِس دعوے کی حقیقت کیا ہے؟، انہوں نے عرض کی: میں نے اپنے نفس کو دنیا (کے غلبۂ محبت سے) لاتعلق کرلیا، تو (اب) میرے نزدیک اس کا پتھر اور سونا اور چاندی اور ڈھیلا (بے توقیری میں) برابر ہوگئے۔ میں نے اپنی راتیں بیدار رہ کر (اللہ کی عبادت میں) گزاریں اور دن پیاسا رہ کر (روزوں کی حالت میں) گزارے، اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں عرشِ الٰہی کو اپنی نظروں کے سامنے دیکھ رہا ہوں اور میں اہلِ جنت کو (خوش وخرم) ایک دوسرے کے ساتھ ملاقاتیں کرتے ہوئے اور اہلِ جہنم کو (شدتِ عذاب کے باعث) فریادیں کرتے ہوئے سن رہا ہوں (یعنی غیبی حقائق مجھ پر منکشف ہونے لگے ہیں)''۔ (مجمع الزوائد للہیثمی: 57/1)

چنانچہ خواجہ معین الدین حسن چشتی اجمیری نے فرمایا:

صفائے قلب، اخلاص ورضا اور للّٰہیت کی معراج یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں سمندر جیسی سخاوت، آفتاب جیسی شفقت اور تواضع پیدا ہوجائے، یعنی سمندر اور آفتاب کی طرح اُس کا فیض اعلیٰ وادنیٰ کی تمیز کے بغیر سب کے لیے عام ہو اور اس فیض رسانی میں کوئی تعلّی اور احسان جتلانے کا شائبہ نہ ہو بلکہ زمین جیسی تواضع ہو جو اپنا سینہ سب کے لیے کشادہ رکھتی ہے اور کسی کو محروم نہیں رکھتی۔

2 مئی 2015ء

دربارِ عام

اسلام آباد میں پی ٹی آئی کے چار ماہ سے زیادہ عرصے پر محیط دھرنے اور مسلسل احتجاج کے نتیجے میں حکومت اور پی ٹی آئی کے درمیان 2013ء کے عام انتخابات کے آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانب دارانہ ہونے کے حوالے سے تحقیقات کے لیے سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایک عدالتی کمیشن کے قیام پر اتفاقِ رائے ہوا۔ اس اتفاقِ رائے تک پہنچنے کے لیے طویل مذاکرات ہوئے اور آخرِ کار ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے اسے قانونی شکل دے دی گئی۔ عدالتی کمیشن کی ٹرمز آف ریفرنس یا دائرۂ اختیار حسبِ ذیل قرار پایا:

کمیشن تحقیق کے بعد یہ طے کرے گا کہ:

(الف) آیا 2013ء کے قومی انتخابات قانون کے مطابق غیر جانب دارانہ، شفاف اور منصفانہ طور پر منعقد کیے گئے تھے؟

(ب) یہ کہ 2013ء کے قومی انتخابات میں دھاندلی یا ہیرا پھیری کی گئی اور کسی فرد یا ادارے کی جانب سے پہلے سے تشکیل شدہ منصوبے کو منظم انداز میں روبہ کار لایا گیا تھا؟۔

(ج) یہ کہ 2013ء کے قومی انتخابات کے نتائج بحیثیتِ مجموعی رائے دہندگان کی جانب سے تفویض کردہ حقِ نمائندگی (Mandate) کی سچی اور بے داغ نمائندگی کے عکاس تھے؟۔

Manipulation کے معنی: ہیرا پھیری، جوڑتوڑ اور سازباز کے ہیں، اسی کو ہماری سیاسی اصطلاح میں دھاندلی اور جھرلو سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ آرڈیننس میں درج الفاظ

سے یہ بات واضح ہے کہ جا بجا مقامی طور پر اگر کسی فرد نے ذاتی طور پر انتخاب پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی ہے تو ایسی شکایات کا مداوا کرنا اس مجوّزہ عدالتی کمیشن کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے پہلے ہی الیکشن کمیشن، الیکشن ٹرابیونلز اور عدالتی نظام موجود ہے۔ آرڈیننس میں تین الفاظ Systematic یعنی منظم، Designed یعنی من پسند نتائج حاصل کرنے کے لیے پہلے سے طے شدہ حکمتِ عملی اور Influenced یعنی اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ کوئی بے اثر اور بے اختیار شخص تخیُّلاتی طور پر کسی منصوبے کی بابت سوچے بلکہ ایسی حکمتِ عملی مراد ہے کہ جسے روبہ عمل لانے کا اختیار منصوبہ ساز کے پاس موجود ہو اور وہ اپنے اختیارات اور تصرُّفات سے کام لے کر ایسا کرسکتا ہو۔ سو حکومت نے جاری کردہ آرڈیننس میں اپنے تحفظات کا مناسب اور محفوظ قانونی بندوبست کرلیا ہے اور اب یہ ساری کارروائی ایک ذہنی مشق یا تماشا گاہِ عالم ہے۔

چیف جسٹس آف پاکستان عزت مآب جناب ناصر الملک نے اپنی سربراہی میں فوراً ہی کمیشن تشکیل دے دیا اور جناب جسٹس اعجاز افضل اور جناب جسٹس امیر ہانی مسلم کو کمیشن کا رکن مقرر کردیا اور تمام سیاسی جماعتوں اور افراد کو دعوتِ عام دے دی کہ کسی کی پٹاری یا زنبیل میں کوئی مستور راز ہیں تو عدالت کے سامنے لے آئے، گویا عدالتی کمیشن نے ایک دربارِ عام منعقد کرنے کا فیصلہ کرلیا تاکہ سیاست دانوں کی دوعملی، ایک دوسرے کے ساتھ مکر وفریب اور فکری وعملی تضاد قوم کے سامنے آئے۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہوئی کہ وہ تمام پارلیمانی جماعتیں جو دھرنے کے زمانے میں نظام کو بچانے کے لیے یا آسان لفظوں میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے حکومت کی پشت پر کھڑی ہوگئیں تھیں اور تکرار کے ساتھ یہ کہہ رہیں تھیں کہ الیکشن میں جو ہوا سو ہوا، لیکن حکومت کو اپنی مدت پوری کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ اب سب کے سب دھاندلی کا نعرہ لگا کر اور انصاف کے طلب گار بن کر جوڈیشل کمیشن میں جا پہنچے، حالانکہ اُن میں سے کوئی بھی جماعت وسط مدتی قومی انتخابات کے لیے نہ تیار ہے اور نہ ایسا چاہتی ہے، تو اس تضاد کے کیا معنیٰ؟۔

ماضی میں جنرل محمد ضیاء الحق نے ایک نامزد مجلسِ شوریٰ تشکیل دی تھی، ان سے پوچھا گیا کہ شوریٰ کے انتخاب (Selection) کے لیے آپ نے کیا معیار رکھا ہے؟، تو انہوں نے جواب دیا: ''ہم نے سب کے نسب نامے دیکھ لیے ہیں''، یعنی صاحبِ اقتدار سے غیر مشروط وفا ان کی ذہنی ساخت میں ہے یا نہیں؟۔ اسی طرح انہوں نے یہ پھبتی بھی کسی تھی کہ اگر میں سیاست دانوں کو اشارہ کروں تو وہ دُم ہلاتے ہوئے چلے آئیں گے، یہ پالتو کتے سے مماثلت بتانا مقصود تھی جو مالک کے اشارے پر دُم ہلاتا ہوا دوڑا چلا آتا ہے۔ اس شوریٰ کا انتظامیہ پر کوئی اثر ورسوخ نہیں تھا، نہ اُن کا تھانے اور پٹوار کلچر پر اثر انداز ہونے کا کوئی اختیار تھا، نہ ہی بجٹ یا کسی قانون کا پاس ہونا اُن کی منظوری پر موقوف تھا، بس یہ محض ایک مجلسِ مباحثہ تھی۔ ان کے اختیار کو ہم اس کہاوت کے مشابہ قرار دے سکتے ہیں:

"I am master of this house & I am saying this with the permission of my wife."

یہ مقولہ بزعم خویش ایک ''با اختیار'' شوہر کی طرف منسوب ہے کہ میں اس گھر کا مالک ومختار ہوں اور میری مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا اور یہ بات میں اپنی بیوی کی اجازت سے کہہ رہا ہوں۔ سو وہ مجلسِ شوریٰ ہمہ مقتدر جنرل محمد ضیاء الحق کے اشارۂ ابرو کی محتاج تھی اور اس کی جان اُسی پنجرے میں محصور تھی۔ لہٰذا اس کی ساری دلچسپیاں قومی اسمبلی کے ہال تک محدود تھیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے مباحثے کا معیار ہماری منتخب اسمبلیوں سے قدرے بہتر تھا اور گالی گلوچ کی روایت بھی نہیں تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ عام آدمی کوئی بے ہودہ لفظ کہے تو اسے گالی کہا جاتا ہے، قوم کے منتخب نمائندے وہی لفظ یا اس سے بھی انتہائی گھٹیا الفاظ استعمال کریں تو اسے گالی نہیں کہا جا سکتا، اس کے لیے ایک مہذّب لفظ ''غیر پارلیمانی'' تجویز کیا گیا ہے۔ عام آدمی کی لفظی بے ہودگی تو واپس نہیں لی جا سکتی، لیکن ہمارے معزز قومی نمائندوں کی بے ہودگی ریکارڈ سے حذف بھی کی جا سکتی ہے، یہ اُن کی رفعتِ شان ہے۔

کاش کہ ہمارے سیاسی رہنما اپنے وقار اور اعتبار کا پاس رکھیں، لیکن: ''اے بسا آرزو

کہ خاک شدہ"۔ اب جوں جوں منظر سامنے آرہا ہے تو یہ واضح ہو رہا ہے کہ منظم دھاندلی اور طے شدہ منصوبے کے تحت قومی انتخابات کے نتائج برآمد کرنے کا براہِ راست ثبوت کسی کے پاس نہیں ہے، حتیٰ کہ اصل مدعی جماعت تحریک انصاف کے پاس بھی نہیں ہے، کبھی کہتے ہیں کہ ثبوت تھیلوں میں ہیں۔ جناب جہانگیر ترین نے کہا کہ: "ہمارے پاس اتنے ثبوت ہیں کہ ٹرک بھرا جاسکتا ہے"۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے جوڈیشل کمیشن کے فاضل جج صاحبان بااختیار ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبانِ کرامت بھی ہوں کہ وہ 45 دن کے اندر مفروضہ ثبوتوں کے اس انبارِ گراں بار کا پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ بھی فرمالیں گے اور نتائج بھی اخذ کرلیں۔ امید قائم کرنے اور خواب دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، تاہم برسرِ زمین دستیاب حقائق وشواہد کی روشنی میں ہم کم فہم لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ لیکن اس کے باوجود جناب عمران خان، اُن کے رفقائے کار اور ان کی آئینی وقانونی ٹیم کے فاضل ارکان کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کئی اہلِ قلم اور ماہرین اس جانب متوجہ کرتے رہے ہیں، لیکن وہ اپنی دانش وبصیرت کا پورا زور لگانے کے باوجود جناب عمران خان کے یقین کو متزلزل نہیں کرسکے، خان ایسا ہی ہونا چاہیے کہ: "زمیں جنبد، نہ جنبد گل محمد" کہ زمین تو گاہے گاہے زلزلے سے حرکت میں آہی جاتی ہے، لیکن گل محمد کا حال یہ ہے کہ: "حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے"، کسی کا باپ بھی نہیں ہلاسکتا۔

ہماری رائے میں اس سے بہتر مشق یہ ہونی چاہیے کہ نظامِ انتخاب کی اصلاح کے لیے جو پارلیمانی کمیٹی کام کررہی ہے، وہ اپنی معاونت کے لیے آئینی وقانونی ماہرین کا ایک آزاد کمیشن تشکیل دے، وہ ہمارے نظامِ انتخاب کی اصلاح کے لیے آئین وقانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ایسی سفارشات مرتب کرے، جو قابلِ عمل بھی ہوں اور اُن کو روبہ کار لانے کے لیے وسائل بھی دستیاب ہوں اور پھر اس انتخابی اصلاحی پیکج کی پارلیمنٹ سے منظوری لی جائے، جہاں قانون سازی کی ضرورت ہو قانون بنایا جائے اور جن سفارشات کے لیے آئینی ترمیم کی ضرورت ہو، اس مقصد کے لیے اتفاقِ رائے سے آئینی

ترمیم منظور کی جائے تا کہ ہماری سیاسی اصطلاح کے مطابق الیکشن چرانے یا جھرلو پھیرنے کے لیے جو خفیہ سوراخ ہیں، انہیں حتّی الامکان ہمیشہ کے لیے بند کیا جاسکے، مزید یہ کہ الیکشن کمیشن آف پاکستان کو مالی، انتظامی اور قانونی اعتبار سے طاقت ور بنایا جائے۔

آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے لیے اٹھارہویں ترمیم میں ہماری پارلیمنٹ کی سیاسی دانش نے یہ حل تجویز کیا تھا کہ منتخب حکومت کی مدت ختم ہونے پر صوبوں اور وفاق کی سطح پر وزیراعظم، وزیراعلیٰ اور قائد حزبِ اختلاف کی مشاورت سے ایک نگران سیٹ اپ تشکیل دیا جائے، اسی طرح چیف الیکشن کمشنر اور الیکشن کمیشن کے ارکان کے چناؤ کے لیے بھی یہی حل تجویز کیا گیا تھا، مگر یہ تجزیہ بے نتیجہ ثابت ہوا۔ نگران سیٹ اپ بنانے کا ماڈل بنگلا دیش نے اختیار کیا تھا، مگر وہاں بھی حسینہ واجد نے اُسے ختم کر دیا۔ چیف الیکشن کمشنر اور الیکشن کمیشن کا منصب بیک وقت عدالتی بھی ہے اور انتظامی بھی، اس کے لیے ایسا الیکشن کمیشن چاہیے جو مکمل طور پر آزاد ہو، اس کے ارکان مضبوط اَعصاب اور قوتِ فیصلہ کے مالک ہوں، ان کے سامنے صرف اور صرف ملک وقوم کا مفاد ہو، ان کا ریٹائرڈ جج ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہندوستان میں ایک اعلیٰ انتظامی استعداد، مضبوط اعصاب اور بروقت قوتِ فیصلہ کے حامل چیف الیکشن کمشنر نے اپنی دھاک بٹھائی اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے انتخابات کا اعتبار دنیا بھر میں قائم کر دیا، جس پر بحیثیتِ مجموعی کوئی انگلی نہیں اٹھاتا۔

5 مئی 2015ء

متفرقات

این اے 125 کا فیصلہ:

لاہور میں قومی اسمبلی کے حلقہ نمبر:125 کے ریٹرننگ افسر اوران کے ماتحت عملے کی غفلت کے سبب جو انتخابی بے ضابطگی ہوئی، اس کی بنا پر الیکشن ٹرابیونل نے اس حلقے کا انتخاب کالعدم قرار دے دیا ہے اور اس سے منتخب رُکنِ قومی اسمبلی خواجہ سعد رفیق کو اپنی نشست سے محروم کردیا ہے اور الیکشن کمیشن آف پاکستان کو اس حلقے میں نئے انتخابات کا حکم دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ الیکشن ٹرابیونل کے فاضل جج نے یہ قرار دیا ہے کہ خواجہ سعد رفیق کی بددیانتی اور دھاندلی یا عملے پر اثر انداز ہونا ثابت نہیں ہوا۔ لہٰذا یہ فیصلہ کچھ اس نوعیت کا ہے کہ جج ملزم سے کہے کہ آپ پر قتل کا جرم ثابت تو نہیں ہوا، لیکن چونکہ قتل بہر حال ہوا ہے، لہٰذا آپ کو سولی پر لٹکایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس چونکہ مخالف امیدوار جناب حامد خان جیتنے والے امیدوار کی طرف سے دھاندلی کا ارتکاب ثابت نہیں کرسکے، اس لیے اس لحاظ سے انہیں پورا فائدہ نہیں دیا گیا کہ انہیں منتخب قرار دیا جائے، تو بوجوہ یہ فیصلہ دلچسپی کا حامل ہے اور ہماری عدالتی دانش کا شاہکار ہے۔ قاضی کا بے لاگ انصاف فراہم کرنا پلِ صراط پر چلنے کے مترادف ہے، ہماری عدالتی تاریخ میں جبریہ یعنی نظریۂ ضرورت کے فیصلے بھی ملتے ہیں اور پاپولر فیصلے بھی، یعنی ہم افراط اور تفریط سے بچ نہیں پاتے۔

لیکن کہا جاسکتا ہے کہ کسی حد تک چوری ثابت ہوگئی ہے، لہٰذا اب اُس کی کھوج لگانی چاہیے اور اگر یہ کام کسی منصوبہ بندی کے تحت ہوا ہے تو نشاناتِ قدم پر چل کر اصل منصوبہ ساز تک پہنچنا چاہیے اور یہ تب ہوسکتا ہے کہ ریٹرننگ آفیسر اور ماتحت عملے یعنی پریذائڈنگ

افسران سے جواب طلبی کی جائے اور منصوبہ ساز اور منصوبے کو روبہ عمل لانے والوں کا تعیُّن کر کے اُن سے قانون کے مطابق سلوک کیا جائے اور اگر قانون اس سلسلے میں خاموش ہے تو اس کے لیے قانون سازی کی جائے، اس سے آئندہ انتخابی عملے کی بدعنوانیوں کا سدِّ باب ہو سکے گا، ورنہ یہ ساری کاوش بے نتیجہ ثابت ہوگی۔

سردست تو نئے جاری کردہ آرڈی نینس میں بھی جوڈیشل کمیشن کے پاس اختیارات محدود ہیں، انہیں ازخود پورے قومی انتخابات کو کالعدم قرار دینے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ جوڈیشل کمیشن کو صرف ایک طرح سے Facts Findings یعنی حقائق معلوم کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے بفرضِ محال اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کا جوڈیشل کمیشن اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت منظم انداز میں دھاندلی کر کے 2013ء کے قومی انتخابات میں من پسند نتائج حاصل کیے گئے ہیں اور کسی خاص فرد یا جماعت کو فائدہ پہنچایا گیا ہے، تو قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں کیسے تحلیل ہوں گی اور اس کے لیے آئینی طریقۂ کار کیا ہوگا، سو یہ بھی بہت بڑا سوالیہ نشان ہے؟۔ ورنہ اُس کے بعد ایک نئے بحران کا سامنا ہوگا، بقول منیر احمد نیازی:

ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا، تو میں نے دیکھا

تحریکِ تحفظِ حرمینِ طیبین:

پاکستان میں ماشاء اللہ منظم انداز میں "تحفظِ حرمینِ طیبین" کی تحریک چلی، مختلف جماعتوں اور تنظیموں کی طرف سے اس عنوان پر سیمینار، کانفرنسیں اور ریلیاں منعقد ہوئیں، تادمِ تحریر آخری ریلی جمعیۃ علمائے اسلام کی تھی، جس سے مولانا فضل الرحمن نے آخری خطاب کیا۔ اس کے تین عنوانات تھے:

(۱) تحفظِ مدارس، (۲) پاکستان کو لبرل اور سیکولر بننے سے روکنا اور (۳) تحفظِ حرمینِ طیبین سعودی عرب کی وزارتِ مذہبی امور کے مشیر جناب ڈاکٹر عبدالعزیز العمّار اور امامِ حرم

جناب شیخ خالد الغامدی نے بھی اس تحریک کو مہمیز لگانے کے لیے خلافِ معمول کافی وقت صرف کیا اور نتیجہ خیز مہم چلائی اور ٹیلی ویژن کے میڈیا کا بھی ماہرانہ استعمال کیا۔ بعض مواقع پر امامِ حرم نے سفارتی حدود سے تجاوز بھی کیا اور کہا:

> ''یمن کے بحران کے حوالے سے پاکستانی پارلیمنٹ کی قرارداد پاکستانی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمان نہیں ہے''۔

ذرا سوچیے! پاکستان کی کوئی بڑی سے بڑی سیاسی یا مذہبی شخصیت سعودی عرب میں جا کر اگر ایسا بیان دے کہ:

''سعودی حکومت کی فلاں پالیسی سعودی عرب کے عوام کی صحیح ترجمان نہیں ہے''، تو کیا وہاں اسے تحسین کی نظر سے دیکھا جائے گا؟۔ پس حرمِ مقدس میں دینی احترام کے منصب پر فائز شخصیات کو قدرے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ہماری پارلیمنٹ جیسی بھی ہے، ہمارے دستوری نظام میں اُسی کے پاس قوم کی نمائندگی کا حق ہے۔ اگر پاکستان کی بڑی شخصیت سعودی عرب میں جا کر یہ بیان دے کہ مصر میں مذہبی نظریات کی علم بردار جماعت ''الاخوان المسلمون'' کی منتخب حکومت کو معزول کرنے میں جنرل سیسی کی مدد کرنا اور اسے اربوں ڈالر کی مدد فراہم کرنا وہاں کے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے مترادف ہے، کیا ایسے کسی تبصرے اور تجزیے کی سعودی عرب میں پذیرائی کی جائے گی۔ مجھے اُن کی رائے سے سو فیصد اتفاق ہے کہ گلہ شکوہ اپنوں ہی سے ہوتا ہے، لیکن اس کا اظہار براہِ راست حاکمِ وقت سے یا سفارتی ذرائع سے بہتر ہوتا ہے۔ آخر میں نہایت ادب کے ساتھ یہ گزارش ہے کہ پاکستان میں تو ماشاء اللہ ریلیوں، کانفرنسوں اور سیمیناروں کی کم از کم سلور جوبلی تو ہو چکی ہوگی۔ ایسی ہی عظیم الشان ریلیاں اگر ائمۂ حرمین طیبین کی قیادت میں مکۂ مکرمہ اور مدینۂ منورہ میں بھی نکال لی جائیں، تو پوری اُمّتِ مسلمہ کے جذبات کی ترجمانی کا روح پرور اور ایمان افروز نظارہ دیکھنے کو ملے گا۔

گوادر چائنا کوریڈور:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے روایتی حلیف ملک چین کی جانب سے پاکستان میں 45ارب ڈالر کی سرمایہ کاری باہمی دوستی کا بین الاقوامی سطح پر ایک مثالی مظہر ہے۔ کسی ترقی پذیر ملک میں بیک وقت اتنی بڑی سرمایہ کاری کی مثال ماضی قریب میں ہمارے علم میں نہیں ہے، اسی لیے بھارتی ذرائع ابلاغ میں اس پر انتہائی ناپسندیدگی اور تحفظات کا اظہار کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ پیکیج ترقیاتی منصوبوں کی صورت میں ہے، اس لیے اس سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ساتھ ساتھ ہنر منداور غیر ہنر مند مزدور طبقے کے لیے بھی روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے اور ان منصوبوں کو خام مال فراہم کرنے والی بعض صنعتوں (مثلاً اسٹیل، سیمنٹ، اسٹون کرشنگ، ٹرانسپورٹیشن وغیرہ) کے لیے بڑے مواقع پیدا ہوں گے۔ اور اگر حسبِ توقع یہ منصوبے پایۂ تکمیل تک پہنچ گئے، تو پاکستان عالمی تجارتی مرکز بن سکتا ہے اور وسطی ایشیائی ریاستوں کے لیے عالمی تجارت کا ایک متبادل روٹ وجود میں آئے گا۔ وہ ان کی عالمی تجارت کے لیے ایک نیا گیٹ وے بن جائے گا اور اس سے اِن ریاستوں کا رشین فیڈریشن پر انحصار ختم ہو جائے گا۔

ان منصوبوں کی تکمیل سے پاکستان معاشی خود کفالت کی جانب پیش قدمی کر پائے گا، لیکن اس سے جن دوستوں اور دشمنوں کے مفادات پر ضرب پڑے گی، وہ ان منصوبوں کو ناکام بنانے کے لیے ہر حربہ آزمائیں گے اور ان منصوبوں کی تکمیل میں مقامی مزاحمت کار پیدا کیے جائیں گے۔ لہٰذا پاکستانی مسلمان سورۃ الفیل دعا کی نیت سے بکثرت پڑھا کریں اور یہ دعا بھی پڑھا کریں:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ تَدْمِیْرَھُمْ فِیْ تَدْبِیْرِھِمْ۔

ترجمہ: اے اللہ! ان کی چالوں میں اُن کے لیے ہلاکت کے اسباب مقدر فرما۔ اور

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُبِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ۔

ترجمہ: اے اللہ! ہم تجھے ان کی گردنوں پر مسلّط کرتے ہیں اور ان دشمنوں کے شر سے تیری

پناہ میں آتے ہیں۔

قومی معاملات اور بین الممالک معاہدات پر رازداری کا پردہ نہیں ہونا چاہیے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا براہِ راست کریڈٹ حکومتِ وقت اور حکمراں جماعت ہی کو جاتا ہے، لیکن معاہدات بہرصورت ممالک اور اقوام کے درمیان ہوتے ہیں اور ان کا مالی بار قوم وملک ہی کو اٹھانا ہوتا ہے۔ لہٰذا قومی نمائندوں یا کم از کم پارلیمانی جماعتوں کی قیادت کو ان معاہدات کی ضروری تفصیلات کے بارے میں علانیہ یا اگر کوئی مصلحت رازداری کا تقاضا کرتی ہے، تو پس پردہ بریفنگ لازماً دینی چاہیے کہ ان کی ادائیگی کا طریقۂ کار کیا ہوگا، یہ Build, Operate, Transfer یعنی BOT کی بنیاد پر ہوں گے یا ان کی ادائیگیوں کا طریقۂ کار کچھ اور ہوگا۔

اسی طرح روٹ کے بارے میں بھی غلط فہمیوں یا جائز خدشات کا ازالہ ہونا چاہیے اور یہ کہ اصل منصوبہ کیا تھا، اس میں تبدیلی ہوئی ہے یا نہیں، اگر ہوئی ہے تو اس کا سبب ہماری حکومتِ وقت کی ترجیحات ہیں یا چین کی خواہشات ہیں۔ نیز اگر کوئی تبدیلی عمل میں آتی ہے تو اس کے پیچھے کیا حکمت کارفرما ہے۔ سیاسی رہنماؤں کو بھی ہر مسئلے کو منفی پروپیگنڈے کی نذر نہیں کرنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ دوست ملک کی قیادت حیرت واستعجاب کے عالم میں یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ پاکستان عجب ملک اور پاکستانی عجب قوم ہیں کہ ان کی مدد کرنا بھی اپنے آپ کو مشتبہ بنانا ہے۔ اسی طرح کی لغو اور لایعنی بحث اُس وقت بھی چھیڑی گئی تھی، جب زرِمبادلہ کے بحران سے نمٹنے کے لیے سعودی عرب نے ڈیڑھ ارب ڈالر کی امداد دی تھی۔

9 مئی 2015ء

پرویز رشید کے فرمودات

آرٹس کونسل کراچی میں ''ادبی سیمینار'' سے خطاب کرتے ہوئے جناب پرویز رشید نے فرمایا: ''ہماری نفسیات کا حصہ ہے کہ بچوں کو بھی علم سے محروم رکھو اور بڑوں کو بھی علم سے محروم رکھو۔ اب کتاب تو وجود میں آچکی، اسکول تو وجود میں آچکے، جب پاکستان بنتا ہے، یہ انگریز کا تحفہ ہے، اس کو بند نہیں کیا جا سکتا، اس سے جان نہیں چھڑائی جا سکتی۔ پھر اس کا متبادل تلاش کیا گیا کہ کتاب چھپتی رہے لیکن وہ کتاب نہ چھپے جو آپ تحریر کرتے ہیں، وہ فکر عام نہ ہو جس کی شمع آپ جلاتے ہیں۔ لوگوں کو پڑھنے کے لیے کتاب دی جائے تو کون سی دی جائے؟: ''موت کا منظر'' عرف مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ (قہقہے)۔ جہالت کا وہ طریقہ جو پنڈت جواہر لال نہرو کو سمجھ نہیں آیا وہ ہمارے حکمرانوں کو سمجھ آ گیا کہ لوگوں کو جاہل کیسے رکھا جا سکتا ہے۔۔۔ کہ فکر کے متبادل فکر دو، لیکن فکر کے متبادل ''مردہ فکر'' دے دو۔ اور پھر منبع جو فکر پھیلاتا ہے، کیا ہو سکتا تھا؟، لاؤڈ اسپیکر۔۔۔ لاؤڈ اسپیکر بھی اُس کے قبضے میں دے دو، دن میں ایک دفعہ کے لیے نہیں بلکہ پانچ دفعہ کے لیے دے دو۔ اب آپ کے پاس اتنے اسکول اور اتنی یونیورسٹیاں نہیں ہیں، جتنی ''جہالت کی یونیورسٹیاں'' ان کے پاس ہیں (تالیاں)، اور بیس پچیس لاکھ طالب علم جن کو وہ ''طالبِ علم'' کہتے ہیں۔

آپ کو تو یہ شکایت ہے کھوڑو صاحب! کہ سندھی سے سندھ کی زبان چھین لی گئی، پختون سے پختون کی زبان چھین لی گئی، پنجابی سے پنجاب کا ورثہ چھین لیا گیا، بلوچستان سے اس کی تہذیب اور ثقافت چھین لی گئی۔ لیکن مجھے یہ بتایئے کہ یہ جو ''یونیورسٹیاں'' ہیں،

جن کو ہم سب چندہ بھی دیتے ہیں۔۔۔عید بقرعید پر فطرانے اور چندے اور کھالیں دیتے ہیں۔۔۔خود پالتی ہے ہماری سوسائٹی۔۔۔یہ جو''جہالت کی یونیورسٹیاں ہیں''۔۔۔پنجابی، سندھی، پٹھان، مہاجر، بھائی! ان مسئلوں کا تو کوئی حل نکل سکتا ہے، ان کا حل پاکستان کے آئین میں بھی موجود ہے، بدقسمتی یہ کہ چونکہ آئین پر عمل نہیں ہوتا اس لیے جھگڑا باقی رہ جاتا ہے۔لیکن جو فکر انہوں نے دے دی، جو نفرت، تعصب، تنگ نظری انہوں نے پھیلا دی اور جو روز پھیلاتے ہیں اور جو تقسیم انہوں نے ڈال دی۔اسکول میں نصاب میں ایک ہی جماعت میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو تقسیم کر دیا گیا، ایک فرقے کا نصاب یہ ہوگا کہ زکوٰۃ کیسے دینی ہے اور دوسرے فرقے کا یہ نصاب ہوگا کہ زکوٰۃ کیسے نہیں دینی؟۔یہ پڑھایا جائے گا بچوں کو، ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے ان کو پاکستانی بنانا ہے، ہم ان کو پاکستانی تو نہیں بنا پائیں گے یہ دو مختلف چیزیں پڑھا کر، تو یہ حاوی ہوا آپ کی کتاب پر جہالت کا علم''۔

میں نے موصوف کے فرمودات لفظ بہ لفظ اس لیے نقل کیے ہیں کہ جب کوئی معقول عذر نہیں بن پاتا، تو کہا جاتا ہے کہ میری بات کو سیاق وسباق (Context) سے ہٹ کر نقل کر دیا گیا ہے یا غلط Quote کیا جارہا ہے، اس میں قطع وبرید یا تحریف کی گئی ہے۔قارئین سے گزارش ہے کہ اسے ایک بار پھر پڑھ لیں، سیاق بھی موجود ہے اور سباق بھی۔اس بیان میں دین اور اہلِ دین، دینی مدارس وجامعات، دینی طلبہ اور علماء سے نفرت کا لاوا پھٹ رہا ہے اور الاؤ دہک رہا ہے۔اللہ تعالیٰ نے دین اور اہلِ دین سے دشمنانِ دین کی نفرت کو اِن کلمات میں بیان فرمایا ہے:

''اے اہلِ ایمان! غیروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ، وہ تمہاری بربادی میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے، انہیں (تو) وہی چیز پسند ہے جس سے تمہیں تکلیف پہنچے، اُن کے مونہوں سے بغض عیاں ہو چکا اور جو (نفرت) وہ اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے ہیں، اِس سے بہت زیادہ ہے''۔(آلِ عمران:118)

موصوف کے نزدیک موت اور اس کے بعد کے احوال بیان کرنا''جہالت'' ہے، اُن

کی توانا فکر کے مقابلے میں ''مُردہ فکر'' ہے۔ دین کا علم حاصل کرنے والے ''طالبِ علم'' کہلانے کے حق دار نہیں ہیں اور دینی مدارس ''جہالت کی یونیورسٹیاں'' ہیں۔ موت اور اس کے بعد کے احوال اور آخرت کے معاملات یعنی جزا وسزا اور جنت وجہنّم کے بارے میں قرآن وسنت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم ﷺ کے ارشادات واضح ہیں، ان پر پرویز رشید کے علاوہ ہر مومن کا ایمان ہے اور ''ایمان بالآخرت'' کے بغیر کوئی شخص مسلمان کہلانے کا حق دار نہیں بن سکتا۔ یہ شریعت کی توہین نہیں تو اور کیا ہے؟۔

جزا اور سزا اور جنت اور جہنّم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ''پس جس (کی نیکی) کے پلڑے بھاری ہوں گے، تو وہ پسندیدہ زندگی میں ہوگا اور جس (کی نیکی) کے پلڑے ہلکے ہوں گے، تو اس کا ٹھکانا ''ہاویہ'' ہوگا اور آپ کیا سمجھے کہ ''ہاویہ'' کیا ہے، وہ سخت دہکتی ہوئی آگ (کا سب سے نیچے والا گڑھا) ہے''۔

(القارعۃ: 11-6)

(۲) ''(رہا اللہ کے برگزیدہ بندوں کا معاملہ تو) اُن کے لیے مقررہ روزی ہے، عمدہ میوے ہیں اور وہ عز وجاہ کے ساتھ نعمت والی جنتوں میں ایک دوسرے کے سامنے مسند نشین ہوں گے، اُن کے لیے شرابِ (طہور) کا جام گردش کر رہا ہوگا، وہ شراب سفید اور پینے والوں کے لیے لذیذ ہوگی، نہ اس سے دردِ سر ہوگا اور نہ وہ اس سے بہکیں گے اور ان کے پاس (عفت وحیا سے) نگاہیں پست کیے ہوئے بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی، گویا کہ وہ انڈوں (کے چھلکوں کے نیچے نرم ونازک) پوشیدہ جھلی ہے، پس وہ جنتی روبرو ہوکر ایک دوسرے سے سوال کریں گے، ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا: بے شک (دنیا میں) میرا ایک ساتھی تھا، جو کہا کرتا تھا: کیا تم بھی (قیامت کی) تصدیق کرنے والوں میں سے ہو؟: جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجائیں گے تو کیا (وہاں) ضرور ہم کو بدلہ دیا جائے گا؟۔ (دوسرا جواباً) کہے گا: کیا تم اُس (کی حالت) کو جھانک کر دیکھو گے؟، پھر وہ اس کو جھانک کر دیکھے گا تو اس کو دوزخ کے درمیان پائے گا۔ پھر وہ (اس سے) کہے

گا: اللہ کی قسم! قریب تھا کہ تو مجھے بھی ہلاک کر دیتا اور اگر مجھ پر میرے رب کا احسان نہ ہوتا تو میں بھی (آج) دوزخ میں پڑا ہوتا تو (جنتی لوگ فرشتوں سے کہیں گے:) اُس پہلی موت کے سوا کیا اب ہم مرنے والے نہیں ہیں؟ اور کیا ہم کو عذاب نہیں دیا جائے گا؟، (پھر تو) بے شک یہ بہت بڑی کامیابی ہے، ایسی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے، آیا یہ زیادہ اچھی مہمانی ہے یا تھوہر کا درخت؟، بے شک ہم نے اس کو ظالموں کے لیے عذاب بنا دیا ہے، بے شک وہ ایسا درخت ہے جو دوزخ کی جڑ سے نکلتا ہے، اس کے شگوفے شیطانوں کے سروں کی طرح ہیں، (دوزخی) ضرور اسی درخت سے کھائیں گے، سو اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر بے شک ان کے لیے (پیپ) ملا ہوا گرم پانی ہوگا، پھر بے شک ان کو ضرور دوزخ کی طرف لوٹنا ہوگا''۔ (الصّٰفّٰت: 68-40)

مسلم لیگ (ن) جو اپنے آپ کو اُس مسلم لیگ کی جانشیں سمجھتی ہے، جس نے قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم کی پرعزم قیادت میں پاکستان حاصل کیا تھا، تو اسے پرویز رشید کے دین اور اہلِ دین کے بارے میں نفرت سے بھرپور اِس معاندانہ بیان کا جائزہ لینا چاہیے، اِس سے پاکستان کے تمام دین دار اور مذہبی طبقات کی دل آزاری ہوئی ہے، جذبات انتہائی حد تک مجروح ہوئے ہیں اور اس کی فوری تلافی ضروری ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کے کریڈٹ پر تو اسلامی جمہوری آئین کی تشکیل ہے، اِرتدادِ قادیانیت کی ساتویں آئینی ترمیم ہے، جس میں عقیدۂ ختمِ نبوت کو تحفظ دیا گیا ہے، تمام مسلم حکمرانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ہے، اس کے برعکس مسلم لیگ کے کریڈٹ پر نظریۂ پاکستان کے حوالے سے ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔

مسلم لیگ (ن) کے قائد وزیر اعظم پاکستان جناب محمد نواز شریف اور وزیر اعلیٰ پنجاب جناب محمد شہباز شریف کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ اپنے خاندانی پسِ منظر اور اپنے مزاج کے اعتبار سے یہ لوگ مذہب سے زیادہ قریب ہیں۔ اگر یہ تاثر کسی حد تک حقیقت پر مبنی ہے، تو پرویز رشید کو ایک لمحے کے لیے بھی وزارت کے منصب پر فائز نہیں رہنا چاہیے،

ورنہ اسے دوعملی اور منافقت سے تعبیر کیا جائے گا۔ پرویز رشید کی اس ہرزہ سرائی پر مذہبی طبقات کا احتجاج بالکل بجا ہے، لیکن بدقسمتی سے شریف برادران نے اصلاح پر مبنی بہت سے مشوروں اور آراء کے بارے میں اپنے کان بند کر رکھے ہیں اور دل ودماغ کو تالے لگا دیے ہیں۔ انہیں ایک بار پھر مشورہ ہے یہ تالے کھول دیں، حق کی آواز پر کان دھریں اور اقتدار کے لیے قدرت کی عطا کی ہوئی فرصت کو اپنے حق میں ابتلا وامتحان کی بجائے انعام میں تبدیل کریں۔

ان مواقع پر کہہ دیا جاتا ہے: ''ہمیں افسوس ہے، ہم معذرت کرتے ہیں''۔ ''معذرت'' کے معنی ہوتے ہیں: ''To Excuse''یعنی اپنی غلطی کی توجیہ کرنا، تاویل کا سہارا لینا اور اس کے لیے عذر تراشنا، یہ ابلیسی شِعار ہے کہ اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کے حضور عقلی دلیل کا سہارا لیا اور ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ قرار پایا۔ اس کے برعکس ''عفو'' کے معنی ہیں: ''اپنی غلطی کو تسلیم کر کے متاثرہ فریق سے معافی مانگنا''۔

15 مئی 2015ء

پاکستان کی ابتلا

پاکستان میں غیر قانونی اور ممنوعہ اسلحے کی آمد بڑے پیمانے پر جہادِ افغانستان کے بعد شروع ہوئی، اس کے ذیلی ثمرات کے طور پر ہیروئن کی وبا عام ہوئی۔ 9/11 کے بعد جب سے ہم نے دہشت گردی کے خلاف امریکا کی زیرِ قیادت عالمی جنگ کو گود لیا ہے اور اسے اُس وقت کے صدرِ پاکستان جناب جنرل (ر) پرویز مشرف نے ''سب سے پہلے پاکستان'' کا خوبصورت نام دیا، ہم مسلسل ابتلا کے دور سے گزر رہے ہیں اور یہ عہدِ ابتلا ختم ہونے میں نہیں آرہا۔ امن وسکون کے وقفے ضرور آتے رہے اور ''آپریشن ضربِ عضب'' کے بعد صورتِ حال میں کافی بہتری آئی، لیکن وقفے وقفے سے دشمن اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ پشاور، لاہور، شکارپور اور کراچی کے سانحات اس کی بڑی علامات ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم آگ اور خون کے ایک الاؤ پر کھڑے ہیں، جو کسی بھی وقت اُبل کر باہر آسکتا ہے۔ دشمن یہ بھی احساس دلانا چاہتا ہے کہ پہل کرنے اور اپنے من پسند ہدف کا انتخاب کرنے کی صلاحیت اس کے پاس موجود ہے۔

چیف آف آرمی اسٹاف جناب جنرل راحیل شریف پر تا حال قوم کو اعتماد ہے، ان کا عزم راسخ ہے، ان کے اخلاص پر قوم کو یقین ہے اور وہ ہر آن متحرک اور مُستعد نظر آتے ہیں۔ لیکن چونکہ دہشت گردی کا نیٹ ورک اور اس وبا کی جڑیں اپنی گہرائی وگیرائی کے اعتبار سے ہمہ گیر اور محیط ہیں، اس لیے لگتا ہے کہ اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں کافی وقت لگے گا، یہ نیٹ ورک شیطان کی آنت کی طرح پھیلا ہوا ہے اور اس کا زہر دور دور تک سرایت

کیے ہوئے ہے۔

دوسری جانب ہماری سیاسی قیادت ایک دوسرے کے لیے بے رحم ہے اور فریقِ مخالف بالخصوص اقتدار کے مسند نشیں کو زک پہنچانے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے کو مہلت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جب ملی مسائل یا امراض مُوذی بن جائیں اور مَرَضِ مُزمِن (Chronic) ہو جائے، تو اس کے لیے قومی اتفاقِ رائے، طویل المدت منصوبہ بندی اور بڑی سرجری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جسدِ ملّی کے صحیح سالم اعضا کو اس کی زد سے بچانا مقصود ہو تو گلے سڑے اعضاء کو کاٹ کر پھینکنا ہوتا ہے۔ پس سرجن اگر رحم کرنے لگے تو وہ جراحی کر ہی نہیں سکتا، اس کے مریض پر ترحُّم کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ جسم کے غیر متاثرہ حصے کو بچائے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسماعیلی کمیونٹی پاکستان کی سب سے پُرامن اور بے ضرر کمیونٹی ہے۔ میں گزشتہ 51 سال سے کراچی میں مقیم ہوں، میں نے اس پوری نصف صدی میں کبھی نہیں سنا کہ اسماعیلی کمیونٹی کا کسی سے تصادم ہوا ہو۔ سب نے دیکھا کہ اتنے بڑے اور انتہائی المناک سانحے کے باوجود اسماعیلی کمیونٹی نے کوئی احتجاج نہیں کیا، توڑ پھوڑ تو کیا وہ گھروں سے باہر بھی نہیں نکلے، ایک کنکر تک نہیں پھینکا اور یہ اُن کے پُرامن ہونے کی ایک روشن مثال ہے۔ عقائد ونظریات سب کے اپنے اپنے ہوتے ہیں، لیکن کسی کے مثبت سماجی رویّے کی تحسین کی جانی چاہیے۔ اس کمیونٹی کے روحانی سربراہ پرنس کریم آغا خان کے عالمی روابط اور اثرات ہیں۔ لہٰذا اس سانحے سے عالمی سطح پر پاکستان کا امیج مزید خراب ہوگا۔

کراچی کے نظم کی منجملہ خرابیوں میں سے پولیس اور شہری خدمات کے اداروں کا سلیکشن اور تقرر میرٹ پر نہ ہونا ہے، الیکٹرونک میڈیا پر ماہرین اور تجزیہ کاروں کا اس پر اتفاقِ رائے نظر آیا کہ کراچی کے مسائل کے پائیدار حل کے لیے پولیس، شہری نظم اور شہری خدمات کے اداروں کے اہلکاروں کا سیاست سے پاک ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا خواب ہے کہ مستقل قریب میں اس کی تعبیر پانا عملاً ممکن نظر نہیں آتا۔ اسی طرح صوبہ سندھ

میں دو بڑے اسٹیک ہولڈرز یعنی پاکستان پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے اتفاقِ رائے اور عملی یکسوئی کے بغیر بھی دیر پا امن ممکن نہیں ہے اور یہ کام الزامات اور جوابی الزامات یعنی Blame Game کے ذریعے سے نہیں ہوسکتا۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ سیاست اور مذہب کو پوری قوت کے ساتھ جرائم سے پاک کیا جائے۔ جب تک سیاست و مذہب اور جرائم کا تعلق قائم رہے گا، اصلاح کی توقع عَبث ہے۔ سو جرائم پیشہ عناصر کو سیاست اور مذہب کی چھتری میں تحفظ دینے کی روایت یکسر ختم ہونی چاہیے، سب جرم سے پاکیزہ سیاست کو شِعار بنائیں۔

ایک تجویز میڈیا کے ذریعے یہ سامنے آئی ہے کہ دستور کے آرٹیکل 245 کے تحت گورنر راج لگا کر کراچی کو فوج کے حوالے کر دیا جائے۔ میری دانست میں یہ رائے ممکن ہے کہ اخلاص پر مبنی ہو، لیکن یہ فوج کے مفاد میں نہیں ہے۔ موجودہ انتظامی ڈھانچے کے ساتھ فوج بھی شاید حسبِ توقع اور خاطر خواہ نتائج نہ دے سکے۔ جب کہ انتظامیہ کے اہل کاروں اور عمل داروں کو یہ پتا ہو کہ اس عارضی مدت کے بعد اپنے ایک ایک اقدام کے لیے انہیں کسی اور کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔ اس سے فوج کی نیک نامی بھی متاثر ہوسکتی ہے، جبکہ موجودہ صورتِ حال میں ناکامی کی ذمے داری سیاسی حکمرانوں پر آسانی سے عائد کی جاسکتی ہے۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ لوگوں کے ٹیکسوں کے پیسے سے ریلوے، پاکستان اسٹیل اور پی آئی اے کے عملے کو تنخواہیں دی جاتی ہیں اور خسارے پورے کیے جاتے ہیں۔ لیکن اگر پی آئی اے اور پاکستان اسٹیل میں ملازمین کو اوسط مسلّمہ عالمی معیارات پر لانے یا نجکاری کرنے یا کسی بھی اصلاح کی بات کی جائے تو سیاسی جماعتیں لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں آجاتی ہیں، یہ پاکستان سے وفا نہیں ہے۔ سنا ہے پاکستان ریلوے کی کارکردگی میں قدرے بہتری آئی ہے، اگر یہ خبر درست ہے تو اس کا کریڈٹ خواجہ سعد رفیق کو ضرور ملنا چاہیے۔

یہ مطالبہ بھی کیا جاتا ہے کہ پاکستان بالخصوص کراچی کو اسلحہ سے پاک کر دیا جائے۔ دو کروڑ آبادی پر مشتمل گنجان آباد شہر کراچی میں ہر مکان اور فلیٹ کے ہر ہر گوشے سے اسلحہ

تلاش کر کے ضبط کرنا آسان کام نہیں ہے، صرف ایسا مطالبہ کرنا آسان ہے، اس کے لیے لاکھوں کی نفری چاہیے۔ سو مسائل بہت گھمبیر اور پیچیدہ ہیں اور پاکستان اور اہلِ پاکستان کی ابتلا کا خاتمہ ابھی کافی دور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انتہائی عجز و نیاز اور اخلاص کے ساتھ ہماری دعا ہے کہ ایسا ہو جائے اور وہ اس پر قادر ہے کہ پلک جھپکتے ہی سب کچھ بدل جائے، لیکن زمینی حالات حوصلہ افزا نہیں ہیں۔

ہمارا الیکٹرونک میڈیا بھی بڑا بے رحم ہے۔ ایک بڑے قومی مسئلے پر بریفنگ دینے کے لیے وزیر اعظم نے قومی سیاسی رہنماؤں کا اجلاس پہلے سے طلب کیا ہوا تھا اور سب لوگ اجلاس کے لیے پہنچ گئے، ظاہر ہے کہ طویل دورانیے کے اجلاس کے لیے کھانے کا اہتمام بھی پہلے سے ہوتا ہے۔ اس دوران بدقسمتی سے کراچی کا سانحہ رونما ہو گیا۔ میڈیا پر سیاسی رہنماؤں کے کھانے کی تصاویر دکھا کر اور کڑوے کسیلے تبصرے کر کے قوم کے سامنے اُن کی تذلیل کرنا کہ مرغن کھانوں کے چٹخارے لے رہے ہیں، اس سے اُن کا وقار مجروح ہوا، اتنی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ کیا خود میڈیا کے لوگوں نے اُس دن کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ پس گزارش ہے کہ خدارا رحم فرمائیں اور کسی کی تذلیل میں اس حد تک نہ جائیں۔ کراچی کا المناک سانحہ چین کی بڑی سرمایہ کاری اور عالمی سطح کے حامل ''پاک چائنا کوریڈور'' کے منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے کہیں ہمارے دشمنوں کی سازش تو نہیں ہے؟۔ تاہم ایجنٹ اور کارندے تو مقامی ہی ہوتے ہیں، لیکن بعض اوقات منصوبہ ساز اور وسائل فراہم کرنے والے بیرونی دشمن بھی ہوتے ہیں، لہٰذا اس جہت سے بھی تحقیق ہونی چاہیے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ایک منظم، ماہرانہ اور جامع انٹیلی جنس کے ذریعے دہشت گردی کے اس نیٹ ورک کی کھوج لگائی جائے اور ان کے سرچشموں اور منصوبہ بندی کے مراکز تک رسائی حاصل کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ تباہ کن اسلحے کو ذخیرہ کرنے اور اپنے اہداف تک پہنچانے کے لیے نقل و حمل کون فراہم کرتا ہے اور دہشت گردوں کو بڑے شہروں میں محفوظ کمین گاہیں کون فراہم کرتا ہے؟۔ جب تک یہ پورا نیٹ ورک دریافت نہیں ہوگا،

Case to Case کارروائیوں سے اس کا مکمل سدِ باب نہیں ہو پائے گا۔

مسلمانوں پر ابتلائیں پہلے بھی آتی رہی ہیں اور اس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے:

ترجمہ: ''کیا تم نے گمان کر لیا ہے کہ تم (یونہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟، حالانکہ ابھی تک تم پر ایسی آزمائشیں نہیں آئیں، جو تم سے پہلے لوگوں پر آئی تھیں، اُن پر آفتیں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ (اس قدر) جھنجھوڑ دیے گئے کہ (اُس وقت کے) رسول اور اُن کے ساتھ ایمان والے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟، سنو! (تم اپنے حصے کا کام کر چکے) بے شک (اب) اللہ کی مدد قریب ہے''۔ (بقرہ:214)

مگر وہ ابتلائیں ہمارے اعتقادی اور خارجی دشمنوں کی طرف سے تھیں اور آج ہم جس آزمائش سے دوچار ہیں، وہ ہمارے ایسے دشمنوں کی جانب سے ہیں جو ہمارے ملی وجود میں پوری طرح سرایت کر چکے ہیں، یہ ہمارے ہم رنگ اور ہم وضع دشمن ہیں، یہ آستین کے سانپ ہیں، ان کو تلاش کر کے کیفرِ کردار تک پہنچانا کافی دشوار ہے۔

16 مئی 2015ء

آیئے! آپ کی ملاقات ایک ''جاہل'' سے کراتے ہیں

15 مئی کے کالم میں بزعمِ خویش علامۃ الدھر وفاقی وزیرِ اطلاعات جناب پرویز رشید کے علمائے دین اور دینی مدارس کے بارے میں فرمودات مِن وعَن آپ کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ ان میں انہوں نے دینی مدارس کو ''جہالت کی یونیورسٹیاں'' اور دین کے مابعدَ الموت اَحوال اور جزاوسزا کے عقیدے کو ''مُردہ فکر'' سے تعبیر کیا تھا۔ آیئے! آج آپ کی ملاقات اُن کے مطابق ایک ''جاہل'' سے کراتے ہیں، جو دینی مدارس کی پیداوار ہیں۔ آپ ہمارے دارالعلوم جامعہ نعیمیہ کے شیخ الحدیث، اپنے عہد کے امام المفسرین والمحدّثین اور فقیہِ عصر علامہ غلام رسول سعیدی ہیں۔ آپ کا سن پیدائش 1937ء ہے اور آپ نے صرف ساتویں جماعت تک اسکول میں پڑھا اور اس کے بعد آپ کی تعلیم اور تعلُّم کی پوری زندگی مدارس میں گزری۔

شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی نے سات ضخیم مجلّدات اور 7850 صفحات پر مشتمل انتہائی وقیع شرح صحیح مسلم لکھی۔ 605 صفحات پر مشتمل فہرستِ موضوعات اور اشاریہ (Index) اس کے علاوہ ہے۔ بارہ ضخیم مجلّدات اور 11000 صفحات پر مشتمل اس عہد کی سب سے جامع تفسیر ''تبیان القرآن'' لکھی، فہرستِ موضوعات اور اشاریہ اس کے علاوہ ہے۔ سولہ ضخیم مجلّدات اور 15500 صفحات پر مشتمل ''نعمۃ الباری شرح صحیح بخاری'' لکھی، فہرستِ موضوعات اور اشاریہ اس کے علاوہ ہے۔ تفسیر تبیان القرآن کا خلاصہ الگ سے ''انوارِ تبیان القرآن'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ تذکرۃ المحدّثین، مقالاتِ سعیدی،

مقامِ ولایت ونبوت اور دیگر متعدد تصانیف اس کے علاوہ ہیں۔ اگر تفسیر تبیان القرآن، شرح صحیح مسلم اور نعمۃ الباری کی متعدد تحقیقی ابحاث کو الگ کتب کی شکل میں شائع کیا جائے تو یہ تعداد سو تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ سب کام انہوں نے 1984ء سے اب تک انجام دیا ہے اور ایک جدید تفسیر "تبیان الفرقان" زیرِ طبع وتصنیف ہے۔ الحمدللہ یہ کتب پاکستان اور پاکستان سے باہر اہلِ علم کے ذاتی کتب خانوں اور علمی لائبریریوں کی زینت ہیں۔ علامہ صاحب کی شخصیت اور تصانیف پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے متعدد یونیورسٹیوں میں لکھے جا چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

میں ان کتب سے وقیع، تحقیقی، تفسیری اور فقہی مباحث کا حوالہ دینے سے اجتناب کرتے ہوئے چند جدید مسائل کی جانب قارئین کو متوجہ کروں گا۔ جب ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا طبی نظریہ اور تحقیق سامنے آئی، تو علامہ صاحب نے شرح صحیح مسلم میں اس کے جواز پر تفصیلی بحث کی اور ایک عظیم حنفی فقیہہ علامہ شمس الدین محمد بن احمد سرخسی متوفی (483ھ) کا حوالہ دیا کہ شوہر اور بیوی کے ازدواجی تعلق کے بغیر اگر شوہر کا نطفہ بیوی کے رحم میں پہنچ جائے اور اس کے بیضہ سے امتزاج کے بعد حمل قرار پائے اور بچہ پیدا ہو جائے، تو اس کا نسب شوہر سے ثابت ہو جائے گا۔ ہمارے ایک عالم مولانا عبدالمجید نے برسٹل یو۔ کے میں مسیحی اسکالرز کے ساتھ جدید مسائل پر مکالمہ کرتے ہوئے اس کا حوالہ دیا، تو دو اسکالر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ انہوں نے کہا: "آج سے ایک ہزار سال پہلے اگر اسلام کے کسی عالم نے یہ امکانی تصور پیش کیا ہے، جس کے طبی اعتبار سے وقوع پذیر ہونے کا اُس وقت دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا، تو اس کے پیچھے وحیِ ربانی کا نور اور فیضان ہی ہو سکتا ہے۔ سورۃ الزلزال کی تفسیر میں زلزلے کی سائنسی تحقیق کرتے ہوئے ماضی کے زلزلوں کی پوری تاریخ پیش کر دی اور زلزلہ پیمائی کے لیے ریکٹر اسکیل کا تعارف پیش کیا۔ سورۃ البروج پر بحث کرتے ہوئے بارہ برجوں، ان کی ہیئت واسماء کے بارے میں پوری تفصیل بیان کی۔ حرمتِ خمر کی بحث کرتے ہوئے حرامِ قطعی شرابوں اور حرامِ ظنّی کے درمیان فرق کو بیان

کیا اور دونوں کے احکام جدا جدا بیان کیے۔ اسلام کی رو سے اِسقاطِ حمل تو جائز نہیں ہے اور جنین میں جان پڑنے کے بعد اِسقاط (Abortion) قتلِ نفس ہے، مگر علامہ سعیدی نے وہ صورتیں اور انسانی اَحوال بیان کر دیے ہیں، جن کی رو سے احتیاط کی بنا پر امتناعِ حمل کے طریقوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

انعامی بانڈز پر ملنے والے انعام کے جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں علماء کی دو آراء ہیں، کیونکہ یہ فقہی اور اجتہادی مسئلہ ہے۔ علامہ صاحب نے قوی اور مفصل دلائل کے ساتھ اس کے جواز کو ثابت کیا ہے۔ اسی طرح بعض علماء زکوٰۃ کے علاوہ ریاست کی طرف سے ٹیکس یعنی محصولات (Revenues) حاصل کرنے کو جائز نہیں سمجھتے، علامہ صاحب نے اس کے جواز کے نقلی اور عقلی دلائل بیان کیے ہیں۔ لیکن یہ بھی قرار دیا ہے کہ عوام سے حاصل کیے ہوئے مالی واجبات قوم کی امانت ہوتے ہیں اور ان میں خیانت، لوٹ کھسوٹ، اسراف وتبذیر، عیاشی اور اللّے تللّے کسی بھی درجے میں جائز نہیں ہیں۔ اَمراض کے متعدی ہونے کے بارے میں مختلف روایات ہیں، علامہ صاحب نے شرح صحیح مسلم میں ان میں تطبیق کرتے ہوئے امراض کے متعدی ہونے کو ثابت کیا ہے، لیکن یہ بتایا کہ اسباب، خواہ نفع کے ہوں یا ضرر کے، مؤثر بالذات نہیں ہوتے، اُن کی تاثیر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ علامہ صاحب نے ووٹ کی شرعی حیثیت پر بھی بحث کی ہے، بعض علماء نے ووٹ کو گواہی سے تعبیر کیا ہے، علامہ صاحب نے اس نظریے سے اختلاف کیا اور بتایا کہ یہ قضا ہے اور ہر ووٹر اپنے آپ کو اپنے ضمیر اور اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ سمجھ کر ووٹ کی پرچی پر مہر لگاتا ہے کہ میرے فیصلے کے مطابق اس منصب کا حق دار فلاں شخص ہے۔ قومی اسمبلی یا صوبائی اسمبلی یا کسی بھی سطح کے حلقۂ نیابت کا منصب تفویض کرنے کے لیے ووٹرز کی حیثیت مجلسِ قضا کی سی ہے اور جس طرح ایک بڑے عدالتی بینچ میں اگر فیصلہ اتفاقِ رائے سے نہ ہو تو کثرتِ رائے سے ہوتا ہے، یہی حیثیت ووٹ کی بھی ہے، شہادت تو قبول بھی کی جاسکتی ہے اور رد بھی ہوسکتی ہے۔

یہ مسئلہ علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے کہ آیا انجکشن سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟۔ علامہ صاحب نے تفصیلی دلائل سے ثابت کیا کہ انجکشن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ معنوی طور پر انجکشن سے انسانی بدن کو براہِ راست وہی فائدہ پہنچتا ہے، جو معدے میں غذا کے تحلیل ہونے، فُضلات اور صالح اجزا کے جدا ہونے اور پھر مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے وٹامن، منرل، پروٹین اور گلوکوز کی شکل میں بدن کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لہٰذا یہ معنوی طور پر مُفسِدِ صوم ہے، لیکن اس سے قضا لازم آئے گی، کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی قدرت سے مادہ جانور کے معدے کے کارخانے میں غذا کے تحلیل اور ہضم ہونے کے بعد اس کے بعض اجزاء گوبر کی صورت میں آنتوں کے راستے سے خارج ہوتے ہیں اور بعض صالح اجزاء مختلف مراحل سے گزر کر خون میں شامل ہوتے ہیں اور اسی کیمیکل پروسیس کے دوران رنگ دار اور ناپاک گوبر اور رنگین خون کے درمیان میں سے چاندنی کی طرح چمکتا ہوا سفید اور شفاف دودھ جانوروں کے تھنوں میں آتا ہے اور اس سے انسانوں اور جانوروں کے بچے استفادہ کرتے ہیں۔ علامہ صاحب نے طبی لحاظ سے اس کی تفصیل بیان کی ہے اور قرآن مجید کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کی شانِ اعجاز کو دلائل سے بیان کیا اور یہ بھی بتایا کہ ماں کے رحم میں جنین کو غذا کیسے ملتی ہے، کن مراحل سے گزر کر دودھ ماں کے پستان اور جانور کے تھنوں تک پہنچتا ہے اور یہ کہ نر حیوان میں دودھ کیوں پیدا نہیں ہوتا ہے، وغیرہ۔

زمین کی حرکت علماء کے درمیان مختلف فیہ مسئلہ رہا ہے، تبیان القرآن میں متعدد مقامات پر آیات سے استدلال کر کے زمین کے مُدَوّر ہونے کو ثابت کیا ہے۔ تخلیقِ کائنات کا ایک سائنسی نظریہ Big Bang Theory یعنی یہ کہ قدرت کا پیدا کردہ منبعِ حرارت وقوت ایک بڑے دھماکے کی صورت میں پھٹا اور اس کے مختلف اجزاء فضا میں بکھر گئے اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بیرونی سطح ٹھنڈی ہوتی چلی گئی۔ اگر یہ نظریہ حقیقتِ ثابتہ ہے، تو علامہ صاحب نے قرآن کی اصطلاحات "فتق" اور "فلق" سے اس کے امکان

کی طرف اشارہ کیا۔ تخلیقِ حیات میں پانی کی تاثیر جو قرآن نے بیان کی، اس کی حقیقت کو بیان کیا اور اس اشکال کا بھی حل پیش کیا کہ بعض چیزوں کو پانی کے بغیر پیدا فرمایا۔ تخلیقِ کائنات، ستاروں کی گردش، نظریۂ کششِ ثقل، حیات کی بنیادی اکائی سالمیہ (DNA) پر بھی تفصیل سے بات کی ہے۔

میں نے علامہ صاحب کی تحقیقات کے حوالے سے تفسیر وحدیث کی وقیع مباحث اور فقہی مباحث کا حوالہ نہیں دیا، فقہی مسائل کے دلائل کا تقابلی جائزہ بھی پیش نہیں کیا، کالم کی تحدیدات میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ بتانا یہ تھا کہ ہمیں اقتدار کی مسندوں پر فائز کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، جو اپنے سوا دوسروں کو جاہل واَجہل کہنے میں ذرا سا بھی دریغ نہیں کرتے، لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں سوچتے کہ ایسے عظیم اہلِ علم پر بلا استثنا پھبتی کسنا اور عظیم مراکزِ علم کی تحقیر اور تجہیل کرنا کتنی بڑی جسارت ہے، جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تھا:

ترجمہ: ''اہلِ ارض وسما اور (پانی میں تیرنے والی) مچھلیاں عالِم (ربانی) کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتی ہیں''۔ (ترمذی:2682)

خواجہ میر دردؔ نے کہا تھا:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

18 مئی 2015ء

موت: ایک اَٹل حقیقت ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں موت کو ''اَجَل'' سے تعبیر فرمایا ہے، ''اَجَل'' کے معنی ہیں:
''کسی چیز کا مقررہ وقت، جو کسی قیمت پر نہ ٹلے''۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''جب تم کسی مقررہ مدتِ ادائیگی تک قرض کا لین دین کرو، تو اسے لکھ لو''۔ (البقرہ:282)

اسی طرح فرمایا: ''جب موسیٰ علیہ السلام نے (حضرت شعیب علیہ السلام کی) خدمت کی طے شدہ مدت پوری کرلی تو اپنی بیوی کو لے کر چلے''۔ (القصص:29)

ان آیاتِ مبارکہ میں مقررہ مدت کے لیے ''اَجَل'' کا کلمہ آیا ہے۔ جس طرح فرد کے لیے ایک وقت مقرر ہوتا ہے، اسی طرح قوموں کے عروج وزوال کا وقت بھی مقرر ہے، فرمایا:
''ہر قوم کے لیے ایک میعاد مقرر ہے، جب مقررہ وقت آجائے گا تو ایک ساعت کی تقدیم وتاخیر نہیں ہو پائے گی''۔ (الاعراف:34)

اسی طرح فرد کی موت کا بھی ایک وقت مقرر ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
''بے شک اللہ کی طرف سے جب (موت کا) مقررہ وقت آجائے، تو وہ ٹلتا نہیں ہے''۔ (نوح:4)

سو ''موت کا منظر'' اور ''مرنے کے بعد کیا ہوگا'' نامی کتابیں کوئی لکھے یا نہ لکھے، موت نے آنا ہی آنا ہے۔ میں نے بھی یہ کتابیں نہیں پڑھیں، صرف ان کا نام سنا ہے، لیکن قرآن وحدیث میں موت اور مابعد الموت کے اَحوال، محشر اور میزانِ عدل کے قیام، جزاوسزا کا نفاذ، جنت وجہنم میں دخول اور جنت وجہنم کے اَحوال تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے گئے

ہیں۔ان کا مذاق کے طور پر ذکر کرنا قرآن وحدیث میں بیان کردہ غیبی حقیقتوں کی اہانت کے مترادف ہے۔آخرت کے تصور کو ''مُردہ فکر'' سے تعبیر کرنے کا کوئی مسلمان تصور بھی نہیں کرسکتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور دنیا کی یہ زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے اور بے شک آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے، اگر وہ جانتے ہوتے''۔(العنکبوت:64)

علامہ اقبال نے کہا ہے:

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

یعنی یہ انسان کی نادانی ہے کہ موت کو فنائے کلی اور اختتامِ زندگی سمجھ بیٹھا ہے، حالانکہ یہ محض اِس عارضی حیاتِ دنیوی کی شام ہے اور اس کے بعد آخرت میں دائمی اور ابدی حیات کا آغاز ہوگا۔سوموت درحقیقت ابدیت کا نقطۂ آغاز ہے، نادان ہیں وہ لوگ جو اسے فنائے کلی سے تعبیر کرتے ہیں۔جب قرآن نازل ہورہا تھا تو اُس کے اوّلین مخاطبین کا تصورِ حیات بھی یہی تھا، جسے قرآن نے اِن الفاظ میں بیان کیا:

''اور انہوں نے کہا: جو کچھ بھی ہے یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے اور (اے مخاطَب!) کاش تو وہ منظر دیکھتا کہ جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، (تب) اللہ فرمائے گا: کیا یہ (حیات بعد الموت) حق نہیں ہے، وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! یہ یقیناً حق ہے، اللہ فرمائے گا: چونکہ تم (اِس روزِ جزا کا) انکار کرتے تھے، سو (اُس کی پاداش میں) اب عذاب چکھو''۔(الانعام:30)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''(وہ کہتے ہیں) بس جو کچھ بھی ہے یہی دنیا کی زندگی ہے، ہم جیتے ہیں اور مرتے ہیں اور ہم (دوبارہ) نہیں اٹھائے جائیں گے''۔(المؤمنون:37)

اسی لیے علامہ اقبال نے مشورہ دیا:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اِسے پیمانۂ اِمروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''دنیا میں اس طرح رہو، جیسے تم ایک (راہ چلتے) مسافر ہو یا کسی منزل کے راہی''۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: ''جب شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کرو اور بیماری سے پہلے صحت کو غنیمت سمجھو اور موت سے پہلے زندگی کو غنیمت سمجھو''۔ (بخاری:6414)

یعنی دنیا کی عیش وعشرت میں مست رہ کر آخرت کو بھول جاؤ گے، تو موت کے وقت پچھتاؤ گے کہ کاش! میں نے آخرت کے لیے کوئی زادِ راہ جمع کیا ہوتا۔ لہٰذا بیماری کی حالت میں انسان انتہائی چاہت وخواہش کے باوجود بہت سے نیک کام نہیں کرسکتا، صحت کے ایام میں جب تمہاری ساری جسمانی، روحانی، عقلی اور فکری توانائیاں عروج پر ہیں، وہ اعمالِ خیر کیوں بجا نہیں لاتے تا کہ بعد میں کفِ افسوس نہ ملنا پڑے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''دنیا آخرت کی کھیتی ہے (یعنی دنیا میں ایمان وعمل کی جو فصل کاشت کرو گے، آخرت میں اسی کا پھل ملے گا)''۔ (اِحیاءعلوم الدین، جلد:4،ص:24، فیض القدیر، جلد:3،ص:392)

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام دنیا سے لاتعلقی یا مردم بیزاری کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام تو وہ دین ہے جس نے رہبانیت کی نفی کی اور رسول اللہ ﷺ نے ایک بھرپور عملی زندگی گزاری اور زندگی کے تمام شعبوں کے لیے خود اپنی سیرتِ طیبہ سے عملی نمونے فراہم کیے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ انسان معاشرے میں فعال کردار ادا کرے اور اُس کی ذات سے جن جن کے حقوق وابستہ ہیں، اُن سے عہدہ برا ہو۔ حدیث پاک میں ہے:

''نبی ﷺ نے حضرت سلمان اور حضرت ابوالدرداء کو (مواخاتِ انصار ومہاجرین کے موقع پر) ایک دوسرے کا بھائی بنایا۔ حضرت سلمان، حضرت ابوالدردا کی ملاقات کے

لیے گئے، اُنہوں نے (اُن کی بیوی) حضرت اُم الدرداء کو خستہ حالت میں دیکھا تو ان سے پوچھا: یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟، اُنہوں نے بتایا کہ تمہارے بھائی ابوالدرداء کو دنیا میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پھر حضرت ابوالدرداء آئے تو انہوں نے حضرت سلمان کو کھانا پیش کیا۔ حضرت سلمان نے کہا: آپ بھی کھائیں تو حضرت ابوالدرداء نے کہا: میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمان نے کہا: میں اُس وقت تک نہیں کھاؤں گا، جب تک کہ آپ نہیں کھائیں گے۔ چنانچہ حضرت ابوالدرداء نے (مہمان بھائی کی دل داری کے لیے نفلی روزہ توڑ کر) کھانا کھایا۔ پھر جب رات ہوگئی تو حضرت ابوالدرداء نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ حضرت سلمان نے اُن سے کہا: آپ سو جائیں، سو وہ سو گئے، پھر (تھوڑی دیر بعد) وہ نماز کے لیے اٹھے، پھر حضرت سلمان نے کہا: آپ سو جائیں، پھر جب رات کا آخری پہر ہوا تو حضرت سلمان نے کہا: اب آپ اٹھیں، پھر دونوں نے نماز پڑھی، پھر اُن سے حضرت سلمان نے کہا: آپ کے رب کا آپ پر حق ہے، آپ کے نفس کا آپ پر حق ہے اور آپ کے اہلِ خانہ کا آپ پر حق ہے، آپ ہر حقدار کو اُس کا حق دیں، پھر حضرت ابوالدرداء نبی ﷺ کے پاس گئے اور (شکایت کے انداز میں) آپ کو یہ قصہ سنایا کہ (میرے بھائی سلمان نے آج رات) مجھے قیام اللیل سے روکے رکھا تو نبی ﷺ نے فرمایا: سلمان نے سچ کہا ہے"۔ (صحیح بخاری:1968)

لیکن اسلام یہ نہیں چاہتا کہ انسان دنیا ہی کو مقصودِ کل اور مطلوبِ کامل سمجھتے ہوئے عشرتوں کا دل دادہ ہو جائے اور حدیثِ پاک کے مطابق درہم و دینار کا بندہ بن جائے۔ اسلام دنیا کو عارضی قیام گاہ سے تعبیر کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے مکانات و محلات میں واش روم پر لوگ لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں، لیکن آپ نے ایک فرد بھی ایسا نہیں دیکھا ہوگا جو انتہائی خوبصورت اور قیمتی واش روم میں اپنا بستر لگالے اور اسے مستقل جائے قیام بنالے۔ اس میں انسان ضرورت کی حد تک قیام کرتا ہے اور وقت گزارتا ہے، مگر بلاضرورت وہاں رکنا پسند نہیں کرتا۔ پس دنیا اور متاعِ دنیا کی تمام تر

رنگینیوں، رعنائیوں اور چمک دمک کے باوجود اِس سے بقائے حیات اور فرحت وانبساط کے لیے استفادہ تو ضرور کرنا چاہیے، لیکن اسے اپنی دائمی اور ابدی منزل ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے۔ مومن کی دائمی منزل کہیں اور ہے، یہی قرآن کا پیغام ہے اور یہی صاحبِ قرآن کا شِعار ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جس مرد وزن نے ایمان پر قائم رہتے ہوئے نیک کام کیے، تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی کے ساتھ ضرور زندہ رکھیں گے اور ہم ان کو ان کے نیک کاموں کی ضرور جزا دیں گے''۔ (النحل:97)

اور فرمایا: ''اور جس نے ایمان کی حالت میں آخرت (کو اپنی ابدی منزل بنانے) کا ارادہ کیا اور اس کے لیے شایانِ شان کوشش بھی کی، تو یہ وہی لوگ ہیں جن کی سعی (اللہ تعالیٰ کے ہاں) مشکور (یعنی مقبول و ماجور) ہوگی''۔ (بنی اسرائیل:19)

نظیر اکبرآبادی نے کہا ہے:

جب چلتے چلتے رستے میں، یہ جَون تیری ڈھل جائے گی
اک بدھیا تیری مٹی پر، پھر گھاس نہ چرنے آوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے، سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھن پُوت، جمائی بیٹا کیا، بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''پس جب کانوں کو بہرا کرنے والی چنگھاڑ (قیامت) آجائے گی، اُس دن ہر شخص اپنے بھائی، ماں باپ اور بیوی، بیٹوں سے بھاگے گا (یعنی کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا)، اُس دن ہر شخص دوسروں سے بے نیاز ہو کر اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا ہوگا، اُس دن کئی چہرے (اپنے اعمالِ صالحہ کے سبب) روشن و درخشاں اور مسکراتے ہوئے ہشاش بشاش ہوں گے اور اُس دن کئی چہرے غبار آلود ہوں گے، اُن پر سیاہی چھائی ہوگی، وہی لوگ کافر بدکار ہیں''۔ (عبس:33-42)

23 مئی 2015ء

کاش کہ......

ہمارے الیکٹرونک میڈیا کا یہ شعار بن گیا ہے کہ کسی بھی قضیے یا واقعے کے بارے میں ایک انتہائی درجے کی حساسیت (Hypersensitivity) پیدا کرتا ہے، جیسے کوئی بھونچال آ گیا ہے، دو چار دن اُسے جاری رکھتا ہے اور پھر کوئی نیا واقعہ رونما ہونے پر ''مٹی پاؤ'' والے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے اسے دفن کر کے آگے چل پڑتا ہے تاکہ اسکرین کی رونقیں بحال رہیں، کسی حد تک اس میں پیشہ وارانہ رقابت اور مسابقت بھی کارفرما ہوتی ہے۔ ایگزیکٹ کے بارے میں نیویارک ٹائمز میں ڈیکلن واش کا آرٹیکل شائع ہوا، تو پاکستان میں جیسے ایک قیامت برپا ہوگئی، کیونکہ امریکا اور یورپ سے کوئی الہامی چیز آ جائے تو پھر اُس پر ایمان بالغیب لازمی ہے۔ حالانکہ ایگزیکٹ تو پاکستان میں برسرِزمین قائم تھا اور ہے اور مجوّزہ ٹیلی ویژن چینل بول کی خبریں بھی دو تین سال سے گردش کر رہی تھیں اور بعض اینکر پرسنز کے ناقابلِ یقین پیکجز یعنی اعلیٰ ترین مشاہرہ جات و مراعات پر ہائرنگ کی خبریں بھی زبان زدِ خاص و عام تھیں، ایسا لگتا تھا کہ کہیں کوئی قارون کا پوشیدہ دفینہ و خزینہ ان کے ہاتھ لگ گیا ہے یا عالمِ غیب سے کچھ نازل ہوا ہے۔ یہ سرگوشیاں بھی سننے میں آتی رہیں کہ اس کے پیچھے کوئی غیبی طاقت ہے یا خزائنِ عامرہ کے دیوتا ہیں۔ الغرض یہ سارا سلسلہ ایک پراسراریت اور افسانوی صورت اختیار کیے ہوئے تھا۔ لیکن نیویارک ٹائمز کے آرٹیکل سے پہلے کوئی اس سربستہ راز کو منکشف کرنے پر آمادہ نہ ہوا، حالانکہ ایف آئی اے، انٹیلی جینس اور سراغ رسانی کے سارے ادارے اور FBR بھی موجود ہے، لیکن آرٹیکل کا

چھپنا تھا کہ گویا ایک طوفانی سیلاب کے آگے جو نادیدہ بند تھا، اچانک ٹوٹ گیا۔

ہم تو اناڑی لوگ ہیں، آئی ٹی انقلاب سے پہلے کے لوگ ہیں۔ اب تو انٹرنیٹ ہی بحر العلوم بلکہ ''محیط العلوم'' ہے۔ عربی میں دریا کو ''نہر''، سمندر کو ''بحر'' اور Ocean کو محیط کہتے ہیں۔ ہر اینکر پرسن کے آگے انٹرنیٹ کھلا ہوتا ہے اور سارے علوم اور معلومات اُس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں اور ہر خبر یا معلوم کی التجا ہوتی ہے کہ پہلے ہمیں لے لیجیے۔ اس موقع پر مجھے بے اختیار فارسی کا یہ شعر یاد آ گیا جو اہلِ ذوق کے لیے پیشِ خدمت ہے کہ ایک محبِّ رسول نے عالَمِ حیوانات میں رسول اللہ ﷺ کی محبوبیت و مقبولیت اور جان نثاری کی کیفیت کو بہ کمال و تمام اس شعر میں بیان کیا ہے:

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف

بہ امید آنکہ روزے، بہ شکار خواہی آمد

یعنی صحرا کے تمام ہرن اپنا سر ہتھیلی پر رکھے ہوئے اپنے دل میں امید کا یہ چراغ روشن کیے ہوئے ہیں کہ شاید کبھی رسول اللہ ﷺ کا گزر اس طرف سے ہو اور وہ ہمیں شکار فرما لیں اور ہمیں اُن کا شکار بننے کی سعادت نصیب ہو جائے۔

اہلِ مغرب دنیا کو اپنا اسیر بنائے رکھنے کے لیے یہ سارے طریقے پہلے سے اختیار کیے ہوئے ہیں اور اُن کی گنجائش نکالنے کے لیے قانون میں جھول بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کے حکمرانوں اور سرمایہ داروں کی ناجائز دولت کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے Off-Shore یعنی بعض جزائر پر کاروباری کمپنیاں یا مالیاتی ادارے اور بینک قائم کیے جاتے ہیں۔ ان کمپنیوں اور اداروں پر اخراجات بھی کم آتے ہیں اور وہ سخت گیر قوانین کی دسترس سے بھی باہر ہوتے ہیں، وہ کسی سے یہ بھی نہیں پوچھتے کہ یہ بے پناہ دولت کیسے کمائی، کہاں سے آئی، کن ذرائع سے آئی اور کون لایا اور دولت کا یہ انبار بھاری ٹیکسوں کی زد میں بھی نہیں آتا۔

اسی طرح یہ جعلی یونیورسٹیاں بھی امریکا اور یورپ کی ایجاد ہیں، انٹرنیٹ پر کورسز کا

تعارف، امتحانات کا انعقاد اور ڈگریوں کا اجرا بھی اُن کی ایجاد ہے اور اس کے ذریعے غیر معمولی Tax Free دولت کی کمائی بھی انہی کا شاہکار ہے۔ لیکن اگر ان کی اس ایجاد واختراع سے استفادہ کر کے محکوم دنیا کا کوئی بندہ یا ادارہ اس کاروبار میں حصہ دار بن جائے، تو یہ شرکت انہیں ہرگز گوارا نہیں ہوتی اور پھر اچانک کوئی آرٹیکل چھپ جاتا ہے یا بریکنگ نیوز آجاتی ہے اور طوفان مچ جاتا ہے۔ یعنی اپنی انگیخت یا تحریک (Initiative) پر ہم کوئی کام نہیں کرتے، ہمارا شِعار صرف نقالی اور تقلید ہے، ایجاد واختراع (Innovation) نہیں ہے۔

اگر ایگزیکٹ کا ادارہ کچھ غلط کام کررہا تھا تو اے کاش! کہ پاکستان کی سرزمین سے کوئی اس کی نشاندہی کرتا اور پھر سربلند ہوکر اس کا کریڈٹ لیتا، لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ کل ایک ٹیلی ویژن چینل پر ایگزیکٹ کے چیف ایگزیکٹو جناب شعیب شیخ کے انٹرویو کا کچھ حصہ سننے اور دیکھنے کو ملا اور وزیرداخلہ جناب چوہدری نثار علی خان کی پریس کانفرنس سننے کو ملی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ جتنا شور وغوغا مچایا گیا ہے، اتنا کچھ اس سے برآمد نہیں ہوگا اور آخر میں بساط لپیٹ دی جائے گی۔ ایک وضاحت شعیب شیخ صاحب نے یہ پیش کی کہ آئی ٹی اور سافٹ ویئر کا کاروبار ٹیکس سے مستثنیٰ ہے، اس پر سابق وفاقی وزیر ڈاکٹر عطاالرحمٰن کا یہ تبصرہ بھی سامنے آیا کہ سافٹ ویئر کا کاروبار 2016ء تک ٹیکس سے مستثنیٰ ہے، لیکن آئی ٹی کی آمدنی پر ٹیکس عائد ہوتا ہے۔

اب ہم بھی سیلاب بلاخیز کے نتائج کے منتظر ہیں کہ اس کے بطن سے کچھ برآمد ہوتا ہے یا نہیں اور وزیرِ داخلہ کی ساکھ کا بھی امتحان ہے۔ ڈاکٹر عطاء الرحمٰن نے یہ بھی کہا ہے کہ جس آمدنی پر ٹیکس ادا نہ کیا ہو، وہ حرام ہے، ہمارے نزدیک وہ غیر قانونی ہے اور ہر اُس قانون کا احترام لازم ہے، جس سے شریعت کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔ اصل جو کرنے کا کام ہے، وہ یہ ہے کہ جن افراد یا اداروں کے تموُّل یعنی اِفراطِ دولت اور نمودِ دولت کا ایک سمندر موج زن ہے، اس کا تعاقب کیا جائے، اُس کے مَنابع (Sources) اور سوتوں کا سراغ

لگایا جائے۔ اس کے لیے جیمز بانڈ 007 کی ضرورت نہیں ہے، یہ سب کچھ برسرزمین ہے اور ذمے داروں کے سوا سب کو نظر آرہا ہے۔ انہوں نے آنکھ، کان اور دل و دماغ کے دریچے بند کر رکھے ہیں یا اُن پر کوئی دباؤ ہے۔

سب سے زیادہ باعثِ حیرت یہ امر ہے کہ بول چینل کی حد تک جو لوگ ان کے نیٹ ورک سے وابستہ ہوئے، وہ جدید تعلیم یافتہ، پروفیشنل اور باخبر لوگ ہیں، بعض انوسٹی گیٹو رپورٹنگ کے ایکسپرٹ ہیں، انسان یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ کیا انہوں نے آنکھیں بند کر کے اسے جوائن کر لیا ہے۔ ایسے آثار بھی نہیں ملے کہ وہ سب کے سب دامن چھڑا کر بھاگ رہے ہیں اور منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔

خود آئی ٹی کی وزیر انوشہ رحمان صاحبہ کا بیان سامنے آیا کہ سائبر کرائم کے لیے ہمارے ہاں کوئی قانون موجود نہیں ہے۔ اور قانونی مسودہ احتساب کا ہو یا سائبر کرائم کا ہو یا فریڈم آف پریس کے لیے کوئی حد بندی مقصود ہو، ایسے قوانین کا بننا ہمارے ہاں آسان نہیں ہے، کیونکہ جو اسٹیک ہولڈر یا مراعات یافتہ طبقات ہوتے ہیں، وہ اس کی راہ میں مزاحم ہو جاتے ہیں۔ حکومتیں میڈیا سے سہمی رہتی ہیں اور اپنی عزت بچانے میں عافیت سمجھتی ہیں، سیاست داں اور پارلیمنٹیرین سمجھتے ہیں کہ کڑے احتساب کے کسی بھی قانون کا پھندا سب سے پہلے ان کی گردن میں فٹ ہوگا۔

مسلم لیگ (ن) کی حکومت سینٹ میں اقلیت میں ہے، لہٰذا حزبِ اختلاف یعنی پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت کے بغیر ان کے لیے قانون سازی عملاً ممکن نہیں ہے۔ ''تحفظِ پاکستان ایکٹ'' اور اکیسویں آئینی ترمیم یعنی نیشنل ایکشن پلان چیف آف آرمی اسٹاف جناب جنرل راحیل شریف کی ذاتی دلچسپی اور خواہش یا دباؤ کے تحت منظور کیے گئے ہیں۔ کراچی میں رینجرز کا آپریشن بھی مسلح افواج کی پشت پناہی کے سبب چل رہا ہے اور حال ہی میں کور کمانڈر جناب لیفٹیننٹ جنرل نوید مختار نے کراچی کے مسائل کو نیشنل ڈیفنس

کوئی مانے یا نہ مانے موجودہ سیاسی سیٹ اپ کی بقا جناب آصف علی زرداری کی قیادت میں حزبِ اختلاف کی پشت پناہی کی مرہونِ منّت ہے، اس بنا پر جناب آصف علی زرداری اور جناب نواز شریف کے "مک مکا" کی پھبتی کسی جاتی ہے اور جناب عمران خان تقریباً روزانہ کسی نہ کسی انداز میں اس کا اعادہ کرتے ہیں۔ لیکن لگتا ہے کہ ہماری سیاسی قیادت اس حد تک سیاسی بلوغت (Political Maturity) کے دور میں داخل ہو چکی ہے کہ انہیں اپنا دیر پا مفاد سمجھ آ گیا ہے اور اب وہ کسی طالع آزما کا آلہ کار بن کر لگ بھگ دس سال تک اپنا سیاسی مستقبل تاریک نہیں کرنا چاہتے۔ زرداری صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بالعموم جذبات میں نہیں آتے اور مغلوب الغضب نہیں ہوتے اور نہ ہی بعید از عقل بلند بانگ دعوے کرتے ہیں۔ جناب عمران خان ہماری قومی سیاست کی ایک منفرد پروڈکٹ اور ایک الگ Phenom ہیں، وہ اس شعر کی مجسم تصویر ہیں:

مفاہمت نہ سکھا جبرِ ناروا سے مجھے
میں سربکف ہوں لڑا دے کسی بلا سے مجھے

لیکن اب وہ بھی آہستہ آہستہ سیاسی پختگی کی طرف آ رہے ہیں اور گرجنے کے بعد برسنے کا تاثر دے کر آخرِ کار اب ضبطِ نفس سے کام لینے لگے ہیں اور "قہرِ درویش بر جانِ درویش" کے مصداق کڑوا گھونٹ پی ہی لیتے ہیں۔

25 مئی 2015ء

احتساب

کہا جاتا ہے کہ ہمارے ملک کے بڑے مسائل میں سے ایک مسئلہ خیانت اور بدعنوانی ہے، قومی امانتوں کی لوٹ مار ہے، ایک معمولی تعداد کے استثنا کے سوا ہر کوئی اُس پر ہاتھ صاف کرنے اور ہڑپ کر لینے کے درپہ ہے اور یہ بات زبان زدِ عام ہے۔ ہمارے ایک لیڈر کا دعویٰ ہے کہ سالانہ ایک ہزار ارب روپے کی کرپشن ہے، واللہ اَعلم بِالصَّواب۔ لیکن اگر زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھ لیا جائے، تو اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کچھ نہ کچھ تو یقیناً ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اس تخمینے میں بیس تا تیس فیصد یا کم وبیش کی مبالغہ آرائی ہو، لیکن اس کی مکمل نفی کرنے کی جرأت کوئی نہیں کرسکتا، کیونکہ نوشتۂ دیوار آنکھیں بند کرنے سے نہ مٹتا ہے، نہ منظر سے غائب ہوتا ہے۔ سو یہاں چند پاک باز، فطرتِ سلیمہ اور نفسِ مطمئنہ کے حامل محدود لوگوں کے سوا صرف وہی دیانت دار ہیں، جو بے اختیار ہیں اور جن کے قلم یا زبان سے نہ کسی کو مالی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی اس سے کسی ضرر رسانی کا خطرہ ہے۔

بدعنوانی کے سدِّ باب کے لیے قوانین تو موجود ہیں، لیکن حاکم اور محکوم یعنی قانون نافذ کرنے والے اور جن پر قانون کا نفاذ ہونا ہے، بالعموم سب ہی کے دامن داغ دار ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف منسوب یہ کہاوت ہم پر صادق آتی ہے: ''زانیہ پر پہلا پتھر وہ پھینکے، جس کا اپنا دامنِ ایمان وعمل اس گناہ سے آلودہ نہ ہو''، تو مجمعِ عام میں پہلا پتھر پھینکنے والا دستیاب ہی نہ تھا۔ اوّل تو ہمارے ہاں قانون بنانے والے اپنے تحفظات کو سامنے رکھ کر

جھول رکھا جاتا ہے اور پھر جرم کرنے والے اتنے ماہر اور ذہین ہوتے ہیں کہ نشاناتِ قدم بھی اپنے پیچھے نہیں چھوڑتے اور جرم کو ضابطوں کے تحفظات کے خول میں مستور کر دیا جاتا ہے، مصطفیٰ زیدی نے کہا تھا:

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

ہاتھ کی صفائی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ کلیم عاجز کا یہ شعر ہر ایک کو اپنے گردوپیش میں مجسم معنی کی صورت میں نظر آتا ہے:

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ ہمارا نظامِ عدل مظلوموں کو انصاف فراہم کرنے میں ناکام ہے، اس پر ہماری عدالتِ عالیہ اور عدالتِ عظمیٰ کے فاضل جج صاحبان ناراض بھی ہوتے ہیں کہ تحقیقاتی اداروں اور انتظامیہ کی ناکامی کا ملبہ اُن پر ڈال دیا جاتا ہے۔ سو اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا ''ضابطۂ قانون'' ہی انصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور عدل کے پاؤں کی زنجیر ہے۔ لیکن آئیڈیل ازم کی علم بردار ہماری قابلِ احترام عدلیہ اور فاضل وکلا اس مسئلے کا کوئی حل فراہم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ حقوقِ انسانی کی پاس داری اور جرائم کی تحقیق و تفتیش کے وہ معیارات، فنی ذرائع، ماہر اور مرفّہ الحال تفتیشی عملے کے افسران ہمارے ہاں دستیاب نہیں ہیں اور نہ ہی اُس طرح کے مالی وسائل دستیاب ہیں۔ پس اپنے وسائل کو دیکھ کر اپنے معروضی حالات کو سمجھ کر اور خاص طور پر مخصوص صورتِ حال میں اُس کے مطابق قوانین بنائے جاتے ہیں۔ تحفظِ پاکستان ایکٹ اور اکیسویں آئینی ترمیم اسی کا مظہر ہے، لیکن یہ چیف آف آرمی اسٹاف کی خواہش یا دباؤ پر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سینٹ آف پاکستان کے موجودہ چیرمین جناب رضا ربانی کو نہایت تأسف کے ساتھ یہ

ووٹ دے رہا ہوں اور سینٹر اعتزاز احسن صاحب نے ووٹ دیتے ہوئے کہا کہ آج بیرسٹر چوہدری اعتزاز احسن مر گیا۔

سو حقیقی اور مکمل احتساب تو آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ہوگا، جہاں نہ کوئی مکروفریب کام آئے گا، نہ کوئی حیلہ وتدبیر کارگر ہوگی اور نہ اپنے جرائم سے انکار کیا جاسکے گا۔ الغرض اقرار واعتراف کے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں اُن کاموں کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے"۔ (یٰسٓ:65)

یعنی انسان کے اپنے اعضاء وجوارح جو جرائم کی لذتوں سے اس دنیا میں لطف اندوز ہورہے ہیں، قیامت کے دن وہی سلطانی گواہ بن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"حتیٰ کہ جب وہ دوزخ کی آگ تک پہنچ جائیں گے، تو ان کے کان اور اُن کی آنکھیں اور اُن کی کھالیں اُن کے خلاف اُن کاموں کی گواہی دیں گی جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔ اور (وہ حیرت زدہ ہوکر) اپنی کھالوں سے کہیں گے: تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ (تم تو گویائی پر قادر نہیں تھے)، وہ جواب دیں گی: ہمیں اسی اللہ نے گویائی بخشی، جس نے ہر چیز کو بولنے کی صلاحیت دی"۔ (حم السجدہ:21)

سو انسانی معاشرے کو گناہوں اور جرائم کی آلودگی اور ہلاکتوں سے بچانے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے آخرت کی جزا وسزا پر ایمان، خشیتِ الٰہی اور خوفِ خدا، اگر یہ ہے تو انسان کی اصلاح ممکن ہے، ورنہ دنیا اور آخرت کی بربادی اس کا مقدر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور ہم نے ہر انسان کا اعمال نامہ اُس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور ہم قیامت کے دن اُس کا اعمال نامہ نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا، (اس سے کہا جائے گا:) آج اپنا اعمال نامہ پڑھ لو، آج تم خود اپنا احتساب کرنے کے لیے کافی ہو"۔ (بنی اسرائیل:13-14)

وہ (فخر سے) کہے گا: آؤ! میرا نامۂ اعمال پڑھو، مجھے یقین تھا کہ مجھے احتساب کا سامنا کرنا ہے، پس وہ بلند و بالا باغ میں پسندیدہ زندگی میں ہوگا، جس کے پھلوں کے خوشے جھکے ہوئے ہوں گے، (اُس سے کہا جائے گا) اُن نیک کاموں کے عوض، جو تم نے (دنیا کی) گزشتہ زندگی میں (آخرت کے لیے) بھیجے تھے، خوب مزے سے کھاؤ اور پیو۔ اور جس کا اعمال نامہ اُس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ (حسرت کے مارے) کہے گا: کاش! میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا ہوتا اور مجھے اپنے حساب کی بابت کچھ پتا ہی نہ چلتا، کاش! موت کے ساتھ ہی میرا قصہ تمام ہو جاتا، میرا مال تو میرے کسی کام نہ آیا، نہ ہی میری حجت بازی میرے کسی کام آئی، (حکم صادر ہوگا:) اسے پکڑ کر گلے میں طوق پہناؤ، پھر اسے جہنم میں جھونک دو، پھر اسے ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو، بے شک یہ بڑی عظمت والے اللہ پر ایمان نہیں لاتا تھا''۔ (الحاقہ:19-33)

پس قرآن و سنت نے اصلاحِ نفس کے لیے جو نسخۂ کیمیا عطا کیا ہے، وہ ''احتسابِ نفس'' ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''دانا شخص وہ ہے، جو اپنے نفسِ امارہ کی باطل خواہشات پر قابو پالے اور آخرت کے لیے کام کرے اور عاجز شخص وہ ہے جو اپنی باطل خواہشات کا تابع ہو جائے اور اللہ سے خیر کی تمنا کرے۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں: ''یوم الحساب سے پہلے خود اپنا احتساب کرنا''۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قبل اس کے کہ (قیامت کے دن) تمہارا حساب کیا جائے، خود ہی اپنا حساب کرلو اور ایک بڑے معرکۂ امتحان کے لیے اپنے آپ کو آراستہ کرو اور جس نے دنیا میں اپنا احتساب کرلیا، آخرت میں اُس کا حساب آسان ہو جائے گا''۔ اور میمون بن مہران نے کہا: ''جو شخص اپنا بھی اتنا ہی کڑا محاسبہ نہ کرے، جتنا کہ اپنے مخالف فریق کا کرتا ہے، تو وہ متقی نہیں ہوسکتا''۔ (ترمذی:2459)

انسان اپنے کرتوتوں اور سیاہ کارناموں کی ہزار تاویلیں کرے، مگر اس کے ظاہر و باطن

تعالیٰ ہے:

”بلکہ انسان اپنے آپ پر خود آگاہ ہے، خواہ وہ کتنے ہی عذر (اور حیلے بہانے) تراشتا پھرے“۔(القیامہ:15-14)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:”جس کا تمہیں علم نہیں، اُس کی ٹوہ میں نہ لگ جاؤ، بے شک کان، آنکھ اور دل، ان سب سے روزِ قیامت پوچھا جائے گا“۔(بنی اسرائیل:36)

یعنی اللہ تعالیٰ نے دیکھنے، سننے، سوچنے سمجھنے اور عمل کی جو صلاحیتیں انسان کو ودیعت فرمائی ہیں، ان سب کے بارے میں آخرت میں سوال ہوگا کہ اُس کی دی ہوئی نعمتوں کو انسان نے کیسے استعمال کیا، اُس کا سارا خیر وشر اسی میں مستور ہے۔اسی طرح اقتدار واختیار بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اب یہ بندے پر منحصر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اسے استعمال کر کے اپنی نجات کا سامان کرے یا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایات اور احکام کے خلاف استعمال کر کے اپنے لیے دائمی عذاب کا ذریعہ بنادے۔علامہ اقبال نے کہا تھا:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ ترا تیرے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

30 مئی 2015ء

جون2015ء

ہمارا نظمِ پریشاں

ہمارے ایک سیاسی رہنما جناب عمران خان وقتاً فوقتاً یہ پھبتی کستے رہتے ہیں کہ یہ پاکستان ہے، کوئی ''بنانا ریپبلک'' نہیں ہے۔ ''بنانا ریپبلک'' دراصل استعارہ ہے انارکی، لاقانونیت، بے امنی، فساد اور کرپشن کی گرم بازاری سے، جہاں جنگل کا قانون ہو، طاقت کا راج ہو، کوئی کسی مظلوم کی دادرسی نہ کر سکے اور کسی ظالم کے ظلم کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو روک نہ سکے۔ جو ہوا کے رخ پر چلے وہ کامیاب و کامران قرار پائے اور جو ظلم کے ریلے کے آگے بند باندھنا چاہے یا سدِّ راہ بننے کی کوشش کرے، وہ بے نام ونشان ہو جائے، صفحۂ ہستی سے مٹ جائے اور نشانِ عبرت بن جائے۔ لیکن منظر کی صحیح تصویر یہی ہے کہ ہم بنانا ریپبلک ہی بنتے جا رہے ہیں۔ فطرت کا دائمی اور ابدی اصول یہ ہے کہ ظلم، ظلم ہے، وقت کے ساتھ اس کے معیارات اور پیمانے بدل نہیں جاتے۔ اسی طرح حق، حق ہے، اس کا پیمانہ بھی ہر ایک کے لیے اور ہر دور میں ایک ہی ہوتا ہے، تمیز بندہ و آقا اس میں نہیں ہوتی، نہ ہی مَن و تو اور یگانہ و بیگانہ کی نسبت سے معیارات بدلتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ یہ گواہی تمہاری اپنی ذات یا تمہارے والدین اور تمہارے قرابت داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، (فریقِ معاملہ) خواہ امیر ہو یا غریب، اللہ (تم سے) زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لٰہذا تم خواہشِ نفس کی پیروی

اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کی خوب خبر رکھنے والا ہے''۔(النساء:135)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو گواہی کو چھپائے گا، تو اس کا دل گناہ سے آلودہ ہے''۔(البقرہ:283)

اور ربِّ ذوالجلال نے فرمایا:

''اور (خبردار!) کسی قوم کی عداوت تمہیں عدل نہ کرنے پر برانگیختہ نہ کرے، عدل کرتے رہو، یہی (شِعار) تقوے کے سب سے زیادہ قریب ہے''۔(المائدہ:8)

ڈسکہ، سیالکوٹ میں جو دو وکلا حضرات کے قتل کا سانحہ رونما ہو، یہ بلاشبہ انتہائی سنگین اور افسوس ناک ہے، لیکن اُس کے بعد اُس کے رَدِّ عمل میں وکلائے کرام نے، جو قانون کے محافظ سمجھے جاتے ہیں، پے درپے قانون شکنی کے اقدامات کیے، یہ بھی ایک المیے سے کم نہیں۔ یہ رُجحان انتہائی اذیت ناک اور رسوا کن ہے۔ آزاد عدلیہ کی بحالی میں وکلائے کرام کا کردار سب سے نمایاں تھا، وہی سالارِ قافلہ تھے، پھر آزاد میڈیا، سول سوسائٹی اور بیشتر سیاسی جماعتیں بھی ان کے ہم رکاب ہوگئیں اور بالآخر ایک طویل، صبر آزما اور عظیم تحریک کے نتیجے میں یہ ہمالیہ سر ہوگیا اور جناب چیف جسٹس سمیت تمام قابلِ احترام معزول جج صاحبان بحال ہوگئے، پی سی او کے حلف یافتہ جج صاحبان گھر بھیج دیے گئے۔

لیکن اس کے بعد متعدد ایسے واقعات ہو چکے ہیں، جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وکلاء حضرات اپنے آپ کو قانون سے مُبرّا سمجھنے لگے ہیں، ماتحت عدلیہ کے ججوں کی بے حرمتی کی گئی، نجی وقومی اَملاک کی توڑ پھوڑ کے واقعات کیمروں کی آنکھوں میں آج بھی محفوظ ہیں۔ اعلیٰ عدلیہ ان کی قانون شکنی سے صرفِ نظر کرتی رہی ہے، موجودہ اور ماضی کی قانون شکنی کے واقعات پر اعلیٰ عدلیہ نے گرفت نہیں فرمائی، اگر گرفت فرمائی ہوتی تو شاید قدرے بہتری آجاتی اور وکلائے کرام کے مزاج میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوجاتا۔ سیاسی قائدین کا مسئلہ یہ ہے کہ اُن کے نزدیک اقدار وروایات کی کوئی حیثیت نہیں ہے، بس حکومتِ وقت کو جس حربے

وصول کی جا سکے۔ مگر سوچنے کا مسئلہ یہ ہے کہ: قانون شکنی اور اَقدار کی پامالی کے اس ماحول میں آئندہ کوئی بھی حکمران باوقار انداز میں حکومت کر سکے گا؟۔ ہمارا ایٹمی طاقت ہونا مسلّم، لیکن ہم بنانا ریپبلک ہی کے مناظر تو پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ ہمارے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

ایک وقت تھا کہ تمام طبقات اہلِ مغرب کو کوستے تھے، تمام ہتھیاروں کا رخ اہلِ دین اور دینی اداروں کی جانب تھا، بجا اور مُسلَّم کہ کسی بھی جرم، بے اعتدالی اور قانون شکنی کو مذہب کا کور نہیں ملنا چاہیے۔ دینی رہنما بھی اس جبر سے گزر رہے تھے کہ اپنے طبقے کے تشدد پر آمادہ انتہاپسندوں کو اپنی صفوں سے جدا کرنے میں مشکلات اور خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ لیکن اب جو حقائق سامنے آ رہے ہیں، اُن سے عیاں ہے کہ ہم سب اس المیے سے گزر رہے ہیں، ہمارا قومی مزاج ایک ہی ہے اور سب سے مشکل اپنے طبقے کی برائی کی نشاندہی ہے، کیونکہ اس صورت میں اپنی عزت بچانا مشکل ہو جاتا ہے اور انسان اپنے ہی ماحول میں اجنبی اور قابلِ نفرت قرار پاتا ہے۔

قتلِ ناحق کا نہ کوئی جواز ہے اور نہ ہی اس کا دفاع اللہ کی شریعت، آئین وقانون اور اخلاق کی رو سے جائز ہے۔ لہٰذا اس کی مذمت میں سب کو یک زباں اور یک آواز ہونا چاہیے، لیکن کیا اس کے لیے آئین وقانون کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں؟۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کلچر اور ان روایات کو ہر دور کے اہلِ اقتدار نے پروان چڑھایا ہے، پُرامن طبقات کی جائز بات پر بھی کان دھرنا ہمارے حکمرانوں کے مزاج کا حصہ کبھی نہیں رہا، بلکہ ہمیشہ اسے کمزوری کی علامت سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور اب وہ اپنی کاشت کی ہوئی فصل کاٹ رہے ہیں۔

آپ کو قطعی طور پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ ملک کے ہزاروں مدارس کی قیادت نے کورئیر کے ذریعے خطوط ارسال کیے اور وزیر اعظم پاکستان، وزیر اعلیٰ پنجاب اور وزیر داخلہ

مسئلے پر رابطہ کرتے ہوئے ضمناً وعدہ کیا، مگر وہ بھی وفا نہ ہوا۔ لیکن اگر کہیں دھرنا دے دیا جاتا تو فوراً شرفِ ملاقات سے نوازا جاتا اور حکم رانی کے بلند ترین مناصب پر فائز یہ اہلِ اقتدار ہانپتے کانپتے کسی حد تک شنوائی پر بھی آمادہ ہوجاتے۔

ڈسکہ کے سانحے میں بھی لازم تھا کہ وزیر اعلیٰ پنجاب بلا تاخیر وکلا کے نمائندوں کو ملاقات کی دعوت دیتے اور باہمی اتفاقِ رائے سے مسئلے کا کوئی حل نکالتے اور ظاہر ہے کہ ایس ایچ او پر مقدمہ درج کر کے اسے فوری طور پر گرفتار کرنا ناگزیر تھا، باقی سارے کام تو قانونی مراحل سے گزر کر ہی انجام پانے تھے۔ یہ بھی لازم ہے کہ عدلیہ، وکلاء، حکمران اور سماجی قائدین باہمی اتفاقِ رائے سے کوئی اصول وضع کریں کہ آزاد میڈیا کے اس دور میں پولیس یا قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنے قانونی فرائض سے کس طرح عہدہ برا ہوں، کیونکہ اب ہر بات اور ہر چیز کی رواں اور براہِ راست کوریج ہو رہی ہوتی ہے اور ہر لمحہ کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہوجاتا ہے۔ وعظ وتذکیر اور اسٹوڈیوز میں بیٹھ کر بحث ومباحثہ سے اگر امن کا قیام اور قانون کی عمل داری ممکن ہوتی تو پھر مسئلہ بہت آسان ہے، لیکن عمل کی دنیا افکار اور تصورات کی دنیا سے جدا ہوتی ہے۔

صوبۂ خیبر پختونخوا کے مقامی انتخابات کے جو مناظر سامنے آئے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا قومی مزاج، قومی ضمیر اور اندازِ حکمرانی ایک ہی ہے۔ ایسے ماحول میں جناب عمران خان تختِ اقتدار پر متمکن ہوجائیں یا کوئی مُصلحِ اعظم اینکر پرسن یا علم وحکمت کا پیکر کالم نگار یا کوئی صاحبِ تقویٰ وکردار مسند نشیں ہوجائے، انیس بیس یا اٹھارہ بیس سے زیادہ کا فرق خوش فہمی یا خود فریبی ہوگی، کیونکہ کوئی انقلاب تو برپا نہیں ہو رہا، نظام کے اندر رہتے ہوئے اور اسی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ہی ہر ایک کو چلنا ہوتا ہے۔ حکومت ایک نیم خود مختار قومی ادارے پیمرا کے چیرمین کو تبدیل کرنے پر قادر نہیں ہے، تو اور کوئی آکر کون سی شانِ اعجاز کا مظاہرہ کر پائے گا کہ پورے نظام کو تہ وبالا کر کے اپنا من پسند نظام یا ہیئتِ مقتدرہ قائم

کی سوچ کا انداز کچھ اور ہوتا ہے، لیکن جب وہ اقتدار کے ''بیت الجنّ'' میں داخل ہوتا ہے، تو اس کی آنکھیں، کان اور دل و دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں۔ حاکمِ وقت کے گرد و پیش جو لوگ ہوتے ہیں، وہ ان کے مزاج پر حاوی ہو جاتے ہیں اور وہی اس کی آنکھیں، کان اور دماغ بن جاتے ہیں اور سوچ کے معیارات بدل جاتے ہیں، بقولِ شاعر:

اس دور کی ہر چیز الٹی نظر آتی ہے
لیلیٰ نظر آتا ہے، مجنوں نظر آتی ہے

یکم جون 2015ء

روہنگیا مسلمانوں کی حالتِ زار

روہنگیا کے مسلمانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نسلاً بنگالی مسلمان ہیں جو برما کے صوبہ اراکان میں آ کر آباد ہوئے، غالباً انہیں انگریز مزدور کے طور پر اپنے مفتوحہ اور مقبوضہ علاقوں میں لے کر گئے، بعد میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد کچھ بہاری مسلمان بھی ہجرت کر کے ان کا حصہ بن گئے۔ آج کل یہ مسلمان شدید اذیت کا شکار ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ سوشل میڈیا پر ان کی مظلومیت کی جو تصاویر آئی ہیں، وہ داعش کے مظالم سے بھی بڑھ کر ہیں، سوشل میڈیا پر ان کے کٹے پھٹے اعضا کو منتشر صورت میں دکھایا گیا ہے اور یہ منظر انتہائی حد تک اذیت ناک ہے۔

یہ لوگ انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں ہیں، گزشتہ برسوں میں ان میں سے بعض نے بحری کشتیوں کے ذریعے تھائی لینڈ کی طرف ہجرت کی کوشش کی، لیکن تھائی لینڈ کی بحریہ نے انہیں جبراً واپس سمندر میں دھکیل دیا، کچھ زندہ دریا برد ہو گئے اور کچھ کو انڈونیشیا کی بحریہ نے بچایا۔ حال ہی میں کچھ نے آسٹریلیا کی طرف ہجرت کی کوشش کی، لیکن انہیں وہاں سے بھی واپس دھکیل دیا گیا۔ ان میں سے کچھ مہاجر بن کر بنگلا دیش کی طرف گئے، لیکن وہاں کی حکومت بھی انہیں قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئی اور نہ ہی وہ بڑے پیمانے پر ان کے لیے پناہ گزین کیمپ قائم کرنے پر آمادہ ہے۔ برما، جس کا موجودہ نام میانمار ہے، کے فوجی حکمرانوں نے انہیں اپنے ملک کی قومیت دینے سے باقاعدہ طور پر انکار کر دیا ہے اور

کیمپوں میں رہ رہے ہیں۔صرف چین کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اُس نے میانمار سے ملحق اپنے سرحدی علاقے میں ان کے لیے کچھ کیمپ قائم کیے ہیں اور ان لوگوں کو عارضی ورک پرمٹ بھی دیے ہیں، لیکن چین کے ہاں دوسروں کو قومیت (Nationality) دینے کی گنجائش نہیں ہے۔

میانمار کا سرکاری مذہب بدھ مت ہے، جس میں جانوروں کو بھی اذیت دینا جائز نہیں ہے۔لیکن بدھ مذہبی رہنما یعنی بھکشو اپنے لوگوں کو ان مسلمانوں کی نسل کشی پر آمادہ کرتے ہیں اور ان کے سفاک درندے انتہائی اذیت دے کر ان کو ذبح کرتے ہیں اور ان کے اعضاء کو بکھیر دیتے ہیں تاکہ یہ اذیت ناک مناظر دیکھ کر یہ لوگ ان کے وطن سے نکل جائیں۔اس کا ہمیں علم نہیں ہے کہ میانمار کے بدھ باشندوں کے دلوں میں اُن کے لیے اتنی شدید نفرت کیوں ہے؟۔اُمّتِ مسلمہ ویسے بھی اپنی تاریخ کے نازک دور سے گزر رہی ہے اور اپنی تباہی اور بربادی کے اسباب پیدا کرنے میں خود کفیل ہے، ہمیں کسی بیرونی دشمن کی ضرورت نہیں ہے، لیکن میانمار کے ان بے گھر اور دربدر مسلمانوں کی حالتِ زار انتہائی اندوہ ناک ہے، ان مناظر کو دیکھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل خون کے آنسو روتا ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کے تیل کی دولت سے مالا مال ممالک بھی ہیں، مجموعی طور پر 57 مسلم ممالک روئے زمین پر موجود ہیں اور ایک اندازے کے مطابق مسلمانوں کی مجموعی تعداد دنیا بھر میں ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ ہے، مگر میانمار کے کم وبیش ایک ملین مظلوم مسلمانوں کی حالتِ زار پر نہ کوئی توجہ دینے والا ہے اور نہ ہی ان کی مدد اور بحالی کی کسی کو پروا ہے۔ہمارے دشمن ہی ہمیں مارتے ہیں اور جب مارتے مارتے وہ تھک جاتے ہیں تو اشک شوئی کے لیے بھی وہی آ پہنچتے ہیں۔ بوسنیا ہرزیگووینا اور کوسوو کے مسلمانوں کی داستانِ اَلم کوئی بہت زیادہ پرانی بات نہیں ہے، ان کو بچانے کے لیے بھی اگر آخری مرحلے میں امریکا مدد کو نہ پہنچتا تو سربیا والوں نے ان کی نسل کشی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور کسی

گزشتہ چند عشروں میں امریکا اور اہلِ مغرب نے ایشیا اور یورپ میں مسیحیوں کی مدد کے لیے اقوامِ متحدہ کو بھی استعمال کیا۔ اپنی طاقت اور اثر ورسوخ کو استعمال کر کے ایسٹ تیمور کے جزیرے کو ریفرنڈم کے ذریعے انڈونیشیا سے الگ کر کے آزاد اور خود مختار ملک بنا دیا۔ اسی طرح سوڈان کو تقسیم کر کے تیل کی دولت سے مالا مال حصے کو ریفرنڈم کے ذریعے آزاد مسیحی ریاست بنا دیا۔ لیکن کشمیر کا مسئلہ آج بھی اقوامِ متحدہ کے ایجنڈے پر ہے، اسی طرح آزاد فلسطینی ریاست کا مسئلہ بھی ابھی تک حل نہیں ہو پا رہا، لیکن مسلم ممالک عالمی سطح پر وُقعت وتکریم سے محروم ہیں اور عالمی معاملات میں ان کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ امریکا اور اہلِ مغرب جب چاہتے ہیں اُنہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر لیتے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال افغانستان کے امور میں اہلِ پاکستان کو کرائے کی فوج (Mercenary) کے طور پر استعمال کرنا اور پھر ٹشو پیپر کی طرح حقارت سے پھینک دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور (اے مسلمانو!) تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے، حالانکہ بے بس کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے بعض یہ فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں ظالموں کی اس بستی سے نکال لے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی پیدا فرما اور کسی کو اپنے پاس سے ہمارا مددگار بنا دے''۔ (النساء:75)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

(۱) ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ خود اُس پر ظلم کرتا ہے اور نہ وہ اسے (مصیبت کے وقت) دشمن کے رحم وکرم پر چھوڑتا ہے، جو کوئی (مصیبت کے وقت) اپنے (مسلمان) بھائی کی حاجت روائی کرے گا تو اللہ تعالیٰ (مشکل میں) اس کی حاجت پوری فرمائے گا اور جو کوئی اپنے مسلمان بھائی سے کسی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کی کسی مصیبت کو دور فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے

(۲) ''ایک دوسرے سے محبت کرنے، ایک دوسرے پر رحم کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ نرمی کے ساتھ پیش آنے میں مسلمانوں کی مثال ایک جسم کی طرح ہے کہ اگر اس کے کسی ایک عضو کو تکلیف پہنچے، تو باقی سارا جسم بیداری اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے''۔ (مسلم:2586)

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ امتِ مسلمہ اور مسلمانانِ عالم آج میانمار کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کو نہیں پہنچ پا رہے اور نہ ہی ان کے لیے عالمی سطح پر صدائے احتجاج بلند کی جارہی ہے، جیسا کہ اس کا حق ہے۔ ہم ایک ایسے دور میں رہ رہے ہیں کہ امریکا اور مغربی اقوام نے وحشی جانوروں (Wild Life)، انواع واقسام کی حیاتیاتی مخلوق اور آثارِ قدیمہ کے تحفظ کے لیے باقاعدہ ادارے قائم کر رکھے ہیں، لیکن مظلوم انسانیت کی چیخوں اور فریادوں کو سننے والا اور ان پر کان دھرنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہمارے ملک میں سعودی عرب کی حمایت میں اور تحفظِ حرمینِ طیبین کے نام پر کانفرنسوں، سیمیناروں اور ریلیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا اور یہ سب مساعی قابلِ تحسین ہیں۔ لیکن روہنگیا کے مظلوم مسلمانوں کے لیے وہ ہمدردی دیکھنے میں نہیں آئی، جبکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(۱) ''کائنات کے اس پورے نظام کی بساط کو لپیٹ دینا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک (مظلوم) مسلمان کے قتلِ ناحق کے مقابلے میں معمولی بات ہے''۔ (سنن ترمذی:1395)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کعبۃ اللہ کے طواف کے دوران یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''(اے کعبۃ اللہ!) تو کتنا پاکیزہ ہے اور تیری خوشبو کتنی پیاری ہے اور تیری حرمت کس قدر عظیم المرتبت ہے، (مگر) اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک (بے قصور) مومن کی جان ومال کی حرمت تجھ سے بھی زیادہ ہے اور یہ کہ ہم مومن کے بارے میں (ہمیشہ) اچھا گمان رکھیں''۔ (سنن ابن ماجہ:3931)

اظہار مقصود ہوتا ہے، کیونکہ ہماری بے توقیری کی وجہ سے عالمی سطح پر اس کے اثرات مرتب نہیں ہوتے، یعنی نوٹس تک نہیں لیا جاتا۔ لیکن اُمتِ مسلمہ کے وہ باشعور اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد جو امریکا اور یورپ میں باعزت اور محفوظ زندگی گزار رہے ہیں، انہیں چاہیے کہ روہنگیا مسلمانوں کی حالتِ زار کی طرف عالمی برادری، اقوامِ متحدہ اور حقوقِ انسانی کی تنظیموں کو متوجہ کرنے کے لیے کوئی منظم تحریک برپا کریں، شاید ان کی کوئی اشک شوئی ہوسکے۔ انہیں چاہیے کہ ان کی بحالی اور حالتِ زار کے مشاہدے کے لیے ایک حقائق جمع کرنے والا وفد (Facts Finding Mission) بنا کر بھیجیں تاکہ مصدقہ حقائق دنیا کے سامنے آسکیں، ان مظلوم مسلمانوں کی اخلاقی اور علامتی حمایت بھی ہوسکے اور کسی حد تک میانمار کی ظالم حکومت کو ترحم پر آمادہ کیا جاسکے۔

اور یہ بھی ضروری ہے کہ اُن کے لیے عالمی سطح پر ایک فنڈ قائم کیا جائے اور حکومتِ پاکستان کو چاہیے کہ اس سلسلے میں کم از کم پہل کرے اور دوسرے مسلم ممالک کو بھی اس کارِ خیر پر آمادہ کرنے کے لیے سفارتی سطح پر اقدامات کرے۔ حال ہی میں پاکستان نے انسانی بنیادوں پر نیپال کے زلزلے کے متاثرین کے لیے امداد فراہم کرنے میں پہل کی تھی اور یہ ایک اچھا اقدام تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ ترکی کی حکومت نے سرکاری سطح پر مؤثر صدائے احتجاج بلند کی ہے، یہ بھی غنیمت ہے۔

6 جون 2015ء

خیبر پختونخوا کے مقامی انتخابات

خیبر پختونخوا کے مقامی انتخابات بہر حال منعقد ہو گئے اور پایۂ تکمیل تک پہنچے، ان انتخابات کا یہ پہلو افسوسناک ہے کہ یہ مردم کُش ثابت ہوئے۔ مابعد انتخابات (Post Elections) کی تلخیاں اور مباحثے کچھ عرصے جاری رہیں گے، کیونکہ تازہ موضوعات تلاش کرنا اور اسٹوڈیوز میں رونقیں لگانا میڈیا کی ضرورت ہے۔ یہ دعویٰ بھی درست ہے کہ امیدواروں کی تعداد کے اعتبار سے یہ بڑے انتخابات تھے، ہماری انتظامیہ اور الیکشن کمیشن کو اس کا تجربہ نہیں تھا، لہٰذا وہ بہتر استعداد اور انتظامی صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کر سکے۔ معمول سے زیادہ تصادم اور محاذ آرائی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جب بہت نچلی سطح پر آمنے سامنے کا مقابلہ ہو تو مقامی سطح کی عصبیتیں اور نفرتیں جاگ اٹھتی ہیں اور اختلافات جماعتی سے زیادہ شخصی سطح پر آجاتے ہیں۔ عدمِ برداشت ویسے بھی ہمارے قومی مزاج کا حصہ بنتی جا رہی ہے اور اب تمام طبقات اسی نفسیاتی بیماری کی لپیٹ میں ہیں۔ اسی طرح ذاتی اور گروہی مفادات کے لیے بھی عصبیتوں کو ابھارنا ہمارا کلچر بنتا جا رہا ہے، جو کہ ایک منفی اور غیر تعمیری سماجی رویہ ہے۔

عربی کا مقولہ ہے: ''امتحان کے مرحلے سے گزر کر ہی انسان عزت و تکریم کا حقدار قرار پاتا ہے یا ذلت و رسوائی سے دوچار ہوتا ہے''۔ سو یہی سبب ہے کہ صوبۂ خیبر پختونخوا کی حکومت اور پی ٹی آئی کو بحیثیتِ جماعت دفاعی پوزیشن میں آنا پڑا، کیونکہ غلطی کسی کی بھی ہو، ذمے دار حکومتِ وقت ہی قرار پاتی ہے۔ سو یہ ممکن نہیں تھا کہ پی ٹی آئی اور خیبر پختونخوا کی

ہمارے الیکشن کمیشن کے بعض فیصلے بھی دانش وحکمت سے عاری نظر آئے، مثلاً وزرا اور ایم این اے وغیرہ کا اپنی جماعت کے امیدواروں کی انتخابی مہم نہ چلا سکنا، جب انتخابات سیاسی بنیادوں پر ہورہے ہیں تو سیاسی قائدین، خواہ حکومت میں شامل ہوں یا حزبِ اختلاف کا حصہ ہوں، کو اپنی جماعت کی انتخابی مہم چلانے کا آزادانہ موقع ملنا چاہیے، ساری جمہوری دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ البتہ یہ پابندی ضرور عائد ہونی چاہیے کہ کوئی وزیر یا حکمراں جماعت کا عہدیدار انتخابی مہم میں سرکاری مشینری، ذرائع اور اثر ورسوخ کا استعمال نہ کرے اور نہ ہی انتخاب کا اعلان ہونے کے بعد کسی ترقیاتی منصوبے کا اعلان کرے، ورنہ کسی ایک فریق کو کھلا میدان حوالے کر دینا قرینِ انصاف نہیں ہوگا۔

اگرچہ میڈیا پر مطالبات اور بحثیں جاری ہیں، لیکن ایسا لگتا ہے کہ اپنی اپنی جگہ پر سب کسی حد تک مطمئن ہیں۔ پی ٹی آئی کو حکمران جماعت کی حیثیت سے مجموعی طور پر اکثریت مل گئی ہے، یہ اس کے لیے نفسیاتی تسکین کا سبب ہے۔ اے این پی گزشتہ قومی انتخابات کی عبرت ناک ناکامی سے نکل کر اپنے سیاسی اِحیا کے دور میں داخل ہوئی ہے، تو یہ پہلوان کے لیے یقیناً اطمینان کا باعث ہوگا۔ جمعیتِ علمائے اسلام اور جماعتِ اسلامی کو بھی ان کا حصہ مل گیا ہے، سو انہیں بھی ایک گونہ اطمینان ہے۔ مسلم لیگ (ن) کی اولین ترجیح چونکہ اپنی وفاقی اور صوبۂ پنجاب کی حکومت کو بچائے رکھنا ہے، اس لیے انہوں نے زیادہ زور لگایا ہی نہیں اور نہ ہی وہ پنگا لینے کے موڈ میں ہیں، پس جو بیر خود ہی ان کی گود میں آگرے ہیں، وہ اسی پر صابر وشاکر اور قانع ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ پی ٹی آئی پر دیگر سیاسی جماعتوں اور میڈیا کی طرف سے جو اخلاقی دباؤ پڑا ہے، یہ اُن کے لیے اضافی تسکین کا باعث بنا کہ جناب عمران خان کے مسلم لیگ (ن) کی طرف پھینکے ہوئے پتھر خود اُن کی طرف واپس پلٹ آئے ہیں، اسی کو ''بیک فائر'' کہتے ہیں۔ اس طرح کے منتشر نتائج (Split Mandate) میں سب سے زیادہ فائدہ آزاد امیدواروں کو ہوتا ہے کہ وہ آسانی سے اقتدار کی طرف لڑھک

آزاد امیدوار کثیر تعداد میں منتخب ہوئے ہیں، سوان کا بھلا ہو جائے گا۔

جناب عمران خان مثالیت پسند (Idealist) ہیں۔ زمینی حقائق سے آنکھیں بند کر کے محض تصوراتی سیاست ڈرائنگ روم یا اسٹوڈیوز میں سیاسی بحث مباحثے کی حد تک تو چل سکتی ہے، عملی زندگی میں اس کا برگ وبار لانا کافی دشوار ہے۔ لہٰذا ہمارے زمینی حقائق اور معروضی حالات کے تحت مناسب یہ ہے کہ سیاست مثالیت اور عملیت کا حسین امتزاج ہونی چاہیے۔ مسلم لیگ (ن)، پیپلز پارٹی، اے این پی اور مولانا فضل الرحمن پر جنابِ عمران خان کے عائد کیے ہوئے الزامات تقریباً سب کو ازبر ہو چکے ہیں، اگر اب تک ان کی اپنی تسکین نہیں ہو پائی تو روزانہ آموختہ دہراتے رہیں۔ لیکن اگر عاجزانہ مشوروں کو درخورِ اعتنا سمجھیں تو کچھ ذخیرۂ الفاظ اور سرمایۂ الزامات آئندہ انتخابات کے لیے بھی بچا کر رکھیں، کیونکہ دانا لوگوں کی کہاوت ہے: ''داشتہ آید بکار''۔ خدا جانے ان کے کس مشیر نے اُن کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ لوگوں کو میٹرو بس، موٹروے اور سڑکیں نہیں چاہییں۔ حضور والا! لوگ انہی آسائشوں، سہولتوں اور ضرورتوں کے لیے سیاست دانوں کو ووٹ دیتے ہیں اور سیاست دان یہی سبز باغ دکھا کر تو لوگوں سے ووٹ لیتے ہیں، کیا آپ لوگوں کو انگلی پکڑ کر جنت میں چھوڑ کر آئیں گے، جو دوسری سیاسی جماعتیں نہیں کر پائیں گی۔

خان صاحب نے کافی وقت برطانیہ میں گزارا ہے، ان کا یہ کہنا درست ہے کہ جمہوری ممالک میں ڈیلیوری مقامی سطح پر ہوتی ہے، بنیادی تعلیم، امن وامان اور شہری خدمات کے تمام شعبے مقامی حکومتوں یعنی Counties اور Councils کے ماتحت ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ مالی معاملات میں خود مختار ہوتی ہیں، اُن کی آمدنی کے اپنے ذرائع اور مقامی ٹیکس بھی ہوتے ہیں، جن میں پراپرٹی ٹیکس سرِ فہرست ہے، بلڈنگ کنٹرول کا سارا شعبہ مقامی حکومتوں کے پاس ہوتا ہے۔ ایک بار امریکا کے دورے کے دوران ہم امریکی دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی سے متصل ریاست ورجینیا گئے، تو وہاں

اپنے میزبان سے اس کا سبب پوچھا، تو انہوں نے بتایا کہ واشنگٹن ڈی سی کے مقابلے میں ورجینیا مال دار ریاست ہے، کیونکہ واشنگٹن کی سڑکوں پر جا بجا کریکس تھے اور وہ قابلِ مرمت نظر آتی تھیں۔ ہمارے ذہن میں تو وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کا نقشہ رہتا ہے۔ ہمارے ہاں شاہی محلات تعمیر ہو رہے ہیں اور ان کا قصرِ ابیض (White House) بہت پرانا ہے اور وہیں بیٹھ کر وہ دنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ نئے صدر کے انتخاب پر وائٹ ہاؤس کی تزئینِ نو (Renovation) کے لیے کچھ رقم منظور ہوتی ہے، تو وہ بھی تنقید کی زد میں آتی ہے۔ یہی صورتِ حال 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ لنڈن کی ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس کے پیچھے اُن کے طویل تجربات، اَقدار و روایات ہیں اور وہ آسانی سے ان پر سمجھوتا نہیں کرتے۔ برطانیہ کا تو دستور بھی تحریری میثاق کی صورت میں نہیں ہے، ان کا تو جمہوری پارلیمانی نظام بھی روایات واقدار پر قائم ہے، وہاں تو بعض اوقات حکومت سے باہر رہ کر عددی اعتبار سے اقلیتی حکومت کو بھی سہارا دیا جاتا ہے اور اسے گرنے نہیں دیا جاتا۔ کیا ہمارے قومی اور سیاسی مزاج میں اتنا تحمل، اتنا نظم اور اتنا صبر وضبط ہے۔ ہماری تو تصوراتی معراج ہی حکومتِ وقت کو گرانا ہوتا ہے۔

ہمارا نظام اور قومی وسیاسی مزاج ارتکازِ اقتدار اور ارتکازِ اختیارات ہے، مالی وسائل کا ارتکاز بھی اسی مزاج کا حصہ ہے۔ پھر اگر ماتحت مقامی حکومت اپنی جماعت کی ہے، تو اقتدار کی چھلنی سے مالی وسائل کے چند قطرے اس کے لیے ٹپکا دیے جائیں گے۔ اور اگر وہ مخالف جماعت کی ہے تو اسے وسائل کے لیے ترسایا جاتا ہے۔ اس لیے بہتر ہوتا کہ پہلے ضلع اور تحصیل کی سطح تک منتخب مقامی حکومتیں قائم کر کے ان کا تجربہ کیا جاتا، صوبے سے مقامی سطح تک وسائل واختیارات اور ذمے داریوں کی تقسیم کا ایک قابلِ عمل نظام وضع کیا جاتا اور پھر بتدریج اسے نچلی سطح تک لے جاتے۔ ابتدائی طور پر ضلع اور تحصیل سطح کی مقامی حکومتوں کی مدت دو یا تین سال بھی رکھی جاسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کرپشن پر کنٹرول

پر باہمی رنجشوں، عداوتوں اور نفرتوں کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے، لہٰذا اختیارات کو انتقام کے لیے استعمال کرنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ خیبر پختونخوا میں مقامی سطح پر پھیلاؤ کافی زیادہ کر دیا گیا ہے، اس کے لیے سول سروس کا ڈھانچہ (یعنی سکریٹریز وغیرہ) بھی ایک مالی بوجھ (Liability) بن سکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ محدود مالی وسائل کا اکثر حصہ خدمات کی فراہمی کی بجائے بیوروکریسی اور نظم کے قیام پر صرف ہو جائے۔ شروع میں ایسے شعبوں کے لیے ملازمین کنٹریکٹ پر رکھے جاتے ہیں، لیکن پھر ان کی یونین بن جاتی ہے، مستقل کرنے کے لیے احتجاج کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، میڈیا لائیو کوریج کرتا ہے، پولیس کے لیے کنٹرول کرنا مشکل ہوتا ہے، ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر وہ سختی کریں تو سیاسی دباؤ کے نتیجے میں معطلی کا خطرہ مول لیں، ورنہ ''ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم'' کا منظر پیش کریں اور اپنی نوکری بچائیں، کیونکہ پولیس سے نفرت ہماری قوم کی گھٹی میں پڑی ہے اور اس کے اثرات زائل ہونے اور پولیس کے سدھرنے میں نہ جانے کتنا وقت لگے گا:

''کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک''

8 جون 2015ء

خلع اور فسخِ نکاح

آج کل بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں ماضی کے مقابلے میں طلاق کی شرح ویسے بھی زیادہ ہو چکی ہے، اسی تناسب سے ''عدالتی فسخِ نکاح'' کی شرح میں بھی اضافہ ہوا ہے، جسے عرفِ عام میں ''خلع'' کہا جاتا ہے، حالانکہ یہ شرعی ''خُلع'' نہیں ہے۔ شرعی خلع یہ ہے:

''اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ یہ زوجین اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے، تو عورت نے جو بدلِ خلع دیا ہے (شوہر کے اسے لینے میں) تم دونوں پر کوئی حرج نہیں ہے''۔ (البقرہ:229)

اس ارشادِ باری تعالیٰ کی رو سے ''خلع'' یہ ہے کہ زوجین جب اس نتیجے پر پہنچ جائیں کہ وہ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی ازدواجی زندگی قائم نہیں رکھ سکیں اور شوہر یک طرفہ طور پر طلاق دینے پر آمادہ نہیں ہے، تو پھر بیوی نے نکاح کے موقع پر جو ''حقِ مہر'' لیا ہے، وہ شوہر کو واپس کر دے اور شوہر اُس کے عوض اُسے طلاق دے دے، یہ خلع ''طلاقِ بائن'' ہوتی ہے، اس کے بعد شوہر کو عدت کے اندر بھی یک طرفہ رجوع کا حق نہیں رہتا۔ البتہ دونوں باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ایک ہی طلاق دی ہو۔

''خلع'' قاضی کے یک طرفہ حکم سے نافذ نہیں ہوتا، اس پر زوجین کی رضامندی ضروری ہے اور قاضی کو چاہیے کہ ترغیب یا ترہیب سے شوہر کو آمادہ کرے۔ فیملی کورٹس کے جج صاحبان عام طور پر شرعی حدود کی رعایت نہیں کرتے، بس صرف قانونی تقاضوں کو

آئے دن لوگ عدالت سے ''فسخِ نکاح'' کی ڈگری لے کر دارالافتا میں آتے ہیں کہ یہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟ کسی بھی مفتی کے لیے ہر فیصلے کی توثیق دشوار ہوتی ہے، بلکہ ''عدالتی ڈگری'' کے باوجود اسے معاشرہ بھی آنکھیں بند کر کے قبول کرنے لیے تیار نہیں ہوتا اور معاشرتی واخلاقی اقدار اور معاشرتی مزاحمت کی بھی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ بیشتر فیصلے ''قضا علی الغائب'' ہوتے ہیں۔ ہمارے جج صاحبان بھی ماشاء اللہ مسلمان ہیں اور انہیں یہ معلوم ہے کہ مجرّد دعویٰ ثبوتِ دعویٰ کے لیے کافی نہیں ہوتا، بلکہ ہر مقدمے میں مُدّعی سے اس کے دعوے کے حق میں ثبوت مانگا جاتا ہے، ''مُدّعیٰ علیہ'' کو اپنی صفائی اور وضاحت کا موقع دیا جاتا ہے کہ یا تو وہ بیوی کی طرف سے عائد کیے ہوئے الزامات کو تسلیم کرے ورنہ اپنی براءت کے شواہد پیش کرے۔ آج کل بالعموم یہ ہوتا ہے کہ ''مُدّعیٰ علیہ'' نہ تو اصالتاً اور نہ ہی وکالتاً عدالت میں حاضر ہوتا ہے، اس کو عدالت کی جانب سے رسمی طور پر سمن جاری ہو جاتا ہے، بیلف چلا جاتا ہے، اس کے دروازے پر نوٹس چسپاں کر آتا ہے یا اخبارات میں اشتہار دے دیا جاتا ہے۔ عام لوگ کب اطلاعِ عام کے اِن روزمرّہ اشتہارات کو پڑھتے ہیں۔ جج کے منصب کو قوت سربراہِ مملکت کی طرف سے حاصل ہوتی ہے، لہٰذا جج پر لازم ہے کہ وہ پولیس کو پابند بنائے کہ وہ ''مُدّعیٰ علیہ'' کو عدالت میں پیش کرے، کیونکہ یہ محض دادرسی اور حق طلبی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ حلال وحرام کا بھی مسئلہ ہے۔ چنانچہ جب ہم معلوم کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ اکثر صورتوں میں ''مُدّعیٰ علیہ'' ملک میں موجود ہوتا ہے اور اس کا صحیح پتا بھی فریقِ مخالف کو معلوم ہوتا ہے۔ یہ استثنا صرف ان مقدمات میں معتبر ہوسکتا ہے، جہاں ''مُدّعیٰ علیہ'' یا تو بالکل لاپتا ہو یا ملک سے باہر ہو، تاہم وہاں بھی ممکنہ طور پر پاکستانی سفارت خانے کی مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔

جج کو اس بات کا پابند ہونا چاہیے کہ وہ ان وجوہ کو باقاعدہ قلم بند کرے، جن کی رو سے اس کے اطمینان اور پیش کردہ ثبوت وشواہد کے مطابق عورت کے لیے عملاً ممکن نہیں رہا کہ

ہونے کا اندیشہ ہے۔ان میں سے بعض وجوہ کا تذکرہ ہم آگے چل کر کریں گے۔الغرض ''فسخِ نکاح'' اور خُلع کے معاملات کو الگ کر دینا چاہیے۔''فسخِ نکاح'' کے مقدمے میں صرف اتنی بات کافی نہیں کہ عورت کہے کہ میں شوہر کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی، جب کہ شرعی معیار پر اس کی قابلِ قبول وجوہ موجود نہ ہوں۔اگر خدانخواستہ قانون میں سقم ہے تو جج صاحبان کو پھر بھی شریعت کی رعایت اور حلال وحرام کی نزاکت اور حساسیّت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔بعض حضرات درجِ ذیل حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ قاضی کو معقول وجوہ کے بغیر بھی ''فسخِ نکاح'' کا اختیار حاصل ہے:

''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! ثابت کے دین اور اخلاق کے بارے میں مجھے کوئی شکایت نہیں ہے، مگر میں اسلام میں رہتے ہوئے کفر (ناشکری اور شوہر کی نافرمانی) سے ڈرتی ہوں۔تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: کیا تم وہ باغ (جو ثابت نے نکاح کے وقت مہر میں دیا تھا) اسے واپس کر دو گی، اس نے عرض کی: جی ہاں! چنانچہ اس نے (مہر میں لیا ہوا) وہ (باغ) شوہر کو واپس کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے (ثابت سے) فرمایا: باغ قبول کر لو اور اسے ایک طلاق دے دو''۔(بخاری:5273)

بخاری میں اس سے اگلی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں (ثابت کو) طلاق کا حکم فرمایا اور ثابت نے طلاق دے دی، اس سے آگے ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ثابت کو حکم فرمایا تو انہوں نے بیوی سے (بذریعہ طلاق) علیحدگی اختیار کر لی۔

یہ حدیث ''فسخِ نکاح'' سے متعلق نہیں ہے، یعنی یہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بحیثیت حاکم وقاضی نکاح فسخ فرمایا بلکہ آپ نے بیوی کو مہر واپس کرنے اور شوہر کو طلاق دینے پر آمادہ فرمایا اور یہی خلع ہے۔شریعت کا تقاضا ہے کہ جج صاحبان فسخِ نکاح کو آخری

ہونی چاہیے، دوسری شوہر کو رضا کارانہ طلاق پر آمادہ کرنا اور تیسری دونوں کو خلع پر آمادہ کرنا ہونی چاہیے، کیونکہ اگر چہ شریعت نے انتہائی ناگزیر صورتِ حال میں زوجین میں طلاق یا تفریق کی گنجائش رکھی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام حلال امور میں یہ سب سے زیادہ اس کے غضب کا باعث ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو قاضی یا حاکم سے زیادہ تصرف کا حق حاصل ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''نبی کو مومنوں پر اس سے زیادہ تصرف کا حق حاصل ہے، جتنا خود ان کو اپنی ذات پر ہے''۔ (الاحزاب:6)

اس لیے رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ بہر حال نافذ ہے اور آپ ﷺ وجوہ کو بتانے کے پابند نہیں ہیں، جبکہ عام جج اور حاکم کی ولایت شرعی حدود کی پابند ہے۔ فقہِ حنفی میں ''عدالتی فسخِ نکاح'' کے بارے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور احتیاط میں یہ شدت اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ یہ حلال وحرام کا مسئلہ ہے، تاہم ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک بعض قیود کے ساتھ اس کی گنجائش موجود ہے اور فقہِ حنفی میں بھی یہ اصول مُسلّم ہے کہ شدید ضرورت کی بنا پر فسخِ نکاح کے لیے دوسرے ائمہ کے قول پر فیصلہ دیا جاسکتا ہے، ان میں سے چند صورتیں یہ ہیں:

شوہر بے انتہا مار پیٹ کرتا ہے، جسمانی وذہنی اذیت میں مبتلا رکھتا ہے، نہ حقوق ادا کرتا ہے نہ طلاق دے کر گلو خلاصی کرتا ہے، بس اسے معلّق رکھنا چاہتا ہے یا شوہر نان نفقہ نہیں دیتا اور بیوی کے پاس کفالت کا کوئی اور ذریعہ بھی نہیں ہے، عجز کی بنا پر بیوی کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ یا شوہر کسی مُوذِی مرض میں مبتلا ہے، جیسے برص وجذام یا کینسر وغیرہ اور نکاح کے وقت بیوی کو معلوم نہیں تھا، اسے دھوکے میں رکھا گیا تھا، بعد میں اس پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی، اگر وہ اس کے باوجود رشتۂ ازدواج کو قائم رکھنا چاہے تو یہ اس کے لیے سعادت کی بات ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں اجر پائے گی، لیکن اگر وہ کسی

یا عمر قید) ہو گئی ہے اور بیوی جواں عمر ہے، اس کے لیے اپنے فطری جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے حدودِ شرع میں رہنا ممکن نہیں ہے اور گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے یا کوئی اس کا کفیل نہیں ہے یا شوہر بلا سبب طویل عرصے تک حقوقِ زوجیت ادا نہیں کرتا یا شوہر مجنون ہو گیا، مناسب وقت گزرنے پر بھی علاج سے صحت یاب نہ ہو سکا، اس کے جنون سے بیوی کے جسم و جاں کو خطرہ لاحق ہے یا وہ اب حقوقِ زوجیت کی ادائیگی اور بیوی کی کفالت کا اہل ہی نہیں رہا وغیرہ۔ لیکن ان تمام صورتوں میں جج صاحب کو وجوہ ریکارڈ پر لانی ہوں گی اور یہ کہ عدالت میں مدعیہ کے یہ الزامات درست ثابت ہوئے، بعض امور میں ماہرین کی رائے درکار ہوتی ہے۔

آخر میں میری دردمندانہ گزارش ہے کہ اگر کوئی عورت خدانخواستہ خوفِ خدا سے عاری ہے، اس پر نفسانی خواہشات یا ہوسِ زر کا غلبہ ہے یا عشرتوں کی دل دادہ ہے اور کسی بھی قابلِ قبول سبب کے بغیر شوہر کے ساتھ بہر صورت رہنے کے لیے تیار نہیں ہے، تو ایسی صورتِ حال میں شوہر کو چاہیے کہ وہ رضا کارانہ طور پر خُلع پر آمادہ ہو جائے یا یک طرفہ طور پر طلاق دے دے۔ اس پر وہ عنداللہ اجر کا حق دار ہو گا اور عورت فتنہ اور گناہ میں مبتلا ہونے سے بچ جائے گی اور اگر شوہر رضا کارانہ طور پر اس پر آمادہ نہ ہو تو عدالت مناسب دباؤ ڈال کر اس سے طلاق دلوائے۔ اس ضمن میں ہمارے ایک قابلِ احترام کالم نگار کا اپنی رائے کو عینِ اسلام اور غالب اکثریت کے فقہی موقف کو مسلکی عصبیت قرار دینا قرینِ انصاف نہیں ہے۔

13 جون 2015ء

جولائی 2015ء

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

علامہ اقبال نے اسلام کی روح میں ارتقا کی امکانی قوت (Potential) کو دیکھتے ہوئے اور اپنی نیک خواہشات کے تحت کہا تھا:

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا، جتنا کہ دبا دیں گے

مگر خواجہ الطاف حسین حالی نے زمینی حقائق اور امتِ مسلمہ کے زوال کے نہ رکنے والے سلسلے کو دیکھا، تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے اور بے اختیار اپنے دردِ دل کو نوکِ قلم پر لے آئے اور کہا:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

مدّ و جزر سمندر کی موجوں کے بلند ہونے اور پھر پیچھے چلے جانے کو کہتے ہیں، اسی کو انگریزی میں Tide کہتے ہیں۔ یعنی قانونِ قدرت یہ ہے کہ سمندر کی موجیں پوری قوت کے ساتھ ابھر کر آتی ہیں اور سانپ کی طرح پھن پھیلائے ہوئے آگے بڑھتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ بہا لے جائیں گی، مگر قدرت اچانک اس کی طنابیں کھینچ لیتی ہے اور

یہی قانونِ قدرت ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے تو یہ رکنے کو نہیں آرہا، لگتا ہے کہ اس کے بحر میں تموّج رہا ہی نہیں تاکہ امید کی جاسکے کہ یہ کبھی نہ کبھی تو پلٹ کر ابھرے گا اور اپنی سابق توانائی اور جولانی کے ساتھ باطل کو بہا لے جائے گا۔ الغرض علامہ اقبال چونکہ حکیم ہیں، اُن کے سامنے اُمّتوں کے عروج وزوال کی پوری داستانیں ہیں اور زمین پر اُن کے باقی ماندہ آثار اور کھنڈرات گواہی دیتے ہیں کہ: ''میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا''، لہٰذا مسلمانوں کو مستقل قنوطیت (Desperateness) کا شکار نہیں ہونا چاہیے، جِدّ وجُہد کرتے رہنا چاہیے، کبھی نہ کبھی ''احساسِ زیاں'' جاگ اٹھے گا اور سلگتی ہوئی چنگاری شعلۂ جوالہ بن جائے گی، لہٰذا امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے۔ اس کے برعکس خواجہ الطاف حسین حالی جب امت میں اپنے آباء کی گم گشتہ میراث کے احساسِ زیاں کا فُقدان دیکھتے ہیں، تو اپنے جذبات پر قابو نہ پاتے ہوئے یہ اشعار کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

علامہ اقبال تو امت کے دل و دماغ میں ہر قیمت پر امید کی شمع روشن رکھنا چاہتے ہیں اور اُن کے جذبات کو ہمیشہ بلند وبالا دیکھنا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ مسلم نوجوان سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
عَبَث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

یعنی مومن اور امتِ مسلمہ کو رضائے الٰہی کا مظہر بننا چاہیے اور جب مومن رضائے الٰہی کا مظہر بن جائے تو اللہ تعالیٰ تقدیر کو اس کے تابع فرمادیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ کے بعض محبوب بندے ایسے ہوتے ہیں کہ بظاہر وہ پراگندہ حال ہوتے

یہ ہے کہ کسی بات کے بارے میں) اللہ کی قسم کھا کر کہہ دیں (کہ یہ یوں ہے) تو اللہ تعالیٰ اُن کی قسم کی لاج رکھ لیتا ہے (اور وہ بات اسی طرح وقوع پذیر ہو جاتی ہے)''۔

(صحیح مسلم: 2024)

یہ تمہیدی سطور میں نے اس لیے لکھیں کہ حال ہی میں اپنا جوہری پروگرام منجمد کرنے یا ختم کرنے کے حوالے سے طویل مزاحمت کے بعد ایران کو امریکا اور اہلِ مغرب کے آگے سپر انداز ہونا پڑا اگرچہ انقلابِ ایران کے بعد مرگ بر امریکا اور شیطان بزرگ کے القابِ خبیثہ سے امریکا کو نوازا جاتا تھا، مگر بالآخر ایران اس کی بالادستی کو ماننے پر مجبور ہو گیا، اس کی عزیمت اور مزاحمت جواب دے گئی اور میڈیا کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق ایرانی اس معاہدے کی خبر سن کر بے اختیار سڑکوں پر آ گئے اور خوشی سے نعرے لگانے لگے، کیونکہ اقتصادی پابندیوں کی وجہ سے وہ معاشی دباؤ اور مشکلات کا شکار تھے، اُن کے اثاثے چھتیس برس سے منجمد تھے، ظالمانہ تجارتی پابندیاں عائد تھیں اور معیشت کمزور ہو گئی تھی۔

امت منتشر ہے، ان کی آپس میں آویزش اور تناؤ حد سے بڑھا ہوا ہے۔ یمن، عراق، لیبیا، شام اور افغانستان کی صورت حال سب کے سامنے ہے، خود پاکستان داخلی طور پر فساد، تخریب کاری اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مصروف ہے۔ مسلم ممالک کی ترجیحات ایک دوسرے سے جدا ہیں، ''بات سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی'' کہ سعودی عرب اپنے مفادات کے لیے اسرائیل سے زیادہ ایران کو خطرہ سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک ایران مشرقِ وسطیٰ میں اپنا حلقۂ اثر بتدریج بڑھا رہا ہے اور بتدریج عرب ممالک کو اپنے زیرِ اثر لا رہا ہے یا وہ بعض ممالک میں داخلی مزاحمتی تنظیموں کو اخلاقی اور دفاعی مدد فراہم کر رہا ہے اور اسی بناء پر سعودی عرب کا امریکا اور اہلِ مغرب پر وہ اعتماد قائم نہیں رہا جو کبھی تھا۔ یہ اندیشہ بھی دامن گیر ہے کہ یہ امکان موجود ہے کہ آئندہ سعودی عرب کے مقابلے میں ترجیحی طور پر ایران امریکا کا حلیف بن جائے، کیونکہ امریکی مجالسِ مفکرین

اور اس کے مقابلے میں ایران کو نسبتاً اپنے لیے بے ضرر سمجھتے ہیں۔

حال ہی میں چین نہایت خاموشی کے ساتھ اور علانیہ اہلِ مغرب کو چیلنج دیے بغیر عالمی سیاست میں مؤثر کردار ادا کرنے لگا ہے اور اس کی واضح علامات پاکستان اور ہندوستان کو ''شنگھائی تعاون کونسل'' کا مستقل ممبر بنانا اور ''گوادر چائنا شاہراہِ معیشت'' کے لیے عملی پیش رفت کا آغاز ہے۔ اس سے چائنا سینٹرل ایشیاء کے مسلم ممالک تک رسائی چاہتا ہے، جس کے سبب اُس کے لیے اپنے دائرہ اثر اور معیشت کے پھیلاؤ کے ناقابلِ تصور مواقع پیدا ہو جائیں گے۔ یہ کوئی سربستہ راز نہیں ہے کہ سینٹرل ایشیاء کے ممالک میں لامحدود قدرتی وسائل ہیں اور اُن کی معیشت میں تیز رفتار نُمُو (Growth) کے فراواں امکانات موجود ہیں۔ لہٰذا امریکا کا چین کی عالمی سیاسی واقتصادی پیش رفت اور پھیلاؤ کے آگے بند باندھنا ناگزیر ہے۔

ہمارے بعض پُرجوش حضرات پُرجوش نعروں اور خطابات کے ذریعے امریکا کو صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں یا عالمی سیاست میں اس کے قائدانہ کردار کو بالکل معدوم کرنا چاہتے ہیں، یہ خواہشات بڑی دل نشیں، دیدہ زیب اور دلکش ہیں۔ لیکن اگر چشمِ بینا اور بصیرت سے حالاتِ حاضرہ کا مشاہدہ کیا جائے تو اس خواب کا تعبیر پانا اتنا آسان نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اسبابِ غیب اور اپنی تقدیر سے صورتِ حال کو آنِ واحد میں تبدیل فرما دے اور اُس کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ لیکن اہلِ نظر جو پیش گوئی یا پیش بینی کرتے ہیں وہ زمینی حقائق اور عالمِ اسباب کے تحت ہوتی ہے، مافوق الاسباب سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت واختیار میں ہے اور پردۂ غیب میں کیا مستور ہے، یہ قطعی طور پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

ہم انیس سو ساٹھ ستر کے عشروں میں بزعمِ خویش انقلابیوں کے مونہوں سے ''ایشیا سرخ ہے''، ''لہو کا رنگ سرخ ہے'' کے دلکش نعرے سنتے تھے، ہمارے بہت سے لوگ

کے بعد انہوں نے بہت جلد نہ صرف حقائق کا ادراک کیا بلکہ اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کرلیا، سب نے اپنا قبلۂ ترجیح امریکا کو بنالیا، بقولِ شاعر:

ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے
ماقبلہ راست کردیم بر سَمت کج کلاہے

یعنی ہرایک کا اپنی دانست میں ایک راستی کا تصور ہے اور ایک قبلۂ عقیدت ہے، مگر ہم نے اپنے عہد کے ''کج کُلاہ'' کو قبلہ قرار دے کر اپنا رُخ اسی کی طرف کرلیا ہے اور آج کی مادّی دنیا کا ''کج کُلاہ'' امریکا ہے اور اس نے انقلابی ایران کو بھی اپنی شرائط کے تحت جھکنے پر مجبور کردیا۔ اگرچہ اسرائیل کی خواہش ہے کہ اس کا گلا ہی گھونٹ دیا جائے، لیکن یہ امریکا کے مفاد میں نہیں ہے۔ حال ہی میں ارسطو اور افلاطون کا وطن یعنی اہلِ مغرب کو حکمت ودانش سکھانے والا یونان اقتصادی بدحالی کے کنارے آپہنچا، پسماندہ اور ترقی پذیر دنیا کی معیشت کی جان جس طوطے میں ہے، اُس کا نام آئی ایم ایف یعنی بین الاقوامی مالیاتی فنڈ ہے، اس نے اسے نادہند (Default) قرار دے دیا، یونانی قوم نے آئی ایم ایف کی شرائط کو رد کردیا۔ اس پر اشتراکیت سے نظریاتی وابستگی رکھنے والے دانشور جناب ڈاکٹر لال خان نے ہمیں بشارت سنائی کہ مغرب کے سرمایہ دارانہ، استحصالی اور استعماری نظامِ سیاست ومعیشت کا زوال مغرب ہی سے شروع ہوچکا، مگر وہاں کی پارلیمنٹ نے نوشتۂ دیوار پڑھ لیا، اپنی قوم کے ریفرنڈم کے فیصلے کو رد کیا اور آئی ایم ایف کی شرائط کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا اور یورپی یونین اپنے نظام کو بچانے کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑی اور جو امید کی کرن محترم ڈاکٹر لال خان نے دکھائی تھی وہ پھر ماند پڑگئی۔ اسی لیے عربی کا مقولہ ہے:

''سچ اگرچہ انمول گوہر ہوتا ہے، مگر کڑوا ہوتا ہے''، سو آج کا کڑوا سچ یہی ہے۔

21 جولائی 2015ء

اگست2015ء

ہتکِ عزت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ''اور بے شک ہم نے بنی آدم کو اپنی مخلوق میں سے بہت سوں پر عزت بخشی اور ان کو بر و بحر میں سواریاں عطا کیں اور ہم نے اپنی مخلوق میں سے بہت سوں پر انہیں فضیلت عطا کی''۔(بنی اسرائیل:۷۰)

(۲) ''بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا، پھر (ان کی بداعمالیوں کے سبب) انہیں سب سے نچلے طبقے میں لوٹا دیا، ان لوگوں کے سوا جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے، سو اُن کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے''۔(التین:۵۔۴)

(۳) ''اور بے شک ہم نے جہنم کے لیے بہت سے ایسے جن اور انسان پیدا کیے جن کے دل ہیں مگر وہ اُن سے سمجھتے نہیں اور اُن کی آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں اور اُن کے کان ہیں مگر وہ اُن سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی بدتر ہیں، وہ غفلت میں ہیں''۔(الاعراف:۱۷۹)

اس سے مراد یہ نہیں کہ اُن کی یہ صلاحیتیں مفلوج اور ناکارہ ہو چکی ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ ان خداداد صلاحیتوں کو حق سمجھنے، آیاتِ الٰہی کو نگاہِ عبرت سے دیکھنے اور پیغامِ حق کو قبولیت کی نیت سے سننے پر آمادہ نہیں ہیں، یعنی عملی اعتبار سے اُن میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ وہ اس لیے جانوروں سے بدتر ہیں کہ جانور تو تعقّل و تدبّر کی صلاحیتوں

اسلام نے انسانیت کو عزّ وشرَف سے نوازا ہے اور اسے اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ اسی طرح انسان کی جان و مال اور آبرو کی حرمت کی پامالی کو حرام قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں آبرو کی حرمت اور جان کی حرمت کو ایک درجہ میں قرار دیا ہے اور کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ دوسرے کی اہانت کرے، اسے بے توقیر کرے اور اس کی عزت کو پامال کرے۔ اسلام نے انسان کی عزّتِ نفس کے تحفظ کے لیے ایک حد بھی مقرر کی ہے، جسے حدِ قذف کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مرد یا عورت پر زنا کی تہمت لگائے اور عدالت میں چار گواہوں کے ذریعے اُسے ثابت نہ کر سکے، تو اُسے اسّی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں گے، یہ سزا سورۃ النور کی آیت نمبر ۴ میں مذکور ہے۔

اس کے علاوہ اسلام نے دوسروں کی عزّتِ نفس کے تحفظ کے لیے متعدد احکام بیان کیے ہیں۔ دنیاوی اعتبار سے ان احکام کو اخلاقی تعلیمات کے درجہ میں رکھا ہے مگر اُخروی اعتبار سے اس کے لیے بڑی وعیدیں ہیں۔ اِن اخلاقی احکام میں دوسروں کا تمسخر اڑانا، دوسروں پر طعن و تشنیع اور اُن کی عیب جوئی کرنا، دوسروں کو برے ناموں سے پکارنا، ثبوت وشواہد کے بغیر دوسروں کے بارے میں بدگمانی کرنا، دوسروں پر جھوٹ بولنا، دوسروں کے پوشیدہ احوال کی ٹوہ لگانا اور بے آبرو کرنے کے ارادے سے اُن کا تجسّس کرنا، غیبت کرنا اور بہتان طرازی سب شامل ہیں۔ سورۃ الحجرات کے دوسرے رکوع میں اور سورۃ الھمزۃ میں اس کے بارے میں سخت وعیدیں ہیں۔ قرآن وحدیث کی اصطلاح میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبانِ مبارک سے ملنے والی اجر کی بشارت کو ''وَعد'' کہتے ہیں اور عذابِ جہنم کا ڈر سنانے کو ''وعید'' کہتے ہیں۔

یہ تمہیدی کلمات میں نے اس لیے عرض کیے کہ ہمارے وطنِ عزیز میں ایک قانون ہے جسے Defamation Act کہتے ہیں، اردو میں اسے ''ازالۂ حیثیتِ عرفی'' کہا جاتا ہے۔ اس قانون میں کسی کی شخصی اہانت کی سزا بھی مقرر کی گئی ہے اور بعض اوقات ہم یہ بھی

معافی کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن عملاً ہم نے اس قانون کو کبھی نافذ ہوتا ہوا نہیں دیکھا۔ صرف چند ہی مثالیں ہوں گی جہاں الزام لگانے والے نے عدالت کے روبرو فریقِ مخالف سے معافی مانگی ہے۔

پاکستان تحریکِ انصاف کے سربراہ جناب عمران خان نے سابق چیف جسٹس آف پاکستان جناب افتخار محمد چوہدری اور سابق نگراں وزیرِ اعلیٰ پنجاب جناب نجم سیٹھی پر ۲۰۱۳ء کے قومی انتخابات میں اثر انداز ہونے (Riging) کا الزام لگایا اور اسے تسلسل کے ساتھ دہراتے رہے۔

ان دونوں حضرات نے عدالت میں جناب عمران خان کے خلاف ازالۂ حیثیتِ عرفی کا دعویٰ کیا اور غیر مشروط معافی نہ مانگنے کی صورت میں بھاری معاوضے کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ کس کی عزت وحُرمت کی قیمت یا بدل کیا ہے اور عدالت کے پاس اس کا معیار کیا ہے، لیکن تاحال ان دونوں حضرات کے مقدمات زیریں عدالتوں میں ہمارے روایتی ضابطۂ قانون (Procedural law) کے تحت چیونٹی کی رفتار سے چل رہے ہیں اور شاید عرصۂ دراز تک چلتے رہیں۔

عبرت کا مقام ہے کہ وہ چیف جسٹس جو کبھی توہینِ عدالت کے تحت ایک دومنٹ یا چند سیکنڈ کی سزا دے کر وقت کے منتخب وزیرِ اعظم جناب سید یوسف رضا گیلانی کو معزول کر سکتے تھے، آج انہیں اسی آزاد عدلیہ کی ایک ماتحت عدالت سے انصاف نہیں مل رہا یا عدالت اُن کے فریقِ مخالف کو سنجیدگی کے ساتھ مقدمے کی کاروائی میں حصہ لینے پر مجبور نہیں کر پارہی تو کسی اور کو حقیقی اور مکمل انصاف ملنے کی توقع کیسے قائم کی جاسکتی ہے؟۔

یہ چند سطور میں نے اس لیے لکھیں کہ آئے دن ہم اس طرح کے واقعات سنتے رہتے ہیں، بعض حضرات تو ایک لیگل نوٹس کے ذریعے غیر مشروط معافی مانگنے یا ہرجانے کا مطالبہ کر کے خاموش ہوجاتے ہیں اور اپنی اشک شوئی کے لیے اسی کو کافی سمجھتے ہیں، لیکن جو حقیقتاً

آئے دن میڈیا پر کسی نہ کسی کی پگڑی اچھالی جاتی ہے، اس کے باوجود ہماری پارلیمنٹ عام شہریوں کی عزتِ نفس کے تحفظ کے لیے کوئی واضح قانون بنانے کے لیے تیار نہیں ہے، تو لوگوں کی عزتوں کا تحفظ کیسے ہوسکتا ہے۔ اسی لیے الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا میں جس کے بارے میں جو کسی کے جی میں آئے لکھ دیتا ہے اور دوسرے کی عزت سے کھیلتا ہے، مگر اس کے ازالے کی کوئی عملی اور قانونی صورت ہمارے نظام میں موجود نہیں ہے۔ اسلام کی رو سے کسی کی عزت سے کھیلنا، کسی کا تمسخر اڑانا، کسی کی عیب جوئی کرنا، کسی کی غیبت کرنا، کسی پر طعن و تشنیع کرنا، کسی پر ناحق جھوٹ بولنا شرعی اور اخلاقی اعتبار سے انتہائی معیوب اور گھناؤنے جرائم میں سے ہے۔ لیکن شریعت نے حدِ قذف کے سوا ان کے لیے کوئی معین سزا مقرر نہیں فرمائی، البتہ عذابِ آخرت اور اُخروی محاسبے کی وعیدیں بے شمار ہیں، لیکن وہ ان پر اثر انداز ہوسکتی ہیں جن کا آخرت اور اللہ تعالیٰ کی عدالت پر یقینِ کامل ہو، ورنہ:

''مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! ہمارے نزدیک مفلس وہ ہے کہ جس کے پاس درہم و دینار اور دنیوی ساز و سامان نہ ہو (یعنی وہ قلاش ہو)، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں (بڑا) مفلس وہ ہوگا جو قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے پاس نماز، روزہ اور زکوٰۃ (یعنی اعمالِ صالحہ) کا ذخیرہ ہوگا۔ لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر زنا کی جھوٹی تہمت لگائی ہوگی، کسی کا (ناحق) مال کھایا ہوگا، کسی کا (ناحق) خون بہایا ہوگا، کسی کو (ظلماً) مارا پیٹا ہوگا۔ چنانچہ حکم باری تعالیٰ سے اس کے اِن جرائم کے عوض اُس کی نیکیاں یکے بعد دیگرے ان سب مظلومین کو منتقل کی جائیں گی (جن کی اس نے حق تلفی کی ہوگی)۔ پس جب (دوسروں کے حقوق اس کے ذمے ابھی باقی ہوں گے اور) اس کی نیکیوں کا ذخیرہ ختم ہوچکا ہوگا تو ان حقوق کے عوض اُن مظلومین کے گناہ اس کے

میں پھینک دیا جائے گا''۔(سنن ترمذی:۲۴۱۸)

اس حدیث کا واضح پیغام یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کی حق تلفی کر کے یا کسی پر ظلم کر کے یا کسی کو جسمانی اور روحانی اذیت پہنچا کر مکروفریب کے ذریعے یا طاقت اور اثر ورسوخ کے ذریعے یا داداگیری اور جبر وجور کر کے مواخذے سے بچ جائے گا، تو یہ اس کی نادانی اور بھول تو ہو سکتی ہے، اسے اپنی کامیابی ہرگز تصور نہ کرے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی ایک حتمی اور قطعی عدالت ضرور لگے گی، جہاں کوئی حیلہ اور مکر وتدبیر کام نہیں آئے گی، نہ ہی کوئی جبر وجور یا اثر ورسوخ کے ذریعے اپنے اعمال کے انجامِ بد سے بچ سکے گا۔ یہ انصاف کا دن آنا ہے اور ضرور آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور اے ایمان والو! ہمارے دیے ہوئے مال میں سے کچھ ہماری راہ میں (اپنی خوشی سے) خرچ کرو، قبل اس کے کہ (حتمی اور قطعی فیصلے کا) وہ دن آجائے کہ جہاں نہ لین دین کام آئے گا، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش کا چلن ہوگا''۔(البقرہ:۲۵۴)

یکم اگست 2015ء

ایک اچھی علامت

قارئین کرام سے معذرت! بات سطحی سی ہے اور غیر علمی ہے، مگر اس میں اہل پاکستان کے لیے کسی حد تک طمانیت کا پہلو موجود ہے۔ ہم الیکٹرونک میڈیا پر اکثر پاکستان پر لعن طعن سنتے رہتے ہیں۔ آہنی نوک دار زبانیں پاکستان کے چہرے کو ایسے نوچتی اور حظ اٹھاتی ہیں، جیسے کسی کے آہنی نوک دار ناخن ہوں اور وہ دوسرے کے چہرے کو نوچ کر لہولہان کردیں۔ اسے حدیث مبارک میں "خمش اور خموش" سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ عربی لغت میں لکھا ہے: "خمش چہرے پر ایسی خراشیں لگانے کو کہتے ہیں، جن پر کوئی قصاص نہ ہو"۔

پاکستان کی اِس بڑے پیانے پر بے توقیری پر بھی کوئی تعزیر یا تادیب نہیں ہے، کیونکہ ہمارے حکمرانوں اور قانون سازوں کو (Parliamenterians) کو اپنی ناموس بچانے سے ہی فرصت نہیں ملتی، ان کے پاس پاکستان کی ناموس کا تحفظ کرنے کی فرصت کہاں؟۔ ملا عمر اور ملک اسحاق کا بھلا ہو کہ انہوں نے ہمارے الیکٹرونک میڈیا کا بحرِ عمیق جیسا پیٹ بھرنے کے لیے دو دن کی غذا فراہم کردی، اس عرصے میں بُہتوں نے سکون کا سانس لیا ہوگا۔

میں جس اچھی علامت کی طرف اپنے معزز قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ عید الفطر کے فوراً بعد مجھے اپنے خاندان کے ساتھ اپنے فرزند ضیاء الرحمٰن مرحوم کے ایصالِ ثواب کی تقریب میں شرکت کے لیے ۲۰ جولائی کو مانسہرہ وایبٹ آباد جانے کا اتفاق

ایک سعادت مند بھتیجے ڈاکٹر نعیم الرحمن ہمیں اسلام آباد ائیر پورٹ پر لینے آئے۔ پروگرام یہ تھا کہ بچوں کو مری اور نتھیا گلی کی سیر کراتے ہوئے ایبٹ آباد جائیں گے۔ لیکن ۱۹ جولائی کی شام کو ہی ٹیلی ویژن اسکرین پر یہ ٹکر چل رہے تھے کہ ایک لاکھ گاڑیاں مری کے راستے پر رواں دواں ہیں اور اپیل کی جارہی تھی کہ باقی لوگ مری کے لیے عازمِ سفر نہ ہوں اور یہ کہ اپنی گاڑیوں میں وافر پٹرول بھر کر لائیں، کیونکہ مری میں پٹرول حسبِ ضرورت دستیاب نہیں ہے۔ چنانچہ ہم نے براہِ راست ایبٹ آباد جانے کا فیصلہ کیا۔

مگر ہری پور اور اس سے آگے ٹریفک کی لمبی لائنیں تھیں، ٹریفک سُست رفتاری سے چل رہی تھی، ایبٹ آباد سے کچھ پہلے ٹریفک پولیس نے مہارت دکھائی اور جانے والی دو ڈھائی لائنوں کو روکا اور ایک لائن بنا کر آگے روانہ کیا۔ اس سے ٹریفک کی روانی قدرے بہتر ہوگئی۔ پھر ایبٹ آباد شہر میں اور مانسہرہ اور اس سے آگے تک ٹریفک کی لمبی لائنیں چل رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ بالاکوٹ، شوگراں، ناران اور جھیل سیف الملوک تک اسی طرح سیاحوں کا بے پناہ رش تھا۔ ظاہر ہے ہزاروں کاریں، سوزکیاں، ہائی روف اور کوچز الغرض ہر طرح کی گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ لوگوں نے بتایا کہ تمام ہوٹل بھرے ہوئے ہیں اور لوگ کھلی فضا میں بھی راتیں گزار رہے ہیں۔ مجھے یہ اچھی علامت محسوس ہوئی کہ آپریشن ''ضربِ عَضب'' کے بعد امن وامان بحال ہوا ہے، لوگوں کے اندر اعتماد اور سلامتی کا احساس پیدا ہوا ہے، خوف اور دہشت کی کیفیت سے نجات ملی ہے اور یہی سبب ہے کہ لوگ خاندان کے افراد سمیت، جن میں خواتین اور بچے بھی شامل ہیں، سیاحت کے لیے نکلے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارا میڈیا فقر وافلاس کی جو تصویر بکثرت دکھاتا ہے، ہوسکتا ہے یہ تصویر جزوی طور پر درست ہو، مگر یہ ہمارے معاشرے کی مکمل تصویر نہیں ہے۔ الحمدللہ علیٰ احسانہٖ لاکھوں لوگوں کا سیاحت کے لیے نکلنا خوش حالی کی ایک خوش گوار علامت ہے اور ہمیں پاکستانی معاشرے کا یہ رُخ بھی دنیا کو دکھانا چاہیے۔

جنرل راحیل شریف کا فیصلہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری سیاسی قیادت نے قوم کو اعتماد میں لے کر اس کا اعلان کرنے میں پہل کا شرف حاصل نہیں کیا، جیسا کہ جمہوری ممالک میں ہوتا ہے۔ جب کہ پاکستان میں اس اقدام کا اعلان سب سے پہلے آئی ایس پی آر نے کیا، یعنی اِقدام اور اوّلیت (Initiation) کا اِعزاز مسلح افواج نے حاصل کیا اور بعد میں خواستہ و ناخواستہ بشمول جناب عمران خان ہماری سیاسی قیادت نے بھی بادلِ ناخواستہ اسے قبول (Own) کیا اور پھر اس کے بطن سے ''نیشنل ایکشن پلان'' اور اکیسویں آئینی ترمیم ظہور پذیر ہوئی۔ تاحال جنابِ جنرل راحیل شریف ڈرائیونگ سیٹ پر یعنی اس حوالے سے کمانڈنگ پوزیشن میں نظر آرہے ہیں اور وہ عالمی سطح پر سیاسی اور فوجی قیادتوں کو اس کے محرکات، ثمرات اور نتائج سے آگاہ کررہے ہیں؛ گویا وہ بیک وقت سیاسی و عسکری کردار ادا کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ ہماری عسکری قیادت کا اس طرح پرعزم ہونا ایک اچھی علامت ہے، ورنہ نیم دلانہ اقدامات نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان کی حکومت اور ریاست معاشی اعتبار سے ہمارے مقابلے میں بہت مضبوط اور مستحکم ہے، لیکن آج بھی وہاں ممبئی اور دیگر بڑے شہروں میں لوگ فٹ پاتھ پر سوتے ہیں، قضائے حاجت کے لیے باپردہ مقامات دستیاب نہیں ہیں۔ اب سنا ہے کہ نریندر سنگھ مودی کی حکومت نے بتدریج دیہاتوں میں سرکاری طور پر ایک ایک بیت الخلا بنا کر دینے کا منصوبہ بنایا ہے، یہ منصوبہ کب پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے، اس کا ہمیں علم نہیں ہے۔ اس کے برعکس پاکستان میں حکومت اور ریاست کی مالی حیثیت اگرچہ مستحکم نہیں ہے، لیکن عوام میں بڑے پیمانے پر تموُّل اور معاشی خوش حالی کی علامات موجود ہیں اور جابجا اس کے مظاہر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اس پر ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکرگزار ہونا چاہیے اور دنیا کو پاکستان کا کوئی اچھا رُخ بھی دکھانا چاہیے۔ آج پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں کوئی فٹ پاتھ پر سو کر رات نہیں گزارتا، یہ سب اچھی علامات ہیں۔

پہلے ہم بڑے پیمانے پر عدمِ تحفظ کے احساس اور خوف ودہشت کی کیفیت سے دوچار تھے۔لیکن الحمدللہ آج صورتِ حال اگر مکمل طور پر نہیں، تو کافی حد تک بہتر ہے۔گزشتہ رمضان المبارک پورے ملک میں بالعموم اور کراچی میں بالخصوص ماضی کے کئی سالوں کے مقابلے میں کافی حد تک خیریت سے گزرا۔گزشتہ سالوں کے مقابلے میں کاروبار کا حُجم (Volume) بھی زیادہ رہا ہے۔اِغوا برائے تاوان اور بھتا خوری کے بڑے واقعات نہیں ہوئے، دو کروڑ کی آبادی والے شہر میں اِکا دُکا بد نظمی کے واقعات کا ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔اور معمولی شرح سے اس طرح کے واقعات دنیا کے ہر سماج، منظّم اور پابندِ آئین وقانون معاشرے میں بھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک بے قصور انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ایک بے قصور مسلمان کے ناحق قتل کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک پورے نظامِ کائنات کا خاتمہ کردینا زیادہ آسان بات ہے"۔

لیکن انسانی معاشرہ جرائم سے مکمل طور پر کبھی بھی پاک نہیں رہا۔عہدِ رسالت مآب ﷺ کا نورانی دور ایک استثنا ہے۔

اس سے قبل بھی میں لکھ چکا ہوں کہ سورۃ القریش میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ قریش کو اپنا یہ احسان یاد دلایا کہ جس کعبۃ اللہ کا مُتوَلّی ہونے اور اس سے نسبت کے سبب تمہارا عالَمِ عرب میں احترام ہے اور لوٹ مار وڈاکا زنی کے کلچر کے باوجود تمہارے تجارتی قافلے بے خوف وخطر گرم وسرد موسم میں تجارتی سفر کرتے ہیں، تو کم ازکم اس احسان کے سبب اسی کعبہ کے رب کی عبادت کرو۔اور سورۃ النحل آیت نمبر ۱۱۲ میں اللہ تعالیٰ نے خوف اور بھوک کے تسلُّط کو عذاب سے تعبیر فرمایا اور اس کا سبب انعاماتِ الٰہیہ کی ناشکری کو قرار دیا ہے۔

پس میری ساری گزارشات کا عاجزانہ مقصد یہ ہے کہ ایک آزاد وطن اسلامی جمہوریہ پاکستان کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے جو بہت بڑی نعمت ہمیں عطا فرمائی ہے، اس پر ہم سب

ہر رُواں اور ہمارے وجود کا انگ انگ مجسّم تشکر بن جانا چاہیے۔ہم نے اس وطن کے ساتھ تسلسل کے ساتھ جو جفا اور نا قدری کی ہے، اس کا سلسلہ رُک جانا چاہیے اور اس کی عزت و وقار اور ناموس کو سربلند رکھنے کے لیے متحد اور منظم ہو کر جِدّ وجُہد اور سَعی کرنی چاہیے۔ہم اکثر شِکوہ کُناں رہتے ہیں، شکایات کا انبار ہر وقت ہمارے ذہن میں تازہ رہتا ہے اور یہ کسی حد تک درست بھی ہے، لیکن اس رَوِش کو اس حد تک اپنے آپ پر مُسلّط نہیں کرنا چاہیے کہ ہم بحیثیتِ قوم یاس اور قنوطیت کا شکار ہو جائیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہمیں حکومت اور ریاست کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے، ہم اصولوں کی بنا پر حکومت سے اختلاف کر سکتے ہیں، ان کے احکام کو قرآن وسنت کی روشنی میں چیلنج کر سکتے ہیں اور آئین وقانون میں دیے ہوئے طریقۂ کار کے مطابق پر امن ذرائع سے حکومت کو تبدیل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں، اِسے ہمارے دستوری نظام نے جائز قرار دیا ہے لیکن ریاست اور مملکت سے جفا اور بغاوت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ریاست سے وفاداری کا رشتہ مستحکم، غیر متزلزل اور غیر مشروط ہونا چاہیے۔

3 اگست 2015ء

مُلّا محمد عمر مجاہد

ملا محمد عمر مجاہد ایک افسانوی کردار بھی ہیں اور ایک ایسی حقیقت بھی جس نے اپنے عہد پر گہرے نُقوش ثبت کیے ہیں۔ وہ امریکا کو مطلوب افراد میں سرِ فہرست تھے اور ان کی نشاندہی کرنے والے کے لیے بھاری انعام مقرر تھا۔ ان کی زندگی بلاشبہ عزیمت واستقامت سے عبارت تھی۔ مبینہ طور پر ۲۰۱۳ء کے وسط میں اُن کا انتقال ہوا، اُن کی وفات سے تحریکِ طالبان اور تنظیم کو پہنچنے والے ممکنہ نقصان سے بچنے کے لیے اس خبر کو پوشیدہ رکھا گیا، لیکن ایسا کرنا زیادہ دیر تک ممکن نہ تھا اور آخرِ کار یہ خبر اِفشا ہوگئی، اس خبر کا اِفشاء ہونا تنظیم کے داخلی اختلافات کا مظہر ہے۔

مُلا محمد عمر مجاہد نے سویت یونین کے خلاف جہاد میں حصہ لیا، زخمی بھی ہوئے اور ایک آنکھ کی بصارت سے محروم ہو گئے۔ افغانستان سے سویت یونین کی ہزیمت اور اِنخلا کے بعد خلا پیدا ہوا اور خانہ جنگی برپا ہوئی، جہادی قائدین کے درمیان اقتدار کی اس جنگ نے مایوسی کو جنم دیا۔ افغانستان کے مختلف علاقے اور اضلاع مختلف وارلارڈز کے کنٹرول میں آگئے۔ ملک انارکی اور بے امنی کا شکار ہوا، جابجا بھتا خوری کے لیے چوکیاں بن گئیں اور مبینہ طور پر غیرِ شرعی وغیر اخلاقی خرابیاں بھی معاشرے میں در آئیں۔ جو مجاہدین محض اللہ کی رضا اور وطن کی آزادی کی خاطر باطل اور غاصب قوتوں کے خلاف جہاد کر چکے تھے، ان کو اس صورتِ حال نے مایوس کر دیا، ملا محمد عمر مجاہد ان میں سے ایک تھے۔ انہوں نے چند

پہلی چوکی اِسپین بولدک سے جہاد شروع کیا، اسے ہم آپریشن کلین اپ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ عوام اور مجاہدین کی حمایت انہیں بتدریج حاصل ہوتی چلی گئی۔ انہوں نے بہت جلد قندھار پر قبضہ کر کے اپنی اِمارت قائم کر دی اور فوری طور پر شرعی عدالتوں کا قیام عمل میں آیا اور عوام میں اسے بے حد پذیرائی ملی۔

اس تحریک کا نام ''تحریکِ طالبانِ'' قرار پایا، مگر بہت جلد یہ افغانستان کی ایک ''نیشنل اسلامک موومنٹ'' میں تبدیل ہوگئی اور بڑے پیمانے پر قبائل اور معاشرے کے دیگر طبقات بھی اس کا حصہ بنتے چلے گئے۔ چونکہ شرعی عدالتیں، اسلامی وضع قطع اور شعار ان کے مزاج سے مناسبت رکھتا تھا، اس لیے انہیں اس کے قبول کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ جرائم ولوٹ مار اور بھتا خوری کا خاتمہ ہوا اور لوگوں نے سکون کا سانس لیا۔ چنانچہ بہت جلد طالبان نے کابل پر قبضہ کر لیا اور ''اِمارتِ اسلامی افغانستان'' کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۹٦ء میں اِمارتِ اسلامی کے قیام کے ابتدائی دور میں ہمیں بعض دوستوں کی وساطت سے قندہار جانے کا موقع ملا۔ اس قافلے میں علامہ غلام دستگیر افغانی، علامہ غلام محمد سیالوی اور مفتی محمد رفیق حسنی ہمراہ تھے، یہ ہمارے لیے ایک مطالعاتی اور معلوماتی دورہ تھا۔ کراچی سے ہم ہوائی جہاز کے ذریعے کوئٹہ پہنچے اور وہاں سے ویگن کے ذریعے افغانستان کی جانب روانہ ہوئے۔ چمن سے آگے قندہار تک سڑک نہایت شکستہ تھی۔ اسپین بولدک سے قندہار تک سڑک کے دائیں بائیں جو قبرستان آتے تھے، جہادِ آزادی کے شہداء کی قبور پر ہر جگہ چھوٹے چھوٹے رنگین جھنڈے نظر آتے تھے۔ راستے میں جا بجا ہم نے یہ بھی دیکھا کہ طالبان کے زخمیوں کو عِلاج کے لیے کوئٹہ لے جایا جا رہا تھا۔

ہم رات کو قندہار پہنچے اور ہمارا قیام سرکاری مہمان خانے میں ہوا۔ ہنگامی حالات تھے، بجلی دستیاب نہیں تھی، ہمیں ایک فرشی دسترخوان پر سب کے ہمراہ کھانا کھلایا گیا۔ گورنر قندہار بنفسِ نفیس تواضع کر رہے تھے اور یہ ہمارے لیے ایک غیر معمولی منظر تھا، اُس وقت

اگلی صبح دن چڑھے ہماری ملاقات مُلاّ محمد عمر سے کرائی گئی، اِس ملاقات کا ذریعہ مُلاّ احمد متوکل تھے، یہ جواں عمر تھے۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ یہ شخص مجھے نہایت ذہین معلوم ہو رہا ہے، آگے چل کر وہ اِمارتِ اسلامی افغانستان کے وزیرِ خارجہ مقرر ہوئے۔ لیکن اس وقت بھی ان کے رُسوخ کا عالم یہ تھا کہ بلا تاخیر ملا محمد عمر سے ہماری ملاقات کا اہتمام کرا دیا۔ ملا محمد عمر کا دفتر یا دارالامارت قندہار میں ''جامع مسجد خرقہ مبارک'' کے بالمقابل ایک عام سی عمارت میں تھا۔ ان کا دفتر ایک کمرے پر مشتمل تھا اور وہ فرشی قالین پر کسی امتیازی شان کے بغیر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم بھی ان کے مقابل فرش پر بیٹھ گئے، ہمیں ایسی کئی علامات ملیں جن سے عیاں تھا کہ افغانستان پاکستان کے مسلکی خلافیات سے متاثر نہیں ہے، مثلاً مُلاّ عمر کے دفتر کے باہر ایک بورڈ پر، دفتر میں ایک طغرے پر اور مسجد خرقہ مبارک کے محراب پر یا اللہ، یا محمد لکھا ہوا تھا، جبکہ ہمارے ہاں اس سے اختلاف کرنے والے موجود ہیں۔ اس بات کی نشاندہی میں اس لیے کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ مسلکی خِلافیات کے حوالے سے ان کے بارے میں منفی رائے رکھتے ہیں، کیونکہ علمائے دیوبند کے ساتھ افغانستان کے جہادی قائدین کے روابط زیادہ رہے ہیں اور یہ ان کی ضرورت تھی کہ کوئی ان کی مدد کے لیے آگے بڑھے اور مسلکِ دیوبند کے علماء و مدارس نے یقیناً آگے بڑھ کر ان کی مدد کی اور وہ بجا طور پر اس کا کریڈٹ بھی لیتے ہیں۔ اس کے برعکس علمائے اہلسنّت بالعموم جہادِ افغانستان سے لاتعلق رہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ افغان جہاد کے صفِ اوّل کے رہنماؤں پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی، مولوی محمد نبی محمدی اور سید سعید احمد گیلانی کے علمائے اہلسنّت کے ساتھ قریبی روابط اور نظریاتی قربت رہی ہے۔ عبدالرسول سیاف کے نام سے ہی مسلکی تشخص ظاہر ہو رہا ہے، لیکن بعد میں سلفی اثرات کے تحت انہوں نے اپنے نام کو بدل کر عبدالرب رسول سیاف کر دیا۔

ملا محمد عمر مجاہد سے میں نے اپنے وفد کی طرف سے جو مکالمہ کیا، وہ یہ تھا: ''ان کو ہم نے

امیر المومنین اتفاق رائے سے مقرر کر دیا گیا ہے، لیکن حکومت کی ایک انتظامی ہیئت تشکیل دیں اور مختلف آئینی عہدوں پر اپنے معتمد افراد کا تقرر کریں تا کہ یہ اہل مناصب باقاعدہ سرکاری حیثیت میں اقوام متحدہ اور دنیا بھر کے ممالک سے مکالمہ، اپنی حکومت کی ترجمانی اور اپنی پالیسیوں اور حکمتِ عملی کی وضاحت کر سکیں، واضح رہے کہ امریکا کے زیرِ اثر اقوام متحدہ اُس وقت بھی پروفیسر برہان الدین ربانی کو افغانستان کی حکومت کا آئینی سربراہ تسلیم کر رہی تھی۔ میں نے ان کے سامنے انقلابِ ایران کا حوالہ پیش کیا کہ انہوں نے بہت جلد اپنا دستوری ڈھانچہ مرتب کر دیا اور مختلف سطح کے آئینی ادارے تشکیل دے دیے۔ بعد میں ملا عمر نے مختلف مناصب پر علماء کو فائز کر دیا۔ اسی طرح میں نے ان سے کہا کہ: ''چین اور افغانستان سے وسطی ایشیا اور ترکی تک تمام خطہ فقہ حنفی پر کاربند ہے اور مسلکی خلافیات سے بچا ہوا ہے۔ لہٰذا اگر آپ افغانستان کو پاک و ہند کی مسلکی خلافیات اور آویزش سے حسبِ سابق بچا کر رکھیں تو یہ افغانستان کی مذہبی وحدت و سالمیت کے لیے انتہائی مفید ہو گا۔ وہ انتہائی کم گو تھے، انہوں نے ہماری گزارشات کو سنا، یہی ان کا شِعار تھا۔ بعد میں نائن الیون کے بعد بعض علماء کے ہمراہ ہمارے حساس اداروں کے ذمے داران کی ملا محمد عمر سے ملاقات کا احوال معلوم ہوا، تو پتا چلا کہ انہوں نے سب کی سنی، لیکن نفی یا اثبات میں کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ وہ سرکردہ علماء کی مشاورت سے معاملات طے کرتے تھے۔

طالبان سے قربت رکھنے والے ایک عالم نے بتایا کہ نائن الیون کے اقدامات پر عملدرآمد سے پہلے یہ منصوبہ ملا محمد عمر کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے علماء سے مشاورت کی، افغانستان کے سرکردہ علماء نے اس کی مخالفت کی لیکن بعض عرب علماء نے اس کی تائید کی۔ ملا محمد عمر نے اس کی اجازت نہیں دی۔ لیکن بعد میں یہ حادثہ رونما ہو گیا اور اُمت عراق ایران جنگ، کویت پر عراق کے قبضے اور نائن الیون کے مابعد اثرات کو آج تک بھگت رہی

نائن الیون کے سانحے کے بعد ملا محمد عمر کے سامنے امریکا کا یہ مطالبہ آیا کہ شیخ اسامہ بن لادن اور القاعدہ کے اہم رہنماؤں کو امریکا کے حوالے کر دیا جائے۔ پاکستان کے حساس ادارے کے ذمے داران تحریکِ طالبان سے قربت رکھنے والے بعض علما کے ہمراہ ملا محمد عمر سے جا کر ملے اور اُن کے سامنے یہ مطالبہ رکھا، مگر انہوں نے اسے پذیرائی نہیں بخشی۔ اس کے نتیجے میں امریکا نے اپنے اتحادیوں سمیت افغانستان پر یلغار کر دی۔

یہ سوال اب بھی جواب طلب ہے کہ آیا اسامہ بن لادن اور ان کی تنظیم کے لوگ ملا محمد عمر پر حاوی ہو چکے تھے یا یہ اتنا ان کے زیر بار احسان تھے کہ انہوں نے بھاری قیمت ادا کرنے کے باوجود اُن سے جفا نہ کی، اور یہ کہ آیا ملا عمر اسامہ بن لادن اور ان کے ساتھیوں کو امریکا کے حوالے کر کے اپنی حکومت کو بچا سکتے تھے۔ اگر ایسا آپشن اُن کے پاس موجود تھا تو انہوں نے اسے اختیار کیوں نہ کیا؟۔ یہ سوال تاریخ پر قرض ہے اور شاید مناسب وقت پر اس کا جواب مل جائے۔ میں نے تحریک طالبان کے بعض انتہائی اہم ہمدردوں سے ملاقات میں یہ سوال اٹھایا تو انہوں نے جواب دیا: امریکا کا اصل ہدف ''امارات اسلامی افغانستان'' کو گرانا تھا، لہٰذا یہ سوال محض نظری ہے، نتائج کے اعتبار سے اس کی اہمیت نہیں ہے؟۔

چند مواقع پر افغانستان کے طالبان رہنماؤں سے ملاقات ہوئی تو میں نے اُن کے سامنے ''طالبان پاکستان'' کے بارے میں سوال اٹھایا کہ یہ فساد فی الارض کا ارتکاب کر کے اس کا کریڈٹ لیتے ہیں اور پاکستان کے خلاف مسلح خروج کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ تمام حرکات ناپسندیدہ ہیں، ہمارا یہ شعار نہیں ہے، لیکن ہم اپنی توجہ ایک محاذ پر مرکوز کیے ہوئے ہیں۔

8 اگست 2015ء

پیمرا جاگ اٹھا

یادش بخیر! اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک ریاستی ادارہ بنام "پاکستان الیکٹرونک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (PEMRA)" قائم ہے۔ جس کی آج تک اس ادارے کی کارکردگی یا کسی نتیجہ خیز مساعی کا پتا نہیں چل سکا، چند افراد کی پرکشش ملازمتوں کے سوا یہ ادارہ بے فیض ہے۔ یہ الیکٹرونک میڈیا کی کن اُمور کو پابند ضوابط بناتا (Regulate) کرتا ہے، اس کا کنٹرول کس حد تک ہے، اس کے پاس اپنے احکام کی تنفیذ کے اختیارات کیا ہیں اور جو ادارہ یا ٹیلی ویژن چینل قانون شکنی کرے، یہ اس کے خلاف کیا کیا انضباطی یا تعزیری اقدامات کرسکتا ہے، یہ اُمور واضح نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اہل اقتدار کافی حد تک ذہنی بلوغت (Maturity) کی منزل میں داخل ہو چکے ہیں۔ لہٰذا وہ الیکٹرونک میڈیا کی اُگاڑی اور پچھاڑی دونوں سے بچ کر چلتے ہیں، کیونکہ اس کے سینگ اور دولتیاں دونوں انتہائی حد تک خطرناک ہیں۔ ان کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں ہے اور نہ ہی ان کے زہر کا کوئی تریاق ہے۔ البتہ سیاستدان ایک دوسرے کو زخمی حالت میں تڑپتا ہوا دیکھ کر لطف ضرور اٹھاتے ہیں، لیکن غالب کی اس نصیحت کو انہوں نے پلّے باندھ رکھا ہے اور پل بھر کے لیے بھی نہیں بھولتے:

خواہ وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟

جس کا متن درجِ ذیل ہے:

پیمرا نے "سینٹ قائمہ کمیٹی برائے اطلاعات ونشریات اور قومی ورثہ" کی رہنمائی کے مطابق ۳ جولائی ۲۰۱۵ء کو تمام ٹی وی چینلز کے لیے ایک ہدایت نامہ جاری کیا ہے جس میں غیر اخلاقی پروگراموں، گانوں اور مقررہ حد سے زائد اشتہارات اور غیر ملکی مواد کو روکنے کے لیے احکامات صادر کیے گئے ہیں۔ پیمرا نے متعدد عوامی شکایات کے پیش نظر تمام ٹی وی چینلز کی طرف سے رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں نیلام گھر طرز کے پروگرام نشر کرنے اور مقدس مہینے کے تقدس کو پامال کرنے کا بھی سختی سے نوٹس لیتے ہوئے ایسے تمام پروگراموں کو مستقبل میں نشر نہ کرنے کی بھی ہدایت کی ہے۔

اتھارٹی کا جاری کردہ ہدایت نامہ درجِ ذیل ہے:

(۱) دس فی صد سے زائد غیر ملکی پروگراموں کا نشر کرنا

(۲) ۱۲ منٹ فی گھنٹے سے زائد اشتہارات

(۳) ماہِ رمضان میں نیلام گھر طرز کے پروگرام

(۴) نیوز بلیٹن میں تفریح کی آڑ میں غیر اخلاقی غیر ملکی گانوں کے کلپس

(۵) پروگراموں یا اشتہارات میں غیر اخلاقی مواد

(۶) جرائم کے پروگراموں کی منظر کشی جو کہ جرم کی تشہیر کا باعث ہوں، وغیرہ۔

علاوہ ازیں اتھارٹی نے تمام ٹی وی چینلز کو ہدایت کی ہے کہ وہ روزانہ اپنی نشریات کا آغاز قومی ترانہ سے کریں جیسا کہ ہمارے پڑوسی ممالک میں بھی روایت ہے تاکہ عوام میں قومی جذبے کو اجاگر کیا جا سکے۔ بالخصوص بچوں سے متعلق صحت مندانہ پروگرام اور کارٹون وغیرہ نشر کرنے کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ پیمرا کے مطابق پاکستان ٹی وی چینلز میں بچوں کے پروگراموں کی طرف انتہائی کم توجہ ہے اور پاکستانی بچے صرف دو غیر ملکی چینلز پر انحصار کیے ہوئے ہیں، جس میں مزید بہتری کی ضرورت ہے"۔

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید پیمرا خواب خرگوش سے جاگ اٹھا ہے اور اب اس کی آنکھیں دیدہ و بینا اور کان سماعت سے آشنا ہو گئے ہیں اور دل و دماغ کے بند دریچے کھل گئے ہیں، اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ اس کے متابعت (Follow up) میں جناب میر ابراہیم کی قیادت میں پاکستان براڈ کاسٹنگ ایسوسی ایشن کی قیادت میں ۵ اگست کو پیمرا کے ارباب اختیار کی ایک میٹنگ بھی منعقد ہو چکی ہے اور انہوں نے کچھ عہد و پیماں بھی کیا ہے۔

ٹیلی ویژن چینلز نے گزشتہ ماہِ رمضان المبارک میں مختلف سابقوں اور لاحقوں کے ساتھ رمضان کا ٹائٹل لگا کر اس ماہِ مقدس کی جو بے حرمتی کی ہے۔ اس پر ''سینٹ کی قائمہ کمیٹی برائے اطلاعات ونشریات'' کے معزز ارکان کا مرکزی ایجنڈا یہی تھا، لیکن پیمرا کے ذمے داران پاکستان براڈ کاسٹنگ ایسوسی ایشن کے ساتھ اپنے اجلاس میں اس کو زیر بحث ہی نہیں لائے اور کمالِ مہارت سے اصل موضوع کو نہ صرف پسِ پشت ڈالا بلکہ ایک طرح سے ٹیلی ویژن چینلز کا اس حوالے سے بپتسما کر کے انہیں پاک وصاف کر دیا۔ حالانکہ سینٹ کی قائمہ کمیٹی کا اصل مقصد اس حوالے سے ٹیلی ویژن چینلز کا مؤاخذہ اور احتساب تھا، جب کہ پیمرا نے ہدایت نامہ جاری کرنے پر اکتفا کی۔ کسی زمانے میں جناب ماہر القادری نے ''قرآن کی فریاد'' کے عنوان سے مندرجہ ذیل نظم لکھی تھی:

قرآن فریاد

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں، آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں
تعویذ بنایا جاتا ہوں، دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں
جزدان حریر و ریشم کے، اور پھول ستارے چاندی کے
پھر عطر کی بارش ہوتی ہے، خوشبو میں بسایا جاتا ہوں
جب قول و قسم لینے کے لیے، تکرار کی نوبت آتی ہے

کس بزم میں مجھ کو بار نہیں، کس عرس میں میری دھوم نہیں
پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں، مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں
مجھ سے محبت کے دعوے، قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں، یوں بھی میں ستایا جاتا ہوں

سو آج نزولِ قرآن کا مہینا اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ فریادی ہے کہ اس کے ساتھ وفا کی آڑ میں جو جفا کی جارہی ہے، کوئی صاحبِ اختیار واقتدار آئے اوران جفا کاریوں سے نجات دے۔ تاویلات کا انبار، طرح طرح کے حیلے اور جواز سب تراش لیتے ہیں، لیکن رمضان مبارک کی فریاد کو سننے والا کوئی نہیں ہے۔

"سینٹ کی قائمہ کمیٹی برائے اطلاعات ونشریات" کے تمام معزز ارکان اوراس کے چیرمین سے گزارش ہے کہ ایک نیک کام کا بیڑا اٹھایا ہے تو ازراہ کرم اسے کنارے لگا کر ہی دم لیں، کشتی کو بیچ منجدھار کے چھوڑ دینا قرین انصاف نہیں ہے۔ اس ماہِ رمضان میں بہت سے محترم کالم نگاروں اوراہلِ قلم نے بھی اپنے اپنے انداز میں اخبارات کے صفحات پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے اور رمضان کی فریاد کو اپنی نگارشات قلم کی تائید سے مؤید کیا ہے اور سنا ہے کہ سوشل میڈیا پر بھی بڑی تعداد میں لوگوں نے اپنے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، لیکن خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر ہے اور نہ جانے کب یہ اپنی تعبیر پائے گا۔

ویسے تو ٹیلی ویژن چینلز کے مالکان بھی ماشاء اللہ پاکستانی ہیں اور مسلمان ہیں، ان کے کاروباری مفادات سے ہمیں کچھ کوئی عناد نہیں ہے، اللہ کرے ان کا کاروبار دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ لیکن میں پہلے بھی نہایت ادب کے ساتھ ان کی خدمت میں اپنے معروضات پیش کر چکا ہوں کہ لِلّٰہ! آپ خود ہی اس وطن عزیز میں رہنے والے اہلِ اسلام اور دیگر پاکستانیوں کے لیے کوئی کم ازکم اخلاقی اقدار کا معیار اور دینی شعائر کا ضابطۂ اخلاق وضع فرمادیں اور کسی انتظامی اور قانونی جبر یا دباؤ کے بغیر اس پر عمل کریں۔ یہ پاکستان اور

عہدہ براں ہوسکیں گے۔ آخر پاکستان اور ہندوستان کے الیکٹرونک میڈیا کا کوئی تو فرق دنیا کے سامنے نمایاں طور پر آنا چاہیے۔ باقی حبّ الوطنی، آزادیِ افکار، آزادیِ اظہار اور حقوقِ انسانی کا درس تو آپ دیتے ہی رہتے ہیں اور ہم اس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ ایک کڑوا گھونٹ یہ بھی اپنے حلق سے اُتار دیجیے، آپ کا کرم ہوگا۔

سینٹ کی کمیٹی کے ہدایت نامے میں ''جرائم کے پروگراموں کی منظرکشی جو کہ جرم کی تشہیر کا باعث ہو'' کی دفعہ بھی موجود ہے اور یہ از حد قابلِ توجہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ٹیلی ویژن چینلز کے پالیسی ساز ادارے میں اگر ماہرینِ آئین و قانون، مذہبی شعبے سے وابستگان اور ماہرین نفسیات کو بھی شامل کر دیا جائے اور ان کی سفارشات کو پروگراموں کی تشکیل میں اہمیت دی جائے، تو شاید کافی بہتری آ جائے۔

10 اگست 2015ء

اِشاعتِ فاحشہ

ہمارا گھرانا پانچ افراد پر مشتمل ہے، میرے علاوہ میری بیوی، بیوہ بہو، آٹھ سالہ پوتا اور چار سالہ پوتی شامل ہیں۔ ٹیلی ویژن پر بچے عام طور پر کارٹون دیکھتے ہیں اور بڑے خبریں وغیرہ دیکھ لیتے ہیں۔ کل میں اندرونِ ملک سفر سے رات دیر گئے واپس گھر پہنچا۔ میں نے ٹیلی ویژن کا ریموٹ ہاتھ میں لیا کہ کچھ تازہ خبریں اور ٹکر وغیرہ دیکھ لوں، تو میری بیوی نے کہا کہ کچھ دنوں کے لیے ٹی وی بند کر دیں اور ریموٹ بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔ میں نے پوچھا: کیا بات ہے؟، انہوں نے بتایا: کہ آٹھ سالہ پوتا آج پوچھ رہا تھا کہ بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کیا ہوتی ہے؟''۔ یہ اس لیے ہوا کہ ضلع قصور کے ایک گاؤں میں رونما ہونے والے واقعات کے حوالے سے ہفتہ بھر سے ٹیلی ویژن چینلز میں سنسنی خیزی کا مقابلہ چل رہا ہے اور کسی طور ختم ہونے میں نہیں آرہا۔

یقیناً ہمارے میڈیا کے مالکان اور کارکنان کے علاوہ پاکستان کے کروڑوں گھرانوں میں آٹھ سے بارہ سال تک کے بچے ہوں گے اور رگوں میں خون کو گرمانے والی ان خبروں کو وہ بھی سنتے اور دیکھتے ہوں گے اور ان کے ذہنوں میں بھی طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہوں گے۔ کیونکہ گھروں میں ٹیلی ویژن سیٹ عام طور پر کامن روم یا نشست گاہ میں ہوتا ہے اور سب چھوٹے بڑے بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہیں اور بالخصوص کرنٹ افیئرز یعنی حالاتِ حاضرہ سے متعلق خبریں دیکھتے ہیں۔ بعض مؤقر کالم نگاروں نے لکھا ہے کہ

جاتا رہا ہے اور ان تصاویر کے عالمی فحاشی کی مارکیٹ میں منہ مانگے دام ملتے ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ لوگ اتنے بااثر اور عالمی روابط کے حامل تھے۔

حال ہی میں پیمرا نے ٹیلی ویژن چینلز کے نام ایک ہدایت نامہ جاری کیا ہے، اس کی دفعہ نمبر چھ میں لکھا ہے: ”جرائم کے پروگراموں کی منظر کشی جو کہ جرم کی تشہیر کا باعث ہوں“۔ ظاہر ہے کہ پیمرا ہدایت نامہ تو جاری کرسکتا ہے، لیکن ہدایت نہیں دے سکتا اور نہ ہی اپنے ہدایت نامے پر عمل کراسکتا ہے۔ انسانیت کے مجرموں کو قرار واقعی بلکہ عبرت ناک سزا دینا ضروری ہے اور اس طرح کے تمام مطالباتِ درست ہیں۔ لیکن ”اشاعتِ فاحشہ“ اور سنگین اخلاقی و قانونی جرائم کی تشہیر کے نوخیز اور ناپختہ ذہنوں پر مرتب ہونے والے اثرات کے سدِّباب کی بھی کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ ہمارے الیکٹرونک میڈیا میں اس کا کوئی اہتمام نہیں ہے اور اہلِ اقتدار کی بے حسی اور بے بسی کا تذکرہ گزشتہ کالم میں کیا جاچکا ہے۔ نئی نسل سگریٹ، شیشہ، ہیروئن اور مشروباتِ خبیثہ کی وبا میں اسی طرح تو مبتلا ہوتی ہے کہ ابتداء میں یہ جاننے کے لیے کہ ان چیزوں کے اثرات کیا ہوتے ہیں یا ان میں کشش کیوں ہے؟، پہلا کش یا پہلا گھونٹ اسی کیفیت کو جاننے کے لیے ہوتا ہے، ابتداء میں جرم کے ارتکاب کا یا مجرم بننے کا ارادہ نہیں ہوتا، لیکن بدقسمتی سے یہ وہ بند گلی ہوتی ہے کہ جس میں داخلے کا راستہ تو ہوتا ہے، واپس بچ کر نکلنے کا راستہ نہیں ہوتا۔

اس لیے میری دردمندانہ اپیل ہے کہ الیکٹرونک میڈیا پر جرائم کی تشہیر یا فواحش کی اشاعت کے سدِّباب کا کوئی نہ کوئی اہتمام ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) ”بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی کی بات پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ (چیزوں کے انجام کو) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے“۔ (النور:19)

(3) ''لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: بے شک تم بے حیائی کا کام کرتے ہو، جو تم سے پہلے جہان والوں میں سے کسی نے نہیں کیا، کیا تم مردوں سے شہوت پوری کرتے ہو اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی (بھری) مجلس میں برا کام کرتے ہو''۔ (العنکبوت:29)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی نے لکھا ہے: ''فاحشہ انتہائی قبیح فعل کو کہتے ہیں''۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے لکھا ہے: ''ہر وہ برا کام جس پر شریعت نے کوئی حد مقرر نہ کی ہو، ''سُوء'' ہے''۔ ابن جریر طبری نے لکھا: ''فحشاء ہر وہ برائی ہے جس کا بیان کرنا اور سننا دونوں قبیح ہوں اور بے حیائی کے زمرے میں آتے ہوں''۔ ''قرآن مجید میں زنا اور عمل قوم لوط پر بھی فاحشہ کا اطلاق کیا ہے''۔

آج کل ہم الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے بڑے پیمانے پر ''اشاعتِ فاحشہ'' کے دور سے گزر رہے ہیں اور اس پر ریاست وحکومت کا تحدید وتوازن (Check & Balance) کا کوئی نظام نہیں ہے اور نہ ہی نظارت یعنی نگرانی کا کوئی نظام ہے۔ بس اس حوالے سے ہم ایک اندھی مسابقت کے دور سے گزر رہے ہیں۔ امریکا اور مغرب میں، جہاں ''اشاعتِ فاحشہ'' کسی اخلاقی برائی یا قانونی جرم کے زمرے میں نہیں آتا، کم از کم اتنا اہتمام ضرور ہے کہ بے حیائی پر مبنی فلمیں یا ڈرامے الیکٹرونک میڈیا پر رات گئے اُس وقت چلائے جاتے ہیں جب اسکول جانے والے بچے سو جائیں، لیکن ہمارے ہاں چوبیس گھنٹے اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

اب تو اردو زبان کی نفاست ولطافت، فصاحت وبلاغت اور ادبیت بھی قصۂ پارینہ بنتی جارہی ہے، ٹیلی ویژن چینلز کے اینکر پرسنز نت نئے محاورے اور اصطلاحات وضع کررہے ہیں اور وہی امامُ اللُّغات ہیں۔ چند دن پہلے ایک ادبی کالم نگار کا کالم پڑھنے کو ملا، جس میں وہ اسی طرح کے روزمرّہ اور محاوروں پر تبصرہ فرمارہے تھے، جن سے اردو لغت بورڈ والے محققین بھی آشنا نہیں ہیں۔ انہیں بھی شاید ان اینکر پرسنز کی شاگردی اختیار کرنی پڑے۔

گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ میڈیا مالکان، پالیسی سازوں، پروگرام ڈائریکٹرز اور اینکر پرسنز کے لیے تربیتی نشستوں کا اہتمام ہونا چاہیے، جن میں انہیں وطنِ عزیز کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی اَقدار کا شعور دیا جائے اور ماہرینِ نفسیات کا بھی اس میں کوئی نہ کوئی کردار ضروری ہے کہ کسی سانحے، حادثے، وقوعے، خبر یا جرم کو کس طرح پیش کیا جائے، کہ ہماری نئی نسل اس کے برے اثرات سے ممکن حد تک محفوظ رہے۔

اسلام نے اخلاقی مفاسد اور جرائم کے سدِّ باب کے لیے مقاصدِ شرعیہ میں "سدِّ ذرائع" کی حکمت کو اختیار کیا ہے اور اس کی شریعت میں کئی مثالیں موجود ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بعض اوقات دین کی عظیم تر حکمت کی خاطر مستحب اور اَولیٰ کام کو بھی ترک فرمایا ہے، بعض اوقات کسی رخصتِ شرعی پر عمل کرنے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تحفظ یا انقباض ہوتا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے رخصتِ شرعی کو مشروع کرنے کے لیے خلافِ اَولیٰ کام بھی کیا اور یہ بحیثیتِ شارع آپ ﷺ پر واجب تھا، جیسے سفرِ جہاد میں عصر کے بعد سرِ عام رمضان کے روزے کو توڑنا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"حلال واضح ہے اور حرام (بھی) واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان مُشتبہ امور ہیں، جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے، سو جو مشتبہ امور سے بچا رہا، اس نے اپنے دین اور آبرو کو بچالیا اور جو مشتبہ امور میں پڑ گیا، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ممنوعہ چراگاہ کے اردگرد اپنے مویشی چرائے۔ پس اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ اس کے مویشی چراگاہ میں گھس جائیں گے، سنو! ہر بادشاہ کی کچھ ممنوعہ حدود ہوتی ہیں، سنو! اللہ کی ممنوعہ حدود اس کے مُحرّمات ہیں، سنو! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ لوتھڑا صحیح ہو تو سارا جسم صحیح رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارے جسم کا نظام بگڑ جاتا ہے، سنو! وہ دل ہے"۔

(صحیح مسلم:52)

آج ہمیں جو مسئلہ درپیش ہے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے یہ احتیاطی حکم

"جب تمہاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو انہیں نماز کا حکم دو اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو ان کے بستر الگ کر دو"۔ (سنن ابوداؤد:496)

15اگست2015ء

سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ

پاکستان کی تاریخ دستوری اور قانونی اعتبار سے مختلف احوال سے گزرتی رہی ہے۔ ماضی میں ہماری عدالتِ عظمیٰ نے مختلف مواقع پر مارشل لا کو قانونی جواز فراہم کیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کے مارشل لا کو نہ صرف جواز عطا کیا بلکہ کسی استدعا کے بغیر آمرِ مُطلق اور شخصِ واحد کو دستور میں ترمیم کا اختیار بھی دے دیا۔ اس عدالتِ عظمیٰ کے دیے ہوئے ان اختیارات کی روشنی میں ان حکمرانوں نے دستور میں ترامیم بھی کیں اور پھر Indemnity Bill کے ذریعے مختلف اوقات میں ہماری پارلیمنٹ نے آمرانہ دور کے ماورائے دستور اقدامات کو دستوری تحفظ بھی عطا کیا۔ ان میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کے سول مارشل لا اور اقدامات کو 1973 کے دستور میں، جنرل محمد ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کے ماورائے دستور اقدامات کو بالترتیب آٹھویں اور سترہویں آئینی ترامیم کے ذریعے دستوری تحفظ عطا کیا گیا۔

ہمارے سیاسی اور صحافتی طنّاز (Satirist) اِسے ''نظریۂ ضرورت'' سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی خوش فہمی کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ''نظریۂ ضرورت'' کو دفن کر دیا گیا ہے۔ دراصل یہ اضطراری جبر کا مسئلہ ہے اور اس کا مدار اِس پر ہوتا ہے کہ کسی صاحبِ منصب میں دباؤ برداشت کرنے یا مفادات و مراعات اور منصبی وجاہت سے دستبردار ہونے کا حوصلہ کتنا ہے؟۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے سوا دوسرے سے عزیمت کی آس لگاتا ہے، کسی بھی اصول

عالی مرتبت جج جناب جسٹس جواد ایس خواجہ، جو ماشاء اللہ 17 اگست کو چیف جسٹس آف پاکستان کا حلف اٹھانے والے ہیں، آئے دن حکومت کے ذمے داروں کو ڈانٹتے رہتے ہیں کہ حکومتی مراسلت اور کارروائی اردو میں کیوں نہیں ہوتی؟ لیکن سپریم کورٹ آف پاکستان کے تمام دفتری ریکارڈ، عدالتی کارروائی اور عدالتی فیصلوں میں اردو کو نافذ کرنے میں تا حال کامیاب نہیں ہو سکے۔ چنانچہ سپریم کورٹ آف پاکستان کا نو سو صفحات پر مشتمل حالیہ فیصلہ بھی انگریزی زبان میں آیا ہے۔ تاہم یہ بات درست ہے کہ انہوں نے سپریم کورٹ کے بعض فیصلوں میں اپنے اختلافی یا اضافی نوٹ اردو میں لکھے ہیں اور ان کی اردو بھی ماشاء اللہ اچھی ہے، اس کی ہم صدقِ دل سے تحسین کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ چیف جسٹس آف پاکستان کے باوقار منصب پر فائز ہونے کے بعد اپنے ۲۳ روزہ عہدِ اقتدار میں اس حوالے سے کافی پیش رفت فرمائیں گے، کیونکہ اتنی مختصر مدت میں تمام تر اخلاص اور حسنِ نیت کے باوجود پورے نظام کو بدلنا اتنا آسان نہیں ہے۔ لیکن کسی بھی اعلیٰ مقصد کی طرف پیش رفت کے لیے پہلی اینٹ اور بارش کا پہلا قطرہ بھی غنیمت ہوتا ہے اور آئندہ آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔

زیرِ بحث عدالتی فیصلے پر اہلِ علم وقلم کے کافی وقیع تبصرے آئے ہیں۔ سابق چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ نے ۱۹۹۳ء میں نواز شریف صاحب کی حکومت کی معزولی کے خلاف آئینی پٹیشن کی سماعت کے اوائل ہی میں کہا تھا کہ جناب مولوی تمیز الدین خان سابق اسپیکر قومی اسمبلی کی پٹیشن پر جسٹس منیر کا فیصلہ اسٹیبلشمنٹ کی خواہش کے مطابق تھا، جناب محمد خان جونیجو کی حکومت کی معزولی کے خلاف سپریم کورٹ کا فیصلہ زمینی حقائق کے مطابق تھا کہ قوم نئے انتخاب کے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور اب ہم میرٹ پر فیصلہ کریں گے۔ لیکن بعد میں جنرل پرویز مشرف کی جانب سے نواز شریف کی حکومت کو معزول کرنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے خلاف پٹیشن پر عدالتِ عظمیٰ

کے آگے جھکنے پر آمادہ نہ ہوئے، انہیں منصب سے معزول کر کے گھر بھیج دیا گیا۔ علامہ محمد اقبال نے کہا تھا:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا، تیرے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

میرے نزدیک سپریم کورٹ آف پاکستان کا حالیہ فیصلہ میرٹ اور زمینی حقائق کا امتزاج ہے۔ آئین میں ترمیم کرنے کے حوالے سے پارلیمنٹ کی خودمختاری اور بالادستی کو تسلیم کرلیا گیا ہے اور یہ درست ہے تاکہ آئندہ کے لیے ایک جہت اور دستوری شعار کا تعین ہو جائے۔ ہماری پارلیمنٹ کی اجتماعی دانش صائب رہتی ہے یا نہیں، اس کا جائزہ Case to Case لیا جاتا رہے گا۔ اکیسویں آئینی ترمیم اور فوجی عدالتوں کے حوالے سے سپریم کورٹ آف پاکستان نے میرٹ کی تصوراتی معراج سے نیچے اتر کر زمینی حقائق کا ادراک کیا۔ بے امنی، قتل و غارت، تخریب و فساد اور دہشت گردی سے نجات کے لیے، جس میں پہل کا شرف جنرل راحیل شریف کو حاصل ہے، قومی اتفاقِ رائے کی حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کیا اور اس میں یہ پیغام بھی مضمر ہے کہ ہمارا نظامِ عدل کامل انصاف فراہم کرنے میں ناکام ہے۔ اس کی وجوہ متعدد ہیں: ہمارا ضابطۂ قانون، وکلاء کا مجرموں کے دفاع اور تحفظ کے لیے نت نئے حیلے اور تاخیری حربے استعمال کرنا، ہمارے تحقیقی اور تفتیشی اداروں کی نااہلی اور ناکامی، کرپشن کا ناسور وغیرہ، یہ اسباب تو ہر خاص و عام کی زبان پر ہیں، لیکن دہشت گردی کے حوالے سے ایک بڑا سبب جبر اور خوف اور عدم تحفظ کا احساس بھی ہے اور شاید یہ سب سے بڑا سبب ہے اور اس سے ہمارے قانون نافذ کرنے والے ادارے اور مختلف سطحوں کی ماتحت عدلیہ کے معزز جج صاحبان بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔

اگرچہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے فوجی عدالتوں کے فیصلے پر نظرِ ثانی کا اختیار اپنے پاس رکھا ہے۔ مگر اس اختیار کا استعمال سنگین مجرموں اور قاتلوں کے بچاؤ کے لیے نہیں ہونا

اگر فوجی عدالتوں کے قیام کے باوجود مجرموں کے بچاؤ کے لیے قانونی ضوابط اور دلائل کی موشگافیوں کا سہارا لیا گیا اور فوجی عدالتوں سے سزا یافتہ مجرم باری باری باعزت بری ہو کر نکلنے لگے تو فوجی عدالتوں کا خوف بھی لوگوں کے ذہنوں سے نکل جائے گا اور عوام کو بے حد مایوسی ہوگی۔

سر دست صورتِ حال یہ ہے کہ چودہ اگست کو پوری قوم نے دل و جان سے یومِ پاکستان منایا، مسلح افواج بھی قوم کے شانہ بشانہ نظر آئیں اور بلوچستان میں جشنِ آزادی کے مناظر نے ایک بار پھر لوگوں میں اعتماد پیدا کیا ہے، حالانکہ وہاں پاکستان کا قومی پرچم لہرانا اور قومی ترانہ پڑھنا ناقابلِ تصور تھا اور جرم بنا دیا گیا تھا۔ حب الوطنی کے جذبات اَزسرِ نو اجاگر ہوئے ہیں اور اہلِ پاکستان، جو مختلف حوالوں سے طبقات میں بٹے ہوئے تھے، ایک قوم نظر آئے اور عوام میں اپنے وطنِ عزیز پر ایک اعتماد پیدا ہوا ہے اور یہ نہایت اچھی علامت ہے۔ ورنہ 2014 سے پہلے لگ بھگ ایک عشرے تک یومِ آزادی اور یومِ پاکستان منانے کا رواج ختم ہو چکا تھا۔ دہشت گردی کے خوف سے قومی وحدت اور تصورِ ملت کی ان علامات کی بساط کو لپیٹ دیا گیا تھا۔ ہم نے خود اپنے محلوں میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو قومی پرچم کے رنگوں پر مشتمل لباس میں ملبوس اور قومی جھنڈوں کو جابجا لہراتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اپنی شعوری زندگی میں پہلی بار ایک رکشا ڈرائیور کو قومی پرچم کی چادر اوڑھ کر رکشا چلاتے ہوئے دیکھا، یہ سب مناظر بڑے دلکش اور حسین معلوم ہوئے۔

حسنِ اتفاق سے اس سال چودہ اگست جمعۃ المبارک کو واقع ہوا اور مساجد میں جمعۃ المبارک کے خطبوں میں تحریکِ پاکستان اور پاکستان کو درپیش مسائل پر خطابات ہوئے۔ مجھے جمعۃ المبارک کے خطاب کے حوالے سے کئی ای میل پیغامات موصول ہوئے اور باشعور لوگوں نے اسے پسند کیا کہ مساجد کے منبر سے نئی نسل میں تحریکِ پاکستان کے حوالے سے آگہی پیدا کی جارہی ہے اور یہ بھی بتایا جارہا ہے کہ ہماری مسلح افواج ملک کے [illegible]

ہی ترقی کی شاہراہ پر اقوامِ عالم کا مقابلہ کر سکتی ہے، نئی نسل کو یہ باور کرانا بھی ضروری ہے کہ کسی نے پاکستان سونے کی طشتری میں رکھ کر نہیں دیا، بلکہ اس کے پیچھے بے انتہا قربانیاں ہیں۔ ہمارے اکابر اور تحریکِ پاکستان کے قائدین کی عزم و استقامت سے بھرپور جہدِ مسلسل ہے اور یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ یہ وطنِ عزیز دو قومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا اور اسلامی قومیت کے نظریے کی جھلک ہمارے نظام میں نظر آنی چاہیے۔

17 اگست 2015ء

گوہ کا سوراخ

گوہ کو عربی میں ''ضَبّ'' اور انگریزی میں Lizard یا Iguana کہتے ہیں، اگرچہ ڈکشنری میں ''لزرڈ'' کے معنی ''چھپکلی'' کے بھی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دسترخوان پر گوہ لائی گئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی نفاستِ طبع کے سبب اسے تناول نہیں فرمایا، لیکن اس سے منع بھی نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ جانور حرام نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے گوہ کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''میں اسے کھاتا بھی نہیں اور اسے حرام بھی قرار نہیں دیتا''۔ (ترمذی:1790)

اس حدیث کی شرح میں امام ترمذی نے لکھا ہے کہ بعض صحابۂ کرام نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ گوہ کا ذکر تو ضمناً آ گیا ہے، دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ایک حدیث کی طرف آپ کو متوجہ کرنا مقصود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''تم ضرور پچھلی امتوں کے طریقوں کی پیروی کرو گے، جیسے ایک بالشت، دوسری بالشت اور ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کے برابر ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوئے ہوں گے، تو تم بھی ان کی پیروی کرو گے۔ ہم نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اور کون؟''۔

(صحیح بخاری:7320)

عربی زبان کا محاورہ ہے: فُلَانٌ اَحْیَرُ مِنَ الضَّبِّ یعنی فلاں شخص گوہ سے بھی زیادہ

[illegible]

والے سوراخ کا تو پتا چل جاتا ہے، لیکن نکلنے والے سوراخ کا پتا نہیں چلتا، لہٰذا حیرت کی علامت کے طور پر گوہ کے بارے میں یہ محاورہ ایجاد ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمان کا مقصد یہ ہے کہ جن فتنوں میں اہلِ کتاب مبتلا ہوئے، ان کے انجام سے باخبر ہونے کے باوجود تم ہی ان فتنوں میں مبتلا ہو گے، کیونکہ انسان بالعموم تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتا، جب تک کہ وہ خود اس تجربے سے نہ گزرے۔ لیکن اس وقت اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے:

"اب پچھتائے کیا ہووت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"

یہ پس منظر میں نے اس لیے بیان کیا کہ پارلیمنٹ سے استعفوں کا آپشن پاکستان تحریکِ انصاف پہلے استعمال کر چکی تھی اور اس کے نتیجے میں ان کے ہاتھ ندامت کے سوا کچھ نہ آیا۔ سب جماعتوں نے اس کا خوب لطف اُٹھایا، ان لطف اندوز ہونے والی جماعتوں میں متحدہ قومی موومنٹ اور جمعیت علمائے اسلام سرِفہرست ہیں، لیکن اس کے باوجود ایم کیو ایم نے پارلیمنٹ کے سب ایوانوں سے مستعفی ہونے کا آپشن استعمال کرنا ضروری سمجھا۔ اگرچہ ایم کیو ایم کے ارکانِ پارلیمنٹ کے استعفے جمع ہونے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر ہی ایم کیو ایم کے قائد جناب الطاف حسین بعض پرائیویٹ ٹیلی ویژن چینلز پر یکے بعد دیگرے آئے اور یہ عندیہ دیا کہ وہ استعفے واپس لے سکتے ہیں۔ اسی طرح استعفے جمع کرنے کے بعد قومی اسمبلی میں ایم کیو ایم کے پارلیمانی لیڈر جناب ڈاکٹر فاروق عبدالستار نے بھی میڈیا کے سامنے آکر کہا کہ ہم نے استعفے بطورِ احتجاج دیے ہیں، اس بیان میں بھی استعفوں کی واپسی کا اشارہ موجود تھا۔

آج بروزِ پیر صبح ٹیلی ویژن پر جناب الطاف حسین کے نام سے ٹکر چلتا ہوا دیکھا کہ استعفے "مائنس الطاف حسین" کا جواب ہے۔ یعنی یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ ایم کیو ایم پر ان کا کنٹرول اب بھی قائم ہے اور کسی کے لیے سرِمو انحراف کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کسی کو

اہل کراچی میں سے کوئی بھی ایسی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھا، یہ ایک ناگزیر حقیقت ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض حلقوں کے نزدیک یہ پسندیدہ امر نہیں ہے۔ شاید ایم کیو ایم کے اراکینِ پارلیمنٹ کے لیے اس آپشن پر عمل کرنا نسبتاً آسان تھا، کیونکہ اس کے جواز کے لیے وہ لمبی چوڑی تاویلات اور توجیہات بیان کر سکتے ہیں اور اس پر انہیں کوئی ندامت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ جبکہ اس کے برعکس اپنے قائدِ محترم کے بعض بیانات کی توجیہات و تاویلات کرتے ہوئے ان کے چہروں کے تاثرات اور بدن بولی کو سمجھنا کسی کے لیے دشوار نہیں ہوتا۔

یہ تو طے ہے کہ استعفے واپس ہو جائیں گے، اس سودے بازی میں ایم کیو ایم کو کچھ حاصل ہوگا یا نہیں یا کس قدر حاصل ہوگا، یہ وقت بتائے گا۔ سرِ دست مولانا فضل الرحمٰن کی سفارت کاری، ذو معنی الفاظ کے چناؤ، آئین کے حوالہ جات اور "پہلے تولو پھر بولو" کے اندازِ تکلّم کا لطف اٹھائیں۔ بہتر ہوگا کہ ہمارے سیاسی رہنما ان سے متانت، ٹھہراؤ، مغلوب الغضب نہ ہونے اور عدمِ جذباتیت کا سبق حاصل کریں، اسی میں سب کا بھلا ہے۔ اپنے مفاد سے غرض رکھنی چاہیے، نہ کہ دوسروں کے الزامات و اتہامات سے بے دل ہو کر اپنا نقصان کیا جائے۔

اسی طرح ایک بات سب کو ذہن نشین کرنی چاہیے کہ اعلیٰ صنعتی و کاروباری طبقے سے لے کر ایک عام مزدور تک سب کو امن کی ضرورت ہے اور جو بھی امن قائم کرے گا، وہ اسے دل سے چاہیں گے۔ ملک مزید بے امنی، فساد، قتل و غارت اور لاقانونیت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ نیشنل ایکشن پلان اور اکیسویں آئینی ترمیم میں اس پر قومی اتفاقِ رائے قائم ہو چکا ہے۔ اس مقدس مشن کا پرچم مسلح افواج کی قیادت نے اٹھا لیا ہے اور اب واپسی کا راستہ نہیں ہے۔ سب پر لازم ہے کہ اپنی چھوٹی موٹی شکایات کے ازالے کی تدبیر کرنے کے ساتھ ساتھ اس قومی مہم کو کامیابی سے ہمکنار کریں۔ دل و جان سے اس حقیقت کا ادراک کر لینا چاہیے کہ کراچی کی صنعتی، اقتصادی اور تجارتی سرگرمیوں کے رواں دواں رہنے کے لیے

حالات کی وجہ سے بہت سے صنعت کار و تاجر یا تو ملک سے باہر جا چکے ہیں یا پنجاب کا رخ کر چکے ہیں۔ میں نے بہت سے ایسے لوگوں کو لاہور میں رہائش اختیار کرتے اور اپنا کاروبار جماتے ہوئے خود دیکھا ہے اور ظاہر ہے کہ کراچی کا کوئی شہری خوشی سے کراچی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ میں نے لاہور کی ایک گلی میں اہلِ کراچی کے جفت سازی کے چھوٹے چھوٹے یونٹ خود دیکھے اور مجھے بتایا گیا کہ یہاں سے اربوں روپے کا مال افغانستان برآمد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ مجبوراً کراچی چھوڑ کر گئے، اس سے سرمایہ بھی وہاں منتقل ہوا اور روزگار کے مواقع بھی اہلِ کراچی کے ہاتھ سے گئے۔ ہمارے ہاں ایک برسرِ روزگار شخص ایک خاندان کا کفیل ہوتا ہے اور ایک بار روزگار شخص کا روزگار سے محروم ہونا ایک خاندان کے محتاج ہونے کے مترادف ہے۔

امن و امان کی قیمت ادا کرنا بلاشبہ یہ کڑوی گولی ہے، لیکن اسے نگل لینے ہی میں ہمارے اجتماعی زندگی کی بقا ہے۔ ہر ایک کی خواہش ہے کہ قیامِ امن کے حوالے سے تمام کارروائیاں شفاف اور غیر جانب دار ہونی چاہییں۔ لیکن اس کی باگ ڈور کسی کے بھی ہاتھ میں ہو اور بالفرض نیت بھی سو فیصد درست ہو، تب بھی بشری خطا کا امکان باقی رہتا ہے اور اس کے ازالے کے لیے کوئی نہ کوئی طریقۂ کار ہونا چاہیے۔ یہ بھی ہمارے دینی، ملی اور قومی مفاد میں ہے کہ اب سیاست اور مذہب دونوں کو جرم اور تشدد سے پاک ہونا چاہیے، Soft Politics اور پر امن مذہبی ماحول ہی ہمارے قومی ایجنڈے کا نقطۂ آغاز اور اوّلین ترجیح ہونی چاہیے۔

یہ مقولہ کہ: ''بد اچھا بدنام برا'' اردو زبان میں بے مقصد رائج نہیں ہوا، اس کے پیچھے اہلِ فکر و نظر کا صدیوں کا تجربہ ہے۔ لہٰذا اگر متحدہ قومی موومنٹ کو پاکستان کی قومی سیاست میں بڑے پیمانے پر نفوذ کرنا ہے، تو زرِ کثیر خرچ کر کے لاہور یا کسی اور مقام پر کانفرنسیں منعقد کرنے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے لیے مثبت اقدامات کر کے اور اپنے

سے نکل کر قومی سطح پر آنا ہوگا، اور یہ مقصد تصنّع اور نمائشی اقدامات سے نہیں بلکہ رویوں میں حقیقی تبدیلی سے حاصل ہوگا۔

1970 کے قومی انتخابات کو آج تک سب سے شفاف انتخابات قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں جناب ذوالفقار بھٹو کو اپنے آبائی صوبے سندھ میں ایسی ہمہ گیر فتح، جسے ہماری سیاسی اصطلاح میں Landslide Victory کہا جاتا ہے، حاصل نہیں ہوئی تھی جیسی کہ صوبۂ پنجاب میں ملی۔ اس میں یہ پیغام مضمر ہے کہ اہلِ پاکستان کے دل پیغامِ محبت کے لیے کھلے رہتے ہیں، عصبیت کے غلافوں میں ملفوف (Wrapped) نہیں رہتے، کوئی آئے اور پیار و محبت کی زبان میں ان کے دلوں پر دستک دے کر تو دے۔

22 اگست 2015ء

ہماری سیاسی حرکیات

ہماری سیاسی حرکیات (Dynamics) کوئی بہت زیادہ پختگی کی مظہر نہیں ہیں۔ زیادہ تر ہم سطحی سوچ کے حامل ہوتے ہیں یا اپنی خواہشات اور تعصّبات کے اسیر ہوتے ہیں۔ عصبیت نظریات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور انسان کو معروضی انداز میں تجزیہ کرنے کے قابل بھی نہیں چھوڑتی۔ اگر ہم اپنے الیکٹرونک اور بطورِ خاص پرنٹ میڈیا کا گہری نظر سے جائزہ لیں تو اس کے مظاہر ہمیں واضح طور پر نظر آئیں گے۔ جس قیادت کی ہم تائید وحمایت کرتے ہیں، اس کی کمزوریوں کی جانب اسے متوجہ کرنے اور اصلاح پر آمادہ کرنے کی بجائے ہم ان کی من مانی تاویلات کرتے ہیں اور جس سے ہمیں نفرت ہے، اس کی اچھائی کو بھی بیک جنبشِ قلم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ ہم ایک ایسے اخلاقی اور نظریاتی تنزل کے دور میں رہ رہے ہیں جہاں خیرِ کل بلکہ خیرِ غالب کا بھی کسی ایک قیادت میں ملنا دشوار ہے۔ سوائے اس کے کہ ہم خیرِ محض یا خیرِ قلیل پر کفایت کریں اور بشری استطاعت کی حد تک اصلاح کی کوشش کرتے ہیں اور ہمارے پاس دستیاب قیادت کا جو اثاثہ ہے، اس کی صلاحیتوں کو صحیح رخ پر موڑنے کی کوشش کریں۔

مولانا فضل الرحمٰن ایم کیو ایم کے ساتھ مذاکرات کے لیے ان کے ہیڈ کوارٹر نائن زیرو آئے، تو میڈیا نے بتایا کہ ان کی جماعت کے بعض لوگ اس پر شدید ناراض ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن کی سیاست مجرّد نظریات پر مبنی نہیں ہے۔ ان کی سیاست

سمجھتے ہیں کہ نظام میں اپنا حصہ ضرور لینا چاہیے۔ اور اگر کبھی وہ ''حصہ بقدرِ جثّہ'' سے زیادہ لے لیتے ہیں، تو یہ اُن کی سودہ بازی کی مہارت یا فریقِ ثانی کی ضرورت اور مجبوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مولانا کا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ وہ معاملات کو Point of no return تک نہیں لے جاتے، ہمیشہ مکالمے کی گنجائش رکھتے ہیں اور بلاوجہ اپنے حکومتی حلیف کے لیے مسائل پیدا نہیں کرتے۔ یعنی وہ وضع داری کو قائم رکھتے ہیں اور ٹوٹا ہوا تعلق دوبارہ جوڑتے وقت جب دوسرے فریق کا سامنا ہو تو شرمندگی نہیں اٹھانی پڑتی۔ جناب عمران خان کے حوالے سے مولانا کا رویہ ذرا منفرد ہے اور اس کا سبب ایک تو خود خان صاحب کا رویہ ہے اور دوسرا یہ کہ خیبر پختونخوا میں تحریک انصاف کی وجہ سے مولانا کا سیاسی نقصان زیادہ ہوا ہے۔

اس کے برعکس ایم کیو ایم کا شعارِ سیاست الگ ہے، وہ بیک وقت نظام میں حصہ بھی لینا چاہتے ہیں اور حزبِ اختلاف کی سیاست بھی کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت میں ان کے سیاسی حلیف نظام میں حصہ دینے کے باوجود زک اٹھاتے رہتے ہیں اور دل ہی دل میں کڑھتے ہیں کہ جب روز ان کے کوسنے اور شکایات ہی سننی ہیں، تو بہتر ہے کہ یہ اپوزیشن ہی میں رہیں۔ اگر حکومت میں شریک رہتے ہوئے بوجھ ہی بنے رہنا ہے، تو ایک دوسرے کے لیے دلوں میں جگہ پیدا ہونا دشوار ہے۔ سیاسی اخلاقیات کا تقاضا یہ ہے کہ جب حکومت کا حلیف بنے تو صرف مفادات نہ سمیٹے بلکہ حکومت کی ناکامیوں میں اپنے حصے کا بوجھ بھی اٹھائے اور کسی حد تک دفاع بھی کرے۔ ایم کیو ایم کے حضرات اپنی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے رہتے ہیں کہ ہم حکومت میں شریک ہیں اقتدار میں نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اقتدار پر اختیار تو غالب فریق ہی کا رہے گا۔ ایم کیو ایم کے لیے لمحۂ موجود کا یہ نہایت مشکل سوال ہے کہ اپنے سیاسی کلچر میں تبدیلی کیسے لائے تاکہ دوسروں کو انہیں اپنے ساتھ ملا کر چلنا نسبتاً آسان اور قابلِ قبول ہو جائے۔ ہاں! ایم کیو ایم کا ایک جائز مسئلہ بااختیار اور باوسائل شہری حکومت ہے اور ہمارے نظمِ اجتماعی کو اس کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کرنا

نجات نہیں ملے گی۔ ایم کیو ایم کے قائدین کو مغلوب الغضب ہو کر اور جوشِ خطابت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا موقف پیش کرنے کی بجائے ٹھہراؤ اور دلائل کے ساتھ اپنا موقف پیش کرنا چاہیے۔ ہم نے عالمی مدبرین (Statesmen) کو ہمیشہ پرسکون انداز اور پراعتماد لہجے میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا ہے، وہ الفاظ کا چناؤ نہایت احتیاط کے ساتھ کرتے ہیں اور الفاظ کی فضول خرچی کی بجائے کم از کم الفاظ میں اپنا موقف بیان کرتے ہیں، انگریزی کا مقولہ ہے:

"Less Spoken Less Committed"

یعنی جتنا کم بولو گے، اتنی ہی گرفت کم ہوگی اور جتنا زیادہ بولو گے اتنا ہی زبان کی لغزش اور فکر کی کجی کے امکانات زیادہ ہوں گے۔

ہمارے ہاں جناب عمران خان نے سیاسی خِلافیات میں بے مروّتی کا کلچر رائج کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں کسی کل جماعتی اجتماع یا اپنے مخالف سیاسی رہنماؤں کے ساتھ بیٹھنے میں تکدُّر (Displeasure) اور اِنقباض محسوس ہوتا ہے۔ انہیں اور ان کے جان نثاروں کو سوچنا چاہیے کہ بالفرض اگر کل انہیں اقتدار مل جاتا ہے، تو انہیں بھی اہم قومی مسائل میں اتفاقِ رائے پیدا کرنے کے لیے دوسروں کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔ اور اب تو ملک کے معروضی حالات یہ بتا رہے ہیں کہ کسی ایک قومی جماعت کے لیے چاروں صوبوں اور مرکز میں بیک وقت بلا شرکتِ غیرے حکومت بنانے اور چلانے کے مواقع کم ہی دستیاب ہوں گے۔ لگتا ہے کہ مینڈیٹ متفرق ہی آ رہا ہے گا اور مل جل کر نظام کو چلانے میں ہی سب کا مفاد ہے اور ملکی وملی مفاد کا تقاضا بھی یہی ہے۔

چونکہ جناب عمران خان اپنے حریفوں پر نہایت تکرار کے ساتھ خاندانی سیاست کا طعن کرتے رہے ہیں، اس لیے اپنی بیگم کو سیاسی میدان میں اُتارنے کے بعد دباؤ برداشت نہ کر سکے اور جلد ہی رَجعت اختیار کر لی، گویا یہ طعن اُن پر بیک فائر ہو گیا۔ حالانکہ یہ ہمارے

فرض کرلیا گیا کہ پی ٹی آئی کا اُمیدوار جیت رہا تھا اور محترمہ ریحام خان کے سبب ہار گیا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے، مخالف امیدوار بابر نواز کے والد جناب اختر نواز بھی ماضی میں یہاں سے الیکشن جیت چکے ہیں اور روایتی طور پر بھی اس علاقے کے لوگ مسلم لیگی ذہن کے ہیں۔ لہٰذا اس امکان کو بھی رد نہیں کرنا چاہیے کہ ہوسکتا ہے محترمہ کی انتخابی مہم کی وجہ سے شکست کا مارجن کچھ کم ہو گیا ہو، لیکن خان صاحب کو دباؤ میں آ کر فوری فیصلہ کرنا پڑا۔

یہ ایسا ہی ہے کہ مانسہرہ کی قومی اسمبلی کی نشست این اے-21 پر فیض محمد خان مرحوم کے انتقال کے بعد کیپٹن صفدر نے جب ضمنی الیکشن لڑا اور کم مارجن سے ہار گئے، تو اسلام آباد اور لاہور سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگ ن کے ہمدرد کالم نگاروں نے اس کا سبب یہ بیان کیا کہ اپنے رشتہ دار کو ٹکٹ دینے کی وجہ سے ن لیگ ایک سیٹ سے محروم ہو گئی۔ اسی زمانے میں ایک میٹنگ میں جناب شہباز شریف سے ملاقات ہوئی، تو میں نے انہیں بتایا کہ میری نظر میں یہ تجزیے درست نہیں ہیں۔ 1970 کے انتخابات میں خان عبدالقیوم خان مانسہرہ اور ہری پور سے جیتے تھے اور اس کے بعد اب پہلی مرتبہ مسلم لیگ کا ووٹر پارٹی بنیاد پر متحرک ہوا ہے۔ کیونکہ 1985 سے 2008 تک کے انتخابات میں جو لوگ اس سیٹ پر جیتتے آئے تھے، ان کے اپنے خاندانی اثرات بھی تھے، یعنی وہ سیاسی اصطلاح میں جزوی طور پر قابل انتخاب (Electables) لوگ تھے۔ پارٹی کی حمایت مل گئی اور وہ جیتتے رہے۔ لیکن کیپٹن صفدر نے پہلی بار مسلم لیگ کا ووٹ بینک دریافت کیا اور جمع کیا، چنانچہ 2013ء میں وہ یہاں سے جیت گئے۔

یہ چند سطور میں نے اس لیے لکھی ہیں کہ جناب عمران خان کو اپنے آپ اور اپنے حامیوں کو سیاسی میدان میں تھکا تھکا کر بے حال نہیں کرنا چاہیے۔ اپنی اور ان کی توانائیوں کو بچا کر رکھنا چاہیے تاکہ وہ تازہ دم ہو کر 2018ء کے انتخابات میں میدان میں اتریں۔ اس وقت ان کے اور پوری قوم کے فائدے میں یہی ہے کہ ملک کو اندرونی دہشت گردی کے

ملک کے معاشی حالات میں بھی کسی حد تک نمایاں بہتری آسکتی ہے اور اگر 2018ء تک ملک کی اقتصادی ریل پٹڑی پر رواں دواں ہو جاتی ہے، تو آپ کو بھی اقتدار کی صورت میں اس کی رفتار تیز کرنے میں آسانی ہو سکتی ہے اور شاید کچھ فیض آپ لوگوں تک بھی پہنچا سکیں۔ ورنہ معاشی لحاظ سے ابتر اور امن امان کے لحاظ سے فساد زدہ پاکستان کسی کے حق میں بھی مفید نہیں ہوگا۔ خاص طور پر آپ کے حق میں جبکہ آپ کے مزاج میں اجتماعیت اور مل کر چلنے کا رجحان دوسروں کی بہ نسبت کم ہے۔

24 اگست 2015ء

چند فقہی مسائل

حج اور قربانی کا موسم شروع ہو چکا ہے، اس حوالے سے چند سوالات آج کل پوچھے جا رہے ہیں، اس لیے اختصار کے ساتھ ان سوالات کے جوابات پیشِ خدمت ہیں:

مثلاً: لوگ پوچھتے ہیں کیا کہ آسٹریلوی گائے کی قربانی جائز ہے، کیونکہ سنا ہے کہ دودھ دینے کی صلاحیت میں اضافے کے لیے ان کی جفتی (Fertilization) حرام جانور سے کرائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ فقہی رائے کا مدار افواہوں یا سنی سنائی باتوں پر نہیں ہوتا بلکہ حقائق و شواہد پر ہوتا ہے۔ فقہ کا مسلّمہ قاعدہ ہے کہ "یقین شک سے زائل نہیں ہوتا"۔ تاہم اگر یہ بات درست بھی ہو تو یہ گائیں حلال ہیں، ان کا گوشت کھانا اور دودھ پینا جائز ہے۔ اس لیے کہ جانور کی نسل کا مدار ماں پر ہوتا ہے۔

علامہ برہان الدین مرغینانی لکھتے ہیں:

"اور جو بچہ پالتو مادہ اور وحشی نر کے ملاپ سے پیدا ہو، وہ ماں کے لیے تابع ہوتا ہے، کیونکہ بچے کے تابع ہونے میں ماں ہی اصل ہے، یہاں تک کہ اگر بھیڑیے نے بکری پر جفتی کی، تو ان کے ملاپ سے جو بچہ پیدا ہوگا، اس کی قربانی جائز ہے"۔

اس کی شرح میں صاحبِ عنایہ علامہ محمد بن محمود حنفی لکھتے ہیں:

"کیونکہ بچہ ماں کا جزء ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بچہ آزاد یا غلام ہونے میں ماں کے

سے نطفہ جدا ہوتا ہے اور وہ قربانی کا محل نہیں ہے اور ماں (مادہ) کے وجود سے حیوان جدا ہوتا ہے اور وہ قربانی کا محل ہے، پس اسی کا اعتبار کیا گیا ہے"۔ (فتح القدیر، ج:9،ص:532)

ہمارے بہت سے لوگ یورپ اور امریکا میں روزگار کے سلسلے میں مقیم ہیں اور وہ اپنی قربانی اپنے آبائی وطن میں کرانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ وہاں بعض صورتوں میں اُن ممالک کے قوانین کی وجہ سے قربانی کرنا دشوار ہوتا ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ وہاں مستحقین دستیاب نہیں ہیں۔ اس لیے وہ کسی کو وکیل بنا کر قربانی کی رقم پاکستان بھیج دیتے ہیں۔ یہ وکیل ان کے خاندان کے لوگ اور عزیز رشتہ دار بھی ہوتے ہیں اور بعض صورتوں میں یہ لوگ دینی مدارس یا رفاہی اداروں کو وکیل بنا کر رُقوم بھیجتے ہیں تاکہ قربانی کا گوشت اور کھال مستحقین تک پہنچ جائے۔ اس سلسلے میں اس بات کا اہتمام ضروری ہے کہ امریکا یا کینیڈا میں مقیم شخص کی قربانی جس دن پاکستان میں کی جارہی ہے، ضروری ہے کہ اس دن کینیڈا یا امریکا میں بھی قربانی کا دن ہو، خواہ پہلا دن ہو یا دوسرا یا تیسرا (یعنی دس یا گیارہ یا بارہ ذوالحجہ) اور یہاں بھی وہ قربانی کا دن ہو، خواہ وہ یہاں کے اعتبار سے عید کا پہلا دن ہو یا دوسرا یا تیسرا۔ کیونکہ بعض صورتوں میں امریکا یا کینیڈا میں عید ایک دن پہلے ہوجاتی ہے۔ لیکن قربانی کے وقت کے اعتبار سے مقامِ ذبح کا اعتبار ہوگا کہ پاکستان میں صبح صادق سے غروبِ آفتاب کے درمیان کا وقت ہو، کیونکہ رات کو قربانی کرنا جائز تو ہے، مگر مکروہ ہے۔ الغرض مذبوح عنہ (یعنی جس کی قربانی کی جارہی ہے) کے اعتبار سے بھی اور مقامِ ذبح دونوں کے اعتبار سے قربانی کا دن ہونا چاہیے اور وقت کے لیے مقامِ ذبح کا اعتبار ہوگا۔

ایک فقہی مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص کسی بھی سبب سے حج کے موسم (شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ) میں حرم میں پہنچ گیا تو اس پر حج فرض ہوجائے گا اور حج فرض ادا نہ کیا تو گنہگار ہوگا۔ اب پاکستان سے لوگ رمضان المبارک میں عمرے کے لیے جاتے ہیں اور بعض اوقات فلائٹ میں نشست نہ ملنے کی وجہ سے انہیں شوال کے ابتدائی دنوں تک مجبوراً رُکنا پڑتا ہے۔

حالانکہ اُن کے پاس مصارف حج اور حج تک قیام کے لیے پیسے نہیں ہوتے۔ مزید یہ کہ سعودی حکومت کے نزدیک ان کا قیام غیر قانونی ہوتا ہے اور قانون کی گرفت میں آنے کی صورت میں انہیں سزا ہوسکتی ہے یا ملک بدر کیا جاسکتا ہے۔ اور بعض صورتوں میں لوگ غیر قانونی طور پر رک جاتے ہیں اور بھیک مانگتے ہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ واپس اپنے وطن چلے آئیں، ان پر حج فرض نہیں ہوا اور حج ادا کیے بغیر واپس جانے کی صورت میں وہ گنہگار نہیں ہوں گے۔ اس لیے کہ حج مُستطیع (صاحبِ استطاعت) پر فرض ہے اور ایامِ حج تک رکنے اور مصارفِ حج ادا کرنے کی ان کے پاس استطاعت ہی نہیں ہے۔ لہٰذا وہ مُستطیع ہی نہیں ہیں اور حج صاحبِ استطاعت پر فرض ہے، اس لیے حج ادا نہ کرنے کی صورت میں وہ گنہگار نہیں ہوں گے۔

اور اگر ان کے پاس تکمیلِ حج تک سعودی عرب میں قیام اور دیگر مصارفِ حج کی استطاعت تو ہے، لیکن سعودی حکومت ان دنوں میں وہاں قیام کی اجازت نہیں دیتی، تو غیر قانونی طور رکنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جب ہم کسی ملک کا ویزا لے کر جاتے ہیں تو اس کے ضمن میں اُس ملک کے قوانین کی پابندی کا عہد بھی شامل ہوتا ہے اور قانون شکنی کی صورت میں سزا یا بے توقیری کے ساتھ ملک بدری کی نوبت بھی آسکتی ہے اور یہ شرعاً ناجائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''مومن کے لیے روا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے، صحابہ کرام نے عرض کی: (یارسول اللہ!) کوئی شخص اپنے آپ کو کیوں ذلیل کرے گا؟، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو ایسی صورتِ حال سے دوچار کرے، جس سے عہدہ برا ہونے کی وہ طاقت نہیں رکھتا، (لہٰذا انجامِ کار اسے ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا) (سنن ترمذی: 2254)''۔ الغرض مومن کے لیے عزتِ نفس اور اپنے شخصی وقار کا تحفظ ضروری ہے۔

جو شخص بیک وقت حج وعمرے کا احرام باندھے اور عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام ہی میں

طرح اگر وہ حج اور عمرہ دونوں کی نیت کرے اور عمرہ ادا کر کے احرام کھول دے اور پھر مکہ مکرمہ سے آٹھ ذوالحج کو حج کا احرام باندھ کر منیٰ جائے اور حج مکمل کرے، تو اسے تَمَتُّع کہتے ہیں اور ایسے شخص کو مُتَمَتِّعْ کہتے ہیں۔ تمتع اور قران کرنے والے پر دو عبادات (عمرہ وحج) کی سعادت سے سرفراز ہونے پر شکرانے کا دَم (قربانی) واجب ہے اور اسے دمِ تمتّع اور دمِ قران کہتے ہیں۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ قارِن چونکہ عمرہ ادا کرنے کے بعد بدستور اِحرام میں رہتا ہے اور مُحرِم ہوتا ہے، اس لیے اگر اس سے کوئی جنایت سرزد ہوجائے، تو جرم کی نوعیت کے اعتبار سے اس پر دو دم یا دو صدقے ہوں گے۔ ہدایہ میں اسی طرح ہے۔ لیکن اس مسئلے میں قدرے تفصیل ہے، اگر قارِن نے اِحرام کی کسی جنایت کا ارتکاب کیا، جیسے سلا ہوا لباس پہن لیا یا بال کٹائے یا ناخن تراش لیے یا خوشبو استعمال کی، تو اسے دمِ قران (شکرانے کی قربانی) کے علاوہ جرم کی نوعیت کے اعتبار سے دو کفارے (خواہ دم ہو یا صدقہ) دینے ہوں گے، کیونکہ یہ جنایت عمرے اور حج دونوں کے اِحرام کے متعلق ہے، تو جزا بھی دو ہوں گی۔ اور اگر اس سے ایسی جنایت سرزد ہوئی جس کا تعلق صرف عمرے سے ہے یا صرف حج سے ہے تو دمِ قران کے علاوہ صرف ایک اضافی کفّارہ (خواہ دم ہو یا صدقہ) دینا ہوگا، جیسے صرف عمرے کا طواف بے وضو کیا یا جنابت کی حالت میں کیا یا عمرے کی سعی چھوڑ دی اور اسی طرح حج کا طواف جنابت کی حالت میں یا بے وضو کیا یا مغرب سے پہلے عرفات سے نکل گیا یا حج کی سعی یا رمی چھوڑ دی یا رمی سے پہلے حلق کرلیا یا قربانی کرلی (اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیک وقت ان ساری جنایات کا ارتکاب کیا بلکہ ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کیا) تو صرف ایک کفّارہ ہوگا، کیونکہ اِن اُمور کا تعلق صرف حج سے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر بالفرض ایک ہی حج میں ایک سے زائد جنایات کا ارتکاب کردیا، تو پھر جنایات کے مطابق اُتنے ہی دم یا صدقے دینے ہوں گے۔

29 اگست 2015ء

چند فقہی مسائل کا حل

چند برسوں سے ہر سال انہی دنوں سیلاب یا کسی اور قسم کی ناگہانی آفات کا سلسلہ رہتا ہے۔ اکثر لوگ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ ہمارے ملک میں تباہ کن سیلاب آیا ہے، جس سے کافی جانی و مالی نقصان ہوا ہے، لاکھوں لوگ بے گھر ہیں، قربانی کو موقوف کر کے یہ رقم ان متاثرین کی مدد پر صرف کی جانی چاہیے۔ ہمیں ایک صاحب نے خط لکھا کہ ایک ادارے کا سربراہ یہ کہتا ہے کہ ہمارے ملک میں لوگ بدترین سیلاب کی زد میں ہیں، لوگوں کے گھر، مال، مویشی اور جانیں تباہ ہورہی ہیں، لہٰذا 10 ذوالحجہ کو سنّتِ ابراہیمی کے طور پر جو قربانی کی جاتی ہے، اس سال نہ کی جائے اور وہ رقم سیلاب زدگان کو بطور امداد دی جائے تاکہ اُن کی مشکلات میں کمی ہوسکے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ علمائے کرام نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ لوگ حج وعمرہ کے بجائے یہ رقم سیلاب زدگان پر خرچ کریں تو انہیں کئی حج اور عمروں کا ثواب ملے گا۔

پہلی عرض تو یہ ہے کہ قربانی کا بدل مالی صدقہ نہیں ہے اور نہ ہی دین کے فرائض وواجبات کو ساقط کرنے کا کسی کو اختیار ہے۔ شریعتِ مُطہرہ کی روشنی میں وہ عبادات جو شریعت میں مقرر ہیں، وہ بجائے خود مقصود ہیں اور ان کو شارع کے حکم کے مطابق بجالانا ضروری ہے۔ قربانی ہر صاحبِ نصاب بالغ مرد و عورت پر واجب ہے۔ قربانی کو واجب قرار دینے کے سلسلے میں ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''اپنے رب کی نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے''۔ (کوثر:2)

[illegible]

''اُضْحِیَہ'' کہتے ہیں، گوشت پوست کے حصول کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کی حقیقت اور روح ایامِ قربانی میں عبادت اور تقرُّب الٰہی کی نیت سے شریعت کی مقررہ شرائط کے مطابق جانور ذبح کرنا ہے۔

حدیث پاک میں ہے: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''قربانی کے دن بنی آدم کا کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں (قربانی کی نیت سے) جانور کا خون بہانے سے زیادہ محبوب نہیں ہے، اور یہ (قربانی کا جانور) قیامت کے دن اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں سمیت (یعنی سالم وجود کے ساتھ) آئے گا اور (قربانی کے جانور کا خون) یقیناً زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں مرتبۂ قبولیت کو پالیتا ہے، سو (اے اہلِ ایمان!) تم خوش دلی سے قربانی کیا کرو''۔ (سُنن ترمذی:1493)۔ اسے حدیث میں ''اھراقُ الدَّمِ یا اِرَاقَۃُ الدَّمِ'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ قربانی کی حقیقت اور اصل عبادت ''اِہراقِ الدّم'' یا ''اِرَاقَۃُ الدّم'' ہے، جس کے معنی ہیں: خون بہانا، یعنی شرعی شرائط کے مطابق ذبح کرنا، جو خون بہانے کا سبب ہے''۔ اس حکمت کو اللہ عزوجل نے بیان فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان (قربانی کے جانوروں) کا نہ گوشت پہنچتا ہے اور نہ ہی اُن کا خون، بلکہ (اس عمل قربانی سے مقصود) تقویٰ ہے، جو اس کی بارگاہ میں پہنچتا ہے''۔ (الحج:37)۔ ہاں! اپنے وطن کے مصیبت زدہ بھائیوں کی اپنی بساط کے مطابق ہر ممکن مدد کرنا بھی ہمارے دین اور ایمان کا تقاضا ہے اور پوری قوم کو اس ذمے داری سے عہدہ برا ہونا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

ترجمہ: ''جس شخص کے پاس گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے''۔

(سُنن ابن ماجہ:3123)

قربانی نہ کرنے پر وعید کا لاحق ہونا، اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب قربانی واجب ہو۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا، جب آپ ﷺ لوگوں کو نماز پڑھا کر فارغ ہوئے، تو آپ ﷺ نے ذبح کی ہوئی بکری کو دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے نماز سے پہلے قربانی کی ہے، وہ اِس کی جگہ دوسری بکری کو ذبح کرے اور جس نے ابھی تک ذبح نہیں کیا، وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کرے"۔ (صحیح مسلم:5060)

آیت اور احادیث مبارکہ میں قربانی کا امر (حکم) ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔ جس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے قربانی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنّت فرمایا ہے، (سنة ابیکم ابراهیم، سُنن ابن ماجہ: 3127)، اُس سے مراد یہ ہے کہ قربانی دین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے اور یہ وجوب کی نفی نہیں کرتا۔

امام برہان الدین علی المرغینانی لکھتے ہیں: "ہر آزاد، مسلمان، مقیم، مال دار پر ایامِ قربانی (10 تا 12 ذوالحجہ) میں اپنی طرف سے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے قربانی کرنا واجب ہے، امام ابوحنیفہ، امام محمد، امام زفر، امام حسن اور ایک روایت میں امام ابو یوسف رحمہم اللہ اجمعین کے نزدیک قربانی واجب ہے"۔ (ہدایہ، جلد 7، ص: 154)

ظاہر الروایۃ کے مطابق نابالغ پر قربانی واجب نہیں ہے، چنانچہ علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

"ہر آزاد مقیم مال دار مسلمان پر اپنی طرف سے قربانی واجب ہے، (حنفی مذہب کی ظاہر الروایۃ کے مطابق نابالغ بچے کی جانب سے قربانی واجب نہیں ہے، البتہ نابالغ کا فطرہ واجب ہے۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ظاہر الروایۃ کے مطابق نابالغ پر قربانی واجب نہیں بلکہ مستحب ہے البتہ صدقۂ فطر واجب ہے۔ امام حسن کی روایت کے مطابق اپنی نابالغ اولاد اور یتیم پوتے پوتی کی قربانی واجب ہے، مگر فتویٰ ظاہر الروایۃ پر ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی بالغ اولاد اور بیوی کی جانب سے قربانی کرے تو ان کی اجازت لے کر کرے۔ ایک روایت کے مطابق اگر بلا اجازت بھی کر دی تو استحساناً جائز ہے"۔

(ردالمحتار، جلد 9، ص: 392)

فقہائے مالکیہ میں متقدمین قربانی کے وجوب کے قائل ہیں اور متاخرین کے نزدیک سنتِ مؤکدہ ہے۔ حنابلہ اور شافعیہ کے نزدیک قربانی سنتِ مؤکدہ ہے۔ مذکور شخص کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ علماء نے فتویٰ دیا ہے کہ ''لوگ حج و عمرہ کے بجائے یہ رقم سیلاب زدگان پر خرچ کریں تو انہیں کئی حج اور عمروں کا ثواب ملے گا''۔

دراصل اُس شخص نے علماء کے موقف کو صحیح نہیں سمجھا۔ علماء کا بیان یہ تھا کہ فرض حج تو کسی طور پر بھی ساقط نہیں ہوتا، البتہ نفلی حج کو مؤخر کر کے یہ رقم سیلاب زَدگان پر خرچ کی جاسکتی ہے، کیونکہ یہ اہلِ پاکستان پر ایک بہت بڑی آزمائش تھی اور عمرہ اپنی اصل کے اعتبار سے ہی ایک نفلی عبادت ہے۔ لیکن واجب قربانی کو نہ تو ترک کیا جاسکتا ہے، نہ ساقط کیا جاسکتا ہے۔ البتہ مالی حیثیت والے لوگ اگر اپنے روزمرہ کے مصارف یا تعیُّشات میں کمی کر کے پس انداز کی ہوئی رقم سیلاب زَدگان کی مدد پر صرف کریں تو یہ اُن کی دینی اور اخلاقی ذمہ داری بھی ہے اور اعلیٰ انسانی قدر بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''اور جو چیز لوگوں کو نفع دیتی ہے، اُسے زمین پر قرار ملتا ہے''۔ (الرعد: 17)

ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے:

ترجمہ: ''بہترین انسان وہ ہے، جس کی ذات انسانیت کے لیے سب سے زیادہ نفع رساں ہو''۔ (الجامع الکبیر: 11760)

قربانی بھی ضرورت مند انسانوں کی خدمت کا ایک ذریعہ ہے۔ مویشی پالنے والے لوگ سال بھر اسی آس پر جانور پالتے ہیں کہ ایامِ قربانی میں اُنہیں فروخت کر کے اپنی ضروریات پوری کریں گے۔ پھر قربانی کے گوشت سے بھی غریبوں اور ناداروں کی مدد کی جاتی ہے اور کھال بھی ناداروں کی مدد کا ایک ذریعہ ہے۔ نیز قربانی اسلام کا ایک شِعار ہے،

ہے اور اس کی بے شمار شرعی حکمتیں اور برکات ہیں۔

ایسا شخص جو قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ یکم ذوالحجہ سے قربانی تک ناخن اور بال نہ ترشوائے۔ اِس حکم پر عمل کرے تو بہتر ہے، نہ کرے تو مضائقہ نہیں۔ حدیثِ پاک میں ہے:

ترجمہ: ''حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس نے ذی الحجہ کا چاند دیکھ لیا اور وہ قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، تو جب تک قربانی نہ کرلے، بال اور ناخنوں سے کچھ نہ لے یعنی اِنہیں نہ ترشوائے''۔ (سُنن ترمذی:1523)

احادیث مبارکہ میں طہارت ونظافت کے احکام میں ناخن تراشنے، مونچھیں پست کرنے اور موئے زیرِ ناف دور کرنے کے لیے جو انتہائی مدت بیان کی گئی ہے، وہ چالیس روز ہے، اِس سے زائد مدت تک چھوڑے رہنا ممنوع ومکروہ ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مونچھیں کاٹنے، ناخن ترشوانے، بغل کے بال لینے اور زیرِ ناف بال دور کرنے کے لیے یہ میعاد مقرر کی گئی کہ چالیس دن سے زیادہ نہ چھوڑیں''۔ (صحیح مسلم:599)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ العزیز لکھتے ہیں: ''اگر کسی شخص نے ۳۱ دن سے کسی عذر کے سبب خواہ بلا عذر ناخن نہ تراشے ہوں نہ خط بنوایا ہو کہ چاند ذی الحجہ کا ہوگیا، تو وہ اگرچہ قربانی کا ارادہ رکھتا ہو، اس مستحب پر عمل نہیں کرسکتا کہ اب دسویں تک رکھے گا تو ناخن وخط بنوائے ہوئے اکتالیسواں دن ہوجائے گا، اور چالیس دن سے زیادہ نہ بنوانا گناہ ہے۔ فعلِ مستحب کے لیے گناہ نہیں کرسکتا۔ ردالمحتار میں ہے: ذوالحجہ کے دس دنوں میں ناخن کاٹنے اور سر منڈانے کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ سنّت کو مؤخر نہ کیا جائے جبکہ اس کے متعلق حکم وارد ہے تاہم تاخیر واجب نہیں ہے۔ تو یہ بالاجماع استحباب پر محمول ہے کیونکہ وجوب کی نفی استحباب کے منافی نہیں ہے، لہٰذا مستحب ہے۔ ہاں! اگر اباحت کی مدت کی انتہا

بہتر اور افضل یہ ہے کہ جو مسلمان قربانی کا ارادہ رکھتے ہیں، اُنہیں ذی الحجہ کے چاند سے ایک دو دن پہلے طہارت یعنی ناخن تراشنے، مونچھیں اور ضرورت سے زیادہ بال کٹوا لینے چاہئیں تاکہ مستحب پر عمل کرنے میں ترکِ سنّت لازم نہ آئے۔

31 اگست 2015ء

ستمبر2015ء

برطانیہ میں بارہ روز

میں 23 اگست کو برطانیہ روانہ ہوا اور 5 ستمبر کو واپسی ہوئی، یہ برطانیہ کا بارہ روزہ دورہ تھا۔ اس کا بنیادی مقصد جماعت اہلسنّت برطانیہ کے زیرِ اہتمام ''انیسویں سالانہ انٹرنیشنل سنی کانفرنس'' میں کلیدی خطاب تھا۔ یہ کانفرنس 30 اگست 2015ء کو جامع مسجد گھمکول شریف برمنگھم میں منعقد ہوئی۔ یہ جماعتِ اہلسنّت برطانیہ کا سالانہ بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ برمنگھم، مانچسٹر، لندن، بریڈفورڈ، بلیک برن اور کارڈف کے علاوہ دیگر مقامات پر مختلف اجتماعات اور استقبالیہ تقریبات میں اظہارِ خیال کے مواقع ملے۔

برطانیہ میں ہر پاکستانی کا پہلا سوال پاکستان کی سیاسی صورتِ حال، امن وسلامتی اور آپریشن ضربِ عضب کے بارے میں ہوتا ہے کہ آیا یہ نتیجہ خیز ثابت ہوگا یا نہیں؟۔ میں نے عرض کیا کہ ضربِ عضب پر اصولی طور پر تو قومی اتفاقِ رائے یقیناً ہوا ہے، پاکستان کی ساری پارلیمانی سیاسی قیادت نے اس کی توثیق کی ہے اور بظاہر سیاسی ودفاعی قیادت متفق نظر آتی ہے۔ چیف آف آرمی اسٹاف جناب جنرل راحیل شریف کے عزمِ صمیم اور فعالیت نے قوم میں اُمید کی کرن پیدا کی ہے۔ کراچی میں صورتِ حال کافی بہتر ہوئی ہے۔ لیکن جب سیاسی تطہیر اور کرپشن کے خلاف رینجرز، ایف آئی اے اور نیب کارروائی کرتے ہیں تو بالخصوص سندھ کی سیاسی قیادت اس پر ردِ عمل کا اظہار کرتی ہے اور اسے انتقامی کارروائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے ایک منفی تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر سیاسی جماعت کی

جائیں اور اسے ہر الزام سے پاک وصاف قرار دے دیا جائے، یہ ایک نقطۂ اختلاف ہے، جس کا ارتعاش آپ لوگ پاکستان کے الیکٹرونک میڈیا اور اخبارات میں دیکھتے ہوں گے۔

جماعتِ اہلسنّت برطانیہ کے سرپرستِ اعلیٰ علامہ مفتی گل رحمٰن قادری، امیر علامہ مفتی یار محمد قادری اور ناظمِ اعلیٰ علامہ غلام ربانی افغانی اور ان کی ٹیم کے ارکان میں علامہ سید ظفر اللہ شاہ، حافظ محمد سعید مکی اور مولانا نصیر اللہ نقشبندی کافی فعال اور متحرک لوگ ہیں۔ علامہ غلام ربانی افغانی اردو کے مایہ ناز خطیب ہیں اور انگلش وعربی زبان میں بھی انہیں خطابت اور تکلم پر یکساں عبور حاصل ہے، کانفرنس میں پیرِ طریقت علامہ علاؤالدین صدیقی، جناب پیر نقیب الرحمٰن، علامہ سید محمد ہاشمی میاں اور بریلی شریف سے علامہ منان رضا خان عرف منانی میاں اور کراچی سے علامہ لیاقت حسین اظہری سمیت بہت سے عالمی شہرت یافتہ مشائخ، عمائدین اور مقررین نے شرکت کی۔ شیخِ طریقت علامہ علاؤالدین صدیقی کا اپنا ٹیلی ویژن چینل ''نور'' ہے، جو مغرب میں کافی دیکھا جاتا ہے۔ برطانیہ میں اُمہ ٹیلی ویژن اور تکبیر ٹیلی ویژن نیٹ ورک بھی مصروفِ عمل ہیں اور عالمی سطح پر دینی حلقوں میں کیو ٹی وی اور مدنی چینل کا دائرۂ ناظرین بھی کافی وسیع ہے۔

انٹرنیشنل سنی کانفرنس میں کلیدی خطاب کے دوران میں نے جماعت اہلسنّت کی قیادت اور وہاں کی دینی تنظیمات اور مساجد و اسلامی مراکز کے منتظمین کو چند اہم امور کی طرف متوجہ کیا۔ ایک تو یہ کہ ائمہ و خطبائے کرام کے لیے تربیتی نشستوں اور ورکشاپس کا اہتمام کیا جائے۔ ہمارے لوگ برطانیہ میں رہتے ہوئے بھی اپنے دائرے میں محدود رہتے ہیں اور امتِ مسلمہ کے حوالے سے عالمی تحریکات سے لاتعلق رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کے بارے میں آگہی پیدا کرنا نہایت ضروری ہے، یہ بھی لازم ہے کہ ان تحریکات کے محرّکات اور اسباب وعوامل کا تجزیہ کیا جائے۔ معاملات کو سمجھنے کے لیے گہرائی (Depth) میں جانا پڑتا ہے اور آپ کی نظر اور مشاہدے میں گیرائی (Comprehenciveness) بھی

جاننا چاہیے کہ امریکا کے تضادات اور مختلف معیارات بہت سی عالمی خرابیوں اور فساد کا سبب ہیں۔ وہ جب چاہتا ہے کسی طبقے کو عالمی ایجنڈے کے لیے استعمال کرتا ہے اور گلے لگا لیتا ہے اور جب چاہتا ہے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے۔ جہادِ افغانستان سے لے کر لیبیا میں کرنل قذافی کے زوال اور شام میں نصیری حکومت کے خلاف مسلح تحریک میں یہی تضاد کارفرما ہے۔ اور اب داعش کے بارے میں سوالات اٹھ رہے ہیں۔

ماضی کے فرعونوں کی طرح امریکا کا موٹو بھی ''انا ربّکم الاعلیٰ'' یعنی Only I am Your Supereme Lord ہی ہے۔ جب بھی کوئی مقتدر عالمی قوت اپنے آپ کو معیارِ حق سمجھ لیتی ہے، تو پھر دلیل واستدلال اور معقولیت (Rationality) کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور یہی رویہ تمام عالمی مسائل کی جڑ ہے۔ میں نے بتایا کہ آپ مغرب کے اہلِ فکرونظر سے پوچھیں کہ آج کی دنیا میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں سب سے زیادہ جانی ومالی نقصان پاکستان نے اٹھایا ہے، پاکستان کے دفاعی اداروں اور عامۃ الناس کا مجموعی جانی نقصان پچاس سے ساٹھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے اور مالی نقصان کا تو آج تک صحیح تخمینہ لگایا ہی نہیں گیا۔ لیکن اس کے باوجود عالمی استعماری قوتیں یہود وہنود کے ساتھ مل کر سب سے زیادہ الزامات پاکستان پر ہی لگاتی ہیں اور صفائی پیش کرتے کرتے ہماری ایک نسل جوانی کی منزل سے گزر کر بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچ گئی ہے۔ اسی رویے اور سوچ نے عالمی سطح پر ناانصافی کو جنم دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ طاقت کے بل پر آپ کسی کی گردن تو جھکا سکتے ہیں، لیکن دل ودماغ میں جگہ نہیں بنا سکتے۔ اور امریکا کی قیادت میں مغربی قوتیں اِس ذہنی نہاد (MindSet) سے باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسی ناانصافی کا شاخسانہ ہے کہ مختلف ادوار کی پاکستانی حکومتیں تو خواستہ وناخواستہ امریکا کا ساتھ دیتی رہیں، لیکن عوام دل وجان سے ان پالیسیوں کا کبھی بھی ساتھ نہ دے سکے۔

میں نے تجویز پیش کی کہ برطانیہ میں ہماری مساجد اور اسلامی مراکز کے منتظمین کے لیے بھی تربیتی ورکشاپس کا انتظا[illegible]

عالی شان مساجد و مراکز تعمیر کیے ہیں، لیکن اُن سے دینی تعلیم و تربیت اور تزکیے کے شعبوں میں پوری استعداد کے مطابق کام نہیں لیا جا سکا، یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ اسی طرح برطانیہ اور مغرب کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم پانے والے نوجوانوں کے ذہنوں میں جو اضطراب اور اشتعال ہے، اسے بھی مثبت اور تعمیری رُخ پر ڈالنے کی اشد ضرورت ہے۔ آج ہمیں الحاد و انحراف، تجدُّد پسندی، اباحتِ کلی اور دینی و اخلاقی اقدار سے آزاد لبرل ازم کے فلسفے کا سامنا ہے۔ علماء و خطبائے کرام کی اس سلسلے میں آگہی نہایت ضروری ہے اور ہمیں ایک جدید علم الکلام اور علم المناظرہ کی ضرورت ہے، جو مخاطب پر دھاک بٹھانے اور اس پر خوف طاری کرنے کی بجائے اسے قائل کرنے کی استعداد رکھتا ہو۔

مغرب میں بسنے والے پاکستانی اہلِ ثروت یقیناً دین، فلاح و رفاہ (Welfare) اور صدقات و خیرات (Charity) کے نام پر دل کھول کر عطیات دیتے ہیں۔ پاکستان میں سیلاب یا زلزلے کی صورت میں کوئی ناگہانی آفت آئے، تو متاثرین کی مدد کے لیے اپنا دل کشادہ رکھتے ہیں اور اپنے خزانوں کی تجوریاں کھول دیتے ہیں۔ لیکن بعض صورتوں میں ان کے بیش بہا عطیات اپنے حقیقی مصارف پر صرف نہیں ہو پاتے ہیں، انہیں دینی ترجیحات کے بارے میں صحیح آگہی اور شعور دینے کی ضرورت ہے تاکہ دین اور انسانیت کے نام پر ان کی جیب سے نکلی ہوئی رُقوم ترجیحی مدات پر صرف ہوں اور نتیجہ خیز ثابت ہوں۔ انہیں یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے دینی و رفاہی خدمات کے شعبے میں دکھاوے کے کلچر کو خیر باد کہنا ہوگا اور انفاق فی سبیل اللہ کے لیے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رضا کو اپنی منزلِ مقصود بنانا ہوگا۔

الحمدللہ علیٰ احسانہٖ میری گزارشات اور ناقدانہ و ناصحانہ گفتگو کو توجہ سے سنا گیا اور علمائے کرام اور مشائخِ عظام سمیت تمام طبقات کے افراد نے دل و جان سے اس کی تحسین کی اور عہد کیا کہ ہم آنے والے سال میں اسے اپنے لیے نشانِ راہ اور عرفانِ منزل سمجھتے

پیوست ہے اور عمل کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، یکسر اور یک دم بدلنا آسان تو نہیں ہے، لیکن ناممکن بھی نہیں ہے۔ لہٰذا ان شاء اللہ العزیز ہم بہتری کی جانب بتدریج پیش رفت ضرور کریں گے اور آپ کو یہ تبدیلی نظر آتی ہوئی محسوس ہوگی۔

برطانیہ میں میرے مشاہدات میں ایک نہایت خوش گوار اضافہ بریڈ فورڈ میں نہایت عظیم الشان صفۃ الاسلام جامع مسجد کا کثیر المقاصد کمپلیکس ہے جو علامہ صاحبزادہ حبیب الرحمٰن محبوبی کی قیادت میں پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے، اس نے دل ونگاہ کو سرور بخشا۔ دعا ہے کہ یہ حسنِ صوری حسنِ معنوی میں منعکس ہو۔

7 ستمبر 2015ء

وزیر اعظم ہاؤس میں اجلاس

7 ستمبر کو وزیرِ اعظم ہاؤس اسلام آباد میں وطنِ عزیز کی اعلیٰ سیاسی ودفاعی قیادت کا دینی مدارس کی پانچ تنظیمات کے قائدین کے ساتھ ایک اہم اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس میں وزیرِ اعظم جناب میاں محمد نواز شریف، مسلّح افواج کے سپہ سالار جناب جنرل راحیل شریف، وزیرِ داخلہ چوہدری نثار علی خان، ڈائرکٹر جنرل آئی ایس آئی جنرل رضوان اختر، وزیرِ مذہبی اُمور سردار محمد یوسف اور وزیرِ تعلیم بلیغ الرحمن کے علاوہ اہم وزارتوں کے اعلیٰ افسران شریک ہوئے۔ دینی مدارس کی تنظیمات کے قائدین کے اسمائے گرامی میڈیا پر آچکے ہیں۔ اندر کا ماحول خوشگوار تھا، باہمی اعتماد اور احترام کی فضا تھی، کوئی تناؤ نہیں تھا اور اگر اس میں طے شدہ اُمور پر لفظاً ومعنیً عمل ہوا تو ان شاء اللہ اس کے یقیناً مُثبت نتائج برآمد ہوں گے۔ لیکن پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے مہربان دوستوں نے اپنی خواہشات کو خبر بنا کر آتش بداماں سرخیاں لگائیں اور بحث مباحثے کی مجالس ٹیلی ویژن اسکرین پر برپا ہوگئیں، پیرزادہ قاسم صدیقی نے کہا ہے:

شہر کرے طلب، اگر تم سے علاجِ تیرگی
صاحبِ اختیار ہو، آگ لگا دیا کرو

سو ہمارے میڈیا کے دوستوں کی مجبوری ہے کہ مسابقت کے اس دور میں جب تک قلم اور زبان سے آگ کے شعلے نہ برسیں رونقِ بزم سجتی نہیں اور گاہک کے ہاتھ سے نکل

''باوثوق ذرائع'' کے عنوان سے اپنے ذہنوں میں جنم لینے والے افکار کو خبر بنانے کا استحقاق اُنہیں حاصل رہتا ہے، بھلے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے، محسن بھوپالی کہہ گئے ہیں:

چاہت میں کیا دنیاداری، عشق میں کیسی مجبوری
لوگوں کا کیا، سمجھانے دو، اُن کی اپنی مجبوری

اجلاس کے بعد وزیرِ داخلہ جناب چوہدری نثار علی خاں کی پریس کانفرنس متوازن تھی، لیکن اگر شروح وحواشی کے ساتھ خبر میں مصالحہ ڈال کر تڑکا نہ لگایا جائے تو بات نہیں بنتی۔ ہمارے ایک مہربان صاحبِ قلم جو گہرائی تک جاتے ہیں اور بینَ السطور کا بھی مطالعہ کرتے ہیں، اُنہوں نے اس اجلاس کو مایوس کُن قرار دیا اور اِسے ریاست کی کمزوری قرار دیا، ریاست کی کمزوری پر الگ سے بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، مگر پھر کبھی۔ میڈیا کے دوستوں نے یہ تاثر دیا کہ گویا چیف آف آرمی اسٹاف اہلِ مدارس کی مُشکیں کسنے اور انہیں بیڑیوں میں جکڑنے کے لیے آئے تھے، غالب نے کہا ہے:

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پر تماشا نہ ہوا

ہماری مُسلح افواج کے سپہ سالار جناب جنرل راحیل شریف ایک مشکل اور پیچیدہ جنگ کی قیادت کررہے ہیں۔ یہ ملک کی سرحدوں کے اندر ریاست سے برسرِ پیکار مفسدین کے خلاف جنگ ہے اور بیک وقت شہروں اور دشوار گزار قبائلی علاقوں میں برپا ہے۔ نریندر سنگھ مودی انتہائی جارحانہ انداز اختیار کیے ہوئے ہیں۔ افغانستان کو تو وہ العیاذ باللہ! پاکستان کی شکست وریخت کے لیے وہ پہلے ہی سے اپنا مرکز بنائے ہوئے تھے۔ لیکن متحدہ عرب امارات میں ہمارے مہربان دوستوں نے اپنی تمام تر روایات کے برعکس مودی کے لیے جلسۂ عام کا اہتمام کیا، جس میں صرف پاکستان کو مُخاطب کیا گیا ہے۔ اِس سے پاکستان کو یہ پیغام دینا مقصود ہے کہ گوادر چائنا اقتصادی شاہراہ اُنہیں کسی طور پر گوارا نہیں ہے۔ دلچسپ

کے لیے سرد جنگ جاری ہے اور یمن میں تو گرم جنگ بھی بپا ہے اور متحدہ عرب امارات سعودی عرب کی "خلیج تعاون کونسل" کا سب سے اہم شراکت دار ہے۔ لیکن اِسے مودی کی جادوگری کہیے کہ بیک وقت اُس کی قربتیں ایران، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے ساتھ قائم ہیں یعنی اپنے مفاد میں اُس نے آگ اور پانی کا ملاپ کر رکھا ہے۔ واضح رہے کہ انڈیا گوادر پورٹ کو غیر موثر بنانے کے لیے ایران کی بندرگاہ چاہ بہار کو ترقی دینے کے لیے اپنے خزانے کی تجوریاں پہلے ہی کھول چکا ہے۔

ان حقائق کے باوجود ہمارے میڈیا کے مہربان کیا یہ چاہتے ہیں کہ ملک کے اندر نئے نئے محاذ کھلیں اور ہماری مسلح افواج چومکھی لڑائی میں پھنس جائیں اور اصل ہدف کو سانس لینے اور اپنی حکمتِ عملی از سرِ نو ترتیب دینے کا موقع مل جائے۔ ہماری رائے میں حب الوطنی کا تقاضا یہ ہے کہ جنگ کے سپہ سالار کو اپنی حکمتِ عملی اور ترجیحات خود طے کرنے کا موقع دیا جائے اور قوم کے تمام تر طبقات اُن کی غیر مشروط حمایت کریں، اُن کی پُشت پر کھڑے ہوں تاکہ پتا چلے کہ یہ قومی جنگ ہے اور قوم پورے عزم کے ساتھ اِسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے یک سو ہے۔ سندھ میں کرپشن کے خلاف کارروائی سے بعض سیاسی عناصر پہلے ہی مضطرب اور سیخ پا ہیں، اس لیے حکمت اور ٹھہراؤ کے ساتھ معاملات سے نمٹنے کی ضرورت ہے۔

میں نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ہمیں طویل تقاریر کی بجائے اصل مسئلے پر گفتگو کرنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ ریاست کو ہم سے کیا چاہیے اور ہم ریاست سے کیا چاہتے ہیں۔ گزشتہ ڈیڑھ عشرے سے تواتر کے ساتھ جو اصطلاحات ہم سنتے چلے آرہے ہیں اور ہمیں اَزبر ہو چکی ہیں، وہ یہ ہیں: فرقہ وارانہ منافرت، فرقہ وارانہ تصادم، عسکریت پسندی، انتہا پسندی اور سابق صدر جناب جنرل پرویز مشرف کے تحائف میں سے آزاد خیالی، روشن خیال اعتدال پسندی شامل ہیں۔ جہاں تک مسالک کی خلافیات کے بارے میں علمی ابحاث کا

ہے، ان کا عوامی اجتماعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دینی لٹریچر قرونِ اُولیٰ سے چلا آرہا ہے اور دنیا کی تمام یونیورسٹیوں اور درس گاہوں میں موجود ہے۔ اس نے ماضی میں کبھی بھی ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے کے لیے مسلح جتھے پیدا نہیں کیے اور نہ ہی مذہب ومسلک کی بنیاد پر قتل وغارت کا بازار گرم رہا ہے۔ یہ رُجحان کب پیدا ہوا، کیوں پیدا ہوا، اس کے قومی اور بین الاقوامی مُحرکات کیا تھے، یہ لوگ کہاں پائے جاتے ہیں، ان کے تکنیکی اور مالیاتی ذرائع کہاں ہیں؟، ان امور کو ریاستی ادارے ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ ریاست ان کے خلاف جو بھی کارروائی کرے گی، ہم ریاست کے ساتھ کھڑے ہوں گے، اُن کے حمایتی نہیں ہوں گے۔

ہم پانچوں تنظیمات کی طرف سے یہ مُتفقہ تحریر دے چکے ہیں کہ اگر ریاستی اداروں کے پاس شواہد ہیں کہ کوئی ادارہ یا مدارس سے متعلق بعض افراد کسی بھی ملک دشمن سرگرمی میں مُلوث ہیں، تو اُن کے خلاف شواہد کی روشنی میں جو بھی کارروائی کی جائے گی، ہم اُن کا کوئی دفاع نہیں کریں گے اور ریاست کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ لیکن حال ہی میں ہمارے اعلیٰ شہرت کے حامل عصری تعلیمی اداروں کے بعض طلبہ کو دہشت گردی کی کارروائیوں میں مُلوث ہونے پر گرفتار کیا گیا ہے اور ایسی بہت سی اور بھی مثالیں ہیں، تو کیا اس کی بنیاد پر اُن اداروں کو دہشت گرد قرار دے دیا جائے گا۔ اب تو مغربی تعلیمی اداروں سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں داعش اور القاعدہ میں آکر شامل ہورہے ہیں اور اُن میں سے بعض یمن، عراق وشام اور وزیرستان میں ڈرون حملوں کا نشانہ بھی بن چکے ہیں۔ سو یہ ایک ذہنی سوچ اور فکری نہاد ہے، جو ذہنوں میں جنم لے رہا ہے اور اس کے مُنجملہ مُحرکات میں ذہن سازوں کی مہارت کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر ناانصافیاں اور جدید آئی ٹی دور میں مظالم کی داستانوں کی سوشل میڈیا پر تشہیر بھی ہے۔

میں نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ الیکٹرونک میڈیا پر مسلکی خلافیات کے بارے میں

تک محدود رہنا چاہیے۔اسی طرح عام اجتماعات میں نفرت انگیز خطابات پر پابندی لگا کر اسے قابلِ تعزیر جرم قرار دیا جائے اور گلی کوچوں و محلوں میں ہر قسم کے جلسوں پر وقت کی پابندی کا اطلاق کیا جائے، ساری ساری رات لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے دور دور تک لوگوں کو پریشان کرنا، نیند سے محروم کرنا، مطالعے میں مصروف طلبہ یا مریضوں کو بے چین کیے رکھنا شرعاً درست نہیں ہے اور اِسے قانون کے دائرے میں لانا ضروری ہے۔لہٰذا ہر مذہبی یا سیاسی جلسے کی اجازت انتہائے وقت کے تعیّن کے ساتھ مشروط ہونی چاہیے۔ہمارے بعض دوستوں کی یہ خواہش ضرور ہے کہ کُشتوں کے پُشتے لگیں، پورے منظر کو تہ وبالا کر دیا جائے۔مگر انہیں احساس ہونا چاہیے کہ ملک کسی انقلابی عمل سے نہیں گزر رہا، داخلی فساد اور مفسدین کے خلاف جنگ اور کرپشن سے تطہیر کی مساعی نظام کے اندر رہ کر ہو رہی ہیں اور نظام کی محدودیت کا ہر ایک کو ادراک ہونا چاہیے، فوجی عدالتوں کے لیے بھی نظام کے اندر گنجائش پیدا کی گئی ہے۔

ہمارے ایک مہربان دوست نے لکھا کہ مدارس کا معاملہ پھر نامعلوم شروعات کی بھول بھلیوں میں دفن کر دیا گیا ہے، حالانکہ ۲۰۱۰ء کا معاہدہ معقول تھا اور اُسی کو آگے بڑھانا چاہیے۔اس سے قطع نظر کہ اُس وقت یہ معاہدہ ہمارے میڈیا کے پرجوش دوستوں کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا، مگر آج اُس کی پسندیدگی پر ہم تہ دل سے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ معاملہ وہیں سے آگے بڑھے گا، جہاں پر رکا تھا، یہ ریاست اور ہم سب کے مفاد میں ہے، باقی امور پر پھر گفتگو ہوگی۔ہمارے ایک مہربان دوست تکرار کے ساتھ یہ کہتے رہتے ہیں کہ اِن چند لوگوں کے ساتھ ہی بات کیوں کی جاتی ہے، گویا "ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں"۔ہمیں اُن کی بھاری جسامت اور وزن کا احساس ہے، لیکن تلخ حقائق کو قبول کرنے ہی میں عافیت ہے۔ملک کا نظام چلانے والے، حساس معاملات پر نظر رکھنے والے اور پاکستان کے دینی مدارس کے غم میں گھلنے والی بیرونی قوتیں خوب جانتی

ہے۔لہٰذا جب بھی سنجیدہ مکالمے کی نوبت آئے گی، انہی ''بے وزن''لوگوں کے ساتھ بات کرنی پڑے گی، یہ اُن کی ترجیح نہیں بلکہ ضرورت ہے۔اور اگر کوئی ہمارے اِن دوستوں کے ساتھ مکالمہ کر کے نظم میں کوئی بہتری لاسکتا ہے تو بصد شوق ایسا کرے، ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

12 ستمبر 2015ء

اندر کی بات

سات ستمبر کے اجلاس میں پاکستان کی اعلیٰ مقتدر شخصیات وزیر اعظم پاکستان، چیف آف آرمی اسٹاف اور وزیر داخلہ کے ساتھ ہماری پہلی ملاقات تھی، دیگر وزرائے کرام کے ساتھ ملاقات کے مواقع پہلے بھی ملتے رہے ہیں۔ میں نے چیف آف آرمی اسٹاف جناب جنرل راحیل شریف کو یومِ دفاع کے موقع پر اُن کے جرأت مندانہ بیان پر دلی مبارک باد پیش کی اور کہا کہ یہ پوری قوم کے دل کی آواز ہے، ایسا لگ رہا تھا کہ پاکستان کا وزیر خارجہ اور وزیر دفاع بول رہا ہے۔ جب انڈیا کے وزیر اعظم نریندر سنگھ مودی اور وزیر خارجہ سشما سوراج کا جواب اُن کے پاکستانی ہم منصب کی طرف سے نہ آئے بلکہ وزیر اطلاعات پرویز رشید لب کشا ہوں تو عوام کو تشنگی سی محسوس ہوتی ہے، کیونکہ بھارت کے ساتھ ہمیشہ تلخ یادیں وابستہ رہی ہیں۔

جناب جنرل راحیل شریف کی یہ ادا پسند آئی کہ وہ بااعتماد دکھائی دیتے ہیں، انداز مدبرانہ ہے اور ضرورت کے مطابق کم سے کم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ایک لطیفہ سنا کر بعض شکایات کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نیچے والے کارکردگی دکھانے کے لیے اوپر والوں کا نام لے کر کارروائی ڈال دیتے ہیں۔ چیف صاحب نے یہ بھی کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں سے علماء کا احترام سیکھا ہے۔ اس لیے میں نے گزشتہ کالم میں لکھا تھا کہ باہمی اعتماد اور باہمی احترام کی فضا میں یہ اجلاس اختتام کو پہنچا۔

خان کے اعتذار کا حوالہ مولانا قاری حنیف جالندھری نے اپنے مضمون میں دیا ہے۔ اس پس منظر کا حوالہ دے کر ہم پر گہری نظر رکھنے والے جناب خورشید ندیم نے لکھا ہے، اس اقتباس سے یقیناً آپ جان گئے ہوں گے کہ میں نے اسے حکومت کے لیے عبرت ناک کیوں کہا۔ اس مضمون سے پہلی ہی نظر میں یہ تاثر ملتا ہے کہ ''ملزم مدارس نہیں، حکومت ہے، وہ معذرت کر رہی ہے اور وضاحت بھی''۔ ہمارے کرم فرما کے ان پیار بھرے کلمات کا اگر مفہومِ مخالف نکالیں تو یہ ہوگا کہ ''مدارس ملزم ہیں''۔ روزنامہ دنیا کے ادارتی صفحات پر میں جناب پرویز رشید کے فرمودات لفظ بہ لفظ نقل کر چکا ہوں اور اب جناب خورشید ندیم سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ ان کلمات کو نقل کر کے ان کی تحسین فرما دیں تاکہ اُن کو تسکین ملے۔ کیونکہ ان میں کسی اِستثنا کے بغیر تمام علماء و مدارس کی دانستہ توہین کی گئی ہے اور شاید ان کی نظر میں ہمیں احتجاج کا حق بھی نہیں ہے، کیونکہ ہم ''ملزم'' ہیں۔

ایک مسئلہ جوابی بیانیہ (Narrative) مرتب کرنے کا تھا۔ یہ خدمت ہم انجام دیں گے اور میں نے جناب جنرل رضوان اختر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اُن کو دکھا دیا جائے گا اور اگر وہ اس میں اپنا حصہ ڈالنا چاہیں، تو اسے بھی مناسب انداز میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ الغرض! ملک و قوم کے مفاد میں ہم مثبت کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ بات قارئین کے ذہن میں رہے کہ یہ بیانیہ اُس بیانیے کے جواب میں ہوگا جو وطنِ عزیز کی سرحدوں کے اندر ریاست سے برسرِ پیکار عناصر کا ہے۔ بیانیے کو آپ کسی کے موقف یا نظریے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، جسے قانون کی زبان میں Locus Standi کہا جاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ بیانیہ انہوں نے باقاعدہ جاری کیا ہے، بلکہ یہ اُن کے طرزِ عمل اور وقتاً فوقتاً جاری کیے جانے والے بیانات سے ظاہر ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر شریعت کے نفاذ کے لیے وہ اللہ کی جانب سے مامور ہیں اور ان کے لیے کسی ریاست، حکومت یا قانون کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ خود شریعت کے شارح ہیں اور اُن کا موقف حتمی قطعی [illegible]

ہو، وہ واجب القتل ہے اور دینی طبقات یا عوام جو حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے نہ ہوں اُن کا بھی یہی حکم ہے۔ اس لیے وہ بچے جوان بوڑھے، مرد اور عورت میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔ باقی تحمل و برداشت یا اس سے ملتے جلتے عنوانات اس کے ذیلی موضوعات ہیں۔ اس رویے کو آج کل عالمی سطح پر عسکریت پسندی اور انتہا پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں جو قتل و غارت اور فساد برپا ہو، اسے دہشت گردی کہا جاتا ہے۔ یہ میں نے اپنی سوچ کے مطابق جوہر کشید کیا ہے۔ کوئی صاحبِ علم یا صاحبِ قلم اسے زیادہ بہتر انداز میں یا بہتر الفاظ میں بیان کرسکتا ہے اور اس میں اضافات بھی کرسکتا ہے۔

میں نے یہ بھی کہا کہ دراصل تمام مکاتب فکر کے مُسلّمہ علماء، جن کی ذات یا موقف کو مسلک کی ترجمانی سمجھا جاتا ہے، مل کر ایک شرعی فتویٰ ترتیب دیں کہ آیا ریاست کی سرحدوں کے اندر ریاست سے برسرِ پیکار عناصر خارجی اور باغی ہیں اور یہ کہ ان کا شرعی حکم کیا ہے؟۔ پچھلے دنوں مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے بیان دیا تھا کہ یمن میں ''حوثی'' قبیلے کے لوگ باغی ہیں اور واجب القتل ہیں۔ اس پر جناب خورشید ندیم نے لکھا تھا کہ ایسا ہی واضح اور دوٹوک حکم پاکستان میں ریاست سے برسرِ پیکار باغیوں کے بارے میں بیان ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر اداروں کے اندر اور باہر بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں ابہام (Confusion) ہے۔ سید منور حسن صاحب کو اینکر پرسن نے جب چاروں طرف سے گھیرا تو انہوں نے منافقت سے گریز کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں اپنے دل کی بات کہہ دی، جس کی وجہ سے وہ چاروں طرف سے ہدفِ ملامت بنے۔ اگر وہ منافقت سے کام لے کر اور لفظی ہیر پھیر کر کے، جسے قرآن نے ''لَیًّا بِاَلْسِنَتِہِم'' سے تعبیر سے کیا ہے۔ اپنے لیے گریز کی راہ نکال لیتے تو اتنی بڑی ملامت سے بچ جاتے۔ لیکن سب کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے نفسِ مسئلہ کی طرف قوم کی توجہ مبذول کرادی۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں اصل مسئلے کا صحیح ادراک کر کے اُسے حل کرنے کی بجائے میڈیا پر بے نتیجہ بلند آہنگ

وزارتِ مذہبی امور اور وزارتِ تعلیم کے ساتھ ورکنگ پیپر تیار کرنے کے لیے جو کمیٹیاں بنائی گئی ہیں، وہ ضروری تھیں۔ کیونکہ مختلف اداروں کی طرف سے جو طرح طرح کے پروفارمے دینی مدارس کو دیے جارہے تھے، ان میں بہت سی چیزیں انتہائی حد تک غیر متعلق اور غیر ضروری تھیں اور یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ یہ کس صاحبِ دانش کے نتیجۂ فکر کا شاہکار ہیں اور کس کے حکم سے جارے ہوئے ہیں۔ ملک میں تعلیمی ادارے تو اور بھی بہت سے قائم ہیں اور وہ حقیقی معنیٰ میں ریاست کے کنٹرول میں نہیں ہیں اور فیسیں بعض صورتوں میں ترقی یافتہ ممالک سے بھی زیادہ ہوں گی۔ لیکن چونکہ آزاد الیکٹرونک میڈیا کے خوش گوار انقلاب کے نتیجے میں ہمارے میڈیا کے خوش نصیب برادران اپر مڈل کلاس کا حصہ بن چکے ہیں اور ان کے بچے سرکاری تعلیمی اداروں میں نہیں بلکہ اِن جدید اعلیٰ اداروں میں تعلیم حاصل کررہے ہیں، اس لیے اُن سے انہیں کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے۔ لٰہذا یہ بات بآسانی ریاستی ذمے داران کی سمجھ میں آگئی کہ رجسٹریشن فارم اور ڈیٹا فارم دو الگ چیزیں ہیں۔ ڈیٹا پر ہمیشہ نظرِ ثانی کی ضرورت رہتی ہے اور اپ ٹو ڈیٹ ہوتا رہتا ہے۔ میں نے خود اپنے ادارے میں طلبہ، اساتذہ اور ملازمین کی تفصیلات پر مشتمل ڈیٹا کمپیوٹرائزڈ کر رکھا ہے اور اس پر ہر ماہ کی ابتدا میں نظرِ ثانی کی جاتی ہے، اس پر ہمارے دوستوں کی ناراضی بلا سبب ہے، حکمرانوں کو کوسنے کے لیے اور موضوعات بہت ہیں۔

جہاں تک پاکستان مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کا تعلق ہے، یہ محترم ڈاکٹر محمود غازی مرحوم کے نتیجۂ فکر کی پیداوار ہے اور انہوں نے ابتدا ہی میں کہہ دیا تھا کہ اس کو مدارس پر مسلط نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ ہم اپنے ماڈل ادارے قائم کریں گے اور جو مدارس رضا کارانہ طور پر اس سے الحاق کرنا چاہیں، اُن کے لیے آپشن کھلا رہے گا۔ لیکن کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ ابتدا سے لے کر آج تک اِن پر سرکاری خزانے سے کتنی رقم خرچ ہوئی اور اِنہوں نے قوم کو صلے میں کیا دیا، لیکن ساری تان آکر مدارس پر ٹوٹتی ہے، اس ناراضی کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں

پرویز مشرف کی صدارت میں منعقد ہونے والے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں واضح طور پر کہا تھا کہ پاکستان مدرسہ ایجوکیشن بورڈ ناکام ہو چکا ہے اور اس کا جاری رکھنا حکومتی پیسے کا ضیاع ہے، لہٰذا اسے بند کر دینا چاہیے۔ لیکن چونکہ سرکار کے تحت ایک بار جو حکومتی ادارہ قائم ہو جائے، وہ جاری و ساری رہتا ہے اور اس سے کچھ اور حاصل ہو یا نہ ہو۔ حکومتِ وقت کے چند پسندیدہ لوگوں کو روزگار ضرور مل جاتا ہے۔ سابق صدر جناب جنرل ضیاء الحق کی ہر علامت پیپلز پارٹی کو ہمیشہ ناپسند رہی ہے اور اسے ''ضیاء کی باقیات'' کے عنوان سے سیاسی گالی بنا دیا گیا ہے۔ لیکن اُن کا قائم کردہ نظامِ زکوٰۃ بہر حال ہر حاکم کو پسند ہے، یہاں تک کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے پہلے دورِ حکومت میں اِسے مرکزی زکوٰۃ کاؤنسل کی تشکیل سے ماورا رکھ کر مالیاتی بل کا حصہ بنا دیا تھا تاکہ اُس کے خرچ پر قواعد و ضوابط کی کوئی روک ٹوک نہ ہو۔

14 ستمبر 2015ء

بزَن

بزن فارسی لفظ ہے، اس کا معنیٰ ہے: ''مار دو، گردن اڑا دو''۔ ہمارے آزاد الیکٹرونک میڈیا کے بعض مہربان دوست اور بعض دیگر لبرل کرم فرما ''مولوی'' نامی مخلوق سے بہت حساس(Allergic) ہیں۔ان کے نزدیک ہر خرابی کا سبب یہی طبقہ ہے۔ان کے بس میں ہوتو چشم زدن میں اڑا کر رکھ دیں تاکہ ہر برائی سے معاشرے کی تطہیر ہو جائے۔ ہمارے تعلیمی اور ریاستی نظم ونسق کے ادارے کارآمد نہیں رہے، کرپشن کا ناسور ہماری جڑوں میں سرایت کر چکا ہے، دہشت گردی اور فساد ہمیں اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے، ان سب معاشرتی امراض کا سبب مولوی یا مذہبی طبقہ ہے۔اپنے سوا ہر ایک سے ناراض بعض میڈیا کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ مولوی سرمائے داروں، چوربازاری کرنے والوں، ذخیرہ اندوزی کرکے مہنگائی کا طوفان برپا کرنے والوں، نظامِ عدل کی تباہی وبربادی کے ذمے داروں، بے رحم حکمرانوں، الغرض! پورے استحصالی نظام کے ایجنٹ ہیں اور اس کے مستفیدین (Benificiaries) میں سے ہیں۔ اس لیے یہ ان طبقات کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے۔یہ یک طرفہ الزام ہے جو خدا خوفی سے عاری ہو کر لگایا جاتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ائمہ وخطباء اِن معاشرتی مفاسد اور خرابیوں پر اپنے دروس اور خطابات میں بات کیوں نہیں کرتے؟۔سوال یہ ہے کہ جن ممالک میں مذہب ریاست کے کنٹرول میں ہے، کیا وہاں کوئی امام وخطیب نظام کی خرابیوں پر براہِ راست تنقید کرسکتا ہے

کرے گا تو آئندہ اس منصب پر نہیں رہے گا یا زنداں خانے پہنچ جائے گا اور اگر زیادہ خطرناک ہوا تو زمین کو اس کے وجود سے پاک کر دیا جائے گا۔ مصر و شام اور عراق و ایران کی ماضی کی تاریخ اس کی شاہدِ عدل ہے۔ ہمارے ہاں بھی مساجد کی انتظامیہ پر بالعموم سردار، چوہدری، وڈیرے، ایک نئی مذہبی فیوڈل کلاس یعنی دین کی ہر پابندی سے آزاد مزاراتِ اولیاء کے سجادہ نشین اور بااثر طبقات مسلط ہیں۔ لہٰذا انہیں براہ راست چھیڑنا آسان نہیں ہے، عمومی اور اجمالی انداز میں بات کرنا الگ بات ہے۔ جس الزام کا کوئی ہدف نہ ہو اس سے بچ نکلنا آسان ہوتا ہے۔ ہمارا قومی مزاج یہ ہے کہ ہر شخص اور ہر طبقہ اپنے آپ کو مستثنیٰ کر کے دوسروں کو ہر معاشرتی و اخلاقی خرابی کا ذمے دار قرار دیتا ہے، یہ ایک حقیقت ہے۔

اگر کوئی زانی یا شرابی یا ہیروئن کا نشے باز ہے، قحبہ گری یا جوئے کا اڈا چلا رہا ہے اور کوئی خطیب یہ کہے کہ ہمارے محلے میں زنا، شراب، ہیروئن اور جوئے جیسی خرابیاں فروغ پا رہی ہیں اور ان کے اڈے قائم ہیں، تو جو لوگ ان میں ملوث ہیں وہ کاٹ کھانے کو دوڑیں گے اور کہیں گے کہ مولوی کو کسی کی نجی زندگی میں جھانکنے کی کیا ضرورت ہے؟، یہی حال کرپشن کو زیرِ بحث لانے کا ہے۔ اگرچہ اسلام پردہ پوشی کی تعلیم دیتا ہے، کسی کا راز افشا کرنے اور اسے رسوا کرنے کو ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ اس کے بارے میں احادیثِ مبارکہ میں تعلیمات موجود ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

”اے لوگو! جو اپنی زبان سے ایمان لائے ہو اور (ابھی) ایمان تمہارے دل میں داخل نہیں ہوا، تم مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اور ان کی پردہ دری نہ کرو، سو جو اپنے مسلمان بھائیوں کی پردہ دری کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کا پردہ فاش فرمادے گا اور اسے اس کے گھر میں رسوا کرے گا“۔ (سنن ابی داؤد: 4882)

ہمارے فقہائے کرام نے اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں کہا ہے کہ اگر کسی کی

ذریعے اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔لیکن جب کسی کی معاشرتی یا اخلاقی خرابی پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے اور پورا ماحول اخلاقی خرابیوں سے آلودہ ہونے لگے تو پھر اس کی نشاندہی اور ازالہ از حد ضروری ہے۔ایسی ہی صورت حال کے بارے میں کہا گیا ہے: "ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے"۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اللہ تعالیٰ علانیہ بری بات (کی تشہیر) کو پسند نہیں فرماتا، مگر مظلوم کو (داد رسی کے لیے) اس کی اجازت ہے"۔(النساء:148)

ظالم کی زیادتیوں کے خلاف حاکم یا عدالت یا ایسے اور افراد کے سامنے ایک مظلوم کو فریاد کرنے کی دین اجازت دیتا ہے تاکہ اسے انصاف ملے اور ظالم کو اُس کے کیے کی سزا ملے۔سو پورے معاشرے کو اَخلاقی اور معاشرتی خرابیوں سے بچانا اس کے مقابلے میں کئی درجے زیادہ اہم ہے۔کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہمارے معاشرے میں دولت و ثروت ہی تکریم و احترام کا معیار ہے، اس سے کسی کو غرض نہیں کہ دولت حاصل کرنے کے ذرائع حلال ہیں یا حرام؟۔جب زانی اور شرابی اپنے بارے میں شرعی حکم ماننا تو درکنار، سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔تو کرپٹ کیسے خوش دلی سے آمادہ ہوگا۔میڈیا کے دوست شیشے کے گھر میں ہوتے ہیں، اُن میں سے بعض بلٹ پروف گاڑیوں میں چل رہے ہوتے ہیں، مولوی تو چوراہے کے بیچ کھڑا ہے۔

میری گزارشات کا مُدّعٰی یہ ہے کہ مولوی بھی اسی معاشرے کا فرد ہے، اس کا خمیر بھی اسی معاشرے سے اُٹھا ہے، جو بشری اور انسانی کمزوریاں معاشرے کے عام افراد میں ہوتی ہیں، مولوی اس سے مبرا نہیں ہوتا۔عام معاشرے میں جو اچھے اور بُرے افراد کا تناسب ہے، توقع کی جاتی ہے کہ دینی تعلیم و تربیت کی وجہ سے یہ تناسب علمائے دین اور خدامِ دین میں بہتر ہو اور ہونا بھی چاہیے۔معاشرہ بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ علماء اخلاق و کردار کا بہتر معیار پیش کریں۔اسی لیے معاشرہ دینی مدارس اور مساجد کو چلانے کا

پروپیگنڈے کے باوجود وہ دین اور اہلِ دین کے ساتھ کھڑا ہے اور یہی وجہ ہے کہ الحمدللہ علیٰ احسانہٖ ہمارے خطے میں دینی اقدار اور دینی شعائر کا التزام اور احترام دوسرے ممالک کے مقابلے میں کافی بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے مزید بہتر بنائے اور دینی طبقات کے بارے میں عام مسلمانوں کی جو توقعات اور حسنِ ظن ہے، انہیں اِن پر پورا اترنے کی سعادت وتوفیق عطا فرمائے۔ یہ بھی گزارش ہے کہ چند افراد کی خرابیوں کی وجہ سے پورے طبقے کو ہدفِ طعن بنانا درست نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے دیگر عافیت پسند طبقات کی طرح مولوی نے بھی اپنے لیے عافیت کا راستہ تلاش کرلیا ہے۔ ایک طبقہ رسالت ونبوت اور ولایت و امامت کے فضائل بیان کر کے عوام کو روحانی سکون پہنچاتا ہے اور دوسرا توحید سے شروع کر کے اپنی بات کو شرک و بدعت پر ختم کر دیتا ہے، اس طرح اپنی دانست میں وہ اپنی ذمے داریوں سے سُبکدوش ہوجاتے ہیں۔ اسلام دینِ کامل ہے، اسلام ایک جامع تصورِ حیات کا نام ہے اور اسے بالاجزاء (by parts) قبول کرنے یا Pick & Choose کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(1) ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ اور شیطان کے نقش وقدم پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔ (بقرہ:208)

(2) ''بے شک وہ لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان (ایمان لانے میں) فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کیا اور چاہتے ہیں کہ ایمانِ (کامل) اور کفر کے درمیان کوئی (بیچ کا) راستہ اختیار کریں''۔ (النساء:150)، یعنی یہ روش دین میں قابلِ قبول نہیں ہے۔

پچھلے دنوں ہمارے ایک لبرل مذہبی مفکر علامہ جاوید احمد غامدی نے یہ راہ دکھائی ہے کہ اجتہاد عوام کے منتخب نمائندوں یا پارلیمنٹ کا کام ہے اور انہی کی تعبیر وتشریح حتمی قرار پائے

اپنے خیر وشر اور نفع ونقصان یعنی What is for & What is against کو طے کرنے کا خود مجاز ہے اور جو فیصلہ وہ اپنی اجتماعی دانش (Collective Wisdom) سے کرے، وہی درست ہے، اسی کو ہماری فقہ میں مَالَهٗ وَمَا عَلَيهَا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علماء اور لبرل مفکرین کے درمیان یہی بنیادی فکری اور اصولی اختلاف ہے۔ علماء قرآن وسنّت کے ساتھ غیر مشروط وابستگی اور تمسّك بِالْكِتَاب وَالسُّنّه کو لازمی قرار دیتے ہیں اور انسان کی اجتماعی دانش کو خطا اور لغزش سے مبرّا اور معصوم قرار نہیں دیتے، بلکہ قرآن وسنّت ہی انسانی دانش کی اِصابت (Righteousness) اور خطا (Wrongness) کو جانچنے کے لیے معیار اور کسوٹی ہے۔

امام مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہارے درمیان دو اہم چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں، جب تک تم ان کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ رہو گے، ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اس کے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت''۔

(مؤطا امام مالک:3338)

19 ستمبر 2015ء

سانحۂ پشاور اور حکمتِ مستور

جب سے پاکستان دشمن، اسلام دشمن اور انسانیت کُش دہشت گردوں کے خلاف آپریشن ضربِ عضب میں پاک فضائیہ نے براہِ راست حصہ لینا شروع کیا ہے، ہدَفی (Targetted) بمباری کے ذریعے دشمن کے اسلحے کے ذخائر اور تزویری مراکز کو تباہ کیا ہے اور انتہائی اہم مطلوبہ دہشت گردوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا ہے، یہاں تک کہ اُن کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے اور پاکستان ایئر فورس کی فضائی کارروائیوں نے پاکستان آرمی کی زمینی گرفت اور پیش رفت کو انتہائی موثر دفاعی مدد فراہم کی ہے، اُس وقت سے مجھے یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ دہشت گرد اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے پاک فضائیہ کے خلاف ضرور کوئی نہ کوئی دہشت گردانہ حملہ کریں گے۔ اور آخر کار گزشتہ جمعۃ المبارک ۱۸ ستمبر کو علی الصباح پشاور ایئر بیس پر یہ ناپاک حملہ کر دیا گیا۔ اِس میں ۲۹ سویلین اور فوجی افراد شہید ہوئے، جن میں کیپٹن اسفندیار بخاری شہید بھی شامل ہیں، اِن کے علاوہ مُتعدد افراد زخمی ہوئے۔ ہماری سیکورٹی کے اداروں نے غیر معمولی مُستعدی اور چوکسی کا ثبوت دیا اور بادیُ النظر میں ہماری دفاعی تنصیبات محفوظ رہیں۔ جانی نقصان بلاشبہ ناقابلِ تلافی ہے۔ اللہ تعالیٰ شُہداے وطن کے درجات بلند فرمائے، زخمیوں کو جلد صحت وشفا عطا فرمائے اور اُن کے تمام پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

حسبِ معمول ہمارے مُسلح افواج کے سربراہ جنابِ جنرل راحیل شریف، ایر چیف

جنازوں تک وہاں موجود رہے، اِسی طرح وزیرِ اعظم جناب محمد نواز شریف، خیبر پختونخوا کے گورنر اور وزیرِ اعلیٰ، وزیرِ دفاع اور دیگر سیاسی قیادت بھی موجود تھی۔ اِس سے دشمن کو یہ پیغام ملا کہ ضربِ عضب کو پوری قوم کی حمایت حاصل ہے، ملک کو دہشت گردی سے نجات دینے کے لیے ہماری اعلیٰ سیاسی اور فوجی قیادت مُتحد ہے، یک سُو ہے اور یک جان ہے۔ حادثات وسانحات ہمیں مُتزلزل نہیں کر سکتے اور نہ ہی ہمارے عزم کو کمزور کر سکتے ہیں۔

اگرچہ ضربِ عضب میں ہمیں خاطر خواہ کامیابیاں مل رہی ہیں، لیکن اِس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ دشمن پوری طرح نیست ونابود ہو چکا ہے۔ بلکہ اِس صورتِ حال سے مایوس ہو کر وہ کہیں بھی اور کوئی بھی کارروائی کر سکتا ہے اور ہمیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ دہشت گردی کی جنگ اور گوریلا جنگ میں پہل (Initiative) کا موقع دہشت گردوں کے پاس ہوتا ہے، وہ وقت اور موقع ومحل کا انتخاب خود کرتے ہیں، اس کے لیے ٹرانسپورٹیشن، افراد اور تباہ کُن اسلحے کی سپلائی، کمین گاہ اور روٹ کا انتخاب کرتے ہیں، کئی دن تک ریکی کرتے ہیں اور ایک دن اچانک حملہ ہو جاتا ہے۔ جنگ روایتی ہو، آمنے سامنے ہو یا گوریلا، اِس میں پہل کرنے والے کو کسی نہ کسی حد تک Advantage اور Edge حاصل ہوتا ہے، اِس کو آپ وقتی یا عارضی برتری سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ برتری حکمتِ عملی کے اعتبار سے ہوتی ہے، اِسی لیے انگریزی کا مقولہ ہے:

"Offence is the best defence."

یعنی "جارحیت یا اِقدام بہترین دفاع ہے"۔ اس کے باوجود سانحۂ پشاور میں ہماری مُسلح افواج اور خاص طور پر سریع العمل دستے یعنی Quick response brigade کا فوری جوابی اِقدام جنگی مہارت اور حربی حکمتِ عملی کے اعتبار سے قابلِ افتخار تھا اور وہ پوری قوم کی طرف سے تحسین کے مُستحق ہیں۔ اِسی طرح موقع پر موجود ہمارے دفاعی محافظوں کا جان پر کھیل کر دشمن کو ہدف تک پہنچنے سے روکنا غیر معمولی کارنامہ ہے۔ دہشت گردوں کا مارا جانا

پہلے مارا جانا یہ اصل کارنامہ ہے۔

اِن سانحات سے ہمیں بحیثیتِ قوم سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور اِس میں ہمارے لیے ایک مستور حکمت اور درسِ عبرت موجود ہے۔ برطانوی اِستعمار کے زمانے میں فوجی تنصیبات اور فوجی چھاؤنیوں کو شہروں اور بستیوں سے دور رکھا جاتا تھا، اِس میں کئی فوائد تھے۔ ایک یہ کہ جنگ کی صورت میں شہری آبادی کم متاثر ہو، پوری آبادی میں دہشت (Panic) نہ پھیلے اور دوسرا یہ کہ مُسلّح افواج کے افراد عام آبادی سے دور رہیں تاکہ وہ اخلاقی وسماجی برائیوں اور بشری کمزوریوں سے بچے رہیں۔ لیکن آزادی کے بعد شہر اور آبادیاں دور دور تک پھیل گئیں، فوجی چھاؤنیوں یعنی Contonments کے علاقے آبادی کے درمیان آگئے، وہاں فوجیوں کی رہائشی کالونیاں بن گئیں اور بعد میں پرائیویٹ اہلِ ثروت کے لیے وہ محفوظ اور اعلیٰ سطح کی سوسائٹیاں بن گئیں۔ اب ہمیں ایک طویل المدت حکمتِ عملی کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ فوجی چھاؤنیوں اور تمام فوجی تنصیبات کو بتدریج شہری آبادی سے باہر منتقل کیا جائے اور اِس مقصد کے لیے جگہ جگہ مُدُنِ دفاع (Defence Cities) بنائے جائیں، جن میں فوجی جوانوں اور افسران کی حسبِ مرتبہ رہائش گاہوں، تعلیمی اداروں، ہسپتالوں، پارکوں اور مارکیٹوں کے علاقے الگ ہوں اور اُن سے مُعتَد بہ فاصلے پر دفاعی تنصیبات ہوں اور اُس طرف شہروں، قصبات اور آبادیوں کا پھیلاؤ ممنوع قرار دیا جائے اور اُن کے بیرونی راستے کھلے ہوں، وہاں ٹریفک کا غیر معمولی دباؤ نہ ہو، غیر مُتعلقہ اور ناقابلِ شناخت لوگ اُن کے قریب بھی نہ جاسکیں، داخلی سلامتی اور بیرونی جارحیت سے دفاع کے وقت افواج اور سامانِ حرب کی نقل وحمل میں رکاوٹ نہ ہو۔

اگر کرپشن کو اس نظم میں حرامِ قطعی اور عبرت ناک سزاؤں کا موجب قرار دیا جائے، تو شہروں کے اندر دفاعی علاقوں کو چھوٹے چھوٹے پلاٹ بنا کر مارکیٹ ریٹ پر فروخت

اس کا دباؤ قابلِ برداشت ہوسکتا ہے۔ ماضی میں راولپنڈی جی ایچ کیو، آرمی ہاؤس اور دیگر حساس عمارات کو آبادیوں سے باہر منتقل کرنے کا پروگرام بنایا جاچکا تھا، مگر چونکہ اِس کی Feasibility Stretagy یعنی اقتصادی لحاظ سے قابلِ عمل ہونے کی حکمتِ عملی تیار نہیں تھی اور نہ ہی کوئی شفاف طریقۂ کار طے کیا گیا تھا تاکہ یہ عمل وسائل کے اندر رہتے ہوئے بتدریج انجام پائے اور اس پر پوری قوم کا اعتماد بھی ہو۔ اعلیٰ فوجی افسران، دیانت واہلیت اور اچھی انتظامی شہرت کے حامل سول افسران، دیانت دار آئینی وقانونی ماہرین اور پارلیمانی رہنماؤں پر مشتمل ایک گورننگ بورڈ تشکیل دیا جائے اور اُن پر یہ پابندی ہو کہ وہ خود، اُن کے دور اور قریب کے رشتے دار، اُن کے کاروباری شراکت دار واحباب اور بے نامی فرنٹ مین اس سے کسی بھی طور پر مُستفید نہیں ہوسکیں گے۔ شاید ہم بحیثیتِ قوم دنیا کے سامنے ایک اچھی مثال قائم کرسکیں۔

میری مزید گزارش یہ بھی ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو ہرگز مختصر المیعاد (Short Term) نہ سمجھا جائے، یہ طویل المدت (Long Term) جنگ ہے۔ اِس کی ابتدا کا تو تعیّن ہوسکتا ہے، انتہا ہماری ملی وحدت، دفاعی وسیاسی اعلیٰ قیادت کے سیاسی عزم (Political Will) پر منحصر ہے۔ انجام کا تعیّن تو اِس دور کی واحد مادی سپر پاور امریکا بھی نہیں کرسکا، ہم جیسے ترقی یافتہ ممالک کیسے کرپائیں گے؟۔ اگرچہ جدید ترین سامانِ حرب، اقتصادی قوت، انتہائی حساس سپروار ٹیکنالوجی، سیٹلائٹ کمیونی کیشن اور دیگر ذرائع کے اعتبار سے امریکا اور اُس کے اتحادیوں کو بلاشبہ تفوّق (Edge) حاصل ہے۔ لیکن جذبۂ ایثار وقربانی، اللہ کی راہ میں شوقِ شہادت اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میدانِ جنگ میں اترنے کے اعتبار سے یقیناً پاکستان اور مسلمانوں کو برتری حاصل ہے، انگریزی کا مقولہ ہے:

"*Its not guns, but men behind the guns*"

یعنی اسلحے کی طاقت مُسلّم مگر اسلحہ چلانے والے [illegible]

بھی کوئی بدل نہیں ہے۔

دہشت گردی کے خلاف ہماری جنگ کے طویل المدت ہونے کے اسباب میں ہمارا تزویراتی وجغرافیائی محلِ وقوع، ہندوستان کی دشمنی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، کابل میں غیر مستحکم حکومت اور بوجوہ اسلام آباد اور کابل میں باہمی اعتماد کا فقدان، ترجیحات میں تفاوت، ایران کے مڈل ایسٹ اور افغانستان میں مفادات، متحدہ عرب امارات کے گوادر پورٹ اور پاک چائنا اقتصادی شاہراہ کے فعال ہونے پر تحفظات اور ناگواری اور امریکا سمیت عالمی قوتوں کی ریشہ دوانیاں اور انٹیلی جنس نیٹ ورک شامل ہیں۔ مزید یہ کہ سابق صدر جناب جنرل پرویز مُشرف پاکستان کے قومی مفادات کا گہرائی اور گیرائی سے جائزہ لیے اور کوئی تحریری میثاق کیے بغیر امریکا کے آگے خود سپردگی (Total submission) کا فیصلہ ہے اور اس کے نتائج پاکستان کو طویل عرصے تک بھگتنے ہوں گے اور اُن کے بوئے ہوئے کانٹے چننے ہوں گے۔ اس وقت ہماری خوش قسمتی ہے کہ چیف آف آرمی اسٹاف جناب جنرل راحیل شریف کی صورت میں ایک محبِ وطن، پُرعزم، یک سُو اور بہادر دفاعی قیادت موجود ہے۔ مگر ایسی قیادت یا اس جیسی صاحبِ عزیمت وبصیرت قیادت کا تسلسل درکار ہے اور اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ پردۂ غیب میں کیا مستور ہے اور جن کے پاس فیصلوں کا اختیار ہے، اُن کے دل ودماغ میں کیا ہے؟۔

سو مستقبل اور غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور دعا ہے کہ اپنے حبیب مکرم ﷺ کے طفیل وہ پاکستان اور اہلِ پاکستان کے لیے بالخصوص اور اُمّتِ مسلمہ کے لیے بالعموم خیر مُقدر فرمائے، پاکستان کو تا اَبد تحفظ وسلامتی اور استحکام ودوام عطا فرمائے، ہماری انفرادی اور اجتماعی تقصیرات کو معاف فرمائے اور ہماری سیاسی قیادت کو بصیرت ودانش، عزیمت واستقامت اور دور اندیشی کی سعادت اور اہلیت وصلاحیت نصیب فرمائے۔

21 ستمبر 2015ء

حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت آدم اور حضرت نوح علیہ السلام کے بعد تمام الہامی مذاہب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت مرکز الملل اور نقطۂ اتصال ہے۔ تمام شاخیں آپ ہی کی ذات سے پھوٹتی ہیں اور تمام نسبتیں آپ پر جا کر یکجا ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں بیک وقت یہود ونصاریٰ، مشرکینِ مکہ اور دینِ حق اسلام کے علم بردار اپنے آپ کو آپ کی ذات کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اِسی سبب اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہود ونصاریٰ اور مشرکینِ مکہ کی خوش فہمی یا خود فریبی کی نفی کی اور فرمایا: ''ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی، بلکہ وہ ہر باطل نظریے سے الگ رہنے والے (خالص) مسلمان تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے''۔ (آل عمران:67)

قرآن کے اِس واضح بیان کے باوجود مشرکینِ مکہ اور اہلِ کتاب اپنے آپ کو دینِ ابراہیم کا علم بردار قرار دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''بے شک تمام لوگوں میں ابراہیم علیہ السلام سے (نسبت کے) سب سے زیادہ حقدار وہی لوگ تھے، جنہوں نے اُن کی اتباع کی اور یہ نبی (محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور جو اِن پر ایمان لائے''۔ (آل عمران:68)

اِس سے معلوم ہوا کہ کسی بات کا اِدّعاء (Claim) الگ چیز ہے اور دعوے کی حقانیت الگ چیز ہے، چنانچہ فرمایا: ''اور اہلِ کتاب (یہود) نے کہا: یہودی ہو جاؤ (اور نصاریٰ نے) کہا: نصرانی ہو جاؤ، تم ہدایت پاؤ گے، آپ کہیے! بلکہ ہم ابراہیم کی ملّت پر ہیں جو باطل سے اعراض کر کے [illegible] تھا اور وہ مشرک [illegible] تھے''۔ (البقرۃ:135)

الغرض ابراہیم علیہ السلام مرکزِ الملل ہیں اور اپنے بعد آنے والے تمام انبیاء کرام کے لیے نقطۂ اتصال (Centre Point) ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام دینِ حق اسلام کے علم بردار تھے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''آپ کہیے! بے شک میرے رب نے مجھے صراط مستقیم کی ہدایت فرمائی ہے، مستحکم دین، ملت ابراہیمی (اور) ہر باطل سے اجتناب کرنے والے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔ آپ کہیے! بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے، اس کو کوئی شریک نہیں ہے اور مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں''۔ (الانعام:161.162)

الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے آپ کو ملتِ ابراہیم کی پیروکار قرار دیتے ہیں اور قرآن یہ شہادت دیتا ہے: بے شک ابراہیم (اپنی ذات میں) ایک اُمت تھے، اللہ کے اطاعت گزار، ہر باطل سے اجتناب کرنے والے اور مشرکوں میں سے نہ تھے، اس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، (اللہ نے) ان کو منتخب کیا اور ان کو سیدھے راستے کی ہدایت فرمائی اور ہم نے ان کو دنیا میں بھلائی عطا فرمائی اور وہ آخرت میں بھی نیکو کاروں میں سے ہوں گے۔ پھر ہم نے (اے رسول!) آپ کی طرف یہ وحی کی کہ آپ ملتِ ابراہیم کی پیروی کریں جو ہر باطل سے دور تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے''۔ (النحل:120-123)

ملتِ ابراہیمی کی اساس توحید پر تھی، ان کے لیے اللہ کی احدیّت اور اس کی قدرت میں شرک کی کوئی صورت گوارا نہ تھی اور اسی توحید کی سربلندی کے لیے انہوں نے راہِ حق میں عزیمت و استقامت کی ایک مثالی اور لازوال جدوجہد کی۔ اُن کے عہد کا نمرود اپنی خدائی کا دعویٰ کر رہا تھا اور لوگوں کو اپنی بندگی کی طرف بلا رہا تھا، ابراہیم علیہ السلام ان کے آگے سدِّ راہ بن گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اور (اے نبی مکرم!) انہیں ابراہیم کی خبر بتا دیجیے، جب انہوں نے اپنے (عرفی) باپ اور قوم سے کہا (یہ تم) کس کی عبادت کیے جا رہے ہو، انہوں نے

ابراہیم نے کہا: جب تم انہیں پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری فریاد سنتے ہیں یا وہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں"۔(الشعراء:73-69)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "اور (اے رسول)! آپ اس کتاب میں ابراہم کا ذکر کیجیے، بے شک وہ بہت سچے نبی تھے، جب انہوں نے اپنے (عرفی) باپ سے کہا: اے میرے باپ! آپ اُس (معبود) کی عبادت کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے اور نہ آپ کے کسی کام آسکتا ہے، اے میرے باپ! بے شک میرے پاس ایسا (یقینی) علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، آپ میری پیروی کیجیے، میں آپ کو سیدھی راہ پر چلاؤں گا، اے میرے باپ! آپ شیطان کی پیروی نہ کریں، بے شک شیطان (اللہ) رحمان کا نافرمان ہے"۔(مریم:44-41)

نمرود صرف علامتی خدائی کا دعویدار نہیں تھا بلکہ وہ خدائی اختیار و اقتدار کا دعوے دار تھا۔ چنانچہ قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان ایک مناظرے کا حال بیان کیا ہے، ارشاد ہوا: "(اے رسول!) کیا آپ نے اس شخص (نمرود) کو نہیں دیکھا، جس نے ابراہیم (علیہ السلام) سے ان کے رب کے بارے میں (مناظرانہ) حجت بازی کی، (ابراہیم علیہ السلام کا دعویٰ تھا) کہ اسے بادشاہت اللہ نے عطا کی ہے (اور وہ اس سے انکاری تھا)، جب ابراہیم نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، اس نے کہا: میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، ابراہیم نے کہا: بے شک اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، (اگر تو خدا ہے) تو اس کو مغرب سے نکال لا، تو (اس پر) وہ کافر لاجواب ہو گیا"۔(بقرہ:158)

ابراہیم علیہ السلام کے اس مناظرے سے پتا چلتا ہے کہ نمرود اُلوہی اقتدار و اختیار کا دعوے دار تھا اور ابراہیم علیہ السلام اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی اور ذات کے لیے اس حیثیت کو تسلیم کرنے پر کسی بھی صورت میں تیار نہیں تھے۔ ظاہر ہے حق و باطل میں مفاہمت کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں ہے، علامہ اقبال نے کہا ہے:

آج ہم باطل سے کسی نہ کسی درجے میں مفاہمت (Compromise) کے دور سے گزر رہے ہیں، اس لیے توحیدِ خالص جو روحانی اور ایمانی قوت عطا کرتی ہے اور جس کے نتیجے میں انسان پیکرِ عزیمت و استقامت بن جاتا ہے، فتح و شکست کے دنیاوی معیارات سے ماورا ہو جاتا ہے اور صرف معبودِ مطلق کی رضا کے لیے اپنی ساری متاعِ حیات و کائنات کو قربان کرنے میں اپنی نجات، بقا اور فلاح سمجھتا ہے، ہم توحید کی اس رُوح سے محروم ہیں۔ اسی ایمانی قوت کے حاملین کے لیے اللہ کی نصرت نازل ہوتی ہے، علامہ اقبال نے کہا تھا:

فضائے بدر پیدا کر، فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اور اگر کلمۂ توحید اور عقیدۂ توحید صرف زبان و بیان تک محدود رہتا ہے، قلب و رُوح میں پیوست ہو کر کردار میں ڈھل نہیں جاتا، تو اس کی بابت علامہ اقبال نے کہا:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟، فقط اِک مسئلۂ علمِ کلام

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اہلِ اسلام کی تعداد روئے زمین پر کم و بیش ڈیڑھ ارب بتائی جاتی ہے، لیکن بے توقیر ہیں، مقامِ افتخار پر فائز نہیں ہیں، اُن کی بات میں وزن نہیں ہے، ان کی کوئی ساکھ اور اعتبار نہیں ہے۔ قرآن نے حضرت ابراہم علیہ السلام کی شخصیت کو جو ''اُمتِ قانت'' کہا ہے، تو اس لیے کہ وہ عقیدۂ توحید کا کامل مظہر بنے اور تنہا باطل سے ٹکرائے اور پرچمِ توحید کو سربلند کرنے کی راہ میں مصلحت اور نفع و نقصان کی تخمینوں کو حائل نہیں ہونے دیا۔ علامہ اقبال نے کہا:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

آپ نے تعمیر کعبہ کے بعد چند دعائیں کیں جو آج مجسم تعبیر کی صورت میں دنیا کے سامنے موجود ہیں۔ اللہ کے حکم سے حج کا اعلان کرنے کے بعد آپ نے دعا کی: ''اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی بعض اولاد کو تیرے حرمت والے گھر کے نزدیک (تیرے حکم کے مطابق) بے آب و گیاہ وادی میں ٹھہرا دیا ہے، اے ہمارے پروردگار! (انہیں توفیق عطا فرمانا) کہ یہ نماز قائم کریں، لوگوں میں سے بعض کے دلوں کو اِن کی طرف مائل کر دینا اور انہیں پھلوں سے روزی عطا کرنا تاکہ وہ (تیرا) شکر ادا کریں''۔ (ابراہیم:37)

آپ نے تعمیر کعبہ کے بعد اہلِ مکہ کے درمیان ایک رسولِ عظیم کی بعثت کی دعا کی جس نے طویل عرصے کے بعد رحمۃ اللعالمین خاتم النّبیین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی صورت میں اپنی تعبیر کو پایا۔ تعمیر کے ایک معنیٰ ہیں عمارت کو بنانا اور دوسرے معنیٰ ہیں اُسے آباد کرنا، پہلے معنیٰ کے اعتبار سے معمارِ کعبہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام ہیں اور دوسرے معنیٰ کے اعتبار سے معمارِ کعبہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

28 ستمبر 2015ء

PLEA BARGAIN

جنابِ جنرل پرویز مشرف کے اقتدار پر ماورائے آئین قابض ہونے کے بعد انہوں نے اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لیے جو قوانین بنائے، ان میں ایک اہم قانون National Accountibility Bureau Ordinance تھا اور اس کا مقصد ایک ''ادارۂ قومی احتساب'' کا قیام تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کا مقصد نیک تھا، مگر جنگِ صفین میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تنازع کے خاتمے کے لیے ایک ثالثی نظام پر رضامندی ظاہر کی اور باہمی اتفاقِ رائے سے دو حکم یعنی منصف یا ثالث مقرر کر دیے گئے، تو آپ کے لشکر سے خوارج کی صورت میں ایک گروہ بغاوت کرتے ہوئے نکلا اور یہ نعرہ لگایا کہ: ''اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ''۔ یعنی حکم تو صرف اللہ کا چلتا ہے اور آپ نے بندوں کو ''حکم'' مان کر معاذ اللہ! کفر کو اختیار کر لیا۔ ان کا یہ نعرہ قرآن مجید کی ان دو آیات سے ماخوذ تھا:

(1) ''حکم تو بس اللہ ہی کا چلے گا، وہ حق بیان کرتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے''۔

(الانعام:57)

(2) ''حکم کا اختیار تو صرف اسی ذاتِ باری تعالیٰ کو ہے اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے''۔

(الانعام:62)

اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہ کلمہ تو بلا شبہ حق ہے، لیکن اس کو باطل مقصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے''۔

یہی صورت حال ادارۂ قومی احتساب کی تھی کہ اس [illegible]

باڑے میں جمع کیا گیا۔ چنانچہ جب 2002ء کے قومی انتخابات کے بعد اہلِ اقتدار کی سعیِ بسیار کے باوجود جنابِ ظفر اللہ خان جمالی بمشکل صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے وزیرِ اعظم منتخب ہوئے، تو انہوں نے کہا کہ ارکانِ اسمبلی نے اپنے ضمیر کے مطابق ووٹ دیے ہیں۔ اس پر مولانا فضل الرحمٰن نے پھبتی کسی کہ بلاشبہ ضمیر کے مطابق دیے ہیں، لیکن سینوں میں دھڑکنے والے ضمیر کے مطابق نہیں بلکہ اُس وقت کے آئی ایس آئی کے ''جنرل ضمیر'' یعنی جنابِ جنرل احتشام ضمیر مرحوم کی ہدایات کے مطابق دیے ہیں، کیونکہ وہی الیکشن سیل کے انچارج تھے۔

مذکورہ ''ادارہ قومی احتساب'' کے دائرہ اختیار میں "Plea Bargain" کی دفعہ بھی موجود ہے، اس کی رو سے اس ادارے کے سربراہ کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر کوئی ملزم اپنے خلاف تحقیقات کے کسی مرحلے میں عدالت میں مقدمہ چلائے جانے سے پہلے یہ استدعا(Plea) کرے کہ میں سرکاری خزانے سے ناجائز طور پر لُوٹی ہوئی رقم واپس کرتا ہوں اور میرے خلاف دائر مقدمہ واپس لے لیا جائے۔ نیب کا چیئرمین اس استدعا کو قبول کرسکتا ہے اور سرکاری خزانے میں واپس کی جانے والی رقم کی مقدار کا تعین کر کے اور احتساب عدالت سے منظوری لے کر یہ معاملہ طے کرسکتا ہے۔ بارگین کے معنی سودا کاری کے ہیں، یعنی سرکاری خزانے میں لوٹائی جانے والی رقم کا تعین بات چیت کے ذریعے کرنا۔ اِسے ہم اپنی سیاسی اور کاروباری اصطلاح میں ''مُک مُکا'' سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، پاکستان تحریک انصاف کے سربراہ جنابِ عمران خان آج کل اس اصطلاح کا بکثرت استعمال کررہے ہیں۔

اس عنوان کو میں نے اپنے کالم کا موضوع اس لیے بنایا کہ پاکستان کے دو سابق چیف جسٹس صاحبان یعنی جناب جسٹس (ر) افتخار محمد چوہدری اور جناب جسٹس (ر) جواد ایس خواجہ اس پر پھبتی کستے رہے ہیں کہ Plea Bargain ایک طرح سے کرپشن کو تحفظ دینا

ملاحظات (Observations) اور ریمارکس درست ہیں۔ لیکن یہ ملکی قانون (Law of the Land) کے مطابق ہیں، کیونکہ ادارۂ قومی احتساب کے قانون میں اس کی گنجائش رکھی گئی ہے، حالانکہ اس میں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ملزم پر اصل چارج یا دعویٰ کتنی رقم کا تھا اور معاملہ طے ہونے کے بعد دونوں رقوم میں فرق کتنا رہا اور آیا یہ فرق حقیقی تھا یا دعوے میں دباؤ ڈالنے کے لیے مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا تھا۔ مزید یہ کہ اس میں اختیارات کا ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھایا گیا؟۔

ہماری نظر میں ہم جیسے اناڑی کا پلی بارگین کے اختیار پر تبصرے اور اس سے اختلاف کا جواز تو بنتا ہے، لیکن ہماری عدالت عظمٰی کے عزت مآب چیف جسٹس صاحبان کے لیے نہیں بنتا، کیونکہ ان کی نظر میں اگر یہ قانونی اختیار اور اس کا استعمال فلسفۂ قانون، روحِ قانون اور تقاضائے عدل کے منافی ہے، تو انہیں پارلیمنٹ اور حکومت کو اسے تبدیل کرنے کی ہدایت یا کم از کم مشورہ دینا چاہیے۔ کیونکہ محض عدالتی ریمارکس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اِن سے الیکٹرونک میڈیا کو بریکنگ نیوز یا پرنٹ میڈیا کو جھلکیاں اور سرخیاں تو مل جاتی ہیں، لیکن کتا کنویں ہی میں پڑا رہتا ہے، جبکہ با اختیار شخصیات کی ذمے داری مسئلے کے حل کی راہ نکالنا ہوتا ہے۔ پلی بارگین کے قانونی اختیار کو ختم کرنے سے پہلے اس امر کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ سرکاری خزانے کو پلی بارگین سے زیادہ فائدہ پہنچا یا بعض مقدمات کو حتمی عدالتی مرحلے تک پہنچانے سے تاکہ نفع ونقصان کا تخمینہ لگایا جاسکے۔

ہماری رائے میں ادارۂ قومی احتساب کے چیرمین کو یہ اختیار دینے کی حکمت یہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے فوج داری (Criminal) اور دیوانی (Civil) قوانین کے نفاذ کا طریقۂ کار یا ضابطے (Procedural Law) اتنے پیچیدہ اور تہ در تہ ہیں کہ ان سے گزر کر کسی ملزم کو مجرم کے درجے تک پہنچانا عقلاً تو نہیں مگر عادتاً محال ہے اور ہمارے ضوابطِ کار کی اِسی پیچیدگی سے بچنے کے لیے اکیسویں آئینی ترمیم عمل میں آئی اور دو سال کے

ہماری قابلِ احترام بار کونسلیں اور مختلف سطح کی وکلا انجمنیں (Bar Associations) ہر آن اور ہر لمحے چوکنا اور متحرک رہتی ہیں اور ہماری قابلِ احترام عدلیہ بھی کسی حد تک یا کافی حد تک اس کی پشتی بان ہے۔ ہمارے رویوں اور تجزیوں میں ایک بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم قوانین اور ضوابطِ قانون اور تفتیش و تحقیق کے معیارات تو مغربی نظام سے مستعار لیتے ہیں، لیکن یہ نہیں سوچتے کہ آیا ہمارے زمینی حقائق ان کے مطابق ہیں، ہمارے تفتیشی و تحقیقی ادارے اتنے آزاد ہیں اور یہ کہ ہمارے ان اداروں کو وہ وسائل اور جدید تحقیقی و تفتیشی سہولتیں دستیاب ہیں؟۔ پس لازم ہے کہ قوانین اپنے معروضی حالات، زمینی حقائق، اَخلاقی معیار اور دستیاب وسائل کے گہرے مطالعے کے بعد بنائے جائیں تا کہ وہ محض کاغذ کی زینت نہ بنے رہیں اور اعلیٰ عدالتوں اور بار کونسلوں کی لائبریریوں میں حسین مجلدات میں سجے ہی نہ رہیں بلکہ ان سے ملک وقوم کو فیض بھی ملے، ہمارا نظامِ عدل برگ و بار بھی لا سکے، عوام اس نظامِ عدل کے سائے تلے راحت و سکون کے سانس لے سکیں اور ہم اقوامِ عالم کے درمیان احساسِ افتخار واعتماد کے ساتھ سر بلند نظر آئیں۔

ہماری پوری تاریخِ عدل میں صرف جنابِ جسٹس (ر) جواد ایس خواجہ واحد مثال ہے کہ انہوں نے نظامِ عدل میں رُکاوٹوں کا بیان کرتے ہوئے عدلیہ اور ادارۂ وکلا کو بھی اس میں شامل فرمایا، پولیس اور تفتیشی اداروں کو تو ہمیشہ ہر ایک ذمے دار قرار دیتا رہا ہے اور بلاشبہ ان پر بنیادی ذمے داری بھی عائد ہوتی ہے، مگر ان کی مجبوریاں اور تحدیدات (Limitations) بھی کچھ کم نہیں ہیں، جن میں ان اداروں کا سیاست زدہ ہونا (Politiciesed) ہونا خشتِ اوّل ہے اور یہی ہماری بہت سی سماجی اور اَخلاقی خرابیوں کے لیے ''اُمّ الامراض'' ہے۔

سیاست دانوں کی خود غرضی کا عالم یہ ہے کہ جنابِ جنرل (ر) پرویز مشرف کے National Accountibility Ordinance سے تو وہ ناراض ہیں، لیکن

پارلیمنٹ احتساب کا قانون نہ بنا سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سیاست دان جب بھی اس طرح کا کوئی قانون بنانے یا اس کا جائزہ لینے یا اس کے بارے میں سوچنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو سب سے پہلے اپنی گردن کو ناپتے ہیں اور اپنی فکر انہیں لاحق ہو جاتی ہے کہ ہو نہ ہو یہ پھندا ہماری ہی گردن میں فِٹ ہوگا، ان کے دل کی کیفیت کا عالم جناب حفیظ جالندھری نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہوجائے

یہی وجہ ہے کہ ہمارے قانون ساز اپنے وقتی اور عارضی مفاد کو دیکھ کر قانون بناتے ہیں اور ان کے قانون ان کے ساتھ ہی دفن ہو جاتے ہیں، نہ وہ دیر پا ثابت ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی برکات سے ملک وقوم صحیح معنیٰ میں مستفید ہو پاتے ہیں۔

29 ستمبر 2015ء

